شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ

حیات اور علمی کارنامے

اقبال حسن خاں

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ

حیات اور علمی کارنامے

اقبال حسن خاں
ایم۔ اے۔ ایم۔ ٹی، پی۔ ایچ۔ ڈی (علیگ)
لکچرار شعبۂ دینیات (سنی)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

سلسلہ منشورات دینیات فیکلٹی

پہلا ایڈیشن

سنہ ۱۹۷۳ء

قیمت -

تعداد اشاعت - ۵۰۰

باہتمام
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس کوہ نور پریس لال کنواں دہلی میں طبع ہوئی

فہرست

عنوان	صفحہ

باب دوم

باب سوم ـ علمی کارنامے

باب چہارم اصلاحی کارنامے

باب پنجم سیاسی زندگی

تحریک ریشمی رومال

مقدمہ

شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ تاریخ اسلام کی ان چند عظیم المرتبت شخصیتوں میں سے ہیں جو علم و فضل، تقویٰ و طہارت اور زہد و ورع کی دولت ابدمدت سے مالا مال ہونے کے ساتھ ایک بلند پایہ مجاہد اور مردِ حریت و آزادی بھی تھے۔ حضرت موصوف نے انقلاب کے ذریعہ استخلاص وطن کا ایک وسیع پروگرام اس وقت بنایا جبکہ کوئی شخص مکمل آزادی کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اور اس کی پاداش میں آپ نے ضعیف العمری اور صحت کی خرابی و کمزوری کے باوجود جو تکالیف و شدائد برداشت کئے اس زمانہ میں کسی کو انکا تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ سوال یہ ہے کہ آپ کی یہ تمام جدوجہد سیاسی نوعیت کی تھی یا اس کا اصل محرک اور باعثِ مذہب تھا؟ جواب یہ ہے کہ آجکل کی اصطلاح میں جس چیز کو سیاست کہتے ہیں حضرت شیخ الہند کا اس سے دور کا تعلق بھی نہیں تھا اور آپ کی تحریک سرتاسر اس اسپرٹ اور اس نقطۂ نظر کے ماتحت تھی، جو قرآن اور اسوۂ رسولؐ و سیرت صحابہؓ کرام پیدا کرتے ہیں، قرآن میں سب سے زیادہ جس چیز کی مذمت کی گئی ہے وہ فساد فی الارض ہے۔ اور فساد فی الارض سب سے زیادہ مہذب مگر نہایت کارگر اور موثر سبب استعمار و ملوکیت ہے۔ یہی وہ برطانوی، فرانسیسی اور پرتگالی استعمار ہے جو اٹھارویں اور انیسویں صدی سے عالم اسلام کے جسم کو جونک کی طرح لگ کر اسکا خون پی رہا اور آہستہ آہستہ اسے درماندہ و ناتواں کر رہا تھا۔ اور اس کا اثر یہ تھا کہ خود اسلام اور اسکی شان و شوکت، حریت و استقلال اور دبدبہ و سطوت کی جڑیں کھوکھلی ہو گئیں۔ اور اس کی عمارت کو گھن لگ گیا تھا۔ حضرت شیخ الہند کی تحریک کا اصل مقصد اسی استعمار اور ملوکیت کو ختم کرنا تھا۔ چنانچہ جب ہندوستان سے برطانوی استعمار کا خاتمہ ہوا تو افریقہ اور ایشیا کے ممالک بھی آگے پیچھے آزاد ہوتے چلے گئے۔ اس بنا پر حضرت شیخ الہند کی یہ تحریک اور سیاسی جدوجہد خالص قرآن مجید کی تعلیمات کے زیر اثر ایک نہایت عظیم اور اہم اسلامی اور انسانی مقصد کی تکمیل کیلئے تھی۔ کوئی شبہ نہیں کہ اس حیثیت سے حضرت شیخ الہند کا مرتبہ و مقام نہ صرف انڈو پاک میں بلکہ عالم اسلام کے مشائخ و علماء میں بہت ممتاز اور نمایاں ہے۔ کیونکہ آپ بیک وقت عظیم محدث اور مفسر بھی تھے۔ اور شاعر و ادیب، عارف باللہ اور ولی کامل بھی تھے۔

اور بلند پایہ بطل حریت و مجاہد بھی۔

عزیزم ڈاکٹر اقبال حسن خاں نے جب شعبہ سنی دینیات کے ماتحت پی۔ ایچ۔ ڈی میں داخلہ لیا۔ اور میری ہی نگرانی میں ان کا کام کرنا منظور ہوا تو میں نے ان کیلئے حضرت شیخ الہند کی لائف اور کارناموں کو تحقیق کا موضوع بنانیکی تجویز کی۔ انھوں نے تین ساڑھے تین برس کی مدت میں جو مقالہ تیار کیا اور جس کو یونیورسٹی نے منظور کر کے مقالہ نگار کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری عطا کی اب آپ کے سامنے موجود ہے، آپ دیکھیں گے اس میں مقالہ نگار نے حضرت شیخ الہند کی شخصیت کا جائزہ ایک مورخ کے نقطۂ نگاہ سے لیا ہے اور کوشش کی ہے کہ موضوع بحث کا کوئی پہلو ایسا نہ ہو جو معرض گفتگو میں نہ آئے اور جو کچھ لکھا جائے تحقیق اور جستجو کے بعد لکھا جائے۔ یوں تو انسان کا کوئی کام بھی لغزش اور خطا سے پاک نہیں ہوتا۔ اور نہ کسی کام کے متعلق یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ وہ بہمہ وجوہ کامل اور مکمل ہے، البتہ پیش نظر مقالہ کی نسبت یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ موضوع مقالہ سے متعلق ہندوستان میں جو کچھ مواد دستیاب ہو سکتا تھا اس سے حتی المقدور مستفید ہونیکی سعی کی گئی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اگرچہ حضرت شیخ الہند پر اصلاً اور تبعاً متعدد کتابیں لکھی گئیں اور شائع ہو گئی ہیں۔ لیکن جو جزئیاتی استقصار اور استیعاب آپ کو اس میں ملے گا وہ کسی اور کتاب میں نظر نہیں آئیگا حضرت شیخ الہند کی تحریک آزادی اور آپ کی اسارت و قیام مالٹا سے متعلق میرے خیال میں ابھی چند امور ہیں جو پردۂ خفا میں ہیں اور ان کی کھوج لگانے کی ضرورت ہے لیکن اُنکا سراغ لندن کے انڈیا آفس یا برٹش میوزیم میں لگ سکتا ہے ہندوستان میں نہیں۔

بہر حال ایک یونیورسٹی کے مقالۂ پی۔ ایچ۔ ڈی کی حیثیت سے یہ مقالہ حضرت شیخ الہند کی حیات اور آپ کے لوع بہ لوع کارناموں کی ایسی داستان ہے جو شیریں اور لذیذ بھی ہے، عبرت انگیز و سبق آموز بھی، جذبات آفریں و ولولہ خیز بھی ہے اور بصیرت افروز و معلومات افزا بھی۔ امید ہے کہ ارباب ذوق اس مطالعہ سے شاد کام و محظوظ ہوں گے؛

پروفیسر سعید احمد اکبر آبادی

انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹری آف میڈیسن اینڈ میڈیکل ریسرچ
(ہمدرد) نئی دہلی - ۶۲

۲۲/ اگست ۱۹۷۳ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

اسلام صرف چند عقائد اور رسوم و عبادات کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک خاص طریق فکر اور نظام حیات ہے اور اس کی تعلیمات زندگی خواہ انفرادی ہوں یا اجتماعی اس کے تمام شعبوں پر حاوی اور محیط ہے پھر چونکہ اس کی تعلیمات فطری اور وحی الٰہی پر مبنی ہیں اس بنا پر اسلام کسی خاص فرقہ گروہ اور کسی ایک خاص ملک اور قوم کیلئے مخصوص نہیں بلکہ دنیا کے سب انسانوں کے لئے ایک صالح، کامیاب اور مکمل زندگی بسر کرنیکا ذریعہ اور طریقہ ہے۔ اس خصوصیت کے باعث اسلامی تعلیمات کی رو سے صرف اتنی بات کافی نہیں ہے کہ مسلمان انفرادی یا اجتماعی طور پر چند عبادات اور رسوم بجالائیں اور چند بندھی ٹکی چیزوں پر عمل کرتے رہیں بلکہ ان کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ایسی فضا اور ماحول پیدا کریں جس میں اسلامی نظام زندگی کسی قسم کا کوئی جبر گھٹن اور دباؤ محسوس نہ کرے اور اس کو آزادی، خود مختاری اور خود اعتمادی کے ساتھ نشو ونما پانے، ترقی کرنے اور پھلنے پھولنے کا موقع مل سکے کوئی پودا کتنا ہی حسین وجمیل اور کوئی تخم کیسا ہی برگ وبار آور ہو لیکن اگر آپ نے اسے کسی بند کمرے میں مقید کر دیا یا اس پر پتھر کی کوئی سل رکھدی ہے تو یہ اس پودے یا تخم کے لئے موت ہے نہ کہ زندگی۔

پس یہی وہ حکمت ومصلحت ہے جس کے باعث جہاد کو اسلام کا ایک اہم رکن قرار دیا گیا اور اس کے فضائل بیان کئے گئے ہیں جہاد کا مقصد ملک گیری اور اپنے حدود مملکت کی توسیع کی غرض سے کسی ملک پر جارحانہ حملہ کرنا ہرگز نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد اسلامی تعلیمات پر بے روک ٹوک عمل اور اس کی تبلیغ واشاعت کے لئے ایسی فضا پیدا کرنا ہے جس میں آزادی ہو اور کسی قسم کا کوئی جبر واکراہ نہ ہو۔

اس مقصد کو حاصل کرنیکے لئے جنگ کرنا اور تلوار اٹھانا ہمیشہ ضروری نہیں ہے بلکہ بعض اوقات یہ کام حکمت عملی سے بھی ہو جاتا ہے البتہ اگر یہ حکمت عملی ناکام ہو اور کوئی دوسری راہ کھلی نہ رہے تو اب بے شبہ جنگ ناگزیر ہو جاتی ہے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ میں ہمیں یہ دونوں باتیں صاف نظر آتی ہیں۔ آپ جب مدینہ پہونچے

تو آپ نے وہاں کے مختلف قبائل کے یہودیوں کے ساتھ ایک معاہدہ کے ذریعہ ایک ریاست قایم کی جس کو ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے "پہلی مدینہ اسٹیٹ" کہا ہے۔ اس معاہدہ کے ماتحت مسلمانوں اور یہودیوں دونوں کے شہری معاملات میں یکساں حقوق و فرائض تھے لیکن جب ان یہودیوں نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی اور قریش مکہ کے ساتھ ساز باز کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھلی دشمنی کا مظاہرہ کرنے لگے تو یہ معاہدہ خود بخود ختم ہوگیا اور اب اس کے سوا کوئی اور چارہ کار نہ رہ گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مسلمانوں کی اور اسلام کی حفاظت کے لئے دشمنوں کے ساتھ جنگ کے لئے تیار ہوں چنانچہ آپ نے بڑے بڑے معرکے سر کئے جو غزوات و سرایا کے نام سے مشہور ہیں۔ اسلام کی تعلیمات کا مکمل نمونہ عمل اور اس بنا پر مسلمانوں ہی کے لئے کیا بلکہ ساری دنیا کے لئے اسوۂ حسنہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی ذات مبارک ہے اور اس کی پیروی اور اتباع ہی فلاح دارین کی ضمانت و کفالت۔

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجو اللہ والیوم الآخر وذکر اللہ کثیرًا ط بے شبہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) تم سب کے لئے بہترین نمونہ عمل ہیں — ہاں ان لوگوں کے لئے جو اللہ اور یوم آخرت کی آس لگائے رکھتے ہیں اور اللہ کو بہت یاد کرتے ہیں۔

اس بنا پر ضروری تھا کہ علمائے کرام اور مشائخ عظام جن کو ارشاد و ہدایت دعوت الی الحق اور وعظ و تذکیر میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت و وراثت کا مرتبہ و مقام حاصل ہے ان میں حضورؐ کی حیات طیبہ کے اس خاص رخ اور پہلو کی بھی جلوہ گری پائی جائے لیکن پوری تاریخ اسلام پڑھ جایئے۔ آپ دیکھیں گے کہ علماء اور مشائخ نے بحیثیت ایک طبقہ کے اپنے آپ کو درس و تدریس، تصنیف و تالیف، وعظ و خطابت اور روحانی تزکیہ و تصفیہ کے لئے وقف کر لیا اور سیرت نبوی کے اس خاص پہلو کو سیاست کا نام دے کر اس سے کنارہ کش رہے اور مجاہدین کے ذریعہ اس کی تعمیل و تکمیل ہوتی رہی۔ اس میں شبہ نہیں کہ تاریخ میں ایسے نفوس قدسیہ بھی نظر آتے ہیں جو ایک طرف ارباب علم و قلم تھے تو ساتھ ہی اصحاب سیف و علم بھی۔ وہ مسند درس و تدریس کی زینت اور مسجد و خانقاہ کی رونق تھے اور ساتھ ہی میدان سیاست کے شہسوار بھی

لیکن ایسے جامع الصفات والکمالات بزرگوں کی تعداد بہت کم ہے اور انھیں قلیل التعداد بزرگوں میں شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کی ذات گرامی بھی شامل ہے لیکن حضرت شیخ الہند نے جن خاص حالات میں دنیا کی ایک عظیم ترین اور ترقی یافتہ قوم (انگریز) کے خلاف اپنی سیاسی تحریک چلائی اور جس طرح چلائی اس سب کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان معدودے چند حضرات علماء میں بھی شیخ الہند کا مقام بہت ممتاز اور نمایاں ہے جہاں مسلمان آزاد ہوں ان کی اپنی حکومت اور فوج ہو وہاں نسبتاً یہ بات آسان ہے کہ اگر کوئی غنیم ان کے ملک پر حملہ آور ہو تو وہ اس کے مقابلہ کے لئے میدان جنگ میں کود پڑیں اور کمال شجاعت و بہادری اور بیخوفی و بے جگری کے ساتھ برسر آزما ہوں۔

لیکن حضرت شیخ الہند اور ان کی تحریک کا معاملہ اس سے مختلف تھا یہاں صورت حال یہ تھی کہ سات سمندر پار کی ایک قوم جو مذہباً عیسائی تھی اور جو اس حیثیت سے مسلمانوں کے ساتھ صلیبی لڑائیوں کو ابتک بھلا نہیں سکی تھی ہندوستان ایسے وسیع وعریض ملک پر حکمران تھی اور اپنی حکومت کی وسعت، جنگی طاقت وقوت ۔ تدبر و سیاست علوم و فنون ۔ سائنس اور ٹکنالوجی اور صنعت و حرفت کے باعث دنیا کی عظیم ترین قوم سمجھی جاتی تھی اور ادھر اس ملک کی حالت یہ تھی کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اس کو جو شکست فاش ہوئی تھی اب تک اس کے اثرات اور مہلک نتائج سے پنپ نہیں سکا تھا ان حالات میں کسی ہندوستانی کے لئے اس فاتح اور حکمران قوم کو اس ملک سے نکال باہر کرنے کا خیال بھی آسان نہ تھا لیکن یہی حالات تھے کہ جن میں ایک نحیف الجثہ مرد مومن جو وقت کا عظیم المرتبت عالم بھی ہے اور شیخ طریقت بھی دیوبند کے اپنے حجرہ میں بوریہ پر بیٹھ کر وقت کی اس عظیم ترین حکومت کے پنجہ استبداد و استعمار سے ملک کو آزاد کرا لینے کا ایک نہایت وسیع منصوبہ بناتا ہے اور ایک تحریک کی شکل میں اسے شروع کر دیتا ہے۔

بے شبہ یہ بھی جہاد ہے لیکن اس میں صرف بہادری اور شجاعت کا مظاہرہ کافی نہیں ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ ضروری ہے فہم و تدبر، سیاسی سوجھ بوجھ، بین الاقوامی حالات سے واقفیت، تنظیم کی اعلیٰ صلاحیت، جوش کے ساتھ ہوش، عزم

ولیند ہمت اور جس شخص نے حضرت شیخ الہند کی اس تحریک کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتا ہے کہ ان چیزوں میں سے وہ کون سی شئے تھی جس کی یہاں کمی ہو۔ منصوبہ کامیاب رہا یا ناکام اس سے بحث نہیں۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ یہ تحریک جس عزم و ہمت، ولولہ و جوش، فہم و بصیرت اور اعلیٰ تنظیم و تدبیر کے ساتھ چلائی گئی ہے اس کے پیش نظر اسمیں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ شیخ الہند کا مرتبہ و مقام صرف برصغیر ہند و پاک کے علماء و مشائخ میں ہی سب سے اونچا نہیں ہے بلکہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں ترکی اور مصر میں جو مجاہدین حریت و آزادی پیدا ہوئے اور جنھوں نے اپنے ملکوں کو اجنبی اقتدار و تسلط سے آزاد کرنے کے لئے نہایت نمایاں کارنامے انجام دیئے ان میں بھی بہت ممتاز نظر آتا ہے کیونکہ علم و عمل، تقویٰ و طہارت، شریعت و طریقت اور پھر دین اور سیاست کی جو جامعیت اور ہمہ گیری آپ کی شخصیت میں پائی جاتی ہے وہ کہیں اور نظر نہیں آتی۔ اس بناپر ضرورت تھی کہ آپ کی عظیم شخصیت اور متنوع خدمات اور کارناموں کا بھرپور جائزہ ممکن الحصول مواد اور معلومات کی روشنی میں اس طرح لیا جائے کہ کوئی پہلو تشنہ اور گوشہ خفا میں نہ رہ جائے۔

حضرت شیخ الہند پر ہندوستان اور پاکستان میں متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن وہ سب کسی نہ کسی حیثیت سے نامکمل ہیں کیونکہ ملک کی آزادی سے قبل جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں تو بتقضائے مصلحت حضرت مرحوم کی سیاسی تحریک کا ذکر تفصیل سے آ ہی نہیں سکتا تھا البتہ آزادی کے بعد سے اب تک جو کتابیں چھپی ہیں ان میں حضرت مرحوم کی سیاسی تحریک کا ذکر نسبتاً ذرا تفصیل سے ہے لیکن پھر بھی ایسی کتاب کی ضرورت تھی جس میں مولانا کی شخصیت، اخلاق و عادات، علمی اور عملی کمالات اور دینی و سیاسی خدمات ان سب کا جامع اور محققانہ تذکرہ ہو۔ یہ مقالہ اس ضرورت کی تکمیل کی غرض سے لکھا گیا ہے لیکن اس کو بھی بہمہ وجوہ مکمل نہیں کہا جاسکتا کیونکہ حضرت شیخ کی سیاسی تحریک اور خصوصاً ریشمی رومال کے متعلق جو سرکاری کاغذات لندن کی انڈیا آفس لائبریری میں محفوظ ہیں ان تک رسائی نہیں ہوسکی۔

مقالہ کی تیاری کے سلسلہ میں دیوبند کا یادگار سفر قابل ذکر ہے۔ میں دیوبند اتفاق سے ایسے موقع پر پہونچا تھا کہ وہاں مجلس شوریٰ کا اجلاس ہو رہا تھا جس

کی وجہ سے مقامی حضرات کے علاوہ کچھ بیرونی حضرات بھی تھے۔ محترم پروفیسر مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی جن کی توجہ اور عنایت شروع سے میرے لئے ممدو معاون ثابت ہوئی انھوں نے وہاں موجود دیگر حضرات سے مجھے ملایا۔ ان حضرات کو میرے مقالہ کا موضوع معلوم ہوا تو بڑے خلوص اور تپاک سے ملے شیخ الہند سے نسبت ان حضرات کے لئے کافی وجہ کشش ثابت ہوئی۔

اس سفر میں شیخ الہند کے مکان کی زیارت ہوئی خاص توجہ سے وہ کمرہ دیکھا جس میں ارکان تحریک کے خفیہ جلسے ہوا کرتے تھے جس میں متعدد مسلمان ارکان کے علاوہ ہندو اراکین تحریک بھی ہوتے تھے۔ شیخ الہند کے بعض اعزاء سے بھی ملاقات ہوئی۔ خصوصیت سے حضرت شیخ الہند کی چھوٹی صاحبزادی محترمہ بتول صاحبہ نے حضرت شیخ الہند کے متعلق بہت سی ایسی باتیں بتائیں جو کتابوں میں نہیں ملتیں۔ میں ان سب حضرات کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

مقالہ کی تیاری کے سلسلہ میں اپنے نگران پروفیسر مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی کا غایت درجہ ممنون ہوں کہ انھوں نے قدم قدم پر رہبری و رہنمائی فرمائی اور اپنے بیش قیمت مشوروں سے نوازتے رہے پروفیسر اکبرآبادی صاحب محترم کی خصوصی توجہ، عنایت ، ہمدردی کی بنا پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے مجھے اس مقالہ پر پی ایچ ڈی کی ڈگری دی۔

استاذ مکرم جناب قاضی مظہر الدین احمد بلگرامی صاحب صدر شعبہ سنی دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ نے میری توجہ اس امر کی طرف بار بار منعطف کرائی کہ میں اپنے اس مقالے پر نظر ثانی کرکے اسے زیور طباعت سے آراستہ کروں ان کی بار بار یاددہانی اور توجہ نے مجھے اس پر آمادہ کیا کہ میں اس پر نظر ثانی کر سکوں۔ میں ان کا حد درجہ ممنون ہوں کہ انھوں نے نظر ثانی کرتے وقت اپنے بیش بہا مشوروں سے مجھے نوازا اور اس کی طباعت کے لئے انھوں نے اجازت مرحمت فرمائی۔

میں یہاں پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب ڈین دینیات فیکلٹی کا سپاس گزار نہ ہوں تو بڑی احسان فراموشی ہوگی۔ پروفیسر موصوف نے خصوصی توجہ فرما کر یونیورسٹی کے "اشاعت مقالات فنڈ" سے ایک گراں قدر رقم منظور فرمائی جس کے بغیر اس کا شائع

ہونا ناممکن تھا۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب محترم نے بھی اپنی انتہائی مصروفیات کے باوجود میرے مقالے پر نظرِ ثانی کی اور اہمیں بہت سے مقامات پر اپنے گرانقدر مشوروں سے نوازا۔ بعض ابواب کو میں ضخامت کے لحاظ سے کم کرنا چاہتا تھا لیکن موصوف نے اس کو برقرار رکھنے پر زور دیا اور محض فنڈ کی کمی کیوجہ سے اسکو خارج کرنے سے منع فرمایا۔ موصوف کی علم نوازی کی یہ ایک انوکھی مثال ہے۔

احسان ناشناسی ہوگی اگر اپنے مخلص کرم فرما ڈاکٹر محمد اسلم استاد شعبۂ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے تعاون کا ذکر نہ کروں ڈاکٹر صاحب موصوف نے پاکستان سے بعض ایسی کتابیں بھیجیں کہ ان کے بغیر سیاسی خدمات سے متعلق مقالہ کا سب سے اہم جز وناقص و نامکمل رہ جاتا۔ میں موصوف کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔

استاذ محترم ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب گنوری لکچرر شعبہ سنی دینیات بھی شکریہ کے مستحق ہیں کہ ان کی عنایت سے شیخ الہند کے کچھ خطبے اور ترک موالات کا مشہور فتویٰ دستیاب ہوا نیز چند غیر مطبوعہ خطوط بھی آپ نے فراہم کئے۔

آخر میں، میں اپنے تمام احباب کا شکرگزار ہوں جنھوں نے وقتاً فوقتاً اس مقالے کی تیاری میں میری ہر طرح مدد فرمائی۔

مولف اقبال

آئندہ ابواب کی ایک جھلک

باب اول :۔ پہلے باب میں یہ دکھایا گیا ہے کہ انگریزوں کی آمد اور ملک پر ان کے تسلط سے قبل ملک کی عمومی حالت کیا تھی نیز اس امر پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے کہ وہ کون سے عوامل تھے جنھوں نے انگریزوں کو اس کا موقع دیا کہ وہ معاملات ملکی میں دخل اندازی کرنے لگے اور رفتہ رفتہ اپنی قوت اتنی بڑھالی کہ پورا ملک ان کے پنجہ استبداد میں آگیا۔ اس سلسلہ میں یہ دکھایا گیا ہے کہ مختلف امراء اور والیان ریاست مکمل بے فکری کے ساتھ دادِ عیش دے رہے تھے اور امور سلطنت سے تقریباً بے نیاز سے ہو گئے تھے جنھیں کچھ دلچسپی تھی وہ ایک دوسرے کیخلاف سازشیں کرنے اور اس کو کمزور کرنے کے درپے رہتے تھے ریاستوں کے اس انتشار سے مرکزی حکومت برابر کمزور ہوتی جارہی تھی۔ اور ریاستوں پر اس کا اثر اور اقتدار کم ہونے لگا تھا۔ اسی دوران سکھوں، مرہٹوں اور جاٹوں کی شورش نے مرکزی حکومت کو نیم جان کر دیا۔ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں پر بھی کسی قدر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

احمد شاہ ابدالی کو حملہ کی دعوت حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے دی تھیں لیکن کیوں؟ ملک کو تباہی کے دہانے پر کھڑا دیکھ کر اس کو تباہی و بربادی کے غار میں گرنے سے بچانے کے لئے۔ لیکن مغلیہ حکومت زوال کی جس منزل میں پہونچ چکی تھی اس میں وہ ابدالی کے حملہ سے بیدار نہ ہو سکی اور اس نے آخری بار سنبھلنے کا موقع بھی کھو دیا۔

شیخ الہند کی تحریک کے مطالعہ سے ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ آپ کی تحریک شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک کا پرتو اور نقش ثالث ہے اس لئے تحریک کے پس منظر کی حیثیت سے ہم نے شاہ صاحب کی تحریک کا کسی قدر تفصیلی جائزہ لیا ہے اور شاہ صاحب کے بعد آپ کی تحریک کے نقش ثانی کی حیثیت سے حضرت سید احمد شہید کی کوششوں کا بھی واضح تذکرہ کیا ہے۔

اس پورے عرصے میں جب مرہٹے، سکھ اور جاٹ مرکزی مغلیہ حکومت سے ٹکرا ٹکرا کر اسکی قوت کمزور کرنیکے ساتھ ساتھ اپنی قوت بھی کمزور کئے لے رہے تھے۔ اسوقت ملک میں ایک اور قوم تھی جو انتہائی خاموشی مگر بے حد ہوشیاری سے اپنے دست و بازو قوی کرنے اور اپنی قوتوں کو منظم کرنے میں مصروف تھی۔ یہ انگریز قوم تھی جو آہستہ آہستہ سیاسیات ملکی میں در اندازی شروع

کی اور نوبت یہاں تک آئی کہ مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کو بے دست و پا کر تخت شاہی سے اتار کر اپنی حکومت قائم کر لی۔ ع

ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

انگریزوں نے ملک پر تسلط حاصل کرنے کے بعد ہندوستان کے اصل باشندوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا سیاست کی باگ ڈور تو ان کے ہاتھوں میں تھی ہی ، صنعت و تجارت سے بھی ملکی باشندوں کو بے دخل کر دیا جس سے ان کی قوت لوٹ گئی جلد ہی انھوں نے مذہبی امور میں بھی مداخلت شروع کر دی۔ جس نے اہل ملک کا پیمانۂ صبر لبریز کر دیا۔ یہاں تک کہ بالآخر ۱۸۵۷ء میں چھلک ہی پڑا ان تمام واقعات کا مکمل جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

۱۸۵۷ء کی ناکامی نے ایک عرصہ کیلئے اہل ملک کے حوصلوں کو پست کر دیا تھا اور وہ مایوس ہوکر تقدیر کے سہارے بیٹھ رہے تھے اس تاریکی سے روشنی کی ایک کرن پھوٹی اور تحریک ولی اللہی کے باقیات صالحات نے دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کیا، جسکا مقصد قیام محض تعلیم و تعلم نہ تھا بلکہ اس کے ذریعہ مایوس دلوں کو امید و حوصلہ کا پیغام بخشنا تھا اس باب کے آخر میں دیوبند کے قیام پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

باب دوم :۔ دوسرے باب میں شیخ الہند کے خاندان ، خصوصیت سے آپ کے والد مولانا ذوالفقار علی صاحب کے کسی قدر حالات اور ان کی علمی و دینی خدمات کے تذکرہ بعد شیخ الہند کی ولادت بچپن ، تعلیم ، آپ کے اساتذہ، پھر دارالعلوم دیوبند میں مدرسی اور خصوصیات درس کا ذکر ہے نیز اسی میں آپ کی شادی، اولاد پھر لڑکیوں کی شادی، گھر میں آپ کے معمولات اخلاق و عادات وغیرہ کا ذکر ہے۔

اسی باب میں سفر حجاز کے دوران حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی سے بیعت ۔ خلافت اور اس سلسلہ کے دیگر متصوفانہ اشغال کا ذکر ہے۔

باب سوئم :۔ اس باب میں شیخ الہند کی علمی خدمات کا تذکرہ ہے جس کے ذیل میں آپ کی تصنیفات ، خطابت اور شاعری وغیرہ سے بحث کی گئی ہے۔ تصنیفات کے ضمن میں آپ کی تمام چھوٹی بڑی تصنیفات کا تذکرہ کیا گیا ہے اور ان پر تبصرہ کر کے ان کی خصوصیات واضح کر دی گئی ہیں بعض جوابی کتابوں کے متعلق یہ تفصیل

درج کر دی گئی ہے کہ متعلقہ موضوع پر کیا مسائل سامنے آئے تھے اور کن حالات میں آپ نے ان پر قدم اٹھایا۔

خطابت کے ذیل میں روزمرہ زندگی میں خطابت کے اثرات پر ایک نوٹ کے بعد شیخ الہند کی خطابت کا تذکرہ ہے چند تقریروں کے جستہ جستہ اقتباسات بھی نقل کر دیے ہیں۔

شعر و شاعری کے سلسلہ میں یہ حقیقت مدنظر رکھنی چاہیے کہ آپ کی شخصیت کا اصل پہلو شعر و شاعری نہیں۔ بیشک آپ نے مختلف اوقات میں کبھی کسی حادثہ سے متاثر ہو کر کبھی محض جودت طبع اور طبیعت وجد میں آنے پر اشعار کہے لیکن شخصیت کو اس کے گرد محیط سمجھنا صحیح نہیں۔ ان اشعار کو خالص شعری و فنی پیمانہ سے ناپنا شعر و فن اور شخصیت دونوں کے ساتھ ناانصافی ہو گی اس لئے کوشش کی گئی ہے کہ آپ کے شعری سرمایہ پر لکھتے وقت محض تاثراتی کیفیات اور شعری خصوصیات کو اجاگر کر دیا جائے۔

باب چہارم و پنجم:۔ شیخ الہند کی خدمات کے دو جزو ہیں ایک علمی خدمات جن کا مفصل تذکرہ تیسرے باب میں کیا جا چکا ہے۔ دوسرا جزو آپ کے قومی سیاسی خدمات کا ہے جس کی اہمیت کے پیش نظر اسے مستقل باب میں علٰحدہ پیش کیا گیا ہے خدمات کا یہی وہ جزو ہے جس نے آپ کو اپنے حلقہ میں امتیاز و انفرادیت بخشی ہے۔

بدقسمتی سے سمجھا یہ جاتا ہے کہ مذہب و سیاست کے دو الگ خانے ہیں ایک کو دوسرے سے کوئی واسطہ اور علاقہ نہیں لیکن حقیقت واقعہ یہ ہے کہ یہ تصور یکسر غلط ہے اس تصور کے ساتھ اسلامی تاریخ کا مطالعہ کیجئے تو چند قدم بھی یہ موہوم تصور کے ساتھ نہیں دے سکتا۔ سیر نبوی ہی کو لے لیجئے۔ ایک ہی ذات گرامی صلی اللہ علیہ وسلم ہے جسے آپ نماز روزہ یا دوسری عبادات کی تلقین کرتے ہوئے پائیں گے۔ اور مقدمات فیصل کرتے ہوئے بھی، سیاسی گتھیاں سلجھاتے ہوئے بھی۔ ایک ہی شخصیت ہے جسے مسجد نبوی میں کبھی تنہا کبھی صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی معیت میں یاد الٰہی میں مشغول اور ذات باری سے مصروف

راز و نیاز پائیں گے کبھی بدر و احد اور تبوک و خندق کے معرکہ میں دیکھیں گے۔ ایک شخصیت ہے جسے عرصۂ حیات تنگ ہونے پر چھپ چھپا کر مکہ معظمہ سے نکلنا پڑتا ہے۔ وہی زیادہ نھیں صرف دس سال بعد کسی فخر و تعلی نہیں بلکہ بارگاہ خداوندی میں سر نیاز خم کئے ہوئے مگر فاتحانہ حیثیت سے مکہ معظمہ میں موجود ہے جس کو حرم کعبہ میں نماز پڑھنے کی اجازت نہ تھی اس کے قدموں میں بیت اللہ کی کنجیاں پڑی ہوئی ہیں۔ تاریخ ان واقعات کا تعلق دو الگ الگ شخصوں سے نہیں ایک ہی سے بتاتی ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ صحابہ میں دیکھئے ایک ہی شخص ہے جس کے ایمان و اسلام کے لئے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم دعا مانگ رہے ہیں۔ ایمان و اسلام لانے پر یہ مرتبہ نصیب ہوا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر ہوتے"۔ ایسے قابل صد رشک ایمان والے صحابی کی زندگی پر نظر ڈالئے کیا مذہب و سیاست کے دو خانے کہیں نظر آتے ہیں پھر یہ تصور کہاں سے در آیا۔ ہندو مت کے جوگ کا اثر ہو یا النصاریٰ کے تصور رہبانیت سے اس کی جڑیں ملتی ہوں کہیں سے بھی آیا ہو بہر حال باطل تصور ہے۔

حضرت شیخ الہند اپنے سلف صالحین کے پیرو تھے اپنی تمام تر علمی و دینی خدمات کے ساتھ ساتھ حالات دیکھ کر اور ضرورت سمجھ کر میدان سیاست میں آئے لیکن حالات کا اقتضاء تھا کہ کھل کر سامنے نہ آیا جائے اور خموشی سے طوق غلامی گلے سے اتار پھینکنے کی جدوجہد کیجائے۔ اس لئے آپ نے سالہا سال کی محنت سے اپنی کوششوں کو ترتیب دیا ہمارے خیال میں آپ کی تحریک شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ کی تحریک کا نقش ثالث ہے۔

عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ تحریک ریشمی رومال آپ کی ان سیاسی کوششوں کا واحد مظہر ہے مگر یہ خیال صحیح نہیں اس باب میں ہم نے یہ دکھایا ہے کہ آپ کے مختلف کام جنھیں عموماً سیاسیات سے علٰحدہ سمجھا جاتا ہے وہ سب کے سب باہم گر مربوط اور ایک ہی سلسلہ کی مختلف کڑیاں ہیں نیز یہ آپ کی ان کوششوں کے چھوٹے چھوٹے منظاہر ہیں ان میں سب سے واضح کوشش وہی ہے جو تحریک ریشمی رومال کے نام سے مشہور ہوئی۔

چوتھے باب میں ثمرۃ الترتیب، جمعیۃ الانصار، نظارۃ المعارف وغیرہ کے قیام اور اس سے پیدا ہونے والے اثرات کا ذکر کیا گیا ہے۔

پانچویں باب میں ان حالات کا ذکر ہے جن میں تحریک محدود دائرہ کار سے نکل کر

بیرون ملک تک پھیل جاتی ہے اور جسمیں متعینہ مقاصد کے حصول کے لئے مولانا سندھی کے سفر کابل اور اسکے مقاصد پر روشنی ڈالنے کے بعد سرحدی لوگوں کو آمادہٗ جہاد کرنے کی تفصیلات کے علاوہ مولانا سندھی کے قیام کابل کے مکمل حالات، ہندوستان و افغانستان کے علاوہ چین و برما، فرانس، جاپان اور امریکہ بھیجے ہوئے وفود کا تذکرہ کرتے کے بعد تحریک کے کام سے خود شیخ الہند کے سفر حجاز کا پوری تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

ہندوستان میں خطوط کا راز فاش ہو جانے کے بعد مولانا سندھی کی کابل میں نظر بندی اور شیخ الہند وغیرہ کی مالٹا کی اسارت کے واقعات بالتفصیل لکھے گئے ہیں۔ دانستہ یا نادانستہ طور پر انگریزوں کا آلہ کار بنکر جن لوگوں نے تحریک کو ناکام بنا دیا آخر میں ان کا بھی تذکرہ کر دیا گیا ہے۔

باب ششم:۔ شیخ الہند مالٹا کی اسارت کا طویل عرصہ گذار کر ہندوستان آئے تو کچھ عمر طبعی کا تقاضا اور بڑی حد تک مالٹا کی ناقابل برداشت سردی اور اس پر مستزاد وہاں کی سزاؤں نے قویٰ میں غیر معمولی ضعف و اضمحلال پیدا کر دیا تھا صحت تو پہلے بھی کچھ زیادہ اچھی نہ تھی لیکن اب بہت زیادہ نحیف و نزار ہو گئے تھے ان قید و بند کا مقصد یہ تھا کہ حصول حریت کا وہ نشہ سرد ہو جائے جو خود آپ کے رگ و ریشہ پر چھایا ہوا تھا اور آپ کے واسطے سے ایک بڑے طبقے پر اثر انداز ہوتا جا رہا تھا لیکن سزائیں جھیل کر یہ نشہ کم نہ ہوا بڑھ گیا۔ ع

بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد

چنانچہ واپسی کے بعد آپ نے اپنی غیر معمولی خرابی صحت کے باوجود مختلف شہروں کے سفر کئے، مختلف مسائل میں کھلکر اپنی رائے دی، نیز مولانا محمد علی جوہر کی دعوت پر قیام جامعہ ملیہ کے تاسیسی اجلاس میں شرکت فرمائی۔ اس کے چند ہی دنوں بعد علالت اور شدت اختیار کر گئی جس کی انتہا آپ کے وصال پر ہوئی۔ مقالہ کے چھٹے باب میں یہی مندرجات مذکور ہیں۔

ضمیمے آخر میں، چند صفحات کے اضافے سے حسب ترتیب ذیل چند ضمیمے شامل کر دیے گئے ہیں۔

۱۔ ممتاز تلامذہ ۔ مع تعارفی نوٹس

۲ ۔ خلفاء و مجاہدین

۳ ۔ مکاتیب

آخری ضمیمہ جو مکاتیب سے متعلق ہے اسمیں مکاتیب کے افادی پہلو پر ایک مختصر نوٹ کے بعد مختلف کتابوں اور اخبارات و رسائل سے جمع کر کے نیز کچھ غیر مطبوعہ خطوط بھی نقل کر دیے گئے ہیں ۔

شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ
حیات اور علمی کارنامے

بابِ اوّل

ہندوستان ۱۸۵۷ء سے پہلے

مغلیہ سلطنت کے شکوہ و دبدبہ کا جو نقش عالمگیر کے عہد میں قائم ہو گیا تھا مرہٹوں کی شورش سے اگرچہ اس پر کچھ دھندلاہٹ کے آثار پیدا ہو گئے تھے تاہم عالمگیر کے عہد تک یہ گمان نہ تھا کہ سطوت و قوت کا یہ نقش یوں مٹ جائیگا۔

عالمگیر کے بعد سرزمین ہند کا وسیع ترمیدان سیاست یکسر نااہلوں کے ہاتھ میں چلا گیا جنھوں نے مرکزی حکومت کو بازیچۂ اطفال بناکر رکھدیا۔ مختلف ریاستیں اور صوبے مرکز کی گرفت سے آزاد ہو گئے اور خود صوبیداروں کے مابین حصول اقتدار کی کشاکش پیدا ہو گئی۔ مرہٹوں کا فتنہ جو عالمگیر کے عہد میں کچھ دب سا گیا تھا اس نے از سرِ نو سر اٹھایا۔ راجپوت، جاٹ اور سکھوں نے اس قیامت خیز طوفان کو اور بڑھایا رہی سہی کمی نادرشاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں نے پوری کر دی۔ ان تمام شورشوں نے سلطنت مغلیہ کی کمر توڑ دی۔ (۱)

نااہلوں کا تسلط تھا ان سے بن کیا پڑتا انھوں نے وقت اور دولت کا صحیح مصرف عیاشی و بدمستی خیال کیا۔ محمد شاہ جو اپنی شہرۂ آفاق عیاشیوں کیوجہ سے "رنگیلا" کے نام سے مشہور ہے، تین تین سو کسبیاں اپنے سامنے ننگی نچاتا تھا اس کے باورچی خانہ کا خرچ تین کروڑ روپیہ ماہوار تھا۔ (۲) انھیں نااہلوں میں ایک اور بادشاہ وقت کا یہ حال تھا کہ ایک پھل بیچنے والی کنجڑن پر مرمٹا اور اس کو ملکہ بناکر چھوڑا۔ (۳)

حکومت کی اس کمزوری سے مرہٹوں، جاٹوں اور سکھوں سب نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی سب نے ملکر انکرا کر اپنی قوت ختم نہیں تو کمزور ضرور کر لی پھیر

احمد شاہ ابدالی کے ایک حملہ (۶۱ – ۱۷۶۰) نے مرہٹوں کا بڑھتا ہوا زور توڑ دیا۔
اس پورے عرصہ میں جب یہ قوتیں ٹکرا ٹکرا کر اپنی قوت کمزور کر رہی تھیں، ایک اور قوت تھی جو ایک طرف اپنے زور بازو کو اور قوی کر رہی تھی۱؎ اور دوسری طرف ہندوستان کی سیاست اور اس کے اتار چڑھاؤ کے غائر مطالعہ میں مصروف تھی۔
اس نے اپنے زور بازو کی نمائش پہلی بار پلاسی کے میدان میں کی ایسی میدان اس بڑھتی ہوئی قوت (انگریزوں) کے ہاتھ رہا۔ زور بازو کی یہ نمائش اگرچہ محدود پیمانہ پر تھی، لیکن اس محدود کامیابی نے آئندہ کے لئے عزم و حوصلہ کی نئی راہیں کھول دیں۔
ہندوستانی تاریخ کا یہ المناک باب ہے کہ اس محدود کامیابی سے لوگوں نے آئندہ آنیوالے خطرات کا صحیح اندازہ نہ لگایا ہمارے خیال میں اس میں سیاسی بے بصیرتی نہیں بلکہ بے بصری کا دخل ہے پلاسی کی معرکہ آرائی سے ایک سال قبل سراج الدولہ نے جون ۱۷۵۶ئ؁ میں شوریدہ سر انگریزوں کو کلکتہ سے نکال باہر کیا، مگر بعد میں باغیوں کو معاف تک کر دیا گیا۔ حالانکہ یہ وقت وہ تھا کہ اس فتنہ کا استیصال کیا جاسکتا تھا، لیکن ایسا نہ ہوسکا۔ (۴) سراج الدولہ نے شرافت و اخلاق کا معاملہ کیا، حالانکہ یہ "شرافت" و "اخلاق" کے الفاظ سیاست کی ٹکسال کے باہر کے ہیں۔
انگریزوں نے ہندوستان کی سیاست کا ایک طویل عرصہ تک مطالعہ کیا، ہندوستانی حکمرانوں کی ایک ایک کمزوری سے واقف ہوئے، اس کے بعد انھوں نے بتدریج ملکی معاملات میں مداخلت شروع کی۔ اس کے بعد جن راہوں سے داخل ہونا انکے لئے ممکن تھا وہاں سے داخل ہوئے۔ مسٹر اینی کا یہ تجزیہ بالکل صحیح ہے کہ۔
"ہندوستان کو انگلستان نے اپنی تلوار سے فتح نہیں کیا، بلکہ خود ہندوستانیوں کی تلوار سے۔ رشوت، سازش اور حد درجہ کی دورخی پالیسی پر عمل کر کے ایک جماعت

۱۔ ناصر کاظمی۔ انتظار حسین۔ سن ستاون میری نظر میں۔ ص۔ ۴۵
۲۔ خورشید مصطفٰے رضوی۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ئ؁۔ ص۔ ۱۷
۳۔ " " " ۲۷
۴۔ باری علیگ۔ کمپنی کی حکومت۔ ص ۴۵-۴۳

کو دوسری سے لڑا کر انھوں نے یہ ملک حاصل کیا۔ (۵)

ہندوستان میں انگریزوں کی پوری مدت قیام پر ایک نظر ڈال لیجیے، مسز اینی بسنٹ کا مندرجہ بالا تجزیہ حرف بحرف صحیح ثابت ہوگا۔

انگریز یہاں جب تک رہے ان کی کوشش یہی رہی کہ یہاں کے باشندوں میں اتحاد و یکجہتی کی فضا نہ پیدا ہونے پائے۔ اس مقصد سے انھوں نے فرقہ وارانہ منافرت پھیلائی۔ یہی نہیں بلکہ خود مسلمانوں کو مسلمانوں سے ٹکرا دیا، چنانچہ انھوں نے بعض انتہائی سطحی اور معمولی اختلافات کو اس قدر ہوا دی کہ پورے ملک میں باہمی اختلافات کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا اور پوری مسلم قوم ذہنی و فکری طور پر مختلف ٹکڑوں میں بٹ گئی۔

انگریز مسلمانوں کے ان اختلافات میں دور کے تماشائی نہ رہے، اختلافات کی خلیجوں کو وسیع تر کرنے کے لئے انھوں نے مختلف گروہوں کی مالی امداد و تعاون سے بھی دریغ نہ کیا۔

مسلم عوام بیہودہ اختلافات میں مبتلا تھے، اور بادشاہ و امراء زوال و انحطاط کے ہر خطرے سے بے نیاز ہو کر مصروف داد عیش تھے۔

سکھوں، جاٹوں اور مرہٹوں نے شیرازہ حکومت پہلے ہی درہم برہم کر رکھا تھا نادرشاہ اور احمد شاہ کے حملوں نے ساری قوت و شوکت کا جنازہ نکال دیا احمد شاہ دیوان عام کی چھت تک گلا کر اتار لے گیا، موتی مسجد میں لگا ہوا زر آب دار کا گچھا بھی اس سے نہ بچ سکا۔ (۶)

ایک طرف اس طرح کے طوفان شاہان مغلیہ کی تباہی کا پتہ دے رہے تھے، دوسری طرف خود شاہان مغلیہ ان تمام خطرات سے بے نیاز ایرانی اور تورانی، اور مغل و افغانی کشاکش کے اسیر تھے شاید وہ اس احساس سے عاری ہو چکے تھے جو انھیں مستقبل کے خطرے سے خبردار کرتا، حالات بہت بگڑنے پر احساس ہوا بھی تو اتنا کہ اب تباہی و بربادی یقینی ہے، شاہ عالم

۵۔ خورشید مصطفےٰ رضوی۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء۔ ص۔ ۳۴

نے اس کا اظہار اسطرح کیا ہے ۔

آفتاب فلک رفعت وشاہی بودیم
برد در شام زوال آہ سیہ کاری ما

انگریزوں کے لئے ملک کے مندرجہ بالا حالات بہت سازگار ثابت ہوئے، اپنی قوت بڑھانے کے ساتھ وہ سازشوں کے جال پھیلاتے رہے، پلاسی کی کامیابی نے ان کے عزم وحوصلہ کو اور تقویت بخشی ۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے یہ تاجر جو ہندوستان کی فضا سازگار پاکر تجارت چھوڑ سیاست کے میدان میں آکودے تھے، اور اب باشندگان ہند کے امن وامان اور سکون واطمینان کے تاجر بن بیٹھے تھے، ان کے مقابلہ کے لئے والئ میسور سلطان ٹیپو شہید اٹھ کھڑے ہوئے ۔

سلطان نے انگریزوں کے خطرناک مقاصد کا اندازہ کرکے اندرون ملک مختلف نوابین اور والیان سلطنت کو ان کے مقابلہ کے لئے آمادہ کرنیکی کوشش کی، بیرون ملک سلطان ترکی سلیم عثمانی وغیرہ سے بھی مدد چاہی ۔ آخر میں خود انگریزوں سے مصروف پیکار ہو گئے ۔ "اپنوں" کی غداری نے کامیابی سے ہمکنار نہ ہونے دیا، آخر ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو سرنگاپٹم کے معرکہ میں جان جان آفریں سپرد کی ۔ (۷)

آخری وقت میں جب سلطان زخم خوردہ ہوکر گر پڑے تھے تو ایک گورے نے آپ کی بیش قیمت پیٹی لینا چاہی تو سلطان نے تلوار کا ایسا وار کیا کہ اس کے گھٹنہ کی ہڈی کٹ گئی، جس پر اس نے آپ کی پیشانی پر گولی ماردی ۔ (۸)

آخری وقت میں سلطان نے اپنے غدار ساتھیوں کو متنبہ کیا تھا کہ "اس غداری کا نتیجہ تمھیں اس وقت معلوم ہوگا جب تم اور تمھاری آئندہ نسلیں اس

---

۶ ۔ مرزا محمد اختر ۔ سوانح دہلی ۔ ص ۔ ۲۸

ملک میں محتاج اور ذلیل ہو کر ایک ایک دانہ چاول اور ایک ایک گھٹی پیاز کو ترسیں گی۔ (۹)

سلطان کی شخصیت انگریزوں کے لئے انتہائی قابل نفرت تھی۔ ہندوستان سے جاتے دم تک اس نفرت کا یہ حال تھا کہ اپنے کتوں کو ان کے نام سے پکارتے تھے۔ (۱۰)

انگریزوں نے سلطان کو بدنام کرنے کے لئے یہ مشہور کیا کہ وہ اپنی ہندو رعایا کو زبردستی مسلمان بنایا کرتے تھے لیکن یہ افسانہ محض سلطان کو بدنام کرنے کے لئے گڑھا گیا تھا ہندوؤں سے ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ (۱۱)

گاندھی جی نے (Young India) کے ایک مضمون میں سلطان کی رواداری اور حب الوطنی کا کھل کر اعتراف کیا تھا اور کہا تھا کہ وطن اور قوم کے شہیدوں میں ان سے بلند مرتبہ کوئی نہیں۔ (۱۲)

سلطان کی جرأت و شجاعت ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے، ان کا مشہور مقولہ ہے کہ ــ "گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی اچھی"۔ ان کی شہادت کی اطلاع جب جنرل ہورس (Horse) کو ملی تو اس نے آپ کی نعش پر کھڑے ہو کر کہا کہ ــ "آج سے ہندوستان ہمارا ہے" (۱۳)

سلطان کی شہادت کے بعد انگریزوں کے لئے میدان خالی ہو گیا اور پھر ہندوستان گویا واقعی انھیں کا ہو گیا۔ پلاسی کے بعد سرنگا پٹم کے معرکہ میں یہ دوسری اہم کامیابی تھی جس نے انگریزوں کے حوصلے اور بلند کر دیے۔

۷۔ سید ابوالحسن علی ندوی ۔ ہندوستانی مسلمان ۔ ص ۔ ۱۳۸
۸۔ سید امجد علی ۔ سوانح سلطان ٹیپو ۔ ص ۔ ۱۳۷
۹۔ سید حامد حسن جیلانی ۔ تصویر کا دوسرا رخ ۔ ص ۔ ۷۹
۱۰۔ سید ابوالحسن علی ندوی ۔ ہندوستانی مسلمان ۔ ص ۔ ۱۳۹
۱۱۔ عبداللہ بٹ ۔ ٹیپو سلطان ۔ ص ۔ ۴۵
۱۲۔ سید ابوالحسن علی ندوی ۔ ہندوستانی مسلمان ۔ ص ۔ ۱۳۹

شاہ دہلی کے اختیارات گو روز بروز محدود ہوتے جا رہے تھے اور نظم مملکت میں ابتری پھیلتی جا رہی تھی تاہم ہندوستان کی عام رعایا میں بادشاہ وقت کا ایک وقار اور اس کے لئے جذبۂ ہمدردی تھا۔ (۱۴)

بنگال میں انگریز پہلے ہی قدم جما چکے تھے۔ ۱۸۰۳ء میں جب شاہ عالم مسند حکومت پر تھا تو لارڈ لیک فاتحانہ دہلی میں داخل ہو گیا، اور مرکزی حکومت کا نام نہاد مالک و مختار شاہ عالم انگریزوں کا پنشن خوار مقرر ہو کر رہا۔ (۱۵)

ہندوستان پر مسلمان صدیوں سے ایک فاتح قوم کی حیثیت سے حکمرانی کر رہے تھے لیکن انگریزوں کے تسلط سے مسلمانوں پر پژمردگی چھا گئی۔ اب وہ ایک فاتح حکمران طبقہ کے فرد نہ تھے بلکہ مغلوب و محکوم ہوتے جا رہے تھے عوام بے دست و پا اور حکمران بے غیرت و بے حیا تھے۔

۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی اور اس کے بعد سلطان ٹیپو کی شہادت نے مسلمانوں کو اور بد دل کر دیا۔ ۱۸۰۳ء میں فتح دہلی کے موقع پر لارڈ لیک کے معاہدہ اور ۱۸۰۶ء میں اکبر شاہ ثانی کی تخت نشینی نے مایوس اور شکستہ دلی کو بڑھا دیا۔ (۱۶) یاس و ناامیدی کا ردعمل انگریزوں سے بے پناہ نفرت کی شکل میں ظاہر ہوا عوام و خواص سب کے پاس نفرت ہی ایک جوابی اقدام کے طور پر باقی تھی۔ کلائیو۔ ہیسٹنگز اور کارنوالس کے کارنامے کیا کم تھے۔ ۱۸۴۸ء میں ڈلہوزی کی آمد مسلمانوں کے لئے اور پریشانی و سراسیمگی کا باعث ہوئی۔ (۱۷)

شاہان مغلیہ جب انگریزوں کے پنشن خوار ہو کر رہ گئے تو انگریزوں نے ان کے ساتھ انتہائی توہین اور حقارت کا معاملہ شروع کر دیا شاہ عالم کے ساتھ کرنل اسمتھ نے نہایت توہین آمیز سلوک کئے۔ (۱۸) بادشاہوں کی عزت کرنا ان کی قوت کو باقی رکھنا تھا اس لئے نازیبا حرکتیں شروع کر دی گئیں۔ (۱۹)

۱۳۔ سید ابو الحسن علی ندوی ۔ ہندوستانی مسلمان ۔ ص ۔ ۱۲۸

۱۴۔ مارشمن ہین ۔ تاریخ ہند ۔ ص ۔ ۲۶۸

۱۵۔ ڈاکٹر محمد اشرف ۔ ہندوستانی مسلم سیاست پر ایک نظر ۔ ص ۔ ۱۳

۱۸۳۷ء میں جب آخری مغل بادشاہ تخت نشین ہوا تو ذلت آمیز برتاؤ بڑھتا جارہا تھا جھک کر سلام کرنا اور بادشاہ کا "فدوی خاص" بننا ناروا تھا۔ اعلان کر دیا گیا کہ بہادر شاہ کے بعد مغل خاندان لال قلعہ سے نکال دیا جائیگا اور "شاہ" کا لقب بھی ختم ہو جائیگا۔ (۲۰)

انگریزوں کا یہ طرز عمل قدرتی طور پر ہندوستان کے عام باشندوں کے لئے تکلیف دہ ثابت ہوا کیونکہ اس گئی گذری حالت میں بھی ان کی نگاہوں میں شاہان مغلیہ کا احترام باقی تھا۔ (۲۱)

انگریز اور ہندوستانی عوام ۱۷۵۷ء تا ۱۸۵۷ء

انگریز ہندوستان میں تاجر کی حیثیت سے آئے تھے لیکن یہاں کے بدلتے ہوئے سیاسی حالات میں انھوں نے ابتدا میں ہی اپنے لئے جگہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اورنگ زیب کے بعد جب حکومت واقتدار کی باگ ڈور تمام تر نا اہلوں کے ہاتھ میں چلی گئی تو ایسے حالات پیدا ہوئے کہ انگریزوں کو اپنی قوت بڑھانے کا موقع مل گیا۔

۱۷۵۷ء میں پلاسی کے میدان میں جب انھوں نے پہلی بار اپنی قوت کا مظاہرہ کیا تو سمجھنے والوں نے اسی وقت آئندہ پیش آنے والے سیاسی خطرہ کا اندازہ کرلیا تھا چنانچہ یہ پہلی فتح ان کی بعد کی فتوحات کے لئے پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

بنگال پر تسلط کے بعد ہی سے انھوں نے عوام الناس کے لئے ناگفتہ بہ

۱۶۔ مولانا فضل حق خیرآبادی۔ ترجمہ عبدالشاہد خان شیروانی باغی ہندوستان۔ ۱۳۸-۱۳۹

۱۷۔ سید ہاشمی فریدآبادی۔ تاریخ مسلمانان پاکستان وبھارت۔ ص۔ ۳۲۲

۱۸۔ مسز ہورلسٹرٹ انگلیس۔ ترجمہ ظفرحسن عاصی۔ تذکرۂ عالم۔ ص۔ ۲۴۶

۱۹۔ خواجہ حسن نظامی۔ دہلی کی جان کنی۔ ص۔ ۱۷

۲۰۔ خورشید مصطفےٰ رضوی۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء۔ ص۔ ۷۶

حالات پیدا کر دیے، اور ان کا عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا، بعد کی فتوحات نے انکو اور آزاد کر دیا۔

پایۂ تخت دہلی میں گو نام کے لئے مغلیہ بادشاہ سریر آرائے سلطنت تھا، لیکن عملاً اقتدار انھیں تجارت پیشہ سیاست والوں کے ہاتھ میں تھا۔

بنگال میں پلاسی کی جنگ کے بعد ہی سے انگریزوں کا طوطی بول رہا تھا، وہاں کی تجارت ان کے قبضہ میں آگئی، دیوانی (لگان وصول کرنے کے) حقوق ان کو حاصل ہو گئے، چنانچہ انھوں نے ہندوستانی عوام کو ان راہوں سے سخت ضیق میں مبتلا کر دیا، ان کی ساری دولت کھینچ لی۔ مرکزی حکومت پر گرفت حاصل ہوئی تو ظلم و جور کی حدیں سرزمین بنگال و بہار کے باہر پورے ہندوستان تک وسیع ہو گئیں۔

آمدنی سے زیادہ ٹیکس عائد کئے گئے، اور تجارت کو ہندوستانی عوام کے ہاتھ سے چھین کر اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ مرے پہ سو درّے کہ انگریزوں کے ظلم و جور سے دبے ہوئے عوام کو ایک اور مصیبت (قحط) نے آگھیرا۔

اس دوران میں صرف پٹنہ میں روزآنہ مرنے والوں کی تعداد ڈیڑھ سو تک پہونچ گئی تھی، اطراف کا حال بھی اس سے بہتر نہ تھا، پردہ نشین عورتیں اپنی اور اپنے بچوں کی جان بچانے کی خاطر سر بازار بھیک مانگتی پھرتی تھیں، ہر طرف تباہی و بدحالی کا دور دورہ تھا، ندی نالہ ہر جگہ لاشوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ (۲۲)

انگریز خود تاجر تھے تاجر اپنا نفع دیکھتا ہے، انھیں کیوں ان تباہ حال عوام کی فکر ہوتی۔ ایک برطانوی ممبر پارلیمنٹ نے کہا تھا۔ "برطانوی مقبوضات صفحۂ عالم پر بدنما دھبوں کی حیثیت رکھتے ہیں"۔ (۲۳)

تجارت ہندوستانی عوام کے ہاتھ سے پہلے ہی چھن چکی تھی، ایک زراعت

۲۱۔ خواجہ حسن نظامی۔ غدر کی صبح و شام۔ ص۔ ۲۸

۲۲۔ فصیح الدین۔ تاریخ مگدھ۔ ص۔ ۳۸۰

۲۳۔ باری علیگ۔ کمپنی کی حکومت۔ ص۔ ۲۳۱

سے محدود طبقہ کی امیدیں وابستہ تھیں اس پر بھی اوس پڑ گئی۔ اس کی تباہی وبربادی کا تیر بہدف نسخہ کارنوالس نے تیار کیا، جس سے عوام کی پریشانیوں میں اور کئی چند اضافہ ہوگیا۔ برطانوی دارالعوام میں تقریر کرتے ہوئے مسٹر فاکس نے کہا تھا۔" کارنوالس نے ملک میں لٹیروں کا ایک جتھہ تیار کیا ہے جو حقداروں کے حق لوٹتا ہے"۔ (۲۴)

ان ظالموں کی نظر سے بھلا بنگال کی مشہور صنعت کیسے بچ سکتی تھی، بنگال میں کپڑے کی صنعت خاص طور پر مشہور تھی۔ ایک انگریز کا بیان ہے کہ ۔

" بعض کپڑے تو ایسی حیرت انگیز نفاست سے تیار ہوتے ہیں کہ پرستان کے بنے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔" (۲۵)

یہ کپڑے انگلستان میں اس قدر مقبول ہوئے کہ وہاں کی تجارت خطرے میں پڑ گئی۔ انگلستان میں جو ریشمی کپڑا فرانس اور اٹلی سے درآمد ہوتا تھا وہ بند ہوگیا، کیونکہ اس سے نصف قیمت پر بنگال کا اس سے اچھا کپڑا پہونچ جاتا تھا۔ برطانوی پارلیمنٹ میں خصوصی قانون پاس ہوا جس کے تحت ہندوستانی کپڑے کا استعمال جرم قرار دیا گیا۔ ایک عورت پر دو ہزار پونڈ جرمانہ ہوا کیونکہ اس کا رومال ہندوستانی کپڑے کا تھا۔ اس کے علاوہ ہندوستانی کپڑوں کی انگلستان میں درآمد پر محصول بہت زیادہ کر دیا گیا، جس سے کپڑے کی صنعت برباد ہوکر رہ گئی۔ کپڑہ بننے والوں کو مجبور کیا جاتا کہ وہ انگریزوں کی فیکٹریوں میں کام کریں۔ (۲۶)

کاریگروں پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے گئے، کاریگر جب کسی جابرانہ معاہدہ کو ماننے سے انکار کرتے تو انکا سامان نیلام کر کے قیمت ضبط کرلی جاتی۔ ایسے واقعات بھی ہوئے کہ باریک ریشم بنانے والوں کے انگوٹھے کاٹ دیئے گئے کہ وہ مہین دھاگہ نہ بنا سکیں۔ (۲۷)

۲۴۔ قیصر مصطفےٰ ۔ شیر میسور ۔ ص ۔ ۱۰۷

۲۵۔ خورشید مصطفیٰ رضوی ۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ۔ ص ۔ ۴۸

۲۶۔ " " ۔ ص ۔ ۴۹

۲۷۔ باری علیگ ۔ کمپنی کی حکومت ۔ ص ۔ ۳۸۰

اس طرح صنعت کو برباد کر دیا گیا، یہاں تک کہ برآمد کا سلسلہ رفتہ رفتہ ختم ہونے لگا۔ ۱۷۹۳ء میں ۷۵،۴۵،۷۵۲،۳۲۔ پونڈ کا کپڑا ہندوستان سے انگلینڈ پہونچا اور یہ مقدار گھٹتے گھٹتے ۱۸۴۹ء میں صرف ۱۵۱ و ۳۶۔ پونڈ رہ گئی۔ (۲۸)

اس صنعتی تباہی کا نتیجہ یہ ہوا کہ لاکھوں افراد دانے دانے کو محتاج ہو گئے، آبادی پر اس کا اثر یہ پڑا کہ ۱۸۰۰ء میں دو لاکھ تھی اور ۱۸۳۸ء میں صرف ستر ہزار رہ گئی۔ (۲۹)

غرض کہ عوام صنعت و حرفت۔ تجارت۔ زراعت ہر میدان میں انگریزوں کے مظالم سے عاجز آ گئے تھے ان کی ساری دولت ان کے ملک سے چھن کر انگلستان جا رہی تھی، اور عوام روز بروز خستہ و بدحال ہوتے جا رہے تھے ۱۸۸۸ء میں آسام کا انگریز کمشنر لکھتا ہے۔ "میں بلا تامل کہہ سکتا ہوں کہ کاشت کاروں کی نصف تعداد ایسی ہے جو سال بھر تک نہیں جانتی کہ ایک وقت پیٹ بھر کھانا کسے کہتے ہیں"۔ (۳۰)

ایک برطانوی ممبر پارلیمنٹ نے ہندوستان کے حالات کے مطالعہ کے بعد بیان دیا تھا کہ۔

"یہ لوگ مکھیوں کی طرح مر رہے ہیں۔ یہاں کی آبادی کا بڑا حصہ پیدائش سے موت تک پیٹ بھر کھانے کو نہیں پاتا"۔ (۳۱)

مذہبی امور میں انگریزوں کی مداخلت

سیاسی اور معاشی طور پر ہندوستانی عوام کو بے دست و پا کرنے کے علاوہ انگریزوں نے ان کے مذہبی امور میں مداخلت شروع کر دی۔ انگریزوں سے نفرت کے منجملہ دیگر اسباب کے ایک اہم سبب ہندوستانیوں کے مذہبی امور میں انگریزوں

۲۸۔ محمد شفیع۔ ۱۸۵۷ء۔ ص۔ ۱۰۸

۲۹۔ باری علیگ۔ کمپنی کی حکومت۔ ص۔ ۳۸۱

۳۰۔ ایضاً۔ حکومت خود اختیاری۔ ص۔ ۸۲

۳۱۔ " " " ۔ص۔ ۸۳

کی دخل اندازی تھی ہندوستانی عوام کی اکثریت (عام اس کے کہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان) ہمیشہ سے مذہبی اقدار و جذبات کی حامل رہی ہے۔
انگریزوں نے ان کے مختلف فرقوں کو آپس میں گتھم گتھا کر دیا۔ دوسری طرف خود ان کے مذہبی شعائر و عقائد کی مسلسل توہین کرتے رہے، پادری انجیل کے وعظ پر اکتفا نہ کرتے بلکہ دوسری قوموں کے مذہبی شعائر اور اشخاص پر بیہودہ اتہامات بھی عائد کرتے رہتے۔ (۳۲)
۱۸۵۵ء میں کلکتہ سے سرکاری ملازمین کے نام خط بھیجا گیا جس میں غیر عیسائی ملازمین حکومت سے یہ کہا گیا کہ اب چونکہ پورے ملک میں ایک ہی عملداری ہو گئی ہے اس لئے مذہب بھی ایک ہی ہونا چاہئے، اب تم سب کو عیسائی ہو جانا چاہئے۔ (۳۳)
بعض ایسے قوانین بھی بنائے گئے جنہیں یہ ظاہر ہوتا تھا کہ پورے ملک کو عیسائی بنانا مقصود ہے۔ (۳۴) اسکولوں اور کالجوں میں انجیل کی تعلیم بڑے اہتمام سے ہوتی تھی، جس کا اعتراف سر فریڈرک ہیلڈ نے دارالعوام میں اس طرح کیا تھا۔
"میں سمجھتا ہوں کہ ہندو کالج میں انجیل کی تعلیم اس قدر زیادہ ہے کہ انگلستان کے کسی پبلک اسکول میں بھی اتنی نہیں"۔ (۳۵)
یہی وجہ تھی کہ سرکاری اسکولوں سے پڑھ کر نکلنے والے خواہ ہندو ہوں یا مسلمان، اپنے آبا و اجداد کے دین و مذہب سے بیزار ہو کر نکلتے تھے۔ (۳۶)
مسز ہورلسٹ انگلیس لکھتی ہے۔
"انگلستان کا بڑا پادری چاہتا ہے کہ ہندوستان کو دین مسیحی میں داخل کر

۳۲۔ سر سید احمد خاں۔ اسباب بغاوت ہند۔ ص۔ ۱۲۳
۳۳۔ " " " ص۔ ۱۲۹۔ ۱۳۰
۳۴۔ " " " ص۔ ۱۳۳
۳۵۔ سید طفیل احمد منگلوری۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل۔ ص۔ ۱۴۱
۳۶۔ ڈبلو ڈبلو ہنٹر۔ ترجمہ صادق حسین۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان۔ ص۔ ۲۰۲

دے جو لوگ خوشی سے اسکا دین قبول نہیں کرتے ان کے ساتھ سختی سے پیش آتا ہے، اور عیسائیت اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے"۔ (۳۷)

اسکولوں میں عیسائیت کی تعلیم ہوتی تھی، اور اس طرح معصوم بچوں کو عیسائیت سے متاثر اور اپنے آبائی مذہب سے بیزار کیا جاتا تھا۔ امتحان میں عیسائیت کے مطابق جواب دینے والے بچوں کو انعام دیا جاتا تھا۔ (۳۸)

ان حالات نے عام طور پر یہ خیال پیدا کر دیا تھا کہ انگریز پورے ملک کو عیسائی بنا کر چھوڑیں گے، انگریزوں کے اس طرز عمل کا یہاں کے باشندوں پر ایک مثبت اثر یہ مرتب ہوا کہ وہ اپنے باہمی اختلافات بھلا کر متحدہ طور پر انگریزوں کے مقابل آ گئے۔ (۳۹)

تعلیمی پسماندگی

انگریزوں کی پوری کوشش یہ تھی کہ ہندوستانی باشندے زیادہ سے زیادہ جاہل رہیں، ان کا خیال تھا کہ تعلیم حاصل کر کے یہ لوگ ہمارے اقتدار کے لئے خطرہ بن جائیں گے، اسی لئے اگر تعلیم کا نظم کیا بھی تو وہ محض تبلیغ عیسائیت کے لئے ورنہ اعلیٰ تعلیم کا ہندوستانی باشندوں کے لئے کوئی نظم نہ تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹر نے ایک موقع پر کہا تھا کہ ۔

"تم ہندوستانیوں کو تعلیم دینا چاہتے ہو؟ تعلیم دیکر تم انھیں اپنی بے انصافیوں سے آگاہ کر دوگے۔ تم نے ان کا ملک لوٹ لیا ہے، تم نے ان کے ہموطنوں کو برباد اور ذلیل کیا، تم نے انکے بادشاہوں کو قتل کر ڈالا ہے لہٰذا تمہاری سلامتی اسی میں ہے کہ ان کو اسی طرح فریب خوردہ، خود فراموش اور جاہل رہنے دو" (۴۰)۔

اس سلسلہ میں سرڈی ہملٹن نے کہا تھا ۔

۳۷۔ مسز ہورلسٹ انگلیس ترجمہ ظفر حسن عاصی۔ ایام غدر۔ ص ۔ ۸

۳۸۔ خورشید مصطفیٰ رضوی۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء۔ ص ۔ ۱۰۱

۳۹۔ ناصر کاظمی۔ انتظار حسین۔ سن ستاون میری نظر میں۔ ص ۔ ۲

"اگر کبھی انگریزوں کو ہندوستان اسی طرح چھوڑنا پڑا جس طرح رومیوں نے انگلستان چھوڑا تھا تو وہ ایک ایسا ملک چھوڑ جائیں گے جسمیں نہ تعلیم ہوگی نہ حفظان صحت کا سامان نہ دولت"۔ (۴۱)

تعلیم کا انتظام اگر کسی درجہ میں تھا تو اس مقصد سے کہ اس کے ذریعہ ایسے افراد پیدا کئے جائیں جو انگریزی حکومت اور ہندوستانی عوام کے درمیان رابطہ کا کام کر سکیں"۔ (۴۲)

انگریزوں پر بے اعتمادی

انگریزوں سے نفرت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ عام خیال تھا کہ انگریز خود غرض اور موقع پرست ہیں یہی وجہ ہے کہ ۱۸۵۷ء میں ہندو راجہ اور مسلمان نوابین سب نے اس پر زور دیا کہ انگریز ہمیشہ وعدہ خلافی کرتے اور دھوکہ دیتے ہیں، اس لئے ہم سب کو مل کر ان سے جنگ کرنی چاہئے۔ انگریزوں سے وہ لوگ بھی غیر مطمئن تھے جو ان کا ساتھ دیتے اور ان کا کام کرتے تھے۔ (۴۳)

فوج کے ہندوستانی افراد میں بھی بے اطمینانی تھی، وہ انگریزوں سے کسی ہمدردی بلکہ انصاف پسندی تک کے متوقع نہ تھے۔

ہومز نے لکھا ہے کہ۔

"ان کو یقین تھا کہ وہ فوجی کمالات میں دوسرے حیدر علی بن جائیں تو بھی ایک نیچے درجے کے انگریز کے برابر تنخواہ نہ پاسکیں گے"۔ (۴۴)

مختلف اسباب تھے جن کی بنا پر عوام کی بے اعتمادی بڑھتی ہی جاتی تھی، انگریزو

۴۰۔ خورشید مصطفیٰ رضوی۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء۔ ص۔ ۹۱
۴۱۔ باری علیگ۔ کمپنی کی حکومت۔ ص۔ ۳۸۴
۴۲۔ خورشید مصطفےٰ رضوی۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء۔ ص۔ ۹۲
۴۳۔ مولانا الطاف حسین حالی۔ حیات جاوید۔ ص۔ ۹۲۸
۴۴۔ خورشید مصطفیٰ رضوی۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء۔ ص۔ ۱۰۷

نے شہنشاہ دہلی سے بنگال کی دیوانی اس شرط پر لی تھی کہ اسلامی نظام عدالت برقرار رکھیں گے لیکن جیسے ہی انھوں نے اپنے کو طاقتور پایا، تمام شرعی عدالتیں ختم کر کے سول عدالتیں قایم کر دیں۔ (۴۵)

یہ تمام حالات ہندوستانیوں کو انگریزوں سے متنفر کر رہے تھے، اور وہ ایسی راہیں تلاش کرنے پر مجبور ہو گئے تھے جن سے وہ انگریزوں کی غلامی سے نجات پا سکیں۔

مختلف اوقات میں اس کی کوششیں کی گئیں کہ انگریزوں سے خلاصی کی صورت نکل سکے۔ سید احمد شہید نے مجاہدین کی ایک جماعت تیار کی لیکن انھیں پہلے سکھوں سے الجھنا پڑ گیا اور حالات ایسے پیدا ہو گئے کہ ان کی قوت سکھوں سے معرکہ آرائی ہی میں ختم ہو گئی، اور وہ خود اسی معرکہ میں شہید ہو گئے لیکن اس تحریک سے وابستہ ایک بڑی جماعت تھی جس نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریزوں کو ناکوں چنے چبوا دیے۔ (۴۶)

انگریزوں کے تسلط کی ابتدا سے ان کے ہاتھوں ملک کی صنعتی تباہی، زمینوں کا جبری قرق و نیلام۔ بادشاہ کی تذلیل۔ بیگمات سے بدسلوکی، ریاستوں کا جبری الحاق، اور ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کی انگریزی خواہش۔ یہ اسباب تھے جنھوں نے یہاں کے باشندوں کو آمادۂ بغاوت کر دیا۔

بغاوت

۱۸۵۶ء میں جب ڈلہوزی نے حکومت کی باگ "کے ننگ" کے حوالہ کی تو بغاوت و شورش کا آتش فشاں پھٹنے کے لئے تیار تھا۔ (۴۷)

حصول نجات کی کوششیں جاری تھیں۔ ۱۸۵۷ء کا سال شروع ہوا تو

۴۵۔ ڈاکٹر سید عابد حسین۔ ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں۔ ص۔ ۳۱

۴۶۔ خورشید مصطفیٰ رضوی۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء۔ ص۔ ۶۶

۴۷۔ سید ہاشمی فرید آبادی۔ تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت۔ ص۔ ۳۲۰

ان کوششوں کا حاصل بھی سامنے آنے اور ملک کے مختلف مقامات پر بغاوت کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ (۴۸)

جنگ آزادی گو عوامی جنگ تھی لیکن اس کی ابتدا فوج والوں سے ہوئی، ایک انگریز کا بیان ہے کہ۔

"فوج والوں کے چہروں پر ترش روئی کے آثار تھے اگرچہ وہ اپنے افسران سے کچھ نہ کہتے تھے صرف ایک جوان سپاہی نے اتنا کہا کہ تمہارا نمک پانی اب کھایا نہیں جاتا"۔ (۴۹)

سرسید نے اسباب بغاوت ہند میں لکھا ہے کہ۔

"باغی کہتے تھے کہ اگر ہم یہ نہ کرتے تو کیا کرتے ایک نہ ایک دن سرکار ہمکو تباہ کر دیتی"۔ (۵۰)

ہمہ گیر بغاوت و انقلاب کی تیاریاں جاری تھیں کہ "چکنے کارتوس" کی ایجاد نے فوجیوں میں نئی شورش برپا کر دی ہندوستانی فوجیوں میں جنگل کی آگ کی طرح یہ بات پھیل گئی کہ ان نئے کارتوسوں میں گائے اور سور کی چربی لگائی جا رہی ہے، فوجیوں نے بالاتفاق طے کیا کہ وہ نئے کارتوس لے کر اپنا دین ایمان خراب نہ کریں گے۔

نئے کارتوس لینے سے انکار کرنیوالوں کو انگریز افسران نے سزائیں دینی شروع کیں جسمیں توہین آمیز برطرفی سے لیکر کورٹ مارشل تک کی سزائیں تھیں، اس نے فوجیوں کو اور بھی برافروختہ کر دیا باوجودیکہ بغاوت و انقلاب کی تاریخ کا تعین ہو چکا تھا تاریخ مقررہ سے پہلے بغاوت پھوٹ پڑی۔

سب سے پہلے بغاوت کا شعلہ میرٹھ میں بھڑکا اسی نے اوروں کو بھی بغاوت کی راہ دکھائی، جلد ہی یہ آگ جو میرٹھ میں لگی تھی دوسرے شہروں تک پہونچ گئی۔

۴۸۔ خورشید مصطفیٰ رضوی۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء۔ ص۔ ۱۴۳

۴۹۔ کنہیالال۔ محاربہ عظیم۔ ص۔ ۶۲

۵۰۔ سرسید احمد خاں۔ اسباب بغاوت ہند۔ ص۔ ۵۵

میرٹھ کے باغیوں نے جب اپنے آپ کو بہادر شاہ کے سامنے پیش کیا، اور جاگیرداروں اور عوام نے اس کی حمایت کا اعلان کیا تو تحریک نے عوامی بغاوت کی شکل اختیار کر لی۔ (۵۱)

مغل سلطنت کے آخری تاجدار اور مسلم عہد حکومت کی آخری یادگار بہادر شاہ ظفر کے نام پر اور ان کے جھنڈے کے نیچے ملک کے کونہ کونہ میں یہ جنگ لڑی گئی۔ بہادر شاہ نے اگرچہ خود کوئی سرگرم حصّہ نہ لیا، لیکن وہ ان سپاہیوں کے ساتھ تھے جنھوں نے بغاوت کی تھی اور دہلی کو اپنا صدر مقام بنا رکھا تھا۔ (۵۲)

ملک کا بچہ بچہ اس جنگ کا سپاہی تھا، عورتیں تک پیچھے نہ تھیں، خواجہ حسن نظامی نے ذکر کیا ہے کہ ایک سبز پوش عورت شہر کے لوگوں کو جہاد کے لئے آمادہ کرتی اور یہ کہتی تھی کہ چلو تمھیں خدا نے بہشت میں بلایا ہے۔ شہر کے لوگ اس کی مجاہدانہ صدا سن کر ساتھ ہو جاتے، وہ خود بہادر سپاہیوں کیطرح میدان میں لڑتی تھی، کبھی سوار کبھی پیادہ پا۔ تلوار اور بندوق مہارت کے ساتھ چلاتی تھی، اس کی ہمت و شجاعت دیکھ کر دوسروں کا حوصلہ بڑھتا تھا۔ (۵۳) جگہ جگہ ہندوستانیوں کے جوش و جذبہ کا اظہار ہو رہا تھا۔

لکھنؤ میں بعض مقامات پر دیواروں پر یہ اعلان چسپاں کر دیا گیا تھا۔

"ہندوؤ مسلمانو! متحد ہو کر اٹھو اور ایک ہی بار ملک کی قسمت کا فیصلہ کر دو، کیونکہ اگر یہ موقع ہاتھ سے نکال دیا گیا تو تم لوگوں کیلئے اپنی جانیں بچانے کا موقع بھی ہاتھ نہ آئے گا، یہ آخری موقع ہے۔ اب یا کبھی نہیں!" ۔ (۵۴)

مدارس کے ایک اعلان میں شہریوں سے کہا گیا تھا۔

"ہموطنو اور مذہب کے وفادار شیدائیو! اٹھو! اٹھو! تم سب ایک ساتھ اٹھو، فرنگی کافروں کو نیست و نابود کرنے کے لئے، جنھوں نے عدل و انصاف کے ہر

۵۱۔ ڈاکٹر منگل سین۔ تواریخ بلند شہر۔ ص۔ ۱۱۴

۵۲۔ علامہ عبداللہ یوسف علی۔ انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ۔ ص۔ ۲۵۳

۵۳۔ خواجہ حسن نظامی۔ بیگمات کے آنسو۔ ص۔ ۱۲۶

۵۴۔ خورشید مصطفیٰ رضوی۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء۔ ص۔ ۱۲۴

اصول کو پاؤں تلے روند ڈالا،ہمارا راج چھین لیا،ہمارے ملک کو خاک میں ملانے کا ارادہ کرلیا ہے،صرف ایک ہی علاج ہے،اور وہ یہ کہ خوں ریز جنگ کی جائے،یہ آزادی کیلئے جہاد ہے،یہ حق و انصاف کے لئے مذہبی جنگ ہے۔(۵۵)
ان مقامی اعلانات کے علاوہ ہندوستان کے عام شہریوں سے اس طرح خطاب تھا۔

"ہندوستان کے رہنے والو ہوراج کا پاک دن جس کا عرصہ سے انتظار تھا آپہونچا ہے،آپ اسے منظور کریں گے یا اس سے انکار کریں گے،اس زبردست موقع سے فائدہ اٹھائیں گے یا اسے ہاتھ سے جانے دیں گے؟
ہندو اور مسلمان بھائیو! آپ سب کو معلوم ہونا چاہئے کہ انگریز ہندوستان میں رہ گئے تو ہم سب کو ختم کر دیں گے،اور مذہب کو مٹا دیں گے۔ ہندوستان کے باشندے اتنے دنوں تک انگریزوں کے دھوکہ میں آتے رہے،اور اپنی تلوار سے اپنا گلا کاٹتے رہے،اس لئے اب ہمیں ملک فروشی کے اس گناہ کا کفارہ ادا کرنا چاہئے،انگریز اب بھی دغابازی سے کام لیں گے، وہ ہندو اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے خلاف ابھاریں گے۔ (۵۶)

اسطرح بغاوت پورے ملک میں پھیل گئی۔سکھوں اور پارسیوں کے علاوہ ہر مذہب کے لوگوں نے اس میں حصہ لیا۔تین ہفتہ کے اندر سارا ملک اس کی لپیٹ میں آگیا۔(۵۷)
ہندوستانیوں نے بغاوت کی۔انگریز افسران اور حکام کو مارا لیکن اس درندگی کا مظاہرہ نہ کیا جو انگریزوں کی خصوصیت ہے،انگریز عورتوں اور بچوں پر عام طور سے ہاتھ نہ اٹھایا گیا۔(۵۸)
بلکہ ایسے بھی واقعات ہوئے کہ اگر انگریزوں نے کسی سے پناہ چاہی تو

۵۵۔ خورشید مصطفیٰ رضوی۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ۔ص ۔ ۱۲۴
۵۶۔ پنڈت سندر لال۔ بھارت میں انگریزی راج جلد سوم ۔ص ۔ ۱۴ ۔ ۱۸
۵۷۔ عبداللطیف ترجمہ پروفیسر خلیق احمد نظامی ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ ۔ص ۔ ۷ ۔ ۸
۵۸۔ کنہیا لال ۔ محاربۂ عظیم ۔ص ۔ ۱۲۶

اس نے اپنی ہندوستانیت اور انگریز دشمنی کے باوجود ان کو پناہ دینے سے انکار نہ کیا۔ (۵۹)

بعض مقامات پر جوش غضب سے بپھرے ہوئے ہندوستانیوں نے عورتوں اور بچوں پر ہاتھ اٹھا دیا، لیکن اس طرح کے واقعات کم ہی ہوئے۔ انگریزوں نے ہندوستانیوں کا ظلم وستم دکھانے کیلئے ان نشاذ ونادر واقعات کی رنگ آمیزی کے ساتھ تشہیر کی۔ لیکن خود انگریزوں ہی میں ایسے افراد نکل آئے جنھوں نے ان فرضی قصوں کی تردید کی، ایک ممبر پارلیمنٹ "لے یارڈ" کا بیان ہے کہ۔

"۔۔۔ پورے غور وتحقیق اور معتبر ذریعوں سے اطلاعات حاصل کرنے کے بعد مجھے مکمل یقین ہے کہ دہلی۔ کان پور۔ جھانسی وغیرہ میں انگریزوں پر مظالم کی تمام داستانیں فرضی ہیں جن کے گڑھنے والوں کو شرم آنی چاہئیے"۔ (۶۰)

سخت جانی اور مالی قربانی کے بعد جنگ آزادی ناکام ہوگئی۔ ناکامی کے دیگر اسباب کے علاوہ ایک سبب یہ بھی تھا کہ ایسی ہمہ گیر جنگ یا بغاوت کیلئے جس نظم وضبط اور تدبر کی ضرورت تھی، اس کا یہاں کافی فقدان تھا، یہ بھی کہنا شاید بیجا نہ ہو کہ اس جنگ میں "ہوش" کی بہ نسبت "جوش" کی کارفرمائی زیادہ تھی۔ حالانکہ ضرورت ہوش کے مقدم رکھنے کی تھی۔

اگر تنظیم وتدبر سے کام لیا گیا ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ انگریزوں کو شکست نہ ہوتی جبکہ انگریزوں کی نسبت سے ہندوستانی فوجی زیادہ تھے۔ (۶۱)

مختلف اسباب و وجوہات کی بنا پر جنگ آزادی اگرچہ ناکام ہوگئی، لیکن اس نے اہل ملک میں زندگی اور بیداری پیدا کردی جو آئندہ مختلف تحریکات کو جنم دینے کا ذریعہ بنی۔ (۶۲)

۵۹۔ ماہنامہ "نیا دور" جنگ آزادی نمبر۔ اپریل ۱۹۵۷ء۔
۶۰۔ انگلینڈ ٹائمز۔ ۲۵، اگست ۱۸۵۸ء۔
۶۱۔ سید حسن ریاض۔ پاکستان ناگزیر تھا ۱۹۶۷ء۔ ص۔ ۲۸
۶۲۔ ناصر کاظمی۔ انتظار حسین۔ سن ستاون میری نظر میں۔ ص۔ ۳۰

شاہ ولی اللہؒ اور ان کی تحریک

منظر اور پس منظر :- جب عہد مغلیہ کی شوکت و جبروت کی آخری شمع دم توڑ رہی تھی، اور سرزمین ہند کی بساط سیاست جو عرصہ سے مغلیہ خاندان کے ہاتھوں میں تھی، کوئی دم میں (اپنی روح کے اعتبار سے) لپیٹ دی جانیوالی تھی، اور اس کے شکوہ و سربلندی کی بلند و بالا عمارت زمیں بوس ہو رہی تھی، تو اس دہلی میں عزت و حشمت کی ایک اور عمارت تعمیر ہونے جا رہی تھی، مال و منال اور دولت و ثروت کی ایک سلطنت برباد ہو رہی تھی تو جاہ و جلال اور علم و حکمت کا ایک نیا جہان آباد ہو رہا تھا۔

۱۷۰۳ء میں عالمگیر کی وفات سے صرف چار سال قبل شاہ ولی اللہ پیدا ہوئے، جو حقیقت میں ہندوستانی مسلمانوں کے دوسرے عظیم محسن ہیں۔ اسلامیان ہند کی تاریخ میں سترھویں صدی کے اوائل کا اگر ایک المناک پہلو یہ ہے کہ اس میں ان کی سلطنت نے قوت و شوکت کے اعتبار سے دم توڑ دیا تو دوسرا پہلو یک گونہ مسرت انگیز یہ بھی ہے کہ ایسے نازک وقت میں شاہ ولی اللہ کے ذریعہ ایسے حالات پیدا ہونے سے محفوظ رکھا جسمیں حکومت وقت کے ساتھ دین و مذہب بھی ختم ہو جاتا یا کم از کم ہئیت اتنی بگڑ جاتی کہ صحیح اسلام پہچانا نہ جاتا۔ (۶۳)

شاہ صاحب نے جب آنکھ کھولی تو سلطنت مغلیہ کا آفتاب اقبال ڈوب رہا تھا، زوال و انحطاط ہر گوشہ اور ہر شعبہ میں انتہائی تیزی کے ساتھ آ رہا تھا (۶۴) سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کی ساکھ دن بہ دن گرتی جا رہی تھی۔ (۶۵)

۶۳۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ سیرت سید احمد شہید۔ ص۔ ۲۷

۶۴۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات۔ ص۔ ۱

۶۵۔ سید ابوالحسن علی ندوی۔ سیرت سید احمد شہید۔ ص۔ ۲۹۔ ۳۰

عالمگیر کے انتقال کے بعد عروج کا ہر امکان ختم ہو تا گیا اور زوال کی آخری منزل قریب آتی گئی۔ (۶۶)

اخلاقی ابتری

اخلاقی ابتری عالمگیر کے بعد بتدریج بڑھتی جارہی تھی یہاں تک کہ محمد شاہ کا عہد اس کے انتہائی عروج کا زمانہ سمجھا جاتا ہے۔ سید ہاشمی صاحب فرید آبادی لکھتے ہیں کہ عیاشی کے پیش نظر بہت سی ادویہ اور منشیات امیروں کی خوراک کا لازمی جزو بن گئی تھیں، عالمگیر کے بعد سے مغلیہ دربار میں شراب کا دور جاری تھا۔ نفسانی جذبات کی تسکین کیلئے ارباب نشاط کی بارہویں صدی ہجری (اٹھارہویں صدی عیسوی) میں افراط تھی۔ طوائفوں کی پوری قوم وجود میں آگئی تھی بڑے بڑے شہروں میں ان کے محلے آباد تھے۔ قصبات تک کا یہ حال تھا کہ شمالی ہند کا شاید ہی کوئی قصبہ ایسا ہو جہاں ان کے اڈے نہ ہوں۔ ان کے ساتھ ساتھ نچنیوں، گویوں کا ایک گروہ تھا جو اپنی زندگی خراب کرنے کے ساتھ ساتھ دوسروں میں بھی گندگی پھیلا رہا تھا اس صدی کا وسط ثلث (محمد شاہ اور احمد شاہ کا عہد) ان سرمستیوں کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا۔ (۶۷)

فسق و معصیت لازمۂ حیات بن چکے تھے شراب نوشی اور دیگر نشہ آور چیزوں کے استعمال کا عام رواج تھا۔ بازاری عورتیں دینی مجالس سے لیکر ہر مجلس کی زینت تھیں حد یہ ہے کہ بعض شرفاء اپنے لڑکوں کو ان کے پاس زبان اور آداب مجلس سیکھنے کے لئے بھیجتے تھے، یہ سبب شرف وافتخار کا ذریعہ تھا گویا جاہلیت اپنے پورے شباب پر تھی۔ (۶۸)

ایک امریکی مصنف ڈاکٹر لوتھراپ اسٹاڈرڈ نے اس عام اخلاقی و دینی ابتری کا نقشہ

۶۶۔ خورشید مصطفیٰ رضوی۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء۔ ص۔ ۶۹

۶۷۔ ابوسلمان شاہجہاں پوری۔ شاہ ولی کے عہد کے اخلاقی و مذہبی حالات۔ رسالہ الرحیم نومبر ۱۹۶۶ء ص۔ ۱۱/۴۱

۶۸۔ سید ابوالحسن علی ندوی۔ سیرت سید احمد شہید۔ ص۔ ۲۹۔ ۳۰

اس طرح کھینچا ہے ۔

"اٹھارہویں صدی تک اسلامی دنیا اپنے ضعف کی انتہا کو پہونچ چکی تھی، صحیح قوت کے آثار کسی جگہ پائے نہیں جاتے تھے، ہر جگہ جمود و تنزل نمایاں تھے۔ آداب و اخلاق قابل نفرت تھے ..... فی الجملہ اسلام کی جان نکل چکی تھی، اور محض بے روح رسمیات اور مبتذل توہمات کے سوا کچھ نہ رہا تھا، اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پھر دنیا میں آتے تو وہ اپنے پیرووں کے ارتداد اور بت پرستی پر بیزاری کا اظہار فرماتے"۔ (۶۹)

مذہبی حالت

مذہبی اعتبار سے حالت جس قدر خراب ہو چکی تھی، اس کا اندازہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی مختلف تحریروں سے ہوتا ہے ۔

شرک اور بت پرستی مختلف ناموں سے مسلمانوں میں گھر کر چکی تھی، قبروں اور مردوں کا ایک مستقل جہان شریعت تھا، ان پر سجدہ کرنا، نذریں ماننا اور چادریں چڑھانا، عورتوں کا وہاں جمع ہونا وغیرہ اس شریعت کے خاص اجزاء ہیں۔ غرض یہ کہ مذہب کے نام پر وہ ساری چیزیں مسلمانوں میں پیدا ہو چلی تھیں جو یہودیوں اور نصرانیوں وغیرہ کے یہاں پائی جاتی ہیں۔ ہندو مذہب کے رسوم و رواج مسلم ثقافت کے دامن میں جگہ پا چکے تھے ۔ (۷۰)

شعائر اسلام میں سلام مسنون کا طریقہ ختم ہو گیا تھا، اس کی جگہ "آداب وتسلیمات" کا رواج تھا، خود شاہ عبدالعزیز صاحب کے یہاں آداب وتسلیمات کا رواج پڑ گیا تھا ۔

سلام مسنون کا طریقہ اس حد تک نامانوس ہو گیا تھا کہ عالمگیر جیسے متشرع اور فقیہ بادشاہ کے متعلق روایت ہے کہ ایک سقہ نے "سلام علیک" کہہ دیا تو حکم ہوا کہ کوتوال کے حوالہ کر دیا جائے ۔ (۷۱)

۶۹۔ ڈاکٹر لوتھراپ اسٹاڈرڈ ۔ ترجمہ ۔ محمد جمیل الدین ۔ جدید دنیائے اسلام ۔ ص ۔ ۴۱ ۔ ۴۲

۷۰۔ سید ابوالحسن علی ندوی ۔ سیرت سید احمد شہید ۔ ص ۔ ۲۸

۷۱۔ سید ابوالحسن علی ندوی ۔ سیرت سید احمد شہید ۔ ص ۔ ۲۹

مذہبی و اخلاقی زوال کا اندازہ اس سے ہو گا کہ خود صوفیار جن کے در سے خلق خدا فیضیاب ہوکر اٹھتی تھی، اب ان کی ذات مصدر فیوض و برکات نہیں بلکہ منبع شر و فساد تھی، وہ خود اپنے حال میں مست تھے، انھیں خلق خدا کی اصلاح کی فکر کب ہوتی۔ حضرت مجدد الف ثانی جنھوں نے صرف ایک صدی قبل اکبر کے شرار بولہبی کے آگے چراغ مصطفوی روشن رکھا تھا، خود ان کے پوتے جنھیں حضرت خواجہ معصوم نے اورنگ زیب کے پاس امر بالمعروف و نہی عن المنکر کیلئے بھیجا تھا، ان کی زندگی کا یہ عالم تھا کہ۔

"آپ کے لئے سرہند میں دیبا کا ایک خیمہ جواہرات اور مروارید سے لٹکا ہوا نصب ہوتا تھا، جس کی چوبوں پر یاقوت جڑے ہوتے تھے، اسی خیمہ کے اندر ایک جڑاؤ کرسی رکھی جاتی جس پر آنجناب جلوہ افروز ہوتے اور جس کے گردا گرد نقیب اور چوبدار ہاتھوں میں سنہری اور روپہلی عصا لئے ہوئے کھڑے ہوتے۔ بادشاہ۔ شاہزادے اور امرار حاضر خدمت ہوکر کھڑے رہتے جب تک حکم نہ ہوتا نہ بیٹھتے"۔ (۷۲)

صوفیار اور مصلحین امت کا وہ طبقہ جس کی نگاہ فیض سے زندگیاں بنتی تھیں، اب اس کے سایہ سے زندگیاں بگڑ رہی تھیں، شاہ صاحب نے اس طبقہ کی بے راہ روی پر سخت نکتہ چینی کی ہے، ایک خط میں ان بدنفس لوگوں سے احتیاط برتنے کی تلقین فرماتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"زمانے کا رنگ بالکل بدل گیا اور مذہب کا چشمہ بہت مکدر ہو گیا ہے، اور ہر پوشش جو مسلمانوں کو ظاہر آرونق دے رہی ہے حقیقت میں اسلامی نہیں۔ ... تم پانچ طرح کے لوگوں سے اپنے تئیں بچاؤ۔

ایک بے حیا صوفی۔ جو رفع تکلیف کے لئے حیلہ کرتا ہے، اور اپنے مجازی امور میں توقف نہیں کرتا۔

دوسرا جھگڑالو معقولی جو شک و اوہام کے فتنے پھیلاتا ہے اور خدا کا مطیع نہیں ہوتا۔

۷۲۔ شیخ محمد اکرام۔ رود کوثر۔ ص۔ ۴۹۲۔۴۹۳

تیسرا۔ شیخی خور فقیہ جو مردہ اقوال پر خوش ہوتا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے لئے جن باتوں کی توضیح کی ہے ان کی پیروی نہیں کرتا۔
چوتھا خشک زاہد جو دین میں اس درجہ سختی اور تشدد کرتا ہے کہ گویا اسے کسی بارے میں اجازت حاصل نہیں۔
پانچواں۔ سرکش مالدار جو تکلیف اور بناوٹ کے ساتھ عجمیوں کی ہیئت اختیار کرنا اور ان کے ہم نوالہ وہم پیالہ ہونے کو دوست رکھتا ہے۔" (۴۳)
شاہ صاحب نے خود اس طبقہ کو بھی برابر تنبیہ فرمائی، اور عوام کو بھی اس کے مضر اثرات سے خبردار کیا چنانچہ وصیت میں فرماتے ہیں کہ۔
" اس زمانہ کے مشائخ کے ہاتھ میں ہاتھ نہ دینا چاہئے، اور کبھی ان کا مرید نہ ہونا چاہئے کیونکہ آج کل یہ لوگ طرح طرح کی بدعات و رسومات میں مبتلا ہیں، شہرت، رجوع خلق، مریدوں کی کثرت دیکھکر دھوکا نہ کھانا چاہئے، اور نہ ہی ان کی کرامتوں سے دھوکا کھانا چاہئے، عوام کا رجحان اور غلو رسم و رواج کی بنا پر ہوتا ہے، اور رسمی امور کبھی قابل اعتبار نہیں ہوا کرتے۔ آج کے کرامت پرستوں نے عام طور پر طلسمات اور شعبدہ بازی کو کرامت سمجھ رکھا ہے۔ الا ماشاء اللہ، انھیں شعبدہ بازیوں کو وہ کرامت کہہ کر مخلوق کے سامنے پیش کرتے ہیں..... ان لوگوں کے نزدیک سب سے بڑی کرامت یہ ہے کہ دل کا حال بتا دیا جائے اور آئندہ پیش آنے والے واقعات معلوم ہو جائیں، اور یہ امر بہت آسان ہے"۔(۴۴)
یہ طبقہ واقعی کبھی مصدر فیوض و برکات تھا، لیکن اب انھی کی راہ سے ہزاروں فتنے در آئے تھے، جو اسلامی زندگی کیلئے مستقل خطرہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ مولانا گیلانی تحریر فرماتے ہیں کہ۔
"... الغرض غلط تصوف، اور جھوٹے تمشیخ کی راہوں سے اعتقادی اور عملی تباہیوں کا سیلاب مختلف شکلوں میں ملک کے مختلف گوشوں میں مسلمانوں کی خالص اسلامی دینی زندگی کو دھمکیاں دیرہا تھا"۔(۴۵)

۴۳۔ شیخ محمد اکرام ۔ رود کوثر ۔ ص ۔ ۵۴۷ ۔ ۵۴۶

صوفیار اور مصلحین امت کی بے راہ روی کے متعلق یہ طویل اقتباسات ہم نے اس خیال سے نقل کر دئیے ہیں کہ اس پر قیاس کر کے عوام الناس کی مذہبی حالت کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

"قیاس کن ز گلستانِ من بہار مرا"۔

سیاسی زوال

سیاسی زوال اور مغل سلطنت کی ہوا خیزی کی ابتدا، خود عالمگیر کے عہد میں ہوگئی تھی جس کا احساس عالمگیر کو بخوبی تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں مختلف فتنوں کا سدباب کرنا چاہا تھا لیکن خود غرض امرار کے سامنے اس کی ایک نہ چلنے پائی۔ عالمگیر کے بعد حالات اگرچہ اور ابتر ہو گئے لیکن یہ کچھ غیر متوقع نہ تھا کیوں کہ اس کی ابتدا خود عالمگیر کے عہد میں ہو چکی تھی جو فتنہ عالمگیر کی زندگی میں سر اٹھا رہا تھا اب اس کا مکمل عہد شباب آچکا تھا۔ چنانچہ مسلمانوں کی طاقت کمزور ہورہی تھی، مسلم قوم عاجز و درماندہ ہوتی جارہی تھی اور اس کی جگہ دوسری قومیں لے رہی تھیں۔ (۷۶)

شاہ صاحب کے والد شاہ عبدالرحیم صاحب جب تک زندہ رہے فرخ سیر پر آنچ نہ آنے دی، شاہ صاحب نے ذکر کیا ہے کہ جو لوگ بادشاہ (فرخ سیر) کی مسند الٹنا چاہتے تھے، ان سے آپ کے والد شاہ عبدالرحیم صاحب نے فرمایا:۔

"برائے من ایں راہم چنیں بگذارید" (۷۷)

فرخ سیر کے دردناک قتل کے بعد فتنے اور بڑھتے ہی گئے، اور نظام میں ابتری آتی رہی۔ ملک میں جاگیرداری نظام قائم تھا۔ مرکز کمزور ہو چکا تھا جس سے ماتحت امرار آزاد ہوتے جارہے تھے۔ (۷۸)

۷۴۔ ابو سلمان شاہ جہانپوری۔ شاہ ولی اللہ کے عہد کے اخلاقی و مذہبی حالات۔ رسالہ الرحیم نومبر ۱۹۶۶ء ص ۔ ۴۱۳

۷۵۔ مولانا مناظر احسن گیلانی۔ تذکرہ شاہ ولی اللہ۔ ص ۱۴۴

۷۶۔ پروفیسر عمر الدین۔ علیگڑھ تحریک۔ ص ۔ ۱۱۶

۷۷۔ مولانا مناظر احسن گیلانی۔ تذکرہ شاہ ولی اللہ۔ ص۔

مہابت خاں بنگال و بہار میں خود مختار بنا بیٹھا تھا، نظام الملک دکن میں اور اودھ میں صفدر جنگ کا اقتدار قائم تھا۔ فرخ آباد میں بنگش رئیس اور روہیل کھنڈ میں روہیلہ سردار آزاد ریاستیں تشکیل دے چکے تھے، اطراف دہلی میں سورج مل جاٹ اپنی طاقت بڑھا رہا تھا۔ راجپوت بھی مرہٹوں سے کم نہ تھے۔ سکھوں اور مرہٹوں کی سرکشی الگ دردِ سر بنی ہوئی تھی۔ (۷۹)

عالمگیر کی زندگی میں مرہٹوں کا جو فتنہ اٹھ کھڑا ہوا تھا، ہر چند کہ عالمگیر نے اس کا مقابلہ کیا اور اپنی بساط بھر اس کو ختم کرنے کی کوشش کی بظاہر وہ کامیاب بھی ہوا لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ مرض کا وقتی علاج تھا جس سے اس کی جڑیں ختم نہ ہوئیں، اور بعد کے حالات نے اس کے جرثومے پھیلنے کے لئے مزید موقع فراہم کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ عالمگیر کی وفات کے بعد جب دوبارہ اس فتنہ نے سر اٹھایا تو برسہا برس اس پر قابو نہ پایا جا سکا، جس کی بڑی وجہ خود مغل امراء اور لشکریوں کی عسکری کمزوری تھی، اس پر مستزاد یہ کہ سپاہیوں اور سپہ سالاروں میں آرام طلب۔ غدار فرض ناشناس عنصر کا اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ خود مغل شہزادے اس قبیح عادت سے مبرا نہ تھے۔ شہزادہ کام بخش نے ایک موقع پر خود اپنے باپ کے خلاف سازباز شروع کر دیا تھا قریب تھا کہ مرہٹہ فوج سے جا ملتا کہ راز فاش ہو گیا، بعض دوسرے شہزادوں کے متعلق رشوت خوری اور غداری کے واقعات تاریخ میں ملتے ہیں۔ (۸۰)

سیاسی زوال میں شاہان مغلیہ کے اندر عیاشی و سرمستی کا روز افزوں رجحان خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ جنون عیش کی انتہا تھی جس کے سبب محمد شاہ (۱۷۴۸ء-۱۷۱۹ء) رنگیلا کے نام سے مشہور عالم ہے۔

اسی محمد شاہ کے دور کا حال مذکور ہے کہ جب کسی علاقہ میں مرہٹوں کے حملہ یا کسی اور شورش کی خبر ملتی تو بجائے امداد بھیجنے کے بادشاہ و وزراء کا عیش و عشرت میں انہماک

۷۸۔ علامہ سید سلیمان ندوی۔ رسالہ الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر۔ ص۔ ۳۲۲

۷۹۔ محمد سرور۔ مضمون۔ اٹھارہویں صدی کا ہندوستان۔ رسالہ الرحیم اکتوبر ۱۹۶۳ء ص۔ ۱۵

۸۰۔ شیخ محمد اکرام۔ رود کوثر۔ ص۔ ۴۸۷ - ۴۹۰

بڑھ جاتا، تاکہ غم دور ہو سکے ۔ (۸۱)

ان کی فرصت کا ہر لمحہ عیاشی و بدمستی کی نذر ہوتا کہ معلوم نہیں کب زندگی کی گھڑیاں پوری ہو جائیں اور عیش و عشرت کی حسرت دل میں باقی رہ جائے ۔ ع

"بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست"

ایرانی و تورانی کشمکش عروج پر تھی ۔ شاہان مغلیہ کے اندرونی انتشار اور خلفشار نے انھیں اس قابل نہ رکھا تھا کہ وہ باہر کے کسی حملہ کے سامنے ٹھہر سکیں۔ اور اندرونی طور پر ان کی بنیادیں ہل گئی تھیں ۔

سنہ ۱۱۲۲ھ مطابق سنہ ۱۷۱۰ء میں جبکہ شاہ صاحب کی عمر تقریباً ۸ سال تھی، راجپوت کے راجاؤں نے اجمیر کے قریب ایک اجتماع میں مغل سلطنت کے خلاف بغاوت اور جنگ کا اعلان کر دیا۔ راجپوتوں کی طرح سکھوں نے بندہ کی سرکردگی میں مسلمانوں کو تباہ کرنے کا بیڑا اٹھایا اور وہ جہاں بھی گئے انھوں نے مسلمانوں کے قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔ سنہ ۱۱۲۲ھ میں سرہند میں چار دن تک غارت گری اور ظلم و ستم کا دور دورہ رہا، مسجدیں گرائی گئیں، مسلمانوں کے گھر جلائے گئے، عورتوں کی عصمتیں لوٹی گئیں اور مسلمانوں کا خون بہایا گیا ۔ (۸۲)

سکھ تحریک

سکھ مذہب کے بانی گرونانک ایک صوفی مشرب بزرگ تھے گرنتھ صاحب (سکھوں کی مقدس کتاب) کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں اسلامی تصوف کے اجزاء بہت کثادگی سے پائے جاتے ہیں ۔ گویا یہ کتاب اس روحانی میل جول اور نزدیک تر رشتہ کا مظہر ہے جو سکھ مذہب اور اسلام میں ہے گرونانک توحید کے قائل تھے ان کے بعد گرو گوبند کی کوششوں سے اس

---

۸۱ ۔ محمد سرور ۔ مضمون "اٹھارہویں صدی کا ہندوستان ۔ رسالہ الرحیم سنہ ۱۹۶۳ء ص ۱۴ ۔

۸۲ ۔ ابوسلمان شاہجہانپوری مضمون ۔ شاہ ولی اللہ کے عہد کے سیاسی حالات ۔ رسالہ الرحیم جولائی سنہ ۱۹۶۶ء ص ۔ ۱۴۹

تحریک نے قطعی سیاسی رنگ اختیار کر لیا۔ گرو گوبند کے بعد جب بندہ نامی شخص سکھوں کا گرو قرار پایا تو اس نے ظلم و ستم کی انتہا کر دی۔

طباطبائی کا بیان ہے کہ اہل اسلام کے گاؤں اور آبادیوں پر جہاں کہیں (بندہ) قابو پاتا، چڑھ دوڑتا تھا اور باشندوں میں جس کو پاتا باقی نہ چھوڑتا تھا، خواہ وہ چھوٹے کمسن بچے ہی کیوں نہ ہوں۔ فساد و درندگی کا یہ عالم تھا کہ حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر کے بچہ نکال کر مار ڈالتے۔ (۸۳)

باآواز بلند اذان نہیں ہونے دیتے تھے، مسجدوں پر قبضہ کر کے ان میں گرنتھ پڑھتے اور اس کا نام مست گڑھ رکھتے تھے۔

سوکھے بوٹوں کو گھاس پھوس کی آگ میں مع شاخوں کے خستہ کرنے کو "ہولے" کہتے ہیں لیکن سکھ اسے "ہولے" نہیں کہتے بلکہ وہ ایک فولادی پنجرہ میں۔ کبوتر، تیتر وغیرہ پرندوں کو بند کر کے نیچے سے آگ دیکر بھوننے کو "ہولے" کہتے ہیں۔ پرندوں کو اس طرح بھوننا کچھ کم حیرت انگیز نہیں لیکن دل لرز اٹھتا ہے جب قساوت و درندگی کی یہ مثال سامنے آتی ہے کہ اس طرح بے گناہ مسلمانوں کے ہولے کئے جاتے تھے۔ (۸۴)

فرخ سیر نے اپنے دور حکومت میں عبدالصمد خاں تورانی صوبہ دار کشمیر کے ذریعہ انھیں سرکرنیکی ناتمام کوشش کی تھی، جو اگرچہ وقتی طور پر کامیاب رہی، لیکن اس سے مکمل استیصال نہ ہوا۔ (۸۵)

مرہٹوں کی شورش

ایک طرف پنجاب سے سکھ تحریک کا فتنہ اٹھا، جو بتدریج تیز ہوتا جارہا تھا،

۸۳۔ ابوسلمان شاہجہانپوری مضمون۔ شاہ ولی اللہ کے عہد کے سیاسی حالات۔
رسالہ الرحیم جولائی ۱۹۶۶ء۔ ص۔ ۱۵۰

۸۴۔ مولانا مناظر احسن گیلانی۔ تذکرہ شاہ ولی اللہ۔ ص۔ ۵۱۔ ۵۲

۸۵۔ 〃 〃 〃 〃 ۔ ص۔ ۵۲

دوسری طرف شیواجی مرہٹہ نے دکن میں نیا ہنگامہ کھڑا کر دیا، جس نے سلطنت مغلیہ کی بنیادیں ہلا دیں۔

مورخ طباطبائی کے بیان کے مطابق عالمگیر نے خود اس فتنہ کے استیصال کیلئے مسلسل پچیس سال تک جدوجہد کی۔ لیکن اسی کے ساتھ ایک دوسرا رخ یہ ہے کہ خود سپہ سالاران و امرار کی ذاتی مصلحتیں اور خود غرضیاں تھیں جنھوں نے اس ہنگامہ کو یکسر نہ ہونے دیا، یہاں تک کہ خود عالمگیر کی زندگی ہی ختم ہوگئی۔ (۸۶)

عالمگیر کے بعد مرہٹہ غارت گروں کو گویا تمام تر آزادی حاصل ہوگئی، ان کی غارت گری کا میدان اب صرف دکن اور کوکن نہ تھا بلکہ دوسرے صوبے بھی انکی درندگی کا شکار ہونے لگے، پایہ تخت دہلی بھی ان کی زد سے محفوظ نہ رہا۔

سنہ ۱۱۳۲ھ مطابق سنہ ۱۷۱۹ء میں جب شاہ صاحب کی عمر تقریباً سترہ سال تھی، حسین علی خاں، بالاجی پیشوا کی سرکردگی میں گیارہ ہزار مرہٹہ فوج لیکر دہلی آیا اگرچہ اس وقت مرہٹوں کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس حملہ نے آئندہ کے لئے ان کی راہیں کھولدیں۔

ایک طرف یہ خطرہ تشویش ناک حد تک بڑھتا جارہا تھا، دوسری طرف حکومت اپنی کمزوری اور امرار کی غداری کے باعث اس لائق نہ رہی تھی کہ یہ فتنہ فرو کر سکے۔ (۸۷)

شاہ عبدالعزیز صاحب نے اپنے چچا شاہ اہل اللہ کے نام عربی اشعار کی صورت میں خط لکھا ہے اس میں انھوں نے سکھوں اور مرہٹوں کی قیامت خیز خونریزی کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

سقوا کل من تعرضہم ــــ من فئام الحمام

جو کوئی ان کے مقابل آیا اسے موت کا پیالہ پلا دیتے ہیں۔

۸۶۔ ابوسلمان شاہجہانپوری۔ مضمون۔ شاہ ولی اللہ کے عہد کے سیاسی حالات۔ رسالہ الرحیم جولائی سنہ ۱۹۶۶ء ص۔ ۱۵۰/۱۵۱

۸۷۔ " " " " " " " " ص۔ ۱۵۱-۱۵۲

ذہلت کل مر ضع عمّا ارضعت و کل ذات فطام

ہر دودھ پلانے والی اس بچہ کو بھول گئی ہے جسے وہ دودھ پلاتی تھی اور ان بچوں کو بھی جو دودھ چھوڑ چکے ہیں۔ (۸۸)

جاٹوں کے حملے

سلطنت مغلیہ کی بربادی میں سکھ اور مرہٹہ تحریک کے ساتھ ساتھ جاٹوں کی ہنگامہ خیزیاں بھی شریک کار رہیں۔ سکھوں اور مرہٹوں کے ظلم وستم کیا کم تھے کہ جاٹوں کی لوٹ مار اور قتل و غارت گری نے ان سے بھی بازی لیجانے کی کوشش کی۔ حکومت ان کے آگے بھی ناکام رہی۔ نظام الملک آصف جاہ کو دکن سے بلایا گیا دو سال تک اس نے بھی بے نتیجہ کوششیں کیں اور آخر کار واپس چلا گیا۔ یہاں بھی خود غرض امراز کی سازشیں آڑے آئیں اور تباہی و بربادی میں اضافہ ہوتا رہا۔

جاٹوں نے مسلمانوں کی خستہ حالی اور تباہی میں کچھ کسر نہ اٹھا رکھی، ان کی تمام دولت کھینچ لی۔ مساجد میں اذان تک دینے کی آزادی نہ تھی۔ (۸۹)

احمد شاہ ابدالی کے نام خط میں شاہ صاحب نے ان کی تباہ کاریوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"شہر بیانہ جوکہ اسلام کا قدیم شہر تھا اور جہاں علماء و مشائخ سات سو سال سے اقامت پذیر تھے، اس شہر میں قہراً و جبراً قبضہ کر کے مسلمانوں کو ذلت و خواری کے ساتھ وہاں سے نکال دیا، اس کے بعد سے سرکشی برابر بڑھتی گئی۔ (۹۰)

۸۸۔ مولانا مناظر احسن گیلانی۔ تذکرہ شاہ ولی اللہ۔ ص۔ ۳۸

۸۹۔ ابو سلمان شاہ جہاں پوری۔ مضمون۔ شاہ ولی اللہ کے عہد کے سیاسی حالات۔ رسالہ الرحیم۔ جولائی ۱۹۶۶ء۔ ص۔ ۱۷

۹۰۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات۔ ص۔ ۱۰۲

نادر شاہ کا حملہ

سکھوں مرہٹوں اور جاٹوں کی درندگی اور ان کے فتنہ سے قطع نظر بے فکرے حکمراں، ایرانیوں اور تورانیوں کی کشمکش اور آویزش کے شکار تھے۔ اسی ایرانی تورانی کشمکش اور حکمرانوں کی غفلت ولاپرواہی نے نادر شاہ کو ہندوستان کا رستہ دکھا دیا۔ ع

شامت اعمال ما صورت نادر گرفت

نادر شاہ کے حملے کے بعد سکھوں۔ مرہٹوں وغیرہ کے واقعات اس کے سامنے گرد ہو کر رہ گئے، غریب دہلی جو بلا شمار مرتبہ بنی بگڑی تھی، کبھی غیروں نے لگاڑا تھا لیکن آج اس کی تباہی "اپنوں" کے ہاتھوں ہو رہی تھی۔

دہشت و مرعوبیت کا یہ عالم تھا کہ دہلی کے شرفاء "جوہر" کا ارادہ کر چکے تھے، لیکن حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے حضرت امام حسین کا قصہ سنا کر انھیں اس سے باز رکھا۔ (۹۱)

(جوہر قدیم ہندوستانی رسم ہے، جب دشمن کا غلبہ اور تسلط اس حد تک ہو جاتا کہ عزت و ناموس خطرہ میں پڑ جاتی تو پاس ناموس کے خیال سے آگ کا الاؤ جوڑ کر عورتیں۔ مرد۔ بچے سب اس میں کود جاتے تھے)۔

عرصہ تک دہلی کی گلیاں لاشوں سے پٹی پڑی تھیں۔ شہر خاک کا ڈھیر بن گیا تھا۔ ذکاء اللہ صاحب نے مرنے والوں کا اندازہ کوئی ڈیڑھ لاکھ تک لگایا ہے۔ (۹۲)

قتل و غارت سے فرصت پائی تو ایک ایک گھر سے روپیہ جمع کرنا شروع کیا، اسی لوٹ میں تخت طاؤس اور کوہ نور ہیرا بھی لے گیا، نقد کا اندازہ نوے کروڑ تک کیا گیا ہے۔ (۹۳)

۹۱۔ مولانا مناظر احسن گیلانی۔ تذکرہ شاہ ولی اللہ۔ ص۔ ۱۴۸

۹۲۔ ابو سلمان شاہجہان پوری مضمون۔ شاہ ولی اللہ کے عہد کے سیاسی حالات۔ رسالہ الرحیم۔ اگست ۱۹۶۶ء۔ ص۔ ۱۸۰

نادر شاہ کے حملہ سے نقصان مسلمانوں ہی کو پہونچا، احمد شاہ ابدالی کے نام خط میں شاہ صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ اس نے مسلمانوں کی طاقت ختم کر دی، اور مرہٹوں اور جاٹوں کی طاقت قائم رہنے دی۔ اس کے بعد سے مخالفین کی قوت بڑھی اور لشکر اسلام کا شیرازہ بکھر گیا اور سلطنت دہلی بچوں کا کھیل بن گئی۔ (۹۴)

نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کے بعد جس طرح لوٹ مار کی ہے وہ تاریخ کے کسی طالب علم سے پوشیدہ نہیں لیکن کمال بے حمیتی کی یہ داستان بھی تاریخ کے انھیں اوراق میں رقم ہے کہ ساری ذلت وخواری انگیز کر کے محمد شاہ نے ہفتوں نادر شاہ کی خاطر تواضع اور ضیافت کا بار اٹھایا، اور عمدۃ الملک کو نادر شاہ کو قہوہ پلانے کیلئے مقرر کیا۔ (۹۵)

یہ ضیافت یہیں تک محدود نہ تھی بلکہ محمد شاہ نے شاہجہاں کی پوتیوں میں سے ایک لڑکی نادر کے چھوٹے لڑکے نصر اللہ مرزا کے نکاح میں دیدی جو اس کے ساتھ ایران سے ہندوستان آیا تھا۔ (۹۶)

روہیلوں کی آمد

اس عہد کی مسلم سیاست میں ایرانی۔ تورانی کشمکش تاریخ کا اہم باب ہے، نادر شاہ کے حملے کے بعد اسمیں ایک اور عنصر کا اضافہ ہوا، وہ "روہیلوں" کا تھا۔ اولاً روہیلے نادری ستم کے شکار ہو کر ہندوستان آئے تھے لیکن جلد ہی ہندوستان کے مطلع سیاست پر چھا گئے۔ (۹۷)

۹۳۔ ابو سلمان شاہجہانپوری۔ مضمون۔ شاہ ولی اللہ کے عہد کے سیاسی حالات رسالہ الرحیم اگست سنہ ۱۹۶۶ء۔ ص۔ ۱۷۹۔ ۱۸۰

۹۴۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات۔ ص۔ ۱۰۶

۹۵۔ مولانا مناظر احسن گیلانی۔ تذکرہ شاہ ولی اللہ۔ ص۔ ۱۸۰

۹۶۔ غلام حسین طباطبائی۔ سیر المتاخرین۔ ص۔ ۴۸۵

مغلیہ سلطنت کی کمزوری ، امرار کی غداری اور باہمی رسہ کشی نے روہیلوں کو اپنا اثر ونفوذ بڑھانے کے لئے اچھا موقع فراہم کر دیا چنانچہ ۱۷۶۱ء تک انھوں نے اتنی قوت حاصل کر لی تھی کہ ان کو نظر انداز کرنا ناممکن ہو گیا تھا اس لئے ۱۷۶۱ء میں جب احمد شاہ ابدالی نے عالمگیر ثانی کے بیٹے عالی گوہر کو شاہ عالم ثانی کے لقب سے تخت شاہی پر بٹھایا تو نجیب الدولہ روہیلہ کو امیر الامراء مقرر کیا۔ (۹۸)

اسی زمانہ میں بریلی میں حافظ الملک رحمت خاں۔ نجیب آباد میں نجیب الدولہ۔ اور بعض دوسری جگہوں رام پور۔ ٹونک۔ بھوپال وغیرہ میں ان کی ریاستیں قائم ہو گئیں۔ نادر شاہ کی دشمنی اور احمد شاہ (ابدالی) کی دوستی نے ان کے قدم ہندوستان میں جما دیئے۔ (۹۹)

اسباب زوال شاہ صاحب کی نظر میں

یہ سارا انتشار اور افراتفری کا دور شاہ صاحب کے سامنے گذرا تھا انھوں نے مسلم قوم اور مسلم حکومت کے زوال کا تنقیدی نظر سے مطالعہ کیا تھا چنانچہ انھوں نے اپنی مختلف تحریروں میں ان اسباب کا بہت ہی صحیح تجزیہ کیا ہے۔

شاہ صاحب کی نظر میں عام مسلم معاشرہ کے زوال کا سبب مذہبی شعار سے بے اعتنائی اور علوم دینیہ سے بے تعلقی تھی۔ سلطنت مغلیہ کے زوال کا سبب انھوں نے اقتصادی انحطاط اور نظم مملکت کے باب میں صحیح تدبر کا فقدان قرار دیا ہے۔ (۱۰۰)

اقتصادی انحطاط سے پیدا ہونے والی خرابیوں کی نشاندھی کرتے ہوئے

۹۷۔ مولانا مناظر احسن گیلانی۔ تذکرہ شاہ ولی اللہ۔ ص۔ ۱۹۰۔ ۱۹۱

۹۸۔ ابو سلمان شاہجہاںپوری۔ مضمون۔ شاہ ولی اللہ کے عہد کے سیاسی حالات۔ رسالہ الرحیم اگست ۱۹۶۶ء۔ ص۔ ۱۸۱

۹۹۔ مولانا مناظر احسن گیلانی۔ تذکرہ شاہ ولی اللہ۔ ص۔ ۱۹۳

۱۰۰۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات۔ ص۔ ۵

آپ نے اپنی مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں تحریر فرمایا ہے کہ" انسانیت کے اجتماعی اخلاق اس وقت برباد ہو جاتے ہیں، جب کسی جبر سے ان کو اقتصادی تنگی پر مجبور کر دیا جائے"۔ (۱۰۱)

مکتوبات میں انھیں بنیادی خرابیوں کی تشریح اور زوال کے اسباب کا تعین کرتے ہوئے بادشاہ وقت کو احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔

شاہ صاحب کی نظر میں جو اساسی اسباب زوال ہیں ان میں سے چند یہ ہیں۔

۱۔ خالصہ کا علاقہ محدود ہونا۔ ۲۔ خزانہ کی قلت۔

۳۔ جاگیرداروں کی کثرت۔ ۴۔ اجارہ داری کے مسموم اثرات۔

۵۔ افواج کے مواجب کا بر وقت نہ ملنا۔ (۱۰۲)

اسباب زوال کے اس تجزیہ سے شاہ صاحب کی دقت نگاہ اور بے پناہ سیاسی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ شاہ صاحب نے چونکہ سیاسی زوال کے سارے مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے اور اس کے اسباب و عوامل کا مدتوں تجزیہ کیا تھا، اس لئے مرض کی صحیح تشخیص کرتے ہوئے آپ نے بادشاہوں کے لئے ضروری قرار دیا کہ اس بات کا خیال رکھیں کہ ماتحت امراء کی جماعت منتشر رہے۔ ان کی اپنی طاقت کمزور رہے اور وہ مرکزی حکومت سے خائف اور اس کے مطیع ہو کر رہیں، اور اس قابل نہ ہو سکیں کہ اپنے لئے کوئی منصوبہ بنا سکیں۔ اگر ان سے بغاوت و سرکشی کا خطرہ ہو تو ان پر ایسے خراج اور جزئیے عائد کر دیے جائیں کہ اس قابل نہ رہ سکیں کہ بغاوت کا ارادہ کریں۔ (۱۰۳)

اصلاح حال کیلئے شاہ صاحب کی عمومی کوششیں

مغلوں کی زوال آمادہ سلطنت اور بتدریج گرتی ہوئی قوت و سطوت، شاہ صاحب

۱۰۱۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات۔ ص۔ ۱۱

۱۰۲۔ " " " ص۔ ۹۴۔ ۹۵

۱۰۳۔ شاہ ولی اللہ۔ حجۃ اللہ البالغہ۔ ص۔ ۹۷

کے سامنے کتنی دنیا کی نظروں میں یہ ایک قوم یا ایک خاندان کی شکست و ریخت کا مسئلہ نہ تھا بلکہ اس کا انتساب دنیا براہ راست اسلام کی طرف کرتی تھی، گویا یہ شکست اسلام کی شکست و ہزیمت تھی، یہی وجہ ہے کہ شاہ صاحب نے حکومت کی بقا اور سالمیت کا تو خیال رکھا لیکن آپ کے پیش نظر یہ امر ہرگز نہ تھا کہ حکومت واقتدار مغل خاندان ہی میں رہے۔

شاہ صاحب نے اس سطوت و اقتدار کی گرتی ہوئی عمارت کو کافی سنبھالا دیا۔ یہ مجاہدانہ کوششیں اور جذبہ آپ کو قدرت نے وراثۃً ودلیعت کیا تھا۔ آپ کے دادا شاہ وجیہہ الدین، اورنگ زیب کی فوج میں شریک تھے۔ آپ کے والد شاہ عبدالرحیم صاحب کا خط نظام الملک آصف جاہ اول کے نام شاہد ہے کہ آپ نے نواب مرحوم کو مرہٹوں سے جہاد کے لئے ترغیب دی تھی۔ (۱۰۴)

اس دور میں شاہ صاحب کا یہی کارنامہ نہ تھا کہ آپ نے زبان وقلم سے اصلاح حال کی کوشش فرمائی بلکہ آپ نے پوری کوشش کی کہ ہندوستان میں صحیح اسلامی حکومت قائم ہو جائے۔ (۱۰۵)

ایک موقع پر آپ نے اس خیال کا اظہار فرمایا کہ "اگر حالات و اسباب کا تقاضا ہوتا تو میں جنگ کر کے عملاً مسلم معاشرہ میں اصلاح کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔" (۱۰۶)

حقیقت یہ ہے کہ قدرت خداوندی کو سرزمین ہند پر اسلام اور مسلمانوں کی بقا منظور تھی کہ ہر نازک موڑ پر اس نے کسی نہ کسی کو پیدا کر دیا جس نے اسلام کی گرتی ہوئی عمارت کو سنبھالا دیا۔ بارہویں صدی ہجری میں اللہ تعالیٰ نے یہ کام شاہ ولی اللہ سے لیا۔ (۱۰۷)

۱۰۴۔ سید ابوالحسن علی (ندوی)۔ حصہ اول سیرت سید احمد شہید۔ ص ۲۷
۱۰۵۔ پروفیسر سعید احمد اکبرآبادی۔ مسلمانوں کا عروج و زوال۔ ص ۔ ۲۴۰
۱۰۶۔ شاہ ولی اللہ۔ تفہیمات جلد اول۔ ص ۔ ۱۰۱
۱۰۷۔ پروفیسر سعید احمد اکبرآبادی۔ مسلمانوں کا عروج و زوال۔ ص ۔ ۳۶

یوں تو شاہ صاحب کا خاندان ہمیشہ سے علم و عمل کا مرکز تھا لیکن تجدید و اصلاح امت اور فقہ دین کی جو دولت شاہ صاحب کے حصہ میں آئی اس میں کوئی ان کا شریک و سہیم نظر نہیں آتا۔ (۱۰۸) علمی کمال اور تجربہ کا یہ عالم تھا کہ دنیا کے ایک سرے سے لیکر دوسرے تک کوئی شخص آپ کا مقابل نہ تھا۔ (۱۰۹) بلکہ کتنے علوم اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسے عطا فرمائے تھے کہ جن میں آپ مکمل انفرادیت رکھتے تھے۔ (۱۱۰)

شاہ صاحب پہلے ہندوستانی مصنف ہیں جن کی عربی تصانیف میں اہل زبان کی سی روانی اور ادبار عرب کی سی عربیت ہے۔ (۱۱۱)

زوال و انحطاط کے مسلسل مطالعہ کے بعد آپ نے ۵ مئی ۱۷۳۱ء سے اصلاح حال کیلئے توکلاً علی اللہ اپنی ذمہ داری پر ایک انقلابی تحریک شروع کرنے کا فیصلہ فرمایا۔ (۱۱۲)

ایک جگہ آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ مجھ کو بتایا گیا ہے کہ " اس حقیقت کا اعلان کر دوں کہ آج وقت میرا ہی وقت ہے اور زمانہ میرا ہی زمانہ ہے اس شخص پر حیف ہے جو میرے جھنڈے کے نیچے نہیں ہے"۔ (۱۱۳)

شاہ صاحب کی تحریک بہت ہمہ گیر تھی وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان میں رہنے والے تمام طبقے پرامن و پرسکون ماحول میں زندگی گذاریں، اور ملک کی معاشی حالت سدھر جائے، اور بگڑا ہوا اقتصادی توازن از سر نو بحال ہو جائے۔ (۱۱۴)

۱۰۸۔ مولانا محمد ادریس ندوی۔ الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر۔ ص۔ ۳۴۷ - ۳۴۸

۱۰۹۔ مولانا محمد رحیم بخش دہلوی۔ حیات ولی۔ ص۔ ۳۸۲

۱۱۰۔ مولانا حکیم عبد الحیٔ صاحب۔ نزہتہ الخواطر جلد ششم۔ ص۔ ۴۰۰

۱۱۱۔ مولانا ابو الحسن علی ندوی۔ الفرقان۔ شاہ ولی اللہ نمبر۔ ص۔ ۳۴۴

۱۱۲۔ مولانا عبید اللہ سندھی۔ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک۔ ص۔ ۹

۱۱۳۔ پروفیسر سعید احمد اکبر آبادی۔ الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر ص۔ ۳۳۳

۱۱۴۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات۔ ص ۲۱

شاہ صاحب نے تمام طبقات کی اصلاح وتنظیم اور ان کی صنفی ترقیات کا خیال رکھا۔ (۱۱۵)

انتہائی خراب سیاسی، سماجی اور مذہبی حالات میں اصلاح حال کی جو کوششیں ہوئیں ان میں شاہ ولی اللہ کی کوششوں کا حصہ وافر ہے آپ کی اس سلسلہ کی کوششیں تاریخ کا ایک ایسا لازمی جزو بن چکی ہیں جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

جہاں تک مسلمانوں میں آپ کی اصلاحی کوششوں کے اثر کا تعلق ہے، اس سلسلہ میں مولانا مفتی عنایت احمد صاحب کاکوروی کا یہ اعتراف خاص اہمیت رکھتا ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ شاہ صاحب کی مثال اس مبارک درخت کی ہے جس کی جڑیں تو خود ان کے گھر میں ہیں لیکن اس کی شاخوں کے سایہ سے مسلمانوں کا کوئی خاندان بلکہ کوئی گھر خالی نہیں۔ آپ کے فیض سے ہر گھر مستفید ہے لیکن کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ یہ کس کا فیض ہے۔ (۱۱۶)

احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان آنیکی دعوت

گذشتہ صفحات میں ہم مغل سلطنت کے زوال وانتشار اور کمزوری کا ذکر کر چکے ہیں۔ حالات جب انتہائی خراب ہو گئے اور غیروں کا تسلط یقینی معلوم ہونے لگا تو اس وقت احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان پر حملہ کرنیکی دعوت مختلف اعیان ومشاہیر کی جانب سے دی گئی۔

احمد شاہ ابدالی اپنی تخت نشینی سے قبل متعدد بار ہندوستان آچکا تھا۔ مغلیہ سلطنت کی کمزوری، امرار کی باہم دست وگریبانی کا حال اس سے پوشیدہ نہ تھا یہاں کی دولت کا نقشہ بھی اس کے ذہن میں تھا۔ سنہ ۱۷۴۷ء سے سنہ ۱۷۶۹ء تک اس نے ہندوستان پر نو حملے کئے۔ (۱۱۷)

۱۱۵۔ مولانا سید ابو النظر صاحب۔ الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر۔ ص۔ ۳۵۸

۱۱۶۔ مولانا حکیم سید عبدالحئی۔ نزہۃ الخواطر جلد ششم۔ ص۔ ۴۰۶

۱۱۷۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات۔ ص۔ ۱۹۰

ان حملوں کی نوعیتیں مختلف تھیں، کبھی وہ خود آیا اور کبھی اس کو بلایا گیا۔ ان تمام حملوں میں اس نے کشت و خون اور لوٹ کھسوٹ میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ سید ہاشمی صاحب فرید آبادی نے لکھا ہے کہ دو ماہ تک لوٹ مار کا سلسلہ جاری رہا۔ بلا رورعایت خانہ تلاشی بلکہ جامہ تلاشی تک لی گئی، کتنے لوگوں نے خودکشی کر لی۔ لوٹ کے مال کا اندازہ نو سے بارہ کروڑ تک کیا گیا ہے۔ (۱۱۸)

۶۱-۱۷۶۰ء میں احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر چھٹا حملہ کیا۔ ابدالی کا یہ حملہ نجیب الدولہ۔ شاہ ولی اللہ اور بہت سے دوسرے لوگوں کی خواہش پر ہوا تھا۔

ابدالی کے اس حملہ میں مرہٹوں کو اپنی موت نظر آرہی تھی، انھوں نے شجاع الدولہ کے پاس اپنے نمائندے بھیجے کہ وہ ابدالی کی رفاقت سے باز رہے، لیکن شجاع الدولہ نے انھیں جواب یہ دیا کہ۔

"ابدالی سے جو نقصانات پہونچیں گے انھیں مرہٹوں کی مصیبت سے آسان خیال کر کے ایسا کیا گیا ہے"۔ (۱۱۹)

ابدالی کے اس حملہ میں نجیب الدولہ اس کا معاون تھا۔ شاہ صاحب کو یہ اندازہ پہلے سے تھا کہ مرہٹے صلح و مصالحت کی کوشش کریں گے۔ نجیب الدولہ کے نام ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ۔ "...... اگر مخالفین مکر و حیلہ کے ساتھ صلح کی گفتگو کریں تو ان کی باتوں پر کان نہ دھرنا، اگر بعض ایسے مسلمان جن کی اعلاء دین محمدی کے سلسلہ میں نیت کمزور ہے لمبے چوڑے خطرے سامنے لاکر پیش کریں تو ان کی کبھی نہ سننا چاہئے"۔ (۱۲۰)

شاہ صاحب کا اندازہ صحیح نکلا۔ مرہٹوں نے صلح کی کوشش کی، جو ناکام ہو گئی۔ ایک موقع پر تو اس کا امکان پیدا ہو گیا تھا کہ مصالحت کی پیش کش منظور ہو جاتی، لیکن نجیب الدولہ نے سختی سے مصالحت سے انکار کر دیا۔

۱۱۸۔ ابوسلمان شاہجہانپوری۔ مضمون۔ شاہ ولی اللہ کے عہد کے سیاسی حالات۔ رسالہ الرحیم اگست ۱۹۶۶ء۔ ص۔ ۱۸۳۔ ۱۸۴

۱۱۹۔ ابوسلمان شاہجہانپوری۔ مضمون شاہ ولی اللہ کے عہد کے سیاسی حالات۔ رسالہ الرحیم۔ اگست ۱۹۶۶ء ص ۱۸۴

۱۲۰۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات۔ ص۔ ۲۴

ابدالی کا حملہ...... نتائج اور اثرات

جب مصالحت کی ہر پیش کش ابدالی نے ٹھکرادی، تو اس کے بعد لشکر کو آگے بڑھایا، بالآخر پانی پت کے میدان میں کوئی ڈھائی ماہ کی جنگ کے بعد احمد شاہ کی قسمت نے یاوری کی اور فتح اور ظفر نے اس کے قدم چومے۔ مرہٹوں کو شکست فاش اٹھانی پڑی۔ (۱۲۱) مشہور ہے کہ تقریباً دو لاکھ مرہٹہ سپاہی اس جنگ میں کام آئے۔ (۱۲۲) غرض مرہٹوں کی قوت کا ہمیشہ کے لئے اس جنگ نے خاتمہ کر دیا۔ پورا مہاراشٹر اس شکست سے ماتم کدہ بن گیا (۱۲۳)

جنگ کے اس انجام کے بعد ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ مستحکم اسلامی حکومت قائم ہو جاتی، لیکن یہ کون کرتا؟ لے دیکے سلطنت مغلیہ سے یہ امید تھی، وہ پہلے ہی اتنے طوفانوں سے گذر چکی تھی کہ اس میں اتنی جان نہ رہ گئی تھی کہ وہ ایک بار پھر سنبھالا لیکر پانی پت کے معرکہ کارزار سے فائدہ اٹھاتی۔ اگر اس میں ذرا بھی دم ہوتا تو پانی پت کے معرکہ کے بعد صدیوں کے لئے اقتدار بحال کر سکتی تھی، آخر کار بیچاری سلطنت مغلیہ عاجز و درماندہ رہی اور جنگ پانی پت کا اصل فائدہ فاتحین جنگ پلاسی نے اٹھایا۔ (۱۲۴)

احمد شاہ ابدالی کا حملہ اور شاہ صاحب کا اہم حصہ

اس میں کوئی شک نہیں کہ احمد شاہ ابدالی کے حملہ میں شاہ ولی اللہ کا ہاتھ تھا، حالات کے مسلسل مطالعہ اور غور و فکر کے بعد شاہ صاحب اسی نتیجہ پر پہونچے۔ کمال بصیرت اور تدبر کی داد دینی پڑتی ہے کہ آپ کی نظریں انھیں دو طاقتوں پر پڑیں جن کے ذریعہ ان حالات میں واقعی کچھ

۱۲۱۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات۔ ص۔ ۱۹

۱۲۲۔ ابو سلمان شاہجہاں پوری۔ شاہ ولی اللہ کے عہد کے سیاسی حالات۔ رسالہ الرحیم۔ ص۔ ۱۸۵

۱۲۳۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی۔ مقدمہ۔ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، ص۔ ۱۹

۱۲۴۔ [illegible] ص۔ ۱۸۵

کام ممکن تھا۔ یعنی :

۱۔ احمد شاہ ابدالی اور ۲۔ نجیب الدولہ (روہیلہ)

مکتوبات کے مطالعہ سے اس امر کی مزید تصدیق و تائید ہوتی ہے، ابدالی کے نام اپنے طویل خط میں ہندوستان کے حالات وغیرہ لکھنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ”ان حالات میں آپ پر ہندوستان آنا۔ مرہٹوں کا تسلط توڑنا اور ضعفائے مسلمین کو غیر مسلموں کے پنجے سے آزاد کرانا فرض عین ہے“۔ (۱۲۵)

یہ خیال رہے کہ شاہ صاحب نے احمد شاہ کو آنے کیلئے دعوت ضرور دی تھی، لیکن اس امر کی طرف بار بار توجہ دلائی تھی کہ عوام الناس پر ظلم و ستم نہ ہو۔ ابدالی کے نام خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ ”خدا سے پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ نادر شاہ کی طرح عمل ہو“۔ اسی خط میں ہے کہ ”ان مجاہدات میں تقویت اسلام کی نیت کرلی جائے“۔ (۱۲۶)

نجیب الدولہ کے نام بھی جو مکتوبات ہیں ان سے بھی اسی دعوے کی مزید تائید ہوتی ہے۔ شاہ صاحب بار بار نجیب الدولہ کی ہمت افزائی فرماتے ہیں، اور فتح و تائید غیبی کی خوشخبری سناتے ہیں۔ نجیب الدولہ کو بھی آپ نے عوام کا خیال رکھنے کیلئے تحریر فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں۔

”..... اہتمام کلی کرنا چاہئیے کہ دہلی سابق کی طرح ظلم سے پامال نہ ہو جائے ..... اگر اس بار آپ چاہتے ہیں کہ کار بستہ جاری ہو جائے تو پوری پوری تاکید کرنی چاہئیے کہ فوجی دہلی کے مسلمانوں اور غیر مسلموں سے جو ذمی کی حیثیت رکھتے ہیں ہرگز تعارض نہ کریں“۔ (۱۲۷)

مکتوبات کے مطالعہ سے آپ سے نجیب الدولہ کے نیازمندانہ تعلقات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

بعد کی اسلامی تحریکات اور شاہ صاحب

اٹھارہویں صدی کے ثلث آخر سے لیکر آج تک کی مسلم تحریکوں کا مطالعہ کیا جائے

۱۲۵۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی۔ مقدمہ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات۔ ص ۔ ۱۰۵

۱۲۶۔ 〃 〃 〃 〃 〃 ۔ ص ۔ ۱۰۶ ۔ ۱۰۷

۱۲۷۔ 〃 〃 〃 〃 〃 ۔ ص ۔ ۱۱۷

تو ضروری ہے کہ کسی نہ کسی منزل میں ان کی جڑیں شاہ صاحب تک پہنچتی ہوں۔ خواہ وہ تحریکیں سیاسی بنیادوں پر وجود پذیر ہوئی ہوں یا محض تعلیمی بنیادوں پر ابھری ہوں۔ گذشتہ صفحات میں ہم نے اصلاً شاہ صاحب کی تحریک کا مطالعہ آپ کی سیاسی خدمات کی روشنی میں کیا ہے لیکن دیکھا جائے تو آپ کی جملہ کوششیں مکمل تاسیس اور تجدید دین کے لئے تھیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں پر مختلف شعبہ ہائے زندگی میں آپ کی کوششوں کا بہت اثر پڑا۔ بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ بعد کی تمام اسلامی تحریکات کا تعلق کسی نہ کسی درجہ میں شاہ صاحب سے قائم ہے۔ سید احمد شہید کی تحریک کو روشنی آپ ہی کی جلائی ہوئی مشعل سے ملی۔ اس تحریک نے مسلمانوں میں ایک عسکری نظام پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن یہ تحریک بھی ہنگامی کشاکش۔ اپنوں کی بے وفائی اور غیروں کی بے توجہی کا نشانہ بن کر ختم ہو گئی۔ اسی کے "باقیات الصالحات" کچھ لوگ تھے جنھوں نے تعلیم و تدریس کی طرف توجہ دی جن کی کوششوں سے انھیں ہنگامی حالات میں دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا۔ (۱۲۸)

شاہ صاحب نے اپنی اولاد اور شاگردوں میں بھی وہی روح اور جذبہ بیدار کر دیا تھا، جس سے وہ خود سرشار تھے چنانچہ آپ کے لڑکوں نے بھی آپ کی تحریک جاری رکھی اور برابر وہ دوسروں کو بھی توجہ دلاتے رہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ مولانا عبدالحیٔ اور مولانا اسماعیل شہید درس و تدریس چھوڑ چھاڑ میدان جنگ میں صف آرا ہو گئے۔ (۱۲۹)

شاہ صاحب کے نظریہ انقلاب کو عملی شکل دینے کے لئے ایک مرکزی جماعت تیار ہوگئی تھی جس کے اہم ارکان یہ تھے: سید احمد شہید رائے بریلوی۔ مولانا عبدالحیٔ۔ مولانا اسماعیل شہید۔ مولانا محمد اسحاق دہلوی۔ (۱۳۰)

شاہ صاحب ہی کے خاندان کے پسماندگان علماء نے تحریک آزادی ۱۸۵۷ء میں چلائی، جو سکھوں اور بعض مسلمان رؤسائے پنجاب کی غداری سے ناکام ہوگئی۔ (۱۳۱)

۱۲۸۔ نسیم قریشی مرتب۔ مضمون پروفیسر عمر الدین۔ علی گڑھ تحریک۔ ص۔ ۱۱۵

۱۲۹۔ میاں محمد شفیع۔ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ۔ ص۔ ۱۵۱

۱۳۰۔ مولانا عبیداللہ سندھی۔ شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ۔ ص۔ ۲۱۵

۱۳۱۔ مولانا حسین احمد مدنی۔ مرتب مولانا عبدالرحمٰن۔ تحریک ریشمی رومال۔ ص۔ ۱۳

مختلف تعلیمی اور اصلاحی تحریکات میں اس درجہ دور رس اثر ہونے کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ شاہ صاحب کا عمل تجدید بیکار و بے اثر رہا۔ یہ شاہ صاحب نہیں بلکہ اسلامیان ہند کی خوش بختی تھی کہ شاہ صاحب کے جانشین ایسے لوگ ہوئے جنھوں نے شاہ صاحب کی کوششوں سے ذرا تغافل نہ برتا۔ (۱۳۲) اور اس جذبۂ صالح اور سوز دروں کو دوسروں تک منتقل کرتے رہے، جو انھیں شاہ صاحب سے ملا تھا۔

شاہ صاحبؒ کی تحریک شاہ صاحبؒ کے بعد

گذشتہ صفحہ پر ہم بعد کی مختلف اسلامی تحریکات کی شاہ صاحب سے وابستگی کی طرف اشارہ کر چکے ہیں یہاں ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ آپ کی وفات کے بعد آپ کی تحریک نے کس طور پر کام کیا اور کن لوگوں نے اس تحریک کو باقی رکھا۔

شاہ صاحب کے انتقال کے وقت آپ کے سب سے بڑے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز کی عمر سترہ سال تھی، اس وقت آپ خود تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے تمام لوگوں نے آپ کو مقتدا تسلیم کیا۔ (۱۳۳)

آپ کے درس و تدریس کا سلسلہ اتنا وسیع ہوا کہ پورے ہندوستان میں ایک عالم بھی ایسا نہ تھا جس کا تعلق براہ راست یا بالواسطہ طور پر حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب سے نہ ہو۔ (۱۳۴) یہاں تک کہ ایک عالم نے یہ جاننے کے لئے ہندوستان کی سیاحت کی کہ اسے کوئی ایسا علم حدیث کا استاد ملے جو شاہ صاحب کا شاگرد نہ ہو۔ اس سیاح کو ایک استاد حدیث ایسا نہ ملا جس نے آپ کے در سے کسب فیض نہ کیا ہو۔ (۱۳۵)

۱۳۲۔ پروفیسر سعید احمد اکبر آبادی۔ الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر۔ ص۔ ۳۳۵

۱۳۳۔ حافظ محمد رحیم بخش۔ حیات ولی۔ ص۔ ۵۹۳

۱۳۴۔ مولانا سید محمد میاں۔ علماء ہند کا شاندار ماضی جلد دوم۔ ص۔ ۴۵

۱۳۵۔ مولانا عبید اللہ سندھی۔ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک۔ ص۔ ۱۱۸

درس و تدریس کے علاوہ آپ نے اپنے والد شاہ ولی اللہ صاحب کے افکار وخیالات کی روشنی میں عوام الناس کی رہبری فرمائی۔ برابر دلچسپ و موثر انداز میں وعظ وارشاد بھی فرماتے رہتے۔ (۱۳۶)

شاہ ولی اللہ کی حیات میں مغل سلطنت میں جو کسی حد تک جان تھی، شاہ عبدالعزیز صاحب کے سامنے وہ بھی جاتی رہی، اور اگرچہ ابھی شاہان مغلیہ کا نام باقی تھا، لیکن عملاً سارا اقتدار انگریزوں کے ہاتھ میں جارہا تھا، حالات کا تقاضا دیکھ کر شاہ عبدالعزیز صاحب نے جہاد کا فتویٰ بھی دیا۔ (۱۳۷)

مغلیہ خاندان شاہ صاحب کے خاندان کا اگرچہ خیال کرتا تھا، لیکن شر پسند امرار کی کثرت تھی، آپ کے بدن پر چھپکلی کا ابٹن ملوادیا گیا، جس سے برص پیدا ہو گیا، متعدد بار قتل کی بھی کوشش کی گئی، آخر کار آپ کو دہلی سے شہر بدر کر دیا گیا۔ شاہدرہ تک آپ پورے خاندان کے ساتھ پیادہ پا تشریف لائے۔ (۱۳۸)

شاہ ولی اللہ جو انقلاب خواص اور امرار کے ذریعہ لانا چاہتے تھے، شاہ عبدالعزیز نے اس کی کوشش عوام الناس کے ذریعہ کی۔ (۱۳۹) اور شاہ صاحب اور آپ کی کوششوں میں یہی فرق ہے، کہ شاہ صاحب نے خواص اور اعلیٰ طبقہ میں کام کیا، اور آپ نے عوامی پیمانہ پر اپنی جد وجہد جاری رکھی۔ (۱۴۰)

شاہ ولی اللہ کے بعد آپ کی تحریک کو جن لوگوں نے زندہ رکھا بلکہ اس کے وجود اور بقا کی خاطر اپنی متاع جان بھی نذر کر دی، اس سلک گہر کا ایک آب دار موتی حضرت شاہ اسماعیل شہید کی ذات گرامی ہے۔

آپ نے عوام الناس کی مذہبی ابتری کا نظارہ سوز و قلق کے ساتھ کیا، جن کی مذہبی متاع بس

۱۳۶۔ ڈاکٹر سید معین الحق۔ ملفوظات شاہ عبدالعزیز۔ ص۔ ۱۵

۱۳۷۔ مولانا محمد میاں۔ علمار ہند کا شاندار ماضی جلد دوم۔ ص۔ ۸۶

۱۳۸۔ " " ص۔ ۵۲

۱۳۹۔ مفتی عزیز الرحمن۔ تذکرہ شیخ الہند۔ ص۔ ۲۵

۱۴۰۔ مولانا عبیداللہ سندھی۔ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک۔ ص۔ ۲

اوہام و مفروضات تھے۔ قرآن و حدیث سے عملاً بے تعلقی و بے گانگی پیدا ہوگئی تھی ۔ (۱۴۱) اس سلسلہ میں آپ کی خدمات انتہائی قابل قدر ہیں ۔

دارالحکومت دہلی پر برطانوی اقتدار کی گرفت مضبوط ہوتی جا رہی تھی چونکہ انگریزوں کا خاص مشغلہ مذہبی بنیادوں پر تفرقہ پیدا کرنا تھا اس لئے شاہ اسماعیل صاحب بھی ان کی نگاہوں میں خار بنے کیونکہ آپ پوری تندہی سے اصلاحی کوششوں میں مصروف تھے ۔ (۱۴۲)

حالات کا رخ اور ضرورت دیکھ کر جہاد کی تیاری شروع کر دی اور عوام الناس کو بھی ترغیب جہاد دیتے رہے ۔ (۱۴۳) جنگی زندگی کا آغاز سکھوں کے خلاف لڑائی سے ہوا ۔

سکھوں سے پہلی جنگ ۲۱ دسمبر ۱۸۲۶ء کو نوشہرہ سے آٹھ میل دور ایک جگہ "اکوڑہ" میں لڑی جس میں سکھوں کو شکست ہوئی اور کافی نقصان اٹھانا پڑا ۔ اس طرح آپ مسلسل جہاد میں مصروف رہے سکھوں ہی سے جنگ میں مانسہرہ کے قریب بالاکوٹ کے میدان میں ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو آخری جنگ لڑتے لڑتے شہید ہو گئے ۔ (۱۴۴)

اس سلسلہ میں مولانا محمد اسحاق صاحب دہلوی اور مولانا محمد یعقوب صاحب دہلوی کا نام بھی آتا ہے مولانا اسحاق صاحب اگرچہ مکہ معظمہ ہجرت کر کے چلے گئے تھے لیکن وہاں رہ کر انھوں نے اپنی تحریک جاری رکھی چنانچہ ہندوستان میں ان کی جاگیر وغیرہ ضبط کر لی گئی ۔ (۱۴۵)

مکہ معظمہ پہونچ کر آپ کو مکمل آزادی حاصل ہوگئی ، اور وہاں آپ نے اپنی کوششیں شروع کر دیں ، آپکو مکہ معظمہ سے نکلوانیکی کوششیں کی گئیں ، لیکن ناکام ہوئیں ۔ (۱۴۶)

---

۱۴۱ ۔ مرتب عبداللہ بٹ ڈاکٹر محمد باقر ۔ شاہ اسماعیل شہید ۔ ص ۔ ۴۴

۱۴۲ ۔ مولانا سید محمد میاں ۔ علماء ہند کا شاندار ماضی جلد دوم ۔ ص ۔ ۱۹۳

۱۴۳ ۔ سرسید احمد خاں ۔ اسباب بغاوت ہند ۔ ص ۔ ۱۰۵

۱۴۴ ۔ مرتب عبداللہ بٹ ۔ مضمون ڈاکٹر محمد باقر ۔ شاہ اسماعیل شہید ۔ ص ۔ ۴۲

۱۴۵ ۔ مفتی عزیز الرحمٰن ۔ تذکرۂ شیخ الہند ۔ ص ۔ ۲۸ ۔ ۲۹

۱۴۶ ۔ مولانا عبیداللہ سندھی ۔ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ۔ ص ۔ ۱۲۶

مولانا اسحاق صاحب کے انتقال کے بعد مولانا یعقوب صاحب نے آپ کے کام کو سنبھالا، اور بجا طور پر وہ اس کے مستحق تھے۔

آپ ہی کے خلیفہ مولانا مظفر حسین صاحب تھے جو مولانا محمد قاسم صاحب اور سرسید، دونوں کے نزدیک یکساں عزت و احترام کے لائق اور ان کے تسلیم شدہ بزرگ تھے۔ (۱۴۷)

سید احمد شہیدؒ

حضرت شاہ ولی اللہؒ صاحب کے بعد آپ کی تحریک کا سب سے روشن باب وہ ہے جب تحریک کو سید احمد شہید نے اپنے ہاتھ میں لیا۔ شاہ صاحب کے بعد سے اگرچہ میدان خالی کبھی بھی نہ رہا لیکن سید احمد شہید نے نہ صرف یہ کہ وقتی طور پر تحریک کو تقویت بخشی بلکہ وہ روش قائم کر گئے جس پر تحریک آپ کے بعد بھی زندہ رہ سکے۔

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی صحبت اور بیعت کے بعد وہ جذبات پروان چڑھے جنھوں نے تحریک کو آگے بڑھایا۔

آپ نے ابتدائی زندگی سپاہ گری سے شروع کی تھی لیکن چند سال بعد آپ دہلی تشریف لے گئے اور وہاں رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری کیا۔ (۱۴۸) وہیں مولانا عبدالحئی اور شاہ اسماعیل شہید آپ سے بیعت ہوئے۔

سید احمد صاحب کے ذریعہ عوام الناس مسلمانوں کو بڑا نفع پہونچا، پوری تحریک کے دوران اصلاح و تبلیغ اور رشد و ہدایت کا سلسلہ برابر جاری رہا، ایک طرف آپ نے نام کے مسلمانوں کو سچا مسلمان بنایا، تو دوسری طرف آپ کی تحریک سے ہزارہا غیر مسلم حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ مشہور ہے کہ اس تحریک سے چالیس ہزار غیر مسلموں نے اسلام کا کلمہ پڑھا۔ (۱۴۹)

رشد و ہدایت کے سلسلہ ہی سے آپ رام پور میں تشریف فرما تھے کہ وہاں کچھ افغان آئے اور انھوں نے اپنا یہ قصہ سنایا کہ سرزمین پنجاب میں ہم ایک کنویں پر پانی پینے کیلئے گئے تھے، وہاں

۱۴۷۔ مفتی عزیز الرحمن۔ تذکرہ شیخ الہند۔ ص۔ ۲۹

۱۴۸۔ شیخ محمد اکرام۔ موج کوثر۔ ص۔ ۱۰

۱۴۹۔ سید ابوالحسن ندوی۔ حصہ اول سیرت سید احمد شہید۔ ص۔ ۲۰

کچھ سکھ عورتیں تھیں ہم نے انھیں اشارے سے پانی پلانے کیلئے کہا، انھوں نے ہمیں مسلمان جان کر بتایا کہ ہم مسلمان زادیاں ہیں اور یہ سکھ ہمیں پکڑ لائے ہیں، ان افغانوں نے سید صاحب کو یہ تکلیف دہ قصہ سنا کر کہا کہ آپ کچھ کریں کہ ان کو اس کفر سے نجات ملے۔ سید صاحب نے فرمایا کہ عنقریب سکھوں سے جہاد کروں گا۔ (۱۵۰)

یہ واقعہ سید صاحب کی آئندہ زندگی کی تمہید ثابت ہوا، جس نے آپ کو وعظ و ارشاد اور تبلیغ وسجادہ سب چھوڑ چھاڑ کر معرکہ قتال میں صف آرا کر دیا۔

اس وقت آپ حج کا ارادہ فرما چکے تھے، حج کے لئے مخلص مریدوں کی بڑی تعداد کے ساتھ روانہ ہوئے لیکن جہاد کا خیال دل میں گھر کر چکا تھا، ایک طرف آپ کے سامنے انگریزوں کی بڑھتی ہوئی قوت بھی تھی۔ سفر حج کے دوران بھی آپ کے پیش نظر یہ مقصد رہا کہ یورپین طاقتوں کے مقابلہ میں ایشیائی طاقتوں کو متحد کیا جائے، اس کے علاوہ سفر حج میں عام سماجی و معاشرتی اصلاح بھی پیش نظر رہی۔ (۱۵۱)

جذبۂ جہاد اتنا بڑھا کہ واعظانہ سرگرمیوں سے ہٹ کر آپ کی توجہ سرحد کی جنگ جو آبادی پر رہنے لگی۔ (۱۵۲) جوش جہاد کا یہ عالم تھا کہ سفر حج ۱۲۳۷ھ میں حدیبیہ (۱۵۳) اور عقبہ (۱۵۴) میں اپنے ساتھیوں سے بیعت جہاد لیکر بیعت جہاد کی سنت نبوی کی یاد تازہ کر دی۔

سید صاحب کے فیض صحبت سے ہزاروں مسلمانوں کی زندگیاں بدل گئیں تھیں۔ (۱۵۵) اللہ تعالیٰ نے آپکو قبول عام کی صفت سے نوازا تھا، مشاہیر وقت کا یہ حال تھا کہ آپ کی پالکی کے پیچھے ننگے پاؤں دوڑا کرتے تھے اور اس کو اپنے لئے سعادت و افتخار کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ (۱۵۶)

۱۵۰۔ شیخ اکرام ۔ موج کوثر ۔ ص ۔ ۱۵ ۔ ۱۶

۱۵۱۔ مولانا سید محمد میاں ۔ علماء ہند کا شاندار ماضی جلد دوم ۔ ص ۔ ۱۴۳ ۔ ۱۴۵

۱۵۲۔ ڈبلو ۔ ڈبلو ۔ ہنٹر ۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان ۔ ص ۔ ۹۵

۱۵۳۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی ۔ سیرت سید احمد شہید ۔ ص ۔ ۲۶۵

۱۵۴۔ 〃 〃 〃 ۔ ص ۔ ۲۶۹

۱۵۵۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی ۔ تاریخی مقالات ۔ ص ۔ ۲۳۴

سید صاحب کی عزت و احترام اور آپ سے خلوص و محبت کچھ مسلمانوں ہی کیساتھ مخصوص نہ تھی اہلِ ہند و عوام و خواص میں بھی آپ کو مرجعیت حاصل تھی۔ (۱۵۷)

سید صاحب کے نزدیک مسلمانوں کی تباہ حالی کے اسباب و عوامل میں جہاں ایک طرف اسلام کے صراطِ مستقیم سے گریز و انحراف تھا تو جذبۂ جہاد سے بے اعتنائی بھی ایک اہم عامل تھی۔ (۱۵۸)

خود آپ کے جذبۂ جہاد کا یہ حال تھا کہ ایک بار آپ نے کسی مرید سے فرمایا "جہاد کی نیت سے ہتھیاروں کو رکھو اور شکم سیر ہو کر کھاؤ انشاء اللہ کفار کے ساتھ جہاد کریں گے تم بھی مشق میں مشغول رہو اس سے بہتر کوئی فقیری اور درویشی نہیں"۔ (۱۵۹)

جب تصوف و سلوک کے مشاغل میں کمی آنے لگی اور ترغیب جہاد اور فنونِ حرب سے آپ کی دلچسپی و انہماک زیادہ ہوا تو آپ کے بعض رفقاء پر یہ بات گراں گذری، انھوں نے مولانا محمد یوسف صاحب پھلتی کو سید صاحب سے گفتگو کیلئے بھیجا، آپ نے ان کی بات سن کر یہ جواب دیا کہ "ان دنوں دوسرا کام اس سے زیادہ افضل ہم کو درپیش ہے، اور وہ جہاد فی سبیل اللہ کے لئے تیاری ہے"۔ (۱۶۰)

آپ نے مسلمانوں میں روحِ جہاد پر بہت زور دیا، اور اپنے حیرت انگیز ایثار و قربانی سے مسلمانوں میں نئی روح پھونک دی۔ (۱۶۱)

انیسویں صدی کے نصفِ اول میں آپ کی تحریک کی شاخیں تمام ملک میں پھیل گئی تھیں، جس سے عوام میں بیداری اور غیر ملکی تسلط کے خلاف نیا حوصلۂ رزم پیدا ہو گیا تھا۔ (۱۶۲)

۱۵۶۔ ڈبلو۔ ڈبلو ہنٹر۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان۔ ص۔ ۲۲

۱۵۷۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی۔ سیرت سید احمد شہید۔ ص۔ ۹۲

۱۵۸۔ مولانا غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید۔ ص۔ ۲۴۸

۱۵۹۔ ″ ابوالحسن علی ندوی۔ سیرت سید احمد شہید۔ ص۔ ۱۶۶

۱۶۰۔ ″ ″ ″ ″ ص۔ ۱۶۸

۱۶۱۔ خورشید احمد۔ ماہنامہ چراغ راہ نظریہ پاکستان نمبر۔ ص۔ ۱۶۱

۱۶۲۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد۔ ہندوستان کا مستقبل۔ ص۔ ۱۸۰

آپ نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کو چند سال بڑی مصیبت میں ڈال رکھا تھا۔ (۱۶۳) آپکے رفقائے کار مولانا عبدالحی اور شاہ اسماعیل شہید وغیرہ ہر طرح سے آپ کی مدد کرتے رہے (۱۶۴)

مسلم عوام تک کا یہ حال تھا کہ تنخواہ یا مزدوری کا ایک جزو استھانہ کیمپ (سید صاحب کے مرکز جہاد) پر پہونچا تے، اور جس طرح ہندو ملازم اپنے بزرگوں کے آشیرواد کیلئے چھٹی مانگتے تھے اسی طرح مسلمان ملازم یہ کہہ کر رخصت لیتے کہ ہمیں فریضۂ جہاد میں شرکت کے لئے جانا ہے۔ (۱۶۵)

مختلف ہندو راجاؤں سے آپ کی مراسلت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کا مقصد ملک سے انگریزی تسلط واقتدار کو ختم کرنا تھا جن سے ہندو مسلمان دونوں ہی پریشان تھے۔ (۱۶۶) اس طرح آپ یہ چاہتے تھے کہ ملک میں منظم و مستحکم حکومت قائم ہو جائے اور اسلامی قانون کے مطابق تمام رعایا پرامن زندگی گذار سکے مگر یہ تحریک "اپنوں" ہی کے ہاتھوں ناکام ہوگئی۔ (۱۶۷)

سید صاحب نے مجاہدین کی ایک کالونی آباد کی تھی، جس کا تذکرہ رولٹ کمیٹی کی رپورٹ میں ملتا ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ یہ کالونی "کٹر ہندوستانیوں" کی ہے، یہ بھی بتایا ہے کہ اس کالونی کی امداد بہت سے لوگ ایک مذہبی ادارے کی حیثیت سے کرتے تھے رپورٹ میں ہندوستان کو دارالحرب ماننے اور کالونی کے لوگوں کے مسلسل ترغیب جہاد وغیرہ کا بھی تذکرہ ہے۔ (۱۶۸)

سید صاحب نے دوسروں کو ترغیب جہاد دیکر تیار کیا اور خود بھی شریک جہاد ہوئے، بالآخر ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ مطابق ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو بالاکوٹ کی رزمگاہ میں جام شہادت نوش فرمایا۔ سکھ فوج کے مسلمان سپاہیوں نے نماز جنازہ ادا کی پھر فوجی اعزاز کے ساتھ آپ کو سپرد خاک کر دیا۔ (۱۶۹)

۱۶۳۔ مرتب عبداللہ بٹ۔ ڈاکٹر محمد باقر۔ شاہ اسماعیل شہید۔ ص۔ ۴۳

۱۶۴۔ 〃 〃 〃 ص۔ ۴۴

۱۶۵۔ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان۔ ص۔ ۴۴۔ ۴۵

۱۶۶۔ مولانا سید محمد میاں۔ علمار ہند کا شاندار ماضی جلد دوم۔ ص۔ ۲۱۷

۱۶۷۔ عبداللہ بٹ، مرتب۔ مضمون۔ پروفیسر سید احمد اکبر آبادی شاہ اسماعیل شہید۔ ص۔ ۱۴۹

وہابی تحریک ۔ کیا اور کیوں

سید احمد شہید کی قیادت ورہنمائی میں تحریک اسلامی جب اپنے عروج پر تھی تو انگریزوں کو اس سے خطرہ محسوس ہوا اور وہ اس کو بدنام کرنے کیلئے فکرمند ہوئے آخرکار انھوں نے عوام الناس کو تحریک سے متنفر کرنے کیلئے ایک فرضی بنیاد بنالی۔ اس طرح آپ کی تحریک کا انتساب محمد بن عبدالوہاب نجدی کی تحریک اصلاح سے کردیا گیا اور تحریک وہابی یا وہابیت کے نام سے مشہور کردیا گیا۔

محمد بن عبدالوہاب نجدی خود بڑے عالم اور مصلح تھے ۔ اٹھارہویں صدی میں عالم اسلام کی دینی حالت جب انتہائی نازک مرحلہ میں آگئی تو اس وقت آپ کی تحریک نے بہت کام کیا یہ ضرور ہے کہ آپ کی تحریک میں ایک حد تک تشدد اور بے اعتدالی تھی ۔ (۱۷۰)

اس طرح سید احمد شہید کی تحریک کو بدنام کرنے کے لئے انگریزوں نے آپ کی تحریک کو وہابیت کے نام سے مشہور کیا ۔ (۱۷۱) اور اس مذہبی اصلاحی تحریک "وہابیت" کے نام سے انھوں نے سیاسی مقاصد حاصل کئے ۔ (۱۷۲) اور عوام الناس کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ جس طرح محمد بن عبدالوہاب نے پر تشدد رویہ اختیار کر رکھا تھا وہی طرز عمل ان لوگوں کا بھی ہے ۔ (۱۷۳)

یہ عین ممکن ہے کہ جب ہم خالص علمی بنیادوں پر دونوں تحریکوں کا تجزیہ کرنا شروع کریں تو کچھ بنیادیں ہمیں ایسی مل جائیں جن کی بنا پر ہم یہ کہہ سکیں کہ سید احمد شہید کی تحریک کا تعلق محمد بن عبدالوہاب نجدی کی تحریک سے تھا لیکن اس تجزیہ میں ایسی باتیں بھی سامنے آئیں گی جن کے باعث یہ باور کرنا مشکل ہو جائیگا کہ سید احمد شہید کسی درجہ میں بھی نجد کی تحریک

۱۶۸۔ " " " روولٹ رپورٹ ۔ ص ۔ ۱۲۴ ۔ ۱۲۵

۱۶۹۔ مولانا سید محمد میاں ۔ علماء ہند کا شاندار ماضی جلد دوم ۔ ص ۔ ۲۵۵

۱۷۰۔ " ص ۔ ۲۵۹

۱۷۱۔ مولانا سید حسین احمد مدنی ۔ نقش حیات دوم ۔ ص ۔ ۲۵

۱۷۲۔ مولانا سید محمد میاں ۔ علماء ہند کا شاندار ماضی جلد دوم ۔ ص ۔ ۲۵۹

۱۷۳۔ " " " " ص ۔ ۲۵۹

اصلاح سے متاثر یا وابستہ تھے۔اس کے برعکس شاہ ولی اللہ کی تحریک سے وابستگی اور تعلق کے قرائن زیادہ ہیں۔

اگر کسی ایک مسئلہ، عدم وجوب تقلید شخصی یا کچھ اور مسائل میں نجدی تحریک سے مشابہت ومماثلت پائی جاتی ہے تو مختلف مسائل مثلاً توسل فی الدعاء وغیرہ میں دونوں کے نقطۂ نظر میں واضح فرق معلوم ہوتا ہے پھر عدم تقلید شخصی کا مسئلہ خود شاہ ولی اللہ کے یہاں بھی پایا جاتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ وہابیت کا انتساب محض سیاسی مقاصد کے لئے کیا گیا ورنہ حقیقت کے اعتبار سے یہ بات بالکل غلط ہے کہ سید احمد شہید کی تحریک کا تعلق نجدی تحریک سے ہو۔ (۱۷۴)

پھر احمد شہید نے سفر حج ۲۳-۱۸۲۲ء میں کیا ہے جبکہ نجدی تحریک ۱۸۱۸ء ہی میں دم توڑ چکی تھی اور سید صاحب کے سفر حج کے وقت تک عام لوگوں کے جذبات وخیالات مرحوم نجدی تحریک کے بارے میں اچھے نہ رہے تھے۔ (۱۷۵)

سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے انگریزوں نے سید صاحب کی تحریک جہاد کے ڈانڈے نجدی دعوت سے ملا دیئے۔ رولٹ کمیٹی کی رپورٹ میں بھی سید صاحب کی تحریک کو نجدی تحریک سے وابستہ دکھایا گیا ہے۔ (۱۷۶)

انگریزوں نے یہ پروپیگنڈا اگرچہ تمام ہندوستان میں کیا لیکن ملک کے ان حصوں میں ان کو اس میں ناکامی ہوئی جہاں کے باشندے صاف ذہن اور بیدار دماغ کے تھے۔ اس کے برعکس جن علاقوں میں جہالت۔ توہم پرستی اور پیر پرستی۔ قبر پرستی جیسے مذموم عناصر تھے، ان حصوں میں انگریزوں کے بیہودہ پروپیگنڈہ کا اثر ہوا اور لوگ سید صاحب کی تحریک سے غیر مطمئن ہوتے گئے۔

بعض جزوی مشابہتوں کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ سید صاحب کی تحریک جہاد اور نجد کی دعوت اصلاح میں باہم کوئی تعلق نہیں۔ مولانا مسعود عالم ندوی جنھوں نے نجد کی تحریک اصلاح کا کافی مطالعہ کیا ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں۔

"ہندوستان کی تحریک "تجدید وامارت" نجد سے اس طرح وابستہ کی گئی ہے کہ غیر تو غیر

۱۷۴۔ شیخ اکرام ۔ موج کوثر ۔ ص ۔ ۴۴ ۔ ۴۵

۱۷۵۔ مولانا محمد میاں ۔ علماء ہند کا شاندار ماضی دوم ۔ ص ۔ ۲۶۷

۱۷۶۔ ـ ـ ۔ رولٹ رپورٹ ص ۔ ۱۲۴ ۔ ۱۲۵

اپنے بھی دونوں کو ایک خیال کرتے لگے ہیں اصلی ماخذ "کتاب وسنت" کے ایک ہونے میں شبہ نہیں، لیکن طریق کار اور اصول دعوت میں نمایاں فرق ہے اور اصولی مماثلت کے باوجود اپنی جگہ پر ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ حضرت سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید کی تحریک تجدید وجہاد پر نجدی دعوت کا اثر بالکل نہیں پڑا"۔ (۱۷۷)

غرض یہ کہ یہ سیاست کی کرشمہ سازی تھی جس نے ایک طرف خود نجد کی دعوت اصلاح کو مطعون کرنے میں کسر نہ اٹھا رکھی اور دوسری طرف اس کے انتساب سے دوسری تحریکات اسلامی کو بھی بدنام کیا۔ (۱۷۸)

سید احمد شہیدؒ کے بعد تحریک

سید صاحب کے بعد تحریک کو گو ان جیسا کوئی باحوصلہ آدمی نہ مل سکا تاہم انھوں نے اپنی زندگی ہی میں تحریک کو اس منزل میں پہونچا دیا تھا کہ جہاں کسی کی موت وحیات اثرانداز نہیں ہوتی۔ اس لئے تحریک آپ کے بعد ختم نہیں ہوئی۔ (۱۷۹) بلکہ آپ کی کوششوں کے مظاہر آپ کی شہادت کے بعد بھی ایک عرصہ تک دیکھے جاتے رہے۔ (۱۸۰)

آپ نے کچھ ایسی روح جہاد پھونک دی تھی کہ ملک کے مختلف حصوں سے مجاہدین کے لشکر نکلتے رہے۔ (۱۸۱)

آپ ہی کی تحریک کے متعلقین تھے جنھوں نے ۱۸۵۷ء کے معرکہ میں انگریزوں سے مختلف مورچوں پر ٹکر لی۔ ان لوگوں نے سرحد کی طرف سے بھی ایک حملہ کی کوشش کی تھی۔ (۱۸۲)

مولانا عنایت علی اور مولانا ولایت علی یہ دونوں بھائی سید صاحب کی تحریک سے بہت

۱۷۷۔ مولانا مسعود عالم ندوی۔ محمد بن عبدالوہاب۔ ایک مظلوم اور بدنام مصلح۔ ص۔ ۱۵۲-۱۵۳

۱۷۸۔ " " " ۔ ص۔ ۱۳۵

۱۷۹۔ ڈبلو۔ ڈبلو۔ ہنٹر۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان۔ ص۔ ۳۴

۱۸۰۔ عبداللطیف۔ ترجمہ نظامی صاحب۔ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ۔ ص۔ ۱۴

۱۸۱۔ سرسید احمد خاں۔ آثارالصنادید۔ طبع اول۔ ص۔ ۱۰۳

۱۸۲۔ " " " ۔ رولٹ رپورٹ۔ ص۔ ۱۲۵

متاثر تھے، اس مقصد سے گھر بار چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے۔ مولانا عنایت علی نے "الٰہی پنچایتیں" قائم کیں، جو باہمی جھگڑوں کا فیصلہ کرتیں، تاکہ انگریزی عدالتوں میں نہ جانا پڑے۔ (۱۸۳)
۱۸۵۷ء کی جنگ میں آپ اپنے بھو کے پیا سے ساتھیوں کے ساتھ انگریزوں سے جنگ کرتے اور اپنے ساتھیوں کے اندر انگریزوں کے خلاف شدید نفرت کے جذبات پیدا کرتے رہے۔ (۱۸۴)

سید احمد شہید کے بعد مولانا عنایت علی نے تحریک کو کافی حد تک منظم کیا، اس سلسلہ میں پٹنہ ہی کے ایک اور بزرگ کا نام آتا ہے جو مولانا یحییٰ علی کے نام سے مشہور ہیں آپ نے بھی جنگ آزادی میں کافی خدمات انجام دیں۔ آخر میں انگریزی عدالت سے پھانسی، پھر بدل کر حبس دوام کی سزا دی گئی۔ (۱۸۵)

سید صاحب کے بعد تحریک کو مختلف علماء امت نے سنبھالا اور تقویت بخشی۔ ۱۸۵۷ء میں اور اس کے بعد بھی یہ علماء انگریزوں کے لئے مستقل خطرہ بنے رہے، ملک کے مختلف حصوں اور مختلف طبقوں کو برابر حصول آزادی کے لئے اکساتے رہے۔

اس سلسلہ میں جن لوگوں نے نمایاں خدمات انجام دیں، ان کی فہرست طویل ہے، اس سلسلہ میں خصوصیت کے ساتھ ان بزرگوں کے نام آتے ہیں۔ مولانا فضل حق خیر آبادی۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی۔ مولانا رشید احمد گنگوہی۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی۔ مولانا سید اسحاق صاحب۔ مفتی عنایت احمد کاکوروی۔ مولانا مظہر نانوتوی۔ مولانا منیر نانوتوی۔ سید محمد امین غازی صاحب وغیرہ۔ (۱۸۶)

سید احمد شہید نے راستہ دکھایا تھا، یہ سب کے سب اسی کے رہرو تھے اور انھوں نے ملک کے انتہائی نازک وقت میں بڑی خدمات انجام دیں۔ ان میں بیشتر نے بڑی مصیبتیں اٹھائیں۔

۱۸۳۔ خورشید مصطفیٰ رضوی۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء۔ ص۔ ۴۶۶

۱۸۴۔ مولانا غلام رسول مہر۔ سرگذشت مجاہدین۔ ص۔ ۲۲۵

۱۸۵۔ خورشید مصطفیٰ رضوی۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء۔ ص۔ ۴۶۵

۱۸۶۔ 〃 〃 〃 〃 ص۔ ۴۵۵۔ ۴۷۲

مولانا فضل حق خیر آبادی پر جب عدالت میں مقدمہ چلا اور اس کے امکانات قوی ہوتے جارہے تھے، کہ آپ رہا کر دیئے جائیں گے آپ نے عدالت میں یہ بیان دیا کہ "میں نے ہی جہاد کا فتویٰ دیا تھا، اور آج بھی میری رائے وہی ہے"۔ آخر آپ کو کالے پانی بھیج دیا گیا۔ (۱۸۷)

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی نے تھانہ بھون اور اطراف وجوانب کے مسلمانوں کے ساتھ شاملی کے میدان میں انگریزوں سے سخت مقابلہ کیا، اسی میں آپ کے ساتھ مولانا محمد قاسم نانوتوی۔ مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد مظہر نانوتوی۔ مولانا منیر نانوتوی اور قاضی عنایت علی تھانوی وغیرہ پیش پیش تھے۔ بعد میں ناکامی ہوئی تو حاجی صاحب مکہ معظمہ ہجرت کر گئے، لیکن وہاں سے بھی ہدایات برابر بھیجتے رہے۔ (۱۸۸)

تہذیبی اور فکری ارتداد اور اسکا مقابلہ

۱۸۵۷ء کی زبردست بغاوت کے دوسرے اسباب کے ساتھ ساتھ ایک اہم سبب یہ تھا کہ سیاسی آزادی چھننے کے علاوہ مسلمانوں اور ملک کے دوسرے باشندوں کو عیسائی بنانے کی منظم مہم چل رہی تھی۔ بیشمار پادری اس مقصد سے ہندوستان میں زندگی گذار رہے تھے۔ ان کی پشت پر انگریزی حکومت کا ہاتھ تھا، روپیہ اور طاقت دونوں کا استعمال جاری تھا۔

ایسے وقت میں جب کہ ذہنی وفکری ارتداد کا سارا سامان انگریزوں نے بہم کر رکھا تھا، کچھ مسلمان آگے بڑھے، اور انھوں نے عیسائی پادریوں کے سارے مکر وفریب کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیئے ـــ مولانا رحمت اللہ کیرانوی ان میں سب سے نمایاں ہیں، انھوں نے پادری فنڈر سے وہ عظیم الشان مناظرہ کیا کہ اس کو ہندوستان چھوڑ کر جانا پڑا۔ (۱۸۹)

۱۸۷۔ خورشید مصطفیٰ رضوی۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء۔ ص۔ ۴۵۸

۱۸۸۔ مولوی رحمٰن علی۔ ترجمہ محمد ایوب قادری تذکرہ علماء ہند۔ ص۔ ۱۲۳

۱۸۹۔ خورشید مصطفیٰ رضوی۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء۔ ص۔ ۴۶۰

مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے علاوہ ڈاکٹر وزیر خاں صاحب اور مولانا محمد قاسم نانوتوی صاحب۔ مولانا رحم علی صاحب منگلوری۔ مولانا عنایت رسول صاحب چریاکوٹی اور مولانا سید محمد علی صاحب مونگیری وغیرہ نے انگریزوں سے اس میدان میں سخت معرکہ آرائی کی اور ان کے سارے اعتراضات کی حقیقت واضح کردی۔ (۱۹۰)

ہندوستان
جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد

اس سے پہلے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی تک کے حالات کا سرسری جائزہ پیش کر چکے ہیں۔ وہیں ہم نے ان اسباب وعوامل کا بھی تجزیہ کیا ہے جن کی بنا پر ہندوستانی عوام انگریزوں کے مقابل آنے پر مجبور ہوئے تھے۔

ذیل میں ہم جنگ آزادی کے بعد پیش آنیوالی صورت حال کا تذکرہ کر رہے ہیں۔

حریت پسند قوتوں کو یکجا اور منظم نہ کرسکنا اور بعض "اپنوں" ہی کی غداری وغیرہ اسباب کی بنا پر ہندوستانیوں کو جنگ آزادی میں ناکامی ہوئی، باوجودیکہ انقلابیوں نے انتہائی جرأت مندی و تندہی سے انگریزوں سے جنگ کی اور اگر ضرورت پڑی تو دست بدست جنگ بھی کی۔ (۱۹۱)

علی گڈھ میں بھی ایسی ایک صورت پیدا ہوگئی، انتہائی جرأت کے ساتھ ساٹھ آدمیوں نے دست بدست جنگ شروع کردی اور مردانہ وار مقابلہ کیا۔ (۱۹۲)

انگریزوں کی سازش سے جب لوگوں نے پیچھے ہٹنا شروع کر دیا تو بھی انقلابیوں نے ہمت نہ ہاری۔ شہزادہ فیروز نے افسروں کو جمع کر کے کہا۔ "میں نے جان پر کھیلنے کا تہیہ کر رکھا ہے، تم میں جو شخص سرفروشی کا عہد کرے وہ میرے ساتھ رہے، ورنہ جہاں چاہے چلا جائے"۔ چنانچہ شہزادہ نے خود ہمت نہ ہاری اور انگریزوں کے مقابل

۱۹۰۔ علامہ سید سلیمان ندوی۔ حیات شبلی۔ ص۔ ۱۵

۱۹۱۔ ظہیر دہلوی۔ داستان غدر۔ ص۔ ۹۲

۱۹۲۔ ایس۔ بی۔ چودھری۔ ۱۸۵۷ء۔ ص۔ ۸۰

ڈٹا رہا۔ (۱۹۳)

انگریزوں کی سازش کامیاب ہوگئی، اور انقلابیوں کی امید بر نہ آئی کئی ماہ تک سخت مقابلوں کے باوجود آخر میں ناکامی اٹھانی پڑی۔

انقلابیوں کا یہ چڑھتا ہوا طوفان جب تھما تو انگریزوں نے اہل ملک سے جنگ آزادی کا انتقام لینا شروع کیا۔ شہر کے شہر تباہ کر دیے، کتنے ہی خاندانوں کا بالکل صفایا کر دیا بڑے بڑے محلوں میں کوئی چراغ جلانے والا نہ بچا، بھیڑ بکریوں کی طرح انسانوں کو ذبح کیا گیا، رحم والسانیت جیسے ان کے لئے نامانوس الفاظ تھے۔

ستمبر ۱۸۵۷ء میں جب دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا تو سخت تباہی پھیلی ہزاروں افراد شہر چھوڑ چھوڑ کر جس کے جدھر سینگ سمائے نکل گئے۔ (۱۹۴)

کاشت کاروں پر لگان اور ٹیکس کی وہ بھرمار کی گئی کہ اس سے ان کی حالت دن بدن خراب ہونے لگی، تجارت پر پہلے ہی سے قبضہ انگریزوں کا تھا اب اس پر ان کی گرفت اور مضبوط ہوگئی۔ (۱۹۵)

نام نہاد تہذیب و تمدن کے دعویدار انگریزوں نے جس درندگی کا مظاہرہ کیا وہ عالم عیسائیت ہی نہیں بلکہ انسانیت کے نام پر دھبہ ہے ایسی عجیب و غریب سزائیں دی جاتیں کہ سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بیگناہ ہندوستانی عوام کو انتہائی بے دردی کے ساتھ نذر آتش کر دیا جاتا اور سکھ (جنھوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا) اور انگریز کھڑے تماشہ دیکھ رہے ہوتے۔ (۱۹۶) مرد، عورت اور بچوں تک کو اندھا دھند پھانسیاں دی گئیں۔ (۱۹۷)

درندگی کی حد یہ کہ سایہ دار درختوں تک کو کاٹ ڈالتے، جو کٹ نہ سکتے ان کی ایک

۱۹۳۔ سید کمال الدین حیدر۔ قیصر التواریخ۔ ص۔ ۴۶۶

۱۹۴۔ مرتب۔ محمد طفیل۔ رسالہ "نقوش" لاہور جون ۱۹۵۷ء۔ ص۔ ۲۶۶

۱۹۵۔ مرتب۔ مولانا عبد الرحمٰن۔ تحریک ریشمی رومال۔ ص۔ ۱۶

۱۹۶۔ ایڈورڈ تھامپسن۔ ترجمہ حسام الدین ۱۸۵۷ء۔ تصویر کا دوسرا رخ۔ ص۔ ۱۴۱

۱۹۷۔ 〃 〃 〃 〃 ۔ ص۔ ۶۷

ایک فٹ گہری چھال نکال دی جاتی ۔ (۱۹۸)

جنرل نکلسن نے خواہش ظاہر کی کہ ـــــــ

"ہمیں ایک ایسا قانون پاس کرنا چاہئے جس کی رو سے ہم انگریز عورتوں اور بچوں کے قاتلوں کو زندہ جلا سکیں، یا ان کی کھال اتار لیں، یا گرم سلاخوں سے اذیت پہونچائیں پھانسی ایک معمولی سزا ہے ۔ (۱۹۹)

انگریز فوجیں جب دہلی میں داخل ہوئیں تو آیت پاک "... اذا دخلوا قریۃ افسدوہا" ۔ جب بادشاہ کسی ملک میں گھستے ہیں تو اس کو تباہ و برباد کر ڈالتے ہیں، اور اس کے معزز لوگوں کو ذلیل کرتے ہیں، کی تفسیر سامنے آگئی ۔

فوجوں کو تین دن تک دہلی لوٹنے کی عام اجازت دیدی گئی۔ انھوں نے انتہائی وحشت کے ساتھ اس اجازت کا فائدہ اٹھایا، کئی دن تک مجرم و بے گناہ کی تمیز کئے بغیر قتل و غارت گری کا بازار گرم رہا ۔ (۲۰۰)

بہادر شاہ ظفر کے سامنے دوران جنگ ایک مرتبہ ساٹھ انگریز عورتوں اور بچوں کو گرفتار کر کے پیش کیا گیا تو بادشاہ نے کہا کہ ہمارے مذہب میں عورتوں اور بچوں کا قتل سخت گناہ ہے، ان کو قلعہ کی جیل میں آرام سے رکھا جائے اور کھانے پینے کی اچھی طرح خبر گیری کی جائے ۔ (۲۰۱)

اسی بہادر شاہ کے نوجوان لڑکوں کو قتل کر دیا گیا، حالانکہ پہلے انھیں امان دیجا چکی تھی، اس درندگی سے قتل کیا کہ خود انگریزوں کو جھرجھری آگئی، اس کے ساتھ شاہی خاندان کے ۳۳ ۔ افراد کو قتل کیا گیا جس میں مریض ۔ بوڑھے اور اپاہج تک شامل ہیں ۔ (۲۰۲) لڑکوں کا سر کاٹ کر بہادر شاہ کے پاس بھیجا اور اس مجسمۂ شیطان ہڈسن نے یہ

۱۹۸۔ مولانا غلام رسول مہر ۔ سرگذشت مجاہدین ۔ ص ۔ ۳۱۳ ۔ ۳۱۴

۱۹۹۔ شورش کاشمیری ۔ سید عطاء اللہ بخاری ۔ ص ۔ ۱۲۷

۲۰۰۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی ۔ ہندوستانی مسلمان ۔ ص ۔ ۱۴۳ ۔

۲۰۱۔ خواجہ حسن نظامی ۔ غدر کا نتیجہ ۔ ص ۔ ۱۴

۲۰۲۔ منشی ذکاء اللہ ۔ عروج سلطنت انگلشیہ دوم ۔ ص ۔ ۸۰۷

کہاکہ "یہ آپ کی نذر ہے جو بند ہو گئی تھی اور جس کے جاری کرانے کے لئے آپ بغاوت میں شریک ہوئے"۔

منشی ذکاراللہ کو اگرچہ اس کی صحت سے انکار ہے لیکن خواجہ حسن نظامی نے بعض تائیدی دلائل کے ساتھ لکھا ہے کہ اسی شیطان ہڈسن نے شہزادوں کو قتل کر کے ان کا خون پیا اور یہ کہا کہ اگر میں ان کا خون نہ پیتا تو پاگل ہو جاتا۔ (۲۰۳)

اس کے علاوہ ملک کے مختلف مقامات پر سیکڑوں ناکردہ گناہ عورتیں مہتابی کی طرح جلائی گئیں، اور ہزاروں معصوم بچوں کو تہہ تیغ کیا گیا۔ (۲۰۴) ایک مقام پر چھ ہزار ہندوستانیوں کا قتل عام کیا تنہا الہ آباد کے علاقہ میں نیل نے اتنے ہندوستانیوں کو مروا ڈالا جتنے انگریز ہندوستان بھر میں انقلابیوں کے ہاتھ سے نہیں مرے۔ (۲۰۵)

ایک انگریز میلی سن کا بیان ہے کہ۔

"ہمارے فوجی افسر ہر قسم کے مجرموں کو مارتے پھرتے تھے اور کسی درد و تأسف کے بغیر انھیں پھانسیاں دے رہے تھے، گویا وہ کتے تھے یا گیدڑ یا نہایت ادنیٰ قسم کے کیڑے مکوڑے" ۔ (۲۰۶)

الہ آباد شہر میں پھانسی کے لئے درختوں کی شاخوں کو استعمال کیا گیا اور ان پر سیکڑوں ہندوستانیوں کے گلے میں رسی ڈال کر لٹکا دیا گیا، اس کے علاوہ ایک انوکھی سزا یہ بھی تھی کہ توپ کے منہ پر آدمی کو باندھ کر اڑا دیا جاتا۔ (۲۰۷)

مرادآباد میں نواب مجو خان کو گولی کا نشانہ بنایا گیا، اس کے بعد شہر میں ہاتھی کے پاؤں سے باندھ کر گھسیٹا گیا، پھر پکتے ہوئے چونے میں ان کی نعش ڈال دی گئی۔ (۲۰۸)

۲۰۳۔ خواجہ حسن نظامی۔ دہلی کی جان کنی طبع چہارم جولائی ۱۹۶۴ء۔ ص۔ ۶۱

۲۰۴۔ میجر جنرل ایف۔ آئی۔ گرام۔ سید احمد خان کی سوانح عمری۔ ص۔ ۲۱

۲۰۵۔ سید طفیل احمد منگلوری۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل۔ ص۔ ۹۲

۲۰۶۔ غلام رسول مہر۔ ۱۸۵۷ء۔ ص۔ ۱۷۷

۲۰۷۔ پنڈت سندر لال۔ سن ستاون۔ ص۔ ۱۲۰ - ۱۱۶

۲۰۸۔ محمود احمد عباسی۔ تاریخ امروہہ جلد اول۔ ص۔ ۸۷

دہلی پر قبضہ کے بعد لوٹ کر ویران کر دیا، وہ تباہی مچائی کہ الامان والحفیظ۔ ایک انگریز کمانڈر (Lord Roberts) نے دہلی کی بربادی کا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا ہے۔

"صبح کی ابتدائی روشنی میں دہلی سے کوچ کا وہ مرحلہ بڑا ہی دردناک تھا (لال قلعہ کے لاہوری دروازہ سے نکل کر ہم چاندنی چوک میں سے گذرے، دہلی حقیقتاً شہر خموشاں معلوم ہوتا تھا، ہمارے اپنے گھوڑوں کی سموں کی آواز کے سوا کوئی آواز کسی سمت سے نہیں آتی تھی، ایک بھی زندہ مخلوق ہماری نظر سے نہ گزری، ہر طرف نعشیں بکھری پڑی تھیں، ہم چپ چاپ چلے جا رہے تھے یا سمجھ لیجئے کہ بے ارادہ زیر لب باتیں کر رہے تھے، تاکہ انسانیت کے ان دردناک باقیات کی استراحت میں خلل نہ پڑنے پائے، جن مناظر سے ہماری آنکھیں دو چار ہوئیں وہ بڑے ہی رنج افزا تھے کہیں کوئی کتا کسی نعش کا برہنہ عضو بھنبھوڑ کر کھا رہا تھا، کہیں کوئی گدھ ہمارے قریب پہونچنے پر اپنی گھناونی غذا چھوڑ کر پھڑ پھڑاتے پروں سے ذرا دور چلا جاتا لیکن اس کا پیٹ اتنا بھر چکا ہوتا کہ اڑ نہ سکتا تھا، اکثر حالتوں میں مرے ہوئے زندہ معلوم ہوتے تھے، کسی کے ہاتھ اوپر اٹھے ہوئے تھے جیسے کوئی کسی کو اشارہ کر رہا ہو، در اصل یہ پورا منظر اس درجہ ہیبت ناک اور وحشت انگیز تھا کہ بیان میں نہیں آسکتا، معلوم ہوتا ہے ہماری طرح گھوڑوں پر بھی خوف طاری تھا اس لئے وہ بھی بدک رہے تھے اور نتھنے پھلا رہے تھے، پوری فضا ناقابل تصور حد تک بھیانک تھی جو بڑی مضر اور بیماری و بدبو سے لبریز تھی۔(۲۰۹)

یہ تصویر اس دلی کی ہے جسے کبھی "عروس البلاد" اور "عالم میں انتخاب" ہونے کا فخر حاصل تھا، جس کی بلند و بالا عمارتیں شاہان مغلیہ کے شکوہ و عظمت کا نشان تھیں، اسی دلی کا چپہ چپہ آج مغلیہ سلطنت کے شکوہ و تمکنت کا مرثیہ پڑھ رہا تھا کہ "جنت نگاہ" اور "فردوس گوش" دہلی کا سہاگ اجڑ چکا تھا اور سدا بہار دہلی کی بہار لٹ چکی تھی اور اب خزاں کا دور دورہ تھا۔

مہذب وحشیوں کا جنون شباب پر تھا، ابھی ان کی پیاس بجھی نہ تھی۔ "عروس البلاد" کا سہاگ اجاڑ کر بھی ان کے جنون کو تسکین نہ ہوئی تو۔

۲۰۹۔ مولانا غلام رسول مہر۔ ۱۸۵۷ء۔ ص۔ ۱۵۲

"باقی ماندہ لوگوں کو پھانسی دینا شروع کیا۔ عام شاہراہوں، گذرگاہوں پر پھانسی کے تختے لگا دیئے گئے، یہ جگہیں جہاں مظلوم ہندوستانی پھانسی کے تختہ پر لٹکے ہوتے انگریزوں کی بہترین تفریح گاہیں بنی ہوئی تھیں، وہ یہاں آکر پھانسی پانیوالوں کے سسکنے، دم توڑنے کا لطف لیتے"۔ (۲۱۰)

ایڈورڈ تھامپسن نے تحریر کیا ہے کہ۔

"دہلی میں خوں ریزی کے عادی سپاہیوں نے پھانسی دینے والے جلادوں کو رشوت دیکر آمادہ کیا کہ وہ پھانسی کے تختہ پر زیادہ دیر تک لٹکتے رہنے دیں تاکہ لاش کے تڑپنے کی دردناک کیفیت دیکھ کر جیسے وہ ناچ کہتے تھے، اپنی خونخوار طبائع کے لئے دلچسپی کا سامان کرسکیں۔ (۲۱۱)

غرض یہ کہ وحشت و بربریت کی کوئی نوع باقی نہ چھوڑی جسے ہندوستانیوں پر برت نہ ڈالا ہو، اس زمانہ کے بعض انگریزی اخبارات کے کچھ مضامین کا ترجمہ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے کیا ہے، جس سے انگریزوں کے کردار اور طرز فکر پر روشنی پڑتی ہے۔ لاہور کرانیکل کا ایک مقالہ افتتاحیہ ہے۔

"دہلی کو مسمار کر کے زمین سے ملا دینا نہایت ضروری ہے جب اس کے باشندے دور دراز کے صوبوں میں جائیں گے، لوگوں سے اپنے شہر کی بربادی کا ذکر کریں گے، وہ بتائیں گے کہ دہلی کی گلیاں اور بازار انگریز عورتوں اور بچوں کے خون سے ناپاک ہوئے تھے اس لئے اس کے عالیشان اور خوبصورت محل اب مٹی کے تودے بن کر رہ گئے ہیں.... جس گاؤں میں ہمارے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ انگریز باشندے کی ذراسی بھی توہین ہوئی ہے اسے جلا کر خاک کر دیا جائے اور اسمیں جتنے لوگ ہیں انھیں برباد کر دیا جائے"۔ (۲۱۲)

جنگ آزادی اور مسلمان

اس سے پہلے جہاں ہم نے جنگ آزادی کے اسباب و محرکات پر روشنی ڈالی

۲۱۰۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی۔ ہندوستانی مسلمان۔ ص۔ ۱۴۶

۲۱۱۔ ایڈورڈ تھامپسن۔ ترجمہ حسام الدین۔ انقلاب ۱۸۵۷ء۔ تصویر کا دوسرا رخ۔ ص۔ ۶۵

ہے، وہاں ہم یہ لکھ چکے ہیں کہ لوگ انگریزوں کو اپنے مذہبی امور کے لئے خطرہ سمجھنے لگے تھے۔ کیونکہ انگریزوں کی کوشش تھی کہ یہاں کے باشندوں کو عیسائی بنا ڈالیں۔ ہندو مسلمان دونوں کی اکثریت مذہبی جذبات و خیالات کی حامل تھی، پھر مسلمان تو صدیوں تک اپنے مذہبی احکام اور الٰہی شریعت کی روشنی میں حکمرانی کر چکے تھے، انھیں کتاب الٰہی کی موجودگی میں کسی اور قانون کی ضرورت کیوں پیش آتی، اور جبراً کسی کا مسلط کیا ہوا قانون وہ کیوں کر برداشت کرتے۔ (۲۱۳) چنانچہ مسلمان شروع سے انگریزوں کے سخت مخالف رہے، سنہ ۱۸۵۷ء میں بھی انھوں نے اپنے تناسب سے کہیں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

اسپیشل کمشنر مرادآباد نے امروہہ کے متعلق سنہ ۱۸۵۹ء میں یہ رپورٹ دی تھی کہ۔

"امروہہ کے سوا کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں اتنی زیادہ دشمنی اور انگریزی حکومت کی اتنی شدید مخالفت ہو"۔ (۲۱۴)

انگریز مسلمانوں سے کبھی مطمئن نہ رہے، اپنی آمد کے بعد ہی سے انھوں نے اپنے اقتدار و تسلط کی راہ کا روڑہ صرف مسلمانوں کو سمجھا۔ ان کا یہ احساس خوف بیوجہ نہیں بلکہ فطری تھا صلیبی جنگوں میں زبردست شکست کے بعد عالم عیسائیت کے لئے مسلمانوں سے بے اطمینانی بالکل قدرتی امر ہے، وحدت کلمہ کی بنا پر وہ سمجھتے تھے کہ اس قوم کے شریانوں میں وہی خون گردش کر رہا ہے جو انھیں زبردست شکست سے دوچار کر چکا ہے، اس احساس نے مسلمانوں سے خائف بھی رکھا لیکن ساتھ ہی ساتھ دلوں میں شدید بغض و عداوت کے جذبات موجزن تھے، جس کا اظہار برابر ہوتا رہا۔ (۲۱۵)

انگریزوں کے طرز عمل نے مسلمانوں کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ اپنی تعداد و تناسب سے زیادہ جنگ آزادی میں حصہ لیں۔ انصاف پسند ہندوؤں نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔ سابق جج ہائیکورٹ مسٹر شیو پرشاد سنہا نے لکھا ہے ۔

۲۱۲۔ ناصر کاظمی۔ انتظار حسین۔ سن ستاون میری نظر میں۔ ص۔ ۱۳۰۔ ۱۳۱

۲۱۳۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی۔ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر۔ طبع پنجم۔ ص۔ ۱۵۶

۲۱۴۔ محمود احمد عباسی۔ تاریخ امروہہ جلد اول۔ ص۔ ۸۰۔ ۸۳

۲۱۵۔ شاہ ولی اللہ دہلوی۔ ترجمہ عزیز ملک۔ سید المرسلین۔ شائع کردہ ادبستان لاہور سنہ ۱۹۵۶ء۔ ص۔ ۱۱

"اس میں شک نہیں کہ آزادی کی جد وجہد میں مسلمان اگلی صفوں میں تھے، اور انھوں نے سب سے زیادہ نقصان اٹھایا، حالانکہ اب رجحان ان مسلمان بہادروں کے کارناموں کو کم کر کے دکھانے کا ہے .... مگر تاریخ شہزادہ برجیس قدر۔ ان کی والدہ حضرت محل، مولوی احمد اللہ شاہ۔ بہادر خاں۔ مجو خاں اور دوسرے مسلمان بہادروں کے عظیم کردار کی گواہ ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ پورا اودھ۔ روہیلکھنڈ اور دہلی مسلمان شہیدوں کی قبروں سے معمور ہے"۔ (۲۱۶)

مسلمانوں کے کثیر تعداد میں حصہ لینے کا ایک اہم سبب یہ تھا کہ مذہبی احساسات رکھنے کی وجہ سے ان کی نظروں میں علماء کی بڑی قدر و منزلت تھی اور علماء شروع سے آزادئ وطن کی کوششوں میں پیش پیش رہے، بلکہ عام انقلاب سے پہلے ہی انھوں نے جنگ شروع کر رکھی تھی۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جنگ آزادی سیاسی بنیادوں اور سیاسی نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر بہت بعد کو شروع ہوئی، اور خالص مذہبی فریضہ اور ملی ضرورت سمجھ کر علماء نے اسے بہت پہلے سے شروع کر رکھا تھا۔

علماء نے اپنے وقار و منزلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قوم کو غیر ملکی اقتدار کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کے لئے آمادہ کیا۔ اس مقصد سے انھوں نے ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا، اس سلسلہ میں خصوصیت کے ساتھ شمس الھند مولانا شاہ عبدالعزیز۔ مولانا عبدالحئی صاحب وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے، ان کے بعد سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید نے تو خود ہی علم جہاد بلند کر دیا تھا، انھیں کے رفقاء تھے جنھوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ میں بہت زیادہ حصّہ لیا۔

اس طرح بہت سے مسلمان شاہ ولی اللہ کی تحریک سے متاثر تھے اور ہندوستان کو دارالحرب تصور کرتے تھے، ان کے خیال میں بیرونی حکمرانوں سے جہاد ایک قومی ضرورت ہی نہیں بلکہ مذہبی فریضہ تھا، خود حضرت سید احمد شہید اور ان کے رفقاء کار اسی تحریک کے "باقیات صالحات" میں سے تھے۔

مولانا سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید نے جہاد کیا، ان کی شہادت کے بعد

۲۱۶۔ مسٹر شیو پرشاد سنہا۔ ایڈیٹر۔ حفیظ نعمانی۔ ندائے ملت مسلم یونیورسٹی نمبر ۱۹۶۵ء۔ لکھنو۔

مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب اور شاہ محمد یعقوب صاحب نے ہجرت کی۔ جہاد کی ایک اور صورت "افضل الجہاد کلمۃ حق عند سلطان جابر" رہ گئی تھی اس کی تکمیل مولانا فضل حق خیرآبادی نے کر دی۔ (۲۱۷)

۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کی فکری و عملی قیادت میں عظیم اللہ خاں۔ جنرل بخت خاں۔ خان بہادر خاں۔ مولانا احمد اللہ۔ مولانا لیاقت علی۔ حضرت محل وغیرہ پیش پیش تھے۔ ان میں مولانا احمد اللہ شاہ فیض آبادی کی شخصیت بڑی ممتاز تھی۔ ہومز لکھتا ہیکہ

"مولوی احمد اللہ شاہ شمالی ہند میں انگریزوں کا سب سے بڑا دشمن تھا"۔ پنڈت سندر لال لکھتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ دنیا کی آزادی کے شہیدوں میں ۱۸۵۷ء کے مولوی احمد اللہ شاہ کا نام ہمیشہ کیلئے قابل احترام رہے گا"۔ (۲۱۸)

پوری جنگ آزادی میں مسلم علماء نے بہت اہم کردار ادا کیا اس لئے انگریز ایک طرف ان سے خائف بھی رہتے دوسری طرف درپردہ انھیں زک پہونچانے کے لئے کوشش کرتے رہتے۔ انگریزوں نے بڑی کوشش کی کہ علماء کی توجہ اپنی جانب سے ہٹا کر ان کو داخلی مسائل میں الجھا دیں۔ اس سلسلہ سے انھوں نے کثرت سے مذہبی اختلافات پیدا کرا دئے جو بیشتر بے بنیاد یا انتہائی سطحی بنیادوں والے تھے۔ علماء کے لئے روز افزوں داخلی انتشار سد راہ ضرور بنا لیکن اصل مرکز توجہ انگریز ہی رہے۔

پٹنہ۔ تھانیسر۔ لاہور وغیرہ کے متعدد علماء پر مقدمے چلائے گئے اور ان میں سے متعدد کیلئے پھانسی کا فیصلہ ہوا جو انگریزوں کے لئے انتہائی مسرت افزا تھا۔

۱۔ مولانا یحییٰ علی ۲۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری ۳۔ مولانا محمد شفیع لاہوری کی پھانسی کا فیصلہ سناتے ہوئے جج نے کہا تھا۔

"تم کو پھانسی دی جائے گی اور تمھاری کل جائداد بحق سرکار ضبط ہو گی اور تمھاری لاش بھی تمھارے وارثوں کو نہ دیجائیگی بلکہ نہایت ذلت کے ساتھ گورستان جیل میں گاڑ دی جائے گی میں تمکو پھانسی پر لٹکتا دیکھ کر بہت خوش ہوں گا"۔ (۲۱۹)

۲۱۷۔ مولانا فضل حق خیرآبادی۔ ترجمہ عبدالشاہد خاں شیروانی "باغی ہندوستان"۔ ص۔ ۱۴۰

۲۱۸۔ مولانا غلام رسول مہر۔ ۱۸۵۷ء۔ ص۔ ۲۰۸

انگریز پھانسی گھر اس لئے آئے کہ ان مظلوموں کی بے بسی اور لاچارگی کا لطف اٹھائیں، لیکن ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انھوں نے یہ دیکھا کہ وہ بڑے اطمینان اور صبر و تحمل کیساتھ ہنسی خوشی پھانسی کے منتظر ہیں، اور اسے راہ خدا میں شہادت تصور کرتے ہیں، یہ بات انگریزوں کو پسند نہ آئی، چنانچہ ڈپٹی کمشنر انبالہ نے چیف کورٹ کا حکم سنایا کہ ان کی سزائے موت حبس دوام بعبور دریائے شور میں تبدیل کر دی گئی اور یہ کہا کہ ـ

"تم لوگ پھانسی پڑنے کو بہت دوست رکھتے ہو اور شہادت سمجھتے ہو اس واسطے سرکار تمہاری دل چاہی سزا تم کو نہ دے گی"۔ (۲۲۰)

ــــ اس کے علاوہ ـ

"۱۸۶۵ء میں مولانا محمد یحییٰ علی، مولانا احمد اللہ عظیم آبادی، مولوی عبدالرحیم صادق پوری اور مولوی محمد جعفر تانیسری کو پورٹ انڈمان روانہ کر دیا گیا۔ مولانا یحییٰ علی اور مولانا احمد اللہ کا وہیں انتقال ہوگیا اور مولوی محمد جعفر تھانیسری صاحب ۱۸ سال قید بامشقت اور جلا وطنی کے بعد اپنے وطن واپس ہوئے۔ پٹنہ میں خاندان صادق پوری کی تمام جائدادیں ضبط کر لی گئیں، ان کی عمارتیں گرا دی گئیں اور ان پر ہل چلوا دیا گیا، اور اس زمین پر نئی سرکاری عمارتیں قائم کی گئیں، ان کے مقبروں کو تباہ و برباد کر دیا گیا۔

اس طرح ممتاز اور جلیل القدر علمار کی خاصی تعداد کو انڈمان میں جلا وطنی کی سزا دی گئی، جن میں مولانا فضل حق خیر آبادی۔ مفتی عنایت احمد کاکوروی۔ مفتی مظہر کریم دریا بادی کے نام قابل ذکر ہیں"۔ (۲۲۱)

علمار کی کوششوں سے عوام میں کافی جوش و جذبہ اور روح جہاد پیدا ہوگئی تھی، ایک مسلمان بڑھیا کے دو لڑکوں رحیم و کریم کو پھانسی کے لئے لیجایا جانے لگا تو اس نے کہا۔

"تم شہید کئے جا رہے ہو، میں تمھیں خوشی سے خدا کے سپرد کر رہی

۲۱۹۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری۔ کالا پانی۔ ص۔ ۹۸

۲۲۰۔ 〃 〃 ص۔ ۱۰۷

۲۲۱۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی۔ ہندوستانی مسلمان۔ ص۔ ۱۵۱

ہوں گے ۔ (۲۲۲)

انگریزوں کی مسلم دشمنی اور اس کے اسباب

انگریزوں نے تحریک آزادی کے ناکام ہونے کے بعد ہندوستانیوں سے بری طرح انتقام لینا شروع کیا۔ تحریک میں شریک اگرچہ ہندو مسلمان سب تھے بلکہ فوج میں اکثریت ہندؤں ہی کی تھی تاہم نظر عتاب کے مستحق بیشتر مسلمان ہی ہوئے۔ (۲۲۳)
ہندؤں کے متعلق ان کا خیال تھا کہ وہ "امن پسند" ہیں اس کے برعکس مسلمانوں کو وہ جنگ کا تمام تر ذمہ دار سمجھتے تھے ایک انگریز لکھتا ہے۔
"مسلمان ہمارے دیوانہ وار دشمن ہیں اس لئے ہماری صحیح پالیسی یہ ہے کہ ہندؤں کے ساتھ مہربانی کی جائے" ۔ یہی شخص لکھتا ہے کہ "ہندو ہماری فتح (کابل و غزنی) پر اظہار مسرت کر رہے ہیں جب ہمیں ان مسلمانوں کی دشمنی کا یقین کامل ہے جن کی تعداد ۱/۱۰ ہے تو پھر کیوں نہ ہم اس قوم کا ساتھ دیں جس کی تعداد ۹/۱۰ ہے جو ہماری وفادار رہے" ۔ (۲۲۴)

انگریزوں کے دل و دماغ پر یہ بات اچھی طرح جم گئی تھی کہ اس جنگ کے اصل محرک اور بانی مسلمان ہیں اس لئے انگریزوں کے انتقام کا نشانہ براہ راست مسلمان تھے۔ انھوں نے ہزارہا مسلمانوں کو تہہ تیغ کیا۔ ستائیس ہزار مسلمانوں کو پھانسی دی گئی۔ اس کے بعد جو بچ رہے ان کے مکانات اور جائدادیں بحق سرکار ضبط کیجانے لگیں ۔ اور تمام سرکاری ملازمتوں سے مسلمانوں کو بیدخل کیا جانے لگا ۔ (۲۲۵)
منشی ذکاء اللہ کا بیان ہے کہ ایک انگریز کا شیوہ ہو گیا تھا کہ ہر مسلمان کو باغی سمجھتا تھا۔ ہر شخص سے پوچھتا ہندو ہے یا مسلمان؟ ۔ جواب میں مسلمان سنتے ہی

۲۲۲۔ عزیز الرحمٰن جامعی ۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور ہندوستان کی جنگ آزادی۔ ص ۔ ۷۰

۲۲۳۔ محمد امین زبیری ۔ سیاست ملیہ ۔ ص ۔ ۵

۲۲۴۔ محمد امین زبیری ۔ مسلمانان ہند کی سیاست وطنی ۔ ص ۔ ۱۶

۲۲۵۔ سید کمال الدین حیدر ۔ قیصر التواریخ جلد دوم ۔ ص ۔ ۴۵۴

گولی مار دیتا۔ (۲۲۶)

ایک انگریز مصنف (Henry Mead) کہتا ہے۔

"اس سرکشی کو موجودہ مرحلے میں سپاہیوں کی بغاوت کا نام نہیں دیا جا سکتا، یقیناً اس کا آغاز سپاہیوں سے ہوا لیکن بہت جلد اس کی حقیقت کھل گئی کہ یہ اسلامی بغاوت تھی"۔ (۲۲۷)

مختصر یہ کہ ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کی قیمت مسلمانوں نے ادا کی، جان مال و عزت آبرو سب کچھ انگریزوں کی درندگی کی نذر ہو گیا۔ (۲۲۸)

اور اس کے بعد بھی انگریزوں کی آتش انتقام سرد نہ ہوئی تو انھوں نے معاشی طور پر کمزور کرنا شروع کر دیا۔ گورنمنٹ گزٹ میں اعلان کیا گیا کہ جو ملازمتیں خالی ہوں ان پر سوائے ہندوؤں کے کسی کا تقرر نہ کیا جائے۔ مسلمان اگر سرکاری ملازمت پانے کی قابلیت بھی رکھتے تو انھیں خاص سرکاری احکام کے ذریعہ ملازمت نہ دی جاتی۔ (۲۲۹)

مسلمانوں کے ساتھ انھوں نے انتہائی بیدردی کا معاملہ کیا۔ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ختم ہونے کے بعد گورنر کے سامنے کچھ عورتوں کو پیش کیا گیا تو ستم کی ماری غریب عورتیں بے پردگی کی تاب بھلا کیونکر لاتیں، راہ چلا نہ جاتا کبھی خود گرتیں کبھی بچے گود سے گر گر پڑتے مگر سپاہی ان کو آگے بڑھنے کے لئے سختی سے دھکے دیتے۔ کتنی ہی عورتوں نے اپنی عزت و آبرو کی خاطر کنویں میں کود کر جانیں دیدیں۔

خواجہ حسن نظامی نے ایک انگریز کا بیان نقل کیا ہے کہ۔

"ہم نے سیکڑوں عورتوں کو کنوؤں سے زندہ نکالا جو لاشوں کی کثرت ہونے کے باعث ڈوب نہ سکی تھیں۔ ہم نے جب انھیں نکالنا چاہا تو وہ چیخ پڑیں۔ خدارا ہمیں ہاتھ نہ لگاؤ، ہم شریف بہو بیٹیاں ہیں ہمیں گولی مار دو مگر ہماری آبرو نہ خراب کرو۔ پھر جب ہم ان کو

۲۲۶۔ منشی ذکاء اللہ۔ عروج سلطنت انگلشیہ دوم۔ ص۔ ۱۲۷

۲۲۷۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی۔ ہندوستانی مسلمان۔ ص۔ ۱۴۵

۲۲۸۔ مفتی عزیزالرحمن بجنوری۔ تذکرہ شیخ الہند۔ ص۔ ۱۸۲

۲۲۹۔ سید طفیل احمد منگلوری۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل۔ ص۔ ۱۵۹

نکال لیتے تو وہ خوف سے تھر تھر کانپ رہی ہوتیں بعض بیہوش ہو ہو کر گر پڑتیں"۔(۲۳۰)

بدبخت انگریزوں نے جامع مسجد کی حالت خراب کر دی تھی اِس بری طرح ناپاک کیا تھا کہ عبادت کے لائق نہ رہی تھی۔ وہاں سکھ فوج کے لئے رہائش کا نظم کیا گیا تھا۔ مسجد کے اندر انگریزوں کے کتے پھرتے۔ مینارے کے قریب سور ذبح ہو کر پکتے تھے۔(۲۳۱)

ایک انگریز مصنف ہنری ہملٹن تامس کی کتاب جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ایک سال بعد لکھی گئی ہے، اس سے انگریزوں کی مسلم دشمنی اور ہندو نوازی کے اسباب و عوامل پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ یہ مصنف لکھتا ہے کہ ۔

" غدر کے بانی اور اصل محرک ہندو نہ تھے۔ یہ غدر مسلمانوں کی سازش کا نتیجہ تھا، ہندو اگر وہ اپنی رعنی اور ذرائع تک محدود رہیں، تو وہ کسی ایسی سازش میں شرکت نہ کر سکتے تھے۔ نہ کرنا چاہتے تھے،..... مسلمان کسی ایسی گورنمنٹ کے جس کا مذہب دوسرا ہو، اچھی رعایا نہیں ہو سکتے کیونکہ احکام قرآنی کی موجودگی میں یہ ممکن نہیں"۔(۲۳۲)

مسلمانوں کے متعلق ایسی باتوں کے لئے بطور ثبوت بعض انگریزی اخبارات نے اسلامی جہاد کی روایتیں بھی پیش کیں۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے جن انگریزی اخباری مضامین کا ترجمہ کیا ہے اس میں ہے کہ ۔

"مسلمانوں کی فطرت میں باغیانہ جذبہ ان کے توحیدی اور خراب مذہب کے اصولوں نے پیدا کر رکھا ہے جب تک ہماری حکومت مسلمانوں کا مذہب برداشت کرے گی، اس وقت تک دشمنی کا یہ جذبہ نہ صرف قائم رہے گا بلکہ روز بروز بڑھے گا"۔(۲۳۳)

انگریزوں کے اس طرز فکر کے اظہار کے بعد قدرتی بات تھی کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ بدسلوکی کرتے، انھوں نے ایسا ہی کیا، طویل قتل و خونریزی کے بعد نوع ستم بدلی تو اقتصادی بدحالی اور معاشرتی پستی میں مبتلا کرنا شروع کر دیا، انھوں نے

۲۳۰۔ خواجہ حسن نظامی۔ دہلی کی جان کنی۔ ص۔ ۷۰

۲۳۱۔ " ص۔ ۹۳

۲۳۲۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی۔ ہندوستانی مسلمان۔ ص۔ ۱۴۷

۲۳۳۔ ناصر کاظمی۔ انتظار حسین۔ سن ستاون میری نظر میں۔ ص۔ ۱۳۲

مسلمانوں کو نہ صرف اہم سرکاری مناصب سے دور رکھا بلکہ ان کے اپنے اوقاف اور جائدادوں کو بھی ضبط کر لیا، ایسے مدارس کھولے گئے جن میں پڑھ کر مسلمان بچے دین و مذہب سے بے بہرہ ہو کر نکلتے۔

انگریزوں کا روز اول ہی سے یہ شیوہ تھا کہ وہ مسلمانوں کی مذہبی بنیادوں کو کمزور کرنے کے در پے رہے، اس مقصد سے انھوں نے اسلام پر سخت حملے کئے اور اس کے مختلف قوانین کو وحشیانہ، غیر مہذب، اور عہد جدید کے لئے از کار رفتہ قرار دیا، اور موقع بہ موقع مسلمانوں کو شکوک و شبہات میں مبتلا کرنے کے لئے کوشاں رہتے۔ انگریز مصنف ہنٹر نے اس فرنگی روش کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"ہم نے مسلمانوں سے مذہبی فرائض کو پورا کرنے کے ذرائع چھین لئے اور اس طرح روحانی اعتبار سے ان کے ایمان کو خطرہ میں ڈال دیا"۔ (۲۳۴)

عبدالسلام خورشید کے ترجمہ کئے ہوئے اخباری مضامین کا ایک ایڈیٹوریل اس طرح ہے۔

"ان مسلمانوں کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا ضروری ہے جو اگرچہ حکومت کے ملازم نہیں ہیں، لیکن انھوں نے سرکشی اور ناشکرے پن کا اظہار کیا، بالواسطہ نوعیت کی سزا دیکر مالی منفعت حاصل کرنی چاہئے، مثلاً ان پر پہلے سے کہیں زیادہ ٹیکس لگائے جائیں، ملک بھر کی تمام مساجد سے خاص رقوم بطور خراج وصول کیجائیں، متمول اوقاف سے زیادہ رقم اور کم آمدنی کے اوقاف سے کم رقم، ہر سال لیجائے"۔ (۲۳۵)

انگریز مجرم انگریز عدالت میں

انگریزوں کے ظلم و جور کی داستان ہم لکھ چکے ہیں، ذیل میں ہم انگریزوں کے ظلم کی مذمت یا کم از کم اعتراف انگریزوں کی زبان سے نقل کرنا چاہتے ہیں۔ جان لارنس نے ایک انگریز کمانڈر کو دسمبر ۱۸۵۷ء میں لکھا تھا۔

۲۳۴۔ ڈبلو۔ ڈبلو۔ ہنٹر۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان۔ ص۔ ۲۱۷

۲۳۵۔ ناصر کاظمی۔ انتظار حسین۔ سن ستاون میری نظر میں۔ ص۔ ۱۲۴

"مجھے یقین ہے کہ ہم نے جس طریقہ پر بلا امتیاز تمام طبقوں کو لوٹا ہے اس کے لئے ہم پر ہمیشہ لعنت بھیجی جائے گی اور یہ فعل حق بجانب ہوگا"۔ (۲۳۶)

مشہور انگریزی مصنف ہنٹر اپنی کتاب میں اعتراف کرتا ہے کہ

"ہم نے ملک کی مسلمان رعایا کے حقوق پورے نہیں کئے، اور ہندوستانیوں کی آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ جس کی تعداد تین کروڑ کے لگ بھگ ہے، اپنے آپ کو میری قومی حکومت کے ماتحت تباہ و برباد ہوتا دیکھ رہا ہے"۔ (۲۳۷)

انگلستان کے مشہور مقرر ایڈمنڈ برک نے ہسٹنگز کے ظلم و ستم کی سخت ترین مذمت کرتے ہوئے چار دن تک ایوان عام میں تقریر کی اور ہسٹنگز کیخلاف بائیس سنگین الزامات لگائے، چنانچہ انگریز مورخ "مارش مین" لکھتا ہے کہ ۔

"انھوں نے ہسٹنگز کو سارق ۔ ظالم ۔ غارت گر ۔ فریبی ۔ جعل ساز ۔ ٹھگ ۔ بے ایمانوں کا سردار اور دوزخ کا بچھو کے القاب سے یاد کیا اور پھر بھی انھیں یہ افسوس رہا کہ اس کے جرائم کی پوری تشریح کرنے والی صحیح اصطلاحات انگریزی زبان میں نہیں ملتیں" ۔ (۲۳۸)

ڈلہوزی کا تذکرہ کرتے ہوئے مارش مین نے اسے "کمینہ" اور "بدترین حاکم" لکھا ہے ۔ (۲۳۹)

ایک دوسرے انگریز نے نوع بہ نوع مظالم کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ۔ "مسلمانوں کو سور کی کھال میں سینا یا پھانسی سے پہلے ان کے جسم پر سور کی چربی ملنا یا زندہ جلا دینا وغیرہ عیسائیت کے نام پر بدنما دھبہ ہے جس کا کفارہ یقیناً ہمیں ایک نہ ایک دن ادا کرنا پڑے گا"۔ (۲۴۰)

۲۳۶۔ غلام رسول مہر ۔ ۱۸۵۷ء ۔ ص ۔ ۱۵

۲۳۷۔ ڈبلو۔ ڈبلو۔ ہنٹر ۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان ۔ ص ۔ ۲۱۲

۲۳۸۔ مارش مین ۔ تاریخ ہند ۔ ص ۔ ۲۱۰

۲۳۹۔ 〃 〃 ۔ ص ۔ ۴۷۶

۲۴۰۔ سید رئیس احمد جعفری ندوی ۔ بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد ۔ ص ۔ ۹۴۵

وزیر اعظم انگلستان نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ـــ

" دوسری قوموں کے جذبات کا احترام کرنا ہماری حکومت کا بنیادی اصول رہا ہے، جس کو حکومت ہند نے خیرباد کہہ دیا ہے، اور یہ اسی حکمت عملی کا نتیجہ ہے کہ ملک کی تقریباً تمام جماعتیں اپنے آپ کو خطرہ میں محسوس کر رہی ہیں "۔ (۲۴۱)

ایڈورڈ تھامپس تحریر کرتا ہے ـــ

" آج بھی پارلیمنٹ کے محفوظ ریکارڈ میں گورنمنٹ ہند کی یادداشتیں محفوظ ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ باغیوں کے علاوہ عام آبادی میں عورتوں، مردوں، بچوں اور بوڑھوں تک کو پھانسی کے تختہ پر لٹکایا گیا "۔ (۲۴۲)

تھامپس نے ایک اور جگہ لکھا ہے کہ ـــ

" بدرجہا سنگین مظالم کے واقعات موجود ہیں، جو ابھی تک پردہ خفا میں ہیں، اور ہم ان کو حق بجانب قرار دینے کے لئے اپنے پاس ایک لفظ بھی نہیں پاتے "۔ (۲۴۳)

لارڈ الفنسٹن نے لارنس کو لکھا تھا ـــ

" محاصرہ ختم ہونے کے بعد ہماری فوج نے جو ظلم کئے ہیں انھیں سن کر دل پھٹنے لگتا ہے، دوست دشمن کی تمیز کے بغیر سب سے یکساں بدلہ لیا گیا لوٹ میں تو ہم نادر شاہ سے بھی بڑھ گئے "۔ (۲۴۴)

ایک اور انگریز مسٹر لیکی لکھتا ہے ـ

" اگر دنیا میں کوئی بغاوت حق بجانب کہی جاسکتی ہے تو وہ ہندوستانیوں کی بغاوت ہے "۔ (۲۴۵)

---

۲۴۱ ـ اسرار احمد آزاد ـ مکمل تاریخ آزاد ہند ـ ص ـ ۱۶۔

۲۴۲ ـ ایڈورڈ تھامپس ـ ترجمہ حسام الدین ـ انقلاب ۱۸۵۷ء ـ تصویر کا دوسرا رخ ـ ص ـ ۶۳

۲۴۳ ـ " " " ـ ص ـ ۶۹

۲۴۴ ـ منشی ذکاء اللہ ـ تاریخ ہند ـ ص ـ ۶۴۶

۲۴۵ ـ ہیی ـ حکومت خود اختیاری ـ ص ـ ۳۲

باشندگان ہند کی بیزاری اور اس کے کچھ مظاہر

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد ہندوستانی عوام بالخصوص مسلمانوں کی تباہی کے جو کچھ سامان انگریز کر سکتے تھے اس میں انھوں نے ذرا کوتاہی نہ کی۔ انقلابیوں نے جو عمارت تعمیر کرنی چاہی تھی اگرچہ وہ اپنی تکمیل سے پہلے ہی ڈھیر ہوگئی لیکن بنیادیں بہرحال پڑ چکی تھیں بعد میں اگرچہ انگریزوں نے اس عمارت کا نام ونشان بھی مٹا دینا چاہا لیکن بنیادیں اتنی قوی تھیں کہ متزلزل نہ کی جا سکیں بلکہ وقت کی رفتار کے ساتھ ان میں اور پختگی آتی گئی۔

ہندوستانی عوام میں جذبۂ حریت جاگ اٹھا اور ایسا شعلہ بھڑک اٹھا جسے سرد کر ڈالنا انگریزوں کے بس میں نہ تھا جلد ہی اس کی چنگاریاں پھر انگریزوں کے خرمن امن کو خاکستر کرنے لگیں سیاسی شعور بیدار ہونے لگا۔ (۲۴۶)

یہ احساس وشعور بڑا مبارک ثابت ہوا اور وقتاً فوقتاً اس کے مختلف مظاہرے، جلسے، جلوس، اور متعدد تحریکوں اور انجمنوں کے قیام کی شکل میں سامنے آتے رہے۔ بڑھتا ہوا عوامی اضطراب دیکھ کر ملکۂ وکٹوریہ تک کو مجبور ہونا پڑا کہ وہ اہل ملک کو اطمینان دلائیں۔ چنانچہ زمینوں کے استحصال کا خاتمہ۔ ملازمتوں میں انصاف، سزاؤں کی معافی وغیرہ امور کا اعلان ۱۸۵۸ء میں ملکہ وکٹوریہ کی جانب سے ہوا یہ اعلان ملکہ وکٹوریہ کے علاوہ برطانوی دارالعوام، دارالخواص، اور متعدد مذہبی شخصیات کے ایما سے ہوا تھا۔ (۲۴۷)

ماضی کے تلخ تجربات نے ہندوستانی عوام کی نگاہوں میں انگریزوں کو بالکل بے اعتماد کر دیا تھا مذکورہ بالا اعلان میں ایسے عناصر شریک تھے جن کی وجہ سے قدرے اطمینان پیدا ہوا تاہم یہ فضا دیر تک باقی نہ رہ سکی عوامی اضطراب بدستور باقی رہا اور اندر اندر جو مواد تیار ہو رہا تھا وہ بالآخر انڈین نیشنل کانگریس کی تنظیم کی شکل میں کھلکر سامنے آگیا۔

اس کے پہلے اجلاس منعقدہ بمبئی میں بلا تفریق مذہب وملت ہر ہندوستانی کو ممبر بنانیکا اعلان کیا گیا اور شکایات ومطالبات کو ریزولیوشن کی شکل میں ہندوستانی عوام کی طرف

۲۴۶۔ محمد سرور۔ مولانا مودودی کی تحریک اسلامی۔ ص۔ ۲۲

۲۴۷ مولانا حسین احمد مدنی۔ نقش حیات دوم۔ ص۔ ۶۵

سے پیش کیا گیا، پہلے ہی اجلاس میں غیر مسلموں کے علاوہ بمبئی کے مشہور تاجر رحمت اللہ سیانی اور دوسرے سربرآوردہ مسلمان شریک ہوئے ۔ (۲۴۸)

حصول آزادی کی انفرادی اور محدود اجتماعی کوششیں پہلے بھی جاری تھیں۔ اس فضا میں منظم طور پر کانگریس کے قیام سے قدرے تقویت پیدا ہوئی اور منتشر قوتیں جو آزادی کے لئے برسر پیکار تھیں کانگریس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہونے لگیں کیونکہ کانگریس بڑی حد تک مشترکہ پلیٹ فارم کی حیثیت سے سامنے آئی تھی ۔

کانگریس نے ہندوستان کو برطانوی حکومت کے پنجۂ استبداد سے چھڑانے کے لئے عدم تشدد کا جو راستہ اختیار کیا تھا ایک طرف اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ملک کے ہر گوشہ اور ہر طبقہ میں سیاسی زندگی پیدا ہوگئی اور بلا لحاظ مذہب و ملت ہر ہندوستانی اپنے وطن کو آزاد کرانے اور آزاد دیکھنے کا خواہش مند نظر آنے لگا ۔ (۲۴۹)

کانگریس کی روز افزوں مقبولیت کو انگریز بجا طور پر اپنے اقتدار کے لئے خطرہ سمجھ رہے تھے، چنانچہ انھوں نے مسلمانوں کو کانگریس سے بدظن کر کے علیحدہ کر دینے کی بھرپور کوشش کی، اس سلسلہ میں بعض صاحب فکر مسلمان مثلاً سر سید وغیرہ سے انھیں اپنے مقصد برآری کے لئے بالواسطہ طور پر مدد ملی کیونکہ وہ خود ہی کانگریس کے مخالف تھے ۔ انھوں نے مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ وہ پرجوش ہندوؤں اور انتہا پسند بنگالیوں کے زیر اثر نہ آئیں، ان کے خیال میں خارزار سیاست سے الجھنے میں مسلمانوں کے لئے مزید مشکلات پیدا ہونیکا امکان تھا ۔ (۲۵۰)

اس موقع پر انگریزوں نے ایسے موقع پرستوں سے بھی فائدہ اٹھایا جن کا "مشغلہ حیات" ہی "قوم فروشی" ہوتا ہے ۔ ان کے ذریعہ انگریزوں نے حسب مقصد فتوے شائع کرائے جس میں کانگریس میں شرکت مسلمانوں کے لئے حرام قرار دی گئی ۔ (۲۵۱)

۲۴۸۔ مولانا سید حسین احمد مدنی ۔ نقش حیات دوم ۔ ص ۔ ۶۹

۲۴۹۔ اسرار احمد آزاد ۔ مکمل تاریخ آزاد ہند فوج ص ۔ ۴۸

۲۵۰۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی ۔ ہندوستانی مسلمان ۔ ص ۔ ۱۵۲-۱۵۳

۲۵۱۔ مولانا حسین احمد مدنی ۔ نقش حیات دوم ۔ ص ۔ ۷۱

مذہبی بنیادوں پر مسلمانوں کو تحریک آزادی سے برگشتہ کرنے کی کوشش دیکھ کر وہ علمار اٹھ کھڑے ہوئے جن کا عوام میں اثر تھا اور وہ بجا طور پر اپنے علم وعمل سے اس قدر ومنزلت کے مستحق تھے، انھوں نے مسلمانوں کو بتایا کہ سیاست ان کے لئے "شجرہ ممنوعہ" نہیں اور کانگریس میں شریک ہونیکا مشورہ دیا۔ کانگریس کی تائید میں ملک کے مختلف گوشوں سے وقتاً فوقتاً فتاوی شائع ہوتے رہے۔

مولانا محمد صاحب لدھیانوی نے ۱۸۸۸ء میں "نصرۃ الابرار" کے نام سے فتاوی کا ایک مجموعہ شائع کیا جس میں کانگریس کی حمایت اور اس میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی، اس پر مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا لطف اللہ علی گڈھی وغیرہ ہندوستانی علمار کے علاوہ مدینہ منورہ اور بغداد کے علمار نے بھی دستخط کئے تھے۔ (۲۵۲)

اس کے علاوہ سرسید اور بعض دوسرے مسلم مفکرین جو دانستہ یا غیر دانستہ طور پر انگریزوں کے لئے کارآمد ثابت ہو رہے تھے، علمار نے ان کی پرزور مخالفت کی، اس میں بھی مولانا رشید احمد گنگوہی پیش پیش تھے۔ ان کے علاوہ مولانا محمود حسن صاحب اور دیگر مدرسین دارالعلوم دیوبند اور بہت سے دوسرے علمار نے کانگریس کی حمایت اور انڈین پیٹریاٹک الیسوسی ایشن کی مخالفت میں فتوے لکھے۔ (۲۵۳)

سرسید بذات خود کانگریس بلکہ سیاست میں شرکت کے خلاف تھے، اور یہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کی توانائیاں سیاست میں الجھ کر ضائع ہوں گی۔ ان کی کوششوں سے دسمبر ۱۸۸۶ء میں علی گڈھ میں "محمڈن ایجوکیشنل کانگریس" قائم ہوئی جس کا نام بعد میں "مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" کر دیا گیا۔ اس کے قیام کی ابتدا میں سرسید نے اس کے دائرہ کار کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا۔

"جن لوگوں کو یہ خیال ہے کہ پولیٹیکل امور پر بحث کرنے سے ہماری قومی ترقی ہوگی، اس سے میں اتفاق نہیں کرتا بلکہ تعلیم اور صرف تعلیم کی ترقی کو ذریعہ قومی ترقی کا سمجھتا ہوں"۔ (۲۵۴)

۲۵۲۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی۔ ہندوستانی مسلمان۔ ص۔ ۱۵۳

۲۵۳۔ مولانا حسین احمد مدنی۔ نقش حیات دوم۔ ص۔ ۷۱

۲۵۴۔ سید طفیل احمد منگلوری۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل۔ ص ۲۸۲

سرسید مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی اور شعور کی ناپختگی دیکھتے ہوئے یہ پسند نہ کرتے تھے کہ وہ اپنی تعلیمی اور اقتصادی حالت بہتر بنانے سے پہلے کسی اور طرف دیکھیں۔ سرسید اس راہ میں اتنا آگے بڑھ گئے کہ سیاست سے یکسر بے تعلقی کی تلقین کر بیٹھے۔ ان کے مخالفین نے اس سے فائدہ اٹھایا اور ان کے خلاف طرح طرح کی مہم جوئی میں مصروف رہے، یہاں تک کہ انھوں نے سرسید کو انگریزوں سے ملا ہوا بتایا۔

سرسید کی سیاست سے کنارہ کشی کی تلقین اگرچہ وہ اس میں مناسب حدود سے آگے بڑھ گئے، لیکن اس کو یکسر غلط اور بے بنیاد نہیں کہا جاسکتا۔ انھوں نے جس مقصد کے پیش نظر ایسا کہا تھا وہ بجائے خود بہت صحیح تھا ــــ مقصود یہ تھا کہ مسلمان اپنی توجہ زیادہ سے زیادہ تعلیم پر منعطف کردیں، اور پہلے تعلیمی اور اقتصادی حالت کا سدھار کرلیں پھر کسی اور طرف نگاہ اٹھائیں۔

بعد کے زمانہ نے سرسید کی اس تعلیمی تحریک کی عظمت دلوں میں پیدا کردی۔ سرسید نے اس وقت اگر سارے زمانہ کی مخالفت مول لے کر تعلیمی پسماندگی دور کرنیکا بیڑہ نہ اٹھایا ہوتا تو آج آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت اس سے بدرجہا زیادہ بدتر ہوتی جتنی آج ہے۔

جنگ آزادی میں اگرچہ ہندو مسلمان دونوں شریک تھے لیکن واقعہ یہ ہے کہ مسلمان قومی پیمانہ پر انگریزوں کے خلاف تھے اور ہندو شخصی اور انفرادی طور پر ــــ اسی لئے پوری مسلم قوم انگریزوں کے عتاب کا نشانہ تھی اور ہندوؤں میں ان کی خفگی افراد تک محدود تھی ــــ بحیثیت قوم ہندوؤں کی ترقی کے سارے مواقع انہوں نے فراہم کئے یہی وجہ ہے کہ ہندو ہر میدان میں آگے بڑھ رہے تھے اور مسلمانوں کا ہر قدم زوال کی طرف جاتا تھا۔ تعلیمی پسماندگی ان کے لئے سم قاتل بنی ہوئی تھی۔ سرسید نے اس کا تریاق فراہم کیا۔ سرسید کے اس فیصلہ کو سراہتے ہوئے پنڈت جواہر لال نہرو لکھتے ہیں ــ

"سرسید کا یہ فیصلہ کہ تمام کوششیں مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے پر صرف کردینی چاہئے یقیناً درست اور صحیح تھا۔ بغیر اس تعلیم کے میرا خیال ہے کہ مسلمان جدید طرز کی قومیت کی تعمیر میں کوئی مؤثر حصہ نہیں لے سکتے تھے بلکہ یہ اندیشہ تھا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہندوؤں کے غلام بن جائیں گے جو تعلیم میں بھی ان سے آگے تھے اور معاشی اعتبار سے بھی زیادہ مضبوط تھے۔" (۲۵۵)

سرسید مسلمانوں کو سیاست سے علیحدہ رکھنا چاہتے تھے لیکن ملک کے مقتدر علماء اور ان کے زیر اثر عوام کو سیاست سے کنارہ کشی میں موت نظر آ رہی تھی، اس لئے وہ سرسید کے خلاف ہو گئے اور اس طرح کانگریس کی حمایت اور اس کا ساتھ دیتے رہے۔

سرسید کی تعلیمی تحریک بذات خود صحیح مگر بے وقت کی راگنی معلوم ہوتی تھی، اس کے ردعمل میں عوامی اضطراب ایک فطری بات تھی چنانچہ ہندوستانی مسلمانوں میں کافی ہیجان برپا ہو گیا۔ (۲۵۶)

انیسویں صدی کے آخر کا۔ یہ عہد عجیب انتشار اور افراتفری کا دور تھا، نہ ہندوستانیوں کی جدوجہد کبیر کامیاب ہو رہی تھی اور نہ انگریزوں کو اطمینان نصیب تھا... جدوجہد آزادی کو ناکام بنانے کے لئے انھوں نے کثرت سے مذہبی اختلافات پیدا کرا دیئے جس کی وجہ سے تحریک آزادی کے علم برداروں کو مزید دشواریاں پیش آئیں، باہمی چپقلش و خلفشار کا تذکرہ کرتے ہوئے مصنف حیات اجمل لکھتے ہیں۔

"اگر ہم ۱۸۹۲ء کے کل واقعات پر نظر ڈالتے ہیں تو ضرور ایک عبرت بھری نظر مسلمانوں پر پڑتی ہے اس سال کے صفحات میں مقلدوں اور غیر مقلدوں کے شرمناک مقدمات کثرت سے ملیں گے۔ ہزاروں روپے ہمارے ناعاقبت اندیش بھائیوں نے آپس کے جھگڑوں میں صرف کئے، اور روپیہ خرچ کرنے کے بعد اسلامی لگا دیے جیسا کہ ایک مسلمان اجر آخرت کا مستحق ہوتا ہے ویسے ہی یہ ذلت و رسوائی کے مستحق ہوئے تکفیر و تفسیق کے فتاوی کا جو ناگوار سلسلہ اٹھ کھڑا ہوا تھا اس کا تذکرہ کرتے ہوئے حکیم اجمل خاں مرحوم نے کہا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ ابتداء اسلام سے غدر ۱۸۵۷ء تک جس قدر تکفیر کے فتوے لکھے گئے اگر انھیں ایک جلد میں جمع کیا جائے تو ہرگز اس جلد کی ضخامت اس جلد کے برابر نہ ہوگی جو ۵۷ء سے لیکر آج تک کفر کے فتووں کی جمع کی جائے۔ (۲۵۸)

۲۵۵۔ پنڈت جواہر لال نہرو۔ میری کہانی حصہ دوم۔ ص۔ ۳۱۵

۲۵۶۔ قاضی عبدالغفار۔ حیات اجمل۔ ص۔ ۲۳

۲۵۷۔ " ص۔ ۳۸

انڈین نیشنل کانگریس کی ابتدا سے گو ہندو مسلمان دونوں اس میں شریک تھے مگر کسی حد تک انگریزوں کی کوششوں کا اثر اور کچھ واقعی اسباب وعوامل نے مسلمانوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا کیا کہ مسلمانوں کی علیحدہ تنظیم ہونی چاہئے۔جو ان کے جذبات واحساسات کی مکمل ترجمان ہو ۔اس خیال کو عملی شکل دینے کے لئے نواب وقار الملک نے ڈھاکہ میں جلسہ کیا۔ اس اجلاس میں مسٹر مظہر الحق نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ۔

"نوجوان اب جنگ کے پیاسے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ ان کے لیڈر معمر اور تجربہ کار ہوں تاکہ نوجوانوں کی بیش از بیش نوجوان قوتوں کو صحیح طور پر منظم کر سکیں"۔ (۲۵۹)

اسی اجلاس میں کانگریس کے متعلق سرسید کے موقف کی وضاحت اسطرح کی گئی تھی۔

"کانگریس کی طرف سے سرسید کے اچھے خیالات نہ ہونے کی وجہ سے یہ سمجھ لینا کہ ان کا منشا یہ تھا کہ ہم مسلمان ہمیشہ پالٹکس سے جُدا رہیں، ایک غلطی ہے انہوں نے خود ایک ڈیفنس ایسوسی ایشن قایم کی تھی لیکن ان کی عمر نے وفا نہ کی اور ایسوسی ایشن مذکور کا کوئی چلانے والا نہ رہا۔اسی اثنا میں تعلیم یافتہ مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہوئی اور تمام ہندوستان نے تیزی کے ساتھ آگے بڑھنا شروع کیا۔ایسی صورت میں پولیٹکل زندگی سے علیحدہ رہنے کے لئے کوئی عذر باقی نہ رہا"۔ (۲۶۰)

مسلمانوں کے ساتھ انگریزوں کے ظالمانہ طرزعمل اور کانگریس سے بے اطمینانی نے مسلمانوں کے اندر "مسلم قومیت" کے احساس وشعور کو جنم دیا۔اور مسلمانان ہند کے اسی قومی شعور کا مظہر بن کر "مسلم لیگ" ابھری۔

کانگریس کے ساتھ مسلمانوں کے بیش از بیش تعاون کے باوجود اس کا دامن مسلمانوں کے لئے تنگ ہوتا گیا اور اس میں ان کے لئے جگہ نہ پیدا ہو سکی۔یہ احساس پیدا ہو گیا تھا کہ کانگریس انگریزوں کی مخالفت کے لئے مسلمانوں کو بطور یرغمال استعمال کرنا چاہتی ہے۔ خود اس کو مسلم عوام کے جذبات واحساسات کا پاس نہیں۔مسلمانوں کے بہلا دے کے لئے

۲۵۸۔ قاضی عبدالغفار ۔ حیات اجمل ۔ص ۔ ۸۰

۲۵۹۔ " " ۔ص ۔ ۶۵

۲۶۰۔ " " ۔ص ۔ ۶۸

مسٹر سی۔ آر۔ داس نے کانگریس کیجانب سے یہ اعلان کیا کہ ـــ "حکومت کی باگ ڈور کانگریس کے ہاتھوں میں آجائیگی تو وہ تمام نئے تقررات میں ساٹھ فیصدی عہدے مسلمانوں کے لئے مخصوص کر دیگی، جب تک کہ آبادی کی نسبت سے صحیح نمائندگی حاصل نہو جائے۔(۲۶۱)

مسلمانوں میں یہ احساس پہلے ہی سے فروغ پا رہا تھا کہ کانگریس ان کے لئے مفید ثابت نہ ہوگی جلد ہی کانگریس کے مندرجہ بالا اعلان کی قلعی کھل گئی جب خود اسی کی صفوں میں مسلم مسائل کے سلسلہ میں انتشار پیدا ہوگیا۔ مسٹر سی۔ آر۔ داس کے انتقال کے بعد کھل کر اس کا اظہار کیا گیا۔ مولانا آزاد اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"یہ افسوس کی بات ہے کہ ان کے انتقال کے بعد ان کے بعض پیروؤں نے ان کے نظریے پر حملے کئے اور ان کے اعلان کو مسترد کر دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان کانگریس سے الگ ہو گئے"۔ (۲۶۲)

کانگریس کا یہی داخلی انتشار اور مسلم مسائل سے عملاً سرد مہری کانگریس سے مسلمانوں کی علیحدگی کا باعث ہوئی۔ مسلم مسائل سے صرف نظر کا یہ طور کانگریس کی صفوں میں جگہ پکڑتا گیا اور اس حد تک ترقی کر گیا کہ اب حصول آزادی کے بعد کانگریس کی صف میں کوئی آدمی ایسا نظر نہیں آتا کہ جو کسی درجہ میں بھی مسلم مسائل سے واقعی دلچسپی رکھتا ہو۔ آزادی کے بعد زیادہ تر کانگریسیوں کی حیثیت شیو پرشاد سنہا کے الفاظ میں "ان کوّوں کی سی ہے جنہوں نے مور کے پر لگائے ہوں"۔

سرسید کے سیاسی خیالات ایک طرف غلط تھے لیکن دوسری طرف ان کی تعلیمی ترقی کا پروگرام اسی قدر مفید ثابت ہوا چنانچہ اسے رفتہ رفتہ قبول عام کی سند حاصل ہوتی رہی۔ اس تحریک کا اہم مظہر سرسید کا وہ مدرستہ العلوم یا ایم۔ او۔ کالج تھا جس نے بعد میں مسلم یونیورسٹی کی شکل اختیار کی۔

۱۸۵۷ء کے بعد اسی ہنگامہ خیز اور پر آشوب دور میں جب ملک کی اکثر قوتیں انگریزوں سے برسرپیکار تھیں اور مسلمانوں کی بیشتر توانائیاں سیاست پر صرف ہو رہی

۲۶۱۔ مولانا ابو الکلام آزاد۔ ہماری آزادی۔ ص۔ ۴۷۔ ۴۸

۲۶۲۔ " " ص۔ ۴۸

تھیں تو اسی وقت دو کام ایسے ہوئے جنہوں نے مسلمانان ہند کی زندگی پر غیر معمولی اثر ڈالا۔ ہماری مراد قیام دارالعلوم دیوبند اور بنار مدرستہ العلوم (جو لبعد میں مسلم یونیورسٹی بنا) سے ہے۔

عجیب بات ہے کہ ایک ہی سرچشمۂ فیض سے دونوں نے فائدہ اٹھایا تھا، سرسید نے بھی اور مولانا محمد قاسم صاحب نے بھی۔ ایک نے جدید کو یکسر اپنا لینے کو لازمۂ حیات سمجھا دوسرے نے قدیم سے وابستگی کو آب بقا خیال کیا۔ ایک نے مشرق کو اپنا کعبۂ مقصود بنایا دوسرے نے مغرب کو قبلہ نما بتایا ـــــ اور سچ یہ ہے کہ ضرورت دونوں کی تھی۔ بے نیازی نہ اس سے ممکن نہ اس سے۔

مدرستہ العلوم کا مختصر تذکرہ اور اس کے قیام کے مقاصد پر ہم اوپر روشنی ڈال چکے ہیں۔ البتہ دارالعلوم دیوبند کا کسی قدر تفصیلی تذکرہ آئندہ صفحات میں پیش ہے کیوں کہ اس داستان کے اصل ہیرو کا تعلق اسی ادارہ سے ہے اور اس کی ذات اسی مکتب فکر سے وابستہ ہے۔

قیام دارالعلوم دیوبند

نتائج واثرات..... ایک جائزہ

تحریک آزادی ۱۸۵۷ء کے اسباب وعوامل میں ایک قومی عامل یہ تھا کہ مجموعی طور پر ہندوستان کے عام باشندوں میں یہ احساس پیدا ہوگیا تھا کہ انگریز ہمیں عیسائی بنا ڈالنا چاہتے ہیں جنگ آزادی کے خاتمہ کے بعد یہ احساس اور شدت اختیار کر گیا۔ عیسائیت کی تبلیغ کھلے عام ہونے لگی۔ سلطنت مغلیہ کے زوال کے ساتھ سیاسی عزو وقار ختم ہوگیا۔ صنعتی اور معاشی اعتبار سے زوال و انحطاط روزافزوں تھا۔

یہ خیال پیدا ہو رہا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مذہبی بنیادیں بھی اسی طوفان بلاخیز کی نذر ہو جائیں۔ یہ احساس زیاں شخصی اور انفرادی نہیں بلکہ قومی تھا، ملک وملت کے مادی خزانے انگریز لوٹ کر لیجا چکے تھے، ضرورت اس بات کی تھی کہ ملت کا علمی وروحانی سرمایہ جلد از جلد محفوظ کر دیا جائے۔

تحریک شاہ ولی اللہ کے باقیات صالحات سے ملک خالی نہ تھا، یہ عظیم اور تاریخی خدمت انھیں کے حصہ میں آئی، وہ خزانہ لٹنے کا نہیں تو مٹنے کا خطرہ ضرور پیدا ہوگیا تھا، اسے اسی تحریک کے کچھ وابستگان نے دیوبند کی سرزمین میں محفوظ کر دینے کا عزم کیا۔

دیوبند ...... محل وقوع

سہارن پور اور دہلی کے درمیان دہلی سے ننانوے ۹۹ میل دور سہارن پور سے بیس ۲۰ میل پہلے جنوب کی جانب ضلع سہارن پور کے متعلقات میں قصبہ دیوبند ایک قدیم بستی ہے۔ (۲۶۳) کہا جاتا ہے کہ اس کا قیام طوفان نوح کے بعد ہوا۔ اس کے جنوب میں مظفر نگر مشرق میں بجنور اور مغرب میں کرنال ہے۔ یہ ہندوستان کی دو مشہور دریاؤں کے وسط

۲۶۳۔ سید اختر حسین۔ سوانح حیات اصغر حسین۔ علی پریس دہلی۔ ص۔ ۳

میں واقع ہے۔اس کے مشرق میں دریائے گنگا اور مغرب میں دریائے جمنا ہے ۔ (۲۶۴)

مولانا ذوالفقار علی دیوبندی صاحب نے اس بستی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ـــ "اما دیوبند فکورۃ قدیمۃ وقصبۃ عظیمۃ وبلدۃ فخیمۃ کانہا اول عمران عمر بعد الطوفان ذات المعابد الوسیعۃ والمساجد الرفیعۃ والمعالم المشہورۃ والمقابر المزدورۃ والآثار المحمودۃ والاخبار المسعودۃ وابنیہ مرصوصۃ وامکنۃ مخصوصۃ واشجار وثمار ومنتزہات وانہار وحیاض ورياض وآجام وغیاض منیعۃ الدور رفیعۃ القصور قریبۃ الی الخیر بعیدۃ من الشرور بلدۃ طیب ورب غفور ـــ" (۲۶۵)

قیام دار العلوم

۱۸۵۷ء کے بعد کے ہنگامہ خیز اور انتہائی پر آشوب دور میں جب کہ مسلمانوں کی سلطنت ختم ہو چکی تھی،عزو وقار خاک میں مل گیا تھا،اور ہندوستان کے مطلع پر ان کے لئے سیاہی کے علاوہ کچھ نہ تھا،لال قلعہ پر اسلامی پرچم کے بجائے یونین جیک لہرا رہا تھا،اور کھلے خزانے عیسائیت کی تبلیغ جاری تھی،مسلمان اقتصادی پریشانیوں کا شکار تھے،ان کے اوقاف اور مدارس ختم ہو چکے تھے،دہلی کی آخری درس گاہ تک بند ہو چکی تھی ـ (۲۶۶)

انہیں حالات میں جنگ آزادی کے دس سال بعد ۱۸۶۷ء میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد پڑی ـ (۲۶۷) اگرچہ اب مشہور یہی ہو گیا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی بنیاد مولانا محمد قاسم نانوتوی صاحب نے اپنے چند رفقاء کے ساتھ دارالعلوم کے نام سے ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۷ء میں اس کی بنیاد رکھی ـ (۲۶۸)

۲۶۴ـ محبوب علی رضوی ـ تاریخ دیوبند ـ ص ـ ۶

۲۶۵ـ مولانا ذوالفقار علی دیوبندی ـ الہدایۃ السنیہ فی ذکر المدرسۃ الاسلامیۃ الدیوبندیۃ مطبع مجتبائی / ۱۳۰۷ھ ـ ص ـ ۱۰

۲۶۶ـ مفتی عزیز الرحمن بجنوری ـ تذکرہ شیخ الہند ـ ص ـ ۱۳۷

۲۶۷ـ محمد انوار الحسن شیرکوٹی ـ حیات امداد ـ ص ـ ۱۳ ـ ۱۴

۲۶۸ـ پروفیسر سید احمد اکبر آبادی مضمون ـ علماء ہند کا سیاسی موقف ـ رسالہ برہان ستمبر ۱۹۴۸ء شمارہ ۳ ص ۴

نے رکھی ہے لیکن مفتی عزیزالرحمٰن صاحب بجنوری نے اس کی بدلائل تردید کی ہے۔ اس کو کیا کہئے کہ واقعاتی تجزیہ سے مفتی صاحب کی بات صحیح نظر آتی ہے۔ مفتی صاحب تحریر فرماتے ہیں ــــــ

"دیوبند کی مسجد چھتہ میں چند علماء نے مل کر ایک مدرسہ قائم کیا جن کے نام یہ ہیں حاجی سید عابد حسین صاحب۔ مولانا ذوالفقار علی صاحب۔ مولانا مہتاب علی صاحب منشی فضل صاحب" ۲۶۹ ترتیب واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمد قاسم صاحب اس وقت وہاں موجود ہی نہ تھے بلکہ وہ میرٹھ میں تصحیح کا کام کرتے تھے ــ (۲۷۰) مولانا ذوالفقار علی جو مدرسہ کے قیام کے وقت نہ صرف موجود تھے بلکہ مفتی صاحب کی مذکورہ بالا تحریر کے مطابق اس کے قیام میں حاجی سید عابد حسین صاحب کے رفیق ومعاون بھی تھے انھوں نے اپنی کتاب الهداية السنية فی ذکر المدرسة الاسلامية الديوبندية میں دارالعلوم کی تاسیس کا انتساب حاجی صاحب ہی کی طرف کیا ہے۔ چنانچہ تحریر فرماتے ہیں ــــ

"لما اراد الله تعالىٰ شانه وعز سلطانه خير هذه البلاد وارشاد العباد باحياء العلوم الدينية والفنون اليقينية اذعانا وتصديقا وايقانا وتحقيقا الهم السيد النسيب النجيب الجليل والشريف الحسيب النبيل صاحب القوة القدسية والابهة الوهبية الرضى التدبير الرحيم على الصغير والموقر للكبير الفقيد المثل والعديم النظير وسامة وجمالا وفخامة وجلالا وصورة وسيرة وسرا وسريرة ورأيا وريا وطباعا ذكيا السمى المخبر البهى المنظر الخير... الحى التقى السخى النقى فخر الامثال الاماجد السيد الاجل محمد عابد ادام الله والبقاه والى منتهى الأمال رقاه ما درسحاب وقرى كتاب بتأسيس هذا المدرسة التى اسست على التقوى على الطريقة المثلى" (۲۷۱)

مدرسہ مذکور کے لئے جب چندہ شروع کیا گیا تو سب سے پہلے رومال پھیلانے والے اور سب سے پہلے چندہ دینے والے حاجی عابد حسین صاحب ہی تھے ــ (۲۷۲)

۲۶۹۔ مفتی عزیزالرحمٰن بجنوری۔ تذکرہ شیخ الہند۔ ص۔ ۱۳۷

۲۷۰۔ " " ص۔ ۱۳۹

۲۷۱۔ مولانا ذوالفقار علی۔ الہدایۃ السنیہ فی ذکر المدرسۃ الاسلامیۃ الدیوبندیۃ۔ ص۔ ۲

۲۷۲۔ مولینا سید محمد میاں۔ علماء حق جلد اول۔ ص۔ ۴۳

اس طرح حاجی سید محمد عابد حسین صاحب نے شام تک تین سو روپئے جمع کر لئے اور مدرسی کے لئے مولانا محمد قاسم صاحب کو میرٹھ خط لکھا۔

"کل عصر اور مغرب کے درمیان تین سو روپئے جمع ہو گئے اب آپ تشریف لے آئیے (۲۷۳)

مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی خود تشریف نہ لا سکے آپ کا جواب آیا کہ ۔۔ میں بہت خوش ہوا۔ خدا بہتر کرے۔ مولوی ملا محمود صاحب کو پندرہ روپئے ماہ وار پر مقرر کر کے بھیجتا ہوں وہ پڑھائیں گے اور میں مدرسہ کے حق میں ساعی رہوں گا"۔۔ (۲۷۴)

مدرسہ کے حق میں یقیناً یہ نیک فال تھی کہ مدرسہ کے پہلے طالب علم اور پہلے مدرس دونوں "محمود" تھے طالب علم وہ جو بعد میں شیخ الہند کے نام سے مشہور ہوئے اور استاد وہ جن کا تذکرہ مولانا محمد قاسم صاحب کے خط میں کیا گیا ہے۔۔ (۲۷۵)

مندرجہ بالا واقعاتی ترتیب و تجزیہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مدرسہ کے اصل بانی تو حاجی سید عابد حسین صاحب ہی تھے، یہ ضرور ہے کہ آپ کے ذہن میں اتنا وسیع تخیل نہ تھا جو بعد میں مدرسہ نے اختیار کیا۔

سنہ ۱۲۹۰ھ تک دارالعلوم کے عملی کاموں میں مولانا محمد قاسم صاحب کا ذکر نہیں ملتا ہاں سنہ ۱۲۹۲ھ مطابق سنہ ۱۸۷۶ء میں جب مدرسہ کا موجودہ وسیع تخیل سامنے آیا اور خاکہ تیار ہوا تو اس میں مولانا محمد قاسم صاحب کی ذات گرامی پیش پیش تھی ۔۔ (۲۷۶)

یہ سب حضرات شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک سے متاثر اور اسی کے نقش قدم پر چلنے والے تھے، مدرسہ کے لئے (موجودہ وسیع شکل میں) ہفت سالہ نصاب تعلیم اور مستقل نظام عمل، اور اساسی قواعد مولانا محمد قاسم صاحب ہی نے بنائے، اور پوری طرح آپ نے اس رو کو پیش نظر رکھا جو شاہ صاحب اور آپ کے اسلاف کے پیش نظر تھی۔ (۲۷۷)

۲۷۳۔ مولانا مناظر احسن گیلانی۔ سوانح قاسمی جلد دوم۔ ص۔ ۲۵۰

۲۷۴۔ " " " ص۔ ۲۵۰

۲۷۵۔ مولانا محمد یعقوب نانوتوی۔ سوانح عمری مولانا قاسم نانوتوی۔ ص۔ ۲۱

۲۷۶۔ مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری۔ تذکرہ شیخ الہند۔ ص۔ ۱۴۱

۲۷۷۔ مولانا عبید اللہ سندھی۔ شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک۔ ص۔ ۲۰۵

مولانا قاسم صاحب بھی شاہ صاحب کی تحریک سے متعلق تھے جب تک دہلی میں تحریک زندہ رہی آپ خدمات انجام دیتے رہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب مسلمانوں میں دو مختلف رجحانات پیدا ہو گئے تو ایک مکتب فکر کی قیادت مولانا موصوف نے کی، اور دوسرے کی سیادت سرسید احمد خان کے حصہ میں آئی۔ (۲۷۸)

ایک ہی سرچشمۂ فیض سے دونوں نے فائدہ اٹھایا تھا۔ مولانا محمد قاسم نے دیو بند کے مدرسہ کو آکر وسعت دی اور سرسید نے علی گڈھ میں مدرسۃ العلوم کی بنا ڈالی۔ (۲۷۹)

سرسید اور مولانا قاسم صاحب کے درمیان اگرچہ اختلافات تھے لیکن سرسید، مولانا کا بہت احترام کرتے تھے۔ اپنے ایک دوست پیر محمد عارف کو سرسید لکھتے ہیں "اگر جناب مولوی محمد قاسم صاحب تشریف لائیں تو میری سعادت ہے میں ان کی کفش برداری کو اپنا فخر سمجھوں گا"۔ (۲۸۰)

مولانا محمد قاسم صاحب کے متعلق سرسید کے خیالات کا اندازہ ان کی اس تحریر سے ہوتا ہے جو انھوں نے مولانا کی وفات پر سپرد قلم کی تھی۔ لکھتے ہیں۔ "زمانہ بہتوں کو رویا ہے اور آئندہ بہتوں کو روئے گا، لیکن ایسے شخص کے لئے رونا جس کے بعد کوئی اس کا جانشین نظر نہ آئے نہایت رنج و غم کا باعث ہوتا ہے.... لوگوں کا خیال تھا کہ بعد جناب مولوی محمد اسحاق صاحب کے کوئی شخص ان کی مثل ان تمام صفات میں پیدا ہونے والا نہیں مگر مولوی محمد قاسم نے..... ثابت کر دیا کہ اسی دلی کی تعلیم و تربیت کی بدولت مولوی محمد اسحاق صاحب کی مثل اور شخص کو بھی خدا نے پیدا کیا بلکہ چند باتوں میں ان سے بھی زیادہ ......

اس زمانہ میں سب لوگ تسلیم کرتے ہیں اور شاید وہ لوگ بھی جو ان سے بعض مسائل میں اختلاف کرتے تھے تسلیم کرتے ہوں گے کہ مولوی محمد قاسم صاحب اس دنیا میں بے مثل شخص تھے، ان کا پایہ اس زمانہ میں شاید معلومات علمی میں شاہ عبدالعزیز صاحب سے کچھ کم ہو، الا تمام باتوں میں ان سے بڑھ کر تھا۔ مسکینی، اور نیکی اور سادہ مزاجی میں اگر ان کا پایہ مولوی

۲۷۸۔ مولانا عبیداللہ سندھی۔ افتتاحی خطبہ ۱۲ جنوری ۱۹۴۰ء۔ ص۔ ۴ (لارنس روڈ کراچی)

۲۷۹۔ مولانا عبیداللہ سندھی۔ شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک۔ ص۔ ۱۸۵

۲۸۰۔ مرتب مشتاق احمد۔ مکاتیب سرسید (اول دوم) لاہور۔ ص۔ ۲۷۵

اسحاق صاحب سے بڑھ کر نہ تھا تو کم بھی نہ تھا۔ درحقیقت فرشتہ سیرت اور ملکوتی خصلت کے شخص تھے، اور ایسے شخص کے وجود سے زمانہ کا خالی ہو جانا ان لوگوں کے لئے جو ان کے بعد زندہ ہیں نہایت رنج اور افسوس کا باعث ہے"۔ (۲۸۱)

مولانا محمد قاسم صاحب تحریک شاہ ولی اللہ کے ان وابستگان میں تھے جنھوں نے انگریزوں سے بذات خود مقابلہ کیا۔ شاملی کے میدان میں آپ ہی کی امارت میں جنگ ہوئی۔ (۲۸۲)

قیام دارالعلوم...... مقاصد اور عزائم

گذشتہ صفحات میں ہم یہ تحریر کر چکے ہیں کہ دارالعلوم کے بانیین اور اس سے وابستہ حضرات شاہ صاحب کی تحریک کے باقی ماندہ لوگوں میں تھے، جو جذبہ تحریک کی وجہ سے ان کے دلوں میں موجزن تھا وہ ختم کہاں ہو سکتا تھا۔ قیام دارالعلوم سے مقصود محض تعلیم نہ تھی، مولانا گیلانی کے استفسار پر مولانا محمود حسن صاحب نے فرمایا کہ ـــ

"حضرت الاستاذ نے اس مدرسہ کو درس و تدریس۔ تعلیم و تعلم کے لئے قائم کیا تھا، مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا، جہاں تک میں جانتا ہوں ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کی ناکامی کے بعد ادارہ قائم کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز ہو جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تاکہ ۵۷ء کی ناکامی کی تلافی ہو سکے"۔ (۲۸۳)

یہی وجہ تھی کہ سرکاری مدد لینا ان حضرات نے گوارہ نہ کیا کیونکہ مدد لینے کے بعد وہ آزادی فکر و عمل مفقود ہو جاتی جو مقصود تھی۔ (۲۸۴)

اسی آزادی فکر کی خاطر مولانا محمد قاسم صاحب نے یہ طے کیا کہ سرکاری وظائف یا دارالعلوم کو مالی امداد تو درکنار طلبہ کے لئے ریلوے کنسیشن تک کی سہولت حکومت سے نہیں لی جائے گی۔ عوام سے رابطہ رکھا جائیگا کہ ضرورت پڑے تو انگریزوں سے مقابلہ کیا جائے۔ (۲۸۵)

۲۸۱۔ سرسید احمد خاں۔ علی گڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ ۲۴ اپریل ۱۸۸۰ء شنبہ۔ ص۔ ۲۶۷ - ۲۶۸

۲۸۲۔ پروفیسر سعید احمد اکبر آبادی۔ نسیم قریشی مرتب۔ علی گڈھ تحریک۔ ص۔ ۲۱۸ - ۲۱۹

۲۸۳۔ مولانا مناظر احسن گیلانی۔ سوانح قاسمی۔ ص۔ ۲۲۶

۲۸۴۔ پروفیسر سعید احمد اکبر آبادی۔ مضمون برہان ستمبر ۸۴ شمارہ ۳۔ ص۔ ۱۰

مولانا محمد قاسم نانوتوی کے توکل علی اللہ کا یہ عالم تھا کہ انگریزی حکومت تو کیا امراء اور والیان ریاست سے تعلقات اور ان پر تکیہ پسند نہ کرتے تھے مدرسہ کے سلسلہ میں آپ نے اپنے وصیت نامہ میں تحریر فرمایا تھا کہ ـــــ

"۱۔ اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں ہے جب تک یہ مدرسہ انشاءاللہ تعالیٰ بشرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا اور اگر کوئی آمدنی یقینی ایسی حاصل ہو گئی جیسے جاگیر یا کارخانہ تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف و رجاء جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہیگا اور امداد غیبی موقوف ہو جائے گی اور کارکنوں میں نزاع پیدا ہو جائیگا القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی ملحوظ رہے۔

۲۔ سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت بھی مضر معلوم ہوتی ہے۔

۳۔ تامقدور ایسے لوگوں کا چندہ زیادہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے کہ جن کو اپنے چندے سے امید ناموری نہ ہو بالجملہ حسن نیت اہل چندہ زیادہ پائداری کا سامان معلوم ہوتا ہے"۔ (۲۸۶)

دارالعلوم بعد شیخ الہند

دارالعلوم کا پہلا دور مولانا رشید احمد گنگوہی کی وفات پر ختم ہوا۔ اس دور میں دارالعلوم میں علمی اور فکری توسیع ہوئی۔ سنہ ۱۳۲۳ھ سے حضرت مولانا محمود حسن صاحب شیخ الہند کی صدارت میں دوسرا دور شروع ہوا جو آپ کی وفات پر ختم ہوا۔ (۲۸۷)

شیخ الہند کے دور میں دارالعلوم نے نمایاں ترقی کی، اور وہ مرکزی فکر جو شاہ صاحب کی تحریک کا نتیجہ تھی آپ کے دور میں زیادہ پھلی پھولی۔ جس کا مظہر مختلف تحریکات سے اہل دیوبند کی وابستگی اور متعدد تحریکوں کی دارالعلوم سے ابتدا ہے۔

شیخ الہند کے عہد کا سب سے نمایاں کارنامہ یہ ہے کہ آپ کی مساعی سے علی گڑھ اور دیوبند والے ایک سیاسی پلیٹ فارم پر نظر آنے لگے۔ (۲۸۸)

۲۸۵۔ پروفیسر سعید احمد اکبر آبادی۔ مرتب نسیم قریشی۔ علی گڑھ تحریک۔ ص۔ ۲۲۱

۲۸۶۔ سید طفیل احمد منگلوری۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل۔ ص۔ ۱۷۶ - ۱۷۷

۲۸۷۔ مولانا عبید اللہ سندھی۔ شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک۔ ص۔ ۲۰۸ - ۲۰۹

علی گڈھ سے اختلافات اگرچہ شیخ الہند کو بھی تھے اور انکیں سرسید سے وہ ربط کبھی نہ تھا جو سرسید اور بعض دوسرے بزرگان دیوبند کے درمیان تھا پھر بھی آپ کے ذریعہ دیوبند اور علی گڈھ کے درمیان جو بعد تھا بڑی حد تک کم ہو گیا۔ (۲۸۹)

۱۹۰۹ء میں جمعیۃ الانصار کا قیام اس سلسلہ میں ایک اہم قدم تھا اس کے جلسوں میں علی گڈھ سے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں وغیرہ بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ انہیں دنوں دیوبند اور علیگڈھ کے مابین یہ معاہدہ ہوا تھا کہ جو انگریزی خواں طلبار علوم اسلامیہ میں دست گاہ حاصل کرنا چاہیں گے دیوبند ان کے لئے خصوصی انتظام کریگا اور جو عربی داں طلبار دیوبند سے علی گڈھ آکر انگریزی تعلیم حاصل کرنا چاہیں گے علی گڈھ ان کے لئے مناسب سہولتیں بہم پہونچائیگا۔ (۲۹۰)

مولانا سید محمد میاں صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ علی گڈھ اور دیوبند کے درمیان اس تعلیمی معاہدہ کی تجویز صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے پیش کی تھی۔ (۲۹۱)

۱۳۲۷ھ میں دارالعلوم دیوبند کی طرف سے جلسہ دستار بندی کا اعلان ہوا جس میں تقریباً تیس ہزار افراد نے شرکت کی اسی میں جمعیۃ الانصار کے قیام کی تجویز طے ہوئی۔ (۲۹۲) اور جمعیۃ الانصار کا پہلا عظیم الشان اجلاس مراد آباد میں ۱۹۱۱ء میں ہوا۔ (۲۹۳)

جمعیۃ الانصار کے سکریٹری مولانا عبیداللہ سندھی تھے جو آپ کے لائق شاگرد اور آپ کی تحریک کا دماغ سمجھے جاتے تھے۔ جمعیۃ الانصار کے ذریعہ علی گڈھ اور دیوبند کے درمیان رابطہ پیدا کرنے میں مولانا سندھی نے نمایاں خدمات انجام دیں۔

۱۹۱۵ء میں مولانا سندھی اور ان کے بعد مولانا شیخ الہند ہندستان سے باہر چلے

۲۸۸۔ محمد سرور ۔ تعلیمات مولانا عبیداللہ سندھی ۔ ص ۔ ۱۳۰

۲۸۹۔ شیخ اکرام ۔ موج کوثر ۔ ص ۔ ۱۴۲

۲۹۰۔ " " ص ۔ ۲۲۴

۲۹۱ ۔ مولانا سید محمد میاں ۔ علمار حق جلد اول ۔ ص ۔ ۱۳۱

۲۹۲۔ مولانا عزیز الرحمٰن ۔ تذکرہ مشائخ دیوبند ۔ ص ۔ ۲۲۳

۲۹۳۔ مولانا سید محمد میاں ۔ علمار حق جلد اول ۔ ص ۔ ۱۳۲

گئے اور علی گڑھ اور دیوبند کے درمیان خلا پر کرنے کا کام رک گیا۔ ۱۹۲۰ء میں جب شیخ الہند واپس آئے تو دق کے مریض اور بس چند دن کے مہمان تھے۔ دیوبند اور علی گڑھ کے درمیان رابطہ کے ایک اہم مظہر کے طور پر آپ نے جامعہ کا سنگ بنیاد رکھا جو علوم عربیہ کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ایک ایسی آزاد درس گاہ تھی جس کا تمام تر نظام عمل اسلامی خصائل اور قومی محسوسات پر مبنی ہو۔ (۲۹۴) افسوس ہے کہ عرصہ ہوا جامعہ کی یہ حیثیت ختم ہو گئی۔

نمایاں خصوصیات

دارالعلوم دیوبند ہندوستان میں دینی تعلیم کا صرف ایک مرکز ہی نہیں بلکہ اسے بہت سی دینی تحریکات کا سرچشمہ بھی ہونے کا فخر حاصل ہے۔ شیخ الہند کے الفاظ اوپر نقل کئے جا چکے ہیں کہ اس کے قیام میں ایک اہم ترین مقصد ۵۷ء میں ناکامی کی تلافی تھی چنانچہ اس میں بیعت جہاد تک لی گئی۔ (۲۹۵)

اس کے بانیوں پر شاہ صاحب کی تحریک کا پرتو تھا اس لئے کسی نے انگریزوں کے سامنے سر اطاعت خم نہ کیا۔ مولانا گیلانی نے مولانا محمد قاسم صاحب کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ دہلی میں جب ملکہ وکٹوریہ کا جشن اقتدار منایا جا رہا تھا تو مولانا محمد قاسم صاحب دیوبند چلے آئے اور یہ فرمایا کہ — "مجھ سے انگریزوں کی شوکت دیکھی نہیں جاتی اس لئے دیوبند چلا آیا ہوں کہ نہ دیکھوں گا نہ کوفت ہوگی"۔ (۲۹۶)

۱۹۱۴ء کی جنگ کے بعد جمعیۃ الانصار اور ریشمی رومال کی تحریک وغیرہ امور کے باعث لندن کے پارلیمنٹ ہاؤس میں دارالعلوم بند کرنے کی تجویز پیش ہوئی، اللہ تعالیٰ کو دین اسلام کی بقا منظور تھی انگریزوں کی خواہش کے باوجود دارالعلوم بند نہ ہو سکا۔ (۲۹۷)

دیوبند نے شاہ ولی اللہ کی تحریک کے تعلق کی لاج رکھی اور اس کی روایات کو زندہ و

۲۹۴۔ شیخ اکرام۔ موج کوثر۔ ص۔ ۲۲۵

۲۹۵۔ عبدالصمد رحمانی۔ انقلابی دور کا تیسرا امیر۔ ص۔ ۲۰

۲۹۶۔ مولانا مناظر احسن گیلانی۔ سوانح قاسمی ص۔ ۹۰

۲۹۷۔ محمد انوار الحسن شیرکوٹی۔ حیات امداد۔ ص۔ ۱۸

برقرار رکھا ۔ بلقان و طرابلس کی جنگ کے دوران حضرت شیخ الہند نے کچھ عرصہ کے لئے مدرسہ بند کر دیا اور طلبار و اساتذہ کے ساتھ نکلے ۔ ہندوستان سے ہر ممکن امداد پہونچائی ۔ اس کے بعد تحریک خلافت میں دیوبند نے حصہ لیا اور آزادی ملک کی دوسری تحریکوں میں بھی اہل دیوبند پیش پیش رہے ۔ (۲۹۸)

ناموران دیوبند

ایک عمومی اندازہ کے مطابق دارالعلوم سے اب تک پندرہ ہزار سے زیادہ طلبار فارغ ہوکر نکل چکے ہیں جنہوں ملک اور بیرون ملک میں نمایاں خدمات انجام دے کر نہ صرف ملت اسلامیہ بلکہ پورے ملک کا نام روشن کیا ہے ۔ یہاں ہم چند ایسے ناموران دیوبند کی فہرست پیش کر رہے ہیں جن کی خدمات کا شہرہ ملک سے نکل کر بیرون ملک تک پہونچ چکا ہے اور جن کی علمی و تبلیغی مساعی و خدمات نے عالم اسلام تک سے خراج تحسین حاصل کیا ہے ۔
دارالعلوم کے ان مشاہیر میں چند کے نام یہ ہیں ۔

مرحومین میں: شیخ الہند مولانا محمود حسن ۔ مولانا اشرف علی تھانوی ۔ مولانا انور شاہ کشمیری ۔ مولانا سید حسین احمد مدنی ۔ مولانا شبیر احمد عثمانی ۔ مفتی کفایت اللہ شاہ جہانپوری ۔ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی ۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی ۔ مولانا عبید اللہ سندھی ۔ مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ۔

اور زندہ بزرگوں میں: ۔ مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی ۔ مولانا مفتی محمد شفیع ۔ مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی ۔ مولانا محمد منظور نعمانی ۔ پروفیسر سعید احمد اکبرآبادی ۔ قاری محمد طیب ۔ مولانا یوسف بنوری مدظلہم ۔

یہ وہ افراد ہیں جنہوں نے اپنی مادر علمی دارالعلوم دیوبند کا نام روشن کیا ہے اور جن کی خدمات رہتی دنیا تک قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی ۔

دیوبند کی خدمات پر ایک نظر

انگریزوں کے تسلط نے یہ خطرہ پیدا کر دیا تھا کہ خدانخواستہ ملک سے دین اور علم دین سب رخصت ہو جائے ان حالات میں دیوبند کے قیام نے یہ خطرہ دور کر دیا اور وہ آیت

قرآنی ـــ " اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ" ـ کی زندہ تفسیر بن کر ہندوستان کے نقشہ پر ابھرا ـ

ہند و پاک کے مسلمان اپنی دینی زندگی میں دیوبند کے فضلاء کے ممنون احسان ہیں ان کی تبلیغی و اصلاحی کوششوں سے ملک کے گوشہ گوشہ میں بدعات و غلط رسم ورواج کا خاتمہ ہوا ـ عقائد کی درستی، تبلیغ دین اور فرق ضالہ سے مناظرہ وغیرہ ان حضرات کے نمایاں کارنامے ہیں ـ متعدد فضلاء نے میدان سیاست میں قدم رکھا ـ انگریزوں کے منہ آئے اور وطن عزیز کی آزادی کے لئے قربانیاں دیں ـ مصیبتیں برداشت کیں ـ (۲۹۹)

بلاشبہ قیام دارالعلوم دیوبند وقت کی ایک اہم ضرورت تھی ـ اس کے فضلاء نے وقت کی اس اہم ضرورت کو پورا کیا ـ ملک کے ایسے حالات میں جب دین اور تعلیم دین کا تصور نہ تھا انگریزوں کے قائم کردہ اسکول تھے جو یا تو اپنے طلباء کو عیسائی بنا کر چھوڑتے یا کم از کم مذہب سے بیزار کر دیتے ـ دیوبند نے ان حالات میں ملک کی صحیح دینی رہبری کی اور پورے ملک میں دینی فضا پیدا کر دی ـ اس سلسلہ میں دیوبند کی خدمات آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں ـ

علمی میدان میں بھی اس کے فضلاء نے عظیم کارنامے انجام دیئے جن میں مفید کتابوں کی تصنیف و تالیف کے علاوہ قدیم علمی ذخیروں کی دریافت، مفید اور پر معنی شرح و حواشی اور بے شمار کتابوں کے ترجمے سب شامل ہیں ـ ہم نے اوپر جن چند مشاہیر کا تذکرہ کیا ہے، علمی میدان میں ان کی خدمات قابل قدر اور لائق تحسین ہیں ـ

اس کے علاوہ دارالعلوم دیوبند مسلمانان ہند کی سیاسی رہبری کا بھی مرکز رہا ہے اس کے فضلاء نے نہ صرف مختلف تحریکوں کے ساتھ وابستہ ہو کر کام کیا بلکہ متعدد تحریکوں کے عالم وجود میں آنے کا ذریعہ بنے ـ اس طرح برابر وہ مسلمانوں کی صحیح سیاسی رہبری کرتے رہے یہاں تک کہ ملک کو آزاد کرا لیا ـ

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

---

۲۹۸ ـ محمد انوار الحسن شیرکوٹی ـ حیات امداد ـ ص ـ ۲۰

۲۹۹ ـ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی ـ ہندوستانی مسلمان ـ ص ـ ۱۱۹

حضرت شیخ الہندؒ

خاندان ..... اور ..... حالاتِ زندگی

ضلع سہارن پور کے مضافات میں اہلِ خیر کی ایک قدیم بستی "دیوبند" ہے۔ مشہور ہے کہ یہ طوفان نوح کے بعد سے قایم و دائم ہے۔ سید احمد شہید نے (بہ نیت جہاد) اپنے سفر کے دوران اس بستی میں بھی قیام فرمایا تھا۔ آپ تقریباً دس یوم اس بستی میں رہے اور اصلاح و تبلیغ کا سلسلہ جاری رہا۔ کتابوں میں آپ کے کچھ خاص رفقار کا تذکرہ ملتا ہے جو اسی بستی کے لوگوں میں سے تھے۔ تذکرہ مشائخ دیوبند میں مندرجہ ذیل افراد سے آپ کی خصوصی رفاقت کا ذکر ہے۔

۱۔ مولانا سید مقبول احمد صاحب۔ ۲۔ مولانا شمس الدین صاحب ۳۔ شیخ رجب علی صاحب ۔۴۔ شیخ منور علی صاحب۔ ۵۔ مولوی بشیر اللہ صاحب۔ ۶۔ مولوی فرید الدین صاحب۔ ۷۔ شیخ عبد الرزاق صاحب۔ ۸۔ شیخ حفیظ اللہ صاحب۔ (۱)

خاندان

مختلف کتابوں کے مطالعہ سے اس بستی میں عثمانی، فاروقی اور صدیقی شیوخ کے وجود کا پتہ چلتا ہے، البتہ ان میں غالب عنصر شیوخ عثمانی ہی کا ہے۔ دیوبند کے اس مشہور عثمانی خاندان سے اس ذات بابرکات کا تعلق ہے جس کا تذکرہ ان صفحات کی زینت ہے۔

عثمانی شیوخ کے اس خاندان میں ایک صاحب شیخ فتح علی تھے انکے تین فرزند تھے۔

۱۔ مولانا مہتاب علی ۔۲۔ مولانا ذو الفقار علی۔ ۳۔ مولانا مسعود علی۔ (حسب ہدایت چھوٹی صاحبزادی محترمہ بتول صاحبہ)۔

مولانا مہتاب علی اور مولانا ذو الفقار علی عربیہ کالج دہلی کے تعلیم یافتہ اور استاذ العلمار مولانا مملوک علی صاحب کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کئے ہوئے تھے، یہ دونوں حضرات دیوبند کے لائق صد افتخار علمار میں سے تھے۔

۱۔ مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری۔ تذکرہ مشائخ دیوبند۔ ص۔ ۱۶۷

مولانا مہتاب علی صاحب کا قیام دیوبند ہی میں رہا۔ وہاں آپ کی طرف سے مذہبی اور تعلیمی کوششیں ہوتی رہتی تھیں جن کا نتیجہ بھی برابر ظاہر ہو رہا تھا۔ مدرسہ عربیہ دیوبند کے ابتدائی بانیین میں حاجی سید عابد حسین صاحب کے علاوہ مولانا مہتاب علی صاحب اور مولانا ذو الفقار علی صاحب کا نام بھی بتایا جاتا ہے۔ (۲)

یہ دونوں بھائی شروع ہی سے مدرسہ کے کاموں کے سلسلہ میں حاجی سید عابد حسین صاحب کے مشیر اور ہم نوا رہے، اور تاحیات مدرسہ کی ترقی کے لئے امکانی کوشش کرتے رہے۔ (۳)

مولانا ذو الفقار علی صاحب نے اپنی گوناگوں علمی صلاحیت وقابلیت کی وجہ سے کافی ترقی کر لی تھی، چنانچہ حکومت کی طرف سے آپ انسپکٹر مدارس بنا دیے گئے تھے، جس کی وجہ سے کسی ایک جگہ آپ کا قیام نہ رہتا تھا۔

سرکاری ملازمت کی مصروفیت کے باوجود آپ نے جو بیش بہا علمی خدمات انجام دی ہیں، انھوں نے اچھے اچھوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال رکھا ہے۔

آپ کی تصانیف کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی، فارسی اور اردو میں آپ کو نہ صرف مہارت بلکہ مکمل عبور حاصل تھا۔ آج بھی آپ کی تصانیف اہل علم کے نزدیک قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ ذیل میں ہم مختصر تعارف کے ساتھ آپ کی تصانیف کا نام درج کرتے ہیں۔

۱۔ عطر الوردۃ :۔ یہ کتاب قصیدہ "بردہ" کی اردو شرح ہے۔

۲۔ الارشاد :۔ یہ قصیدہ "بانت سعاد" کی شرح ہے۔

۳۔ التعلیقات :۔ یہ قصیدہ "سبع معلقہ" کی شرح ہے۔

۴۔ تسہیل الدراستہ :۔ ابوتمام حبیب بن اوس الطائی کی کتاب "دیوان الحماسہ" کی اردو شرح ہے۔

۵۔ تسہیل البیان :۔ ابوالطیب المتنبی کی کتاب "دیوان المتنبی" کی اردو شرح ہے۔

۲۔ مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری۔ تذکرہ شیخ الہند۔ ص۔ ۱۳۷

۳۔ 〃 〃 ص۔ ۵۱

۶۔ معیار البلاغۃ :۔ اردو زبان میں علم معانی و بیان پر نہایت عمدہ کتاب ہے۔

۷۔ الہدایۃ السنیۃ فی ذکر المدرسۃ الاسلامیۃ الدیوبندیۃ :۔ دیوبند قصبۂ اہل قصبہ اور مدرسہ دیوبند کا مختصر مگر جامع تذکرہ۔

۸۔ تسہیل الحساب :۔ ریاضی کے اصول و قواعد پر ایک مفید رسالہ ہے۔ (۴)

مذکورہ بالا کتابیں اپنے موضوع کی اہمیت کے علاوہ زبان و بیان اور اسلوب نگارش کے اعتبار سے بھی اپنی مثال آپ ہیں۔

مولانا ذوالفقار علی صاحب نے ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۹۰۴ء میں پچاسی سال کی عمر میں وفات پائی، آپ کی وفات کے وقت آپکی اولاد و احفاد میں تقریباً ساٹھ افراد تھے۔ دو صاحبزادیاں تھیں اور چار صاحبزادے۔

۱۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب۔ ۲۔ مولوی حامد حسن صاحب۔ ۳۔ حکیم محمد حسن صاحب۔ ۴۔ مولوی حافظ محمد محسن صاحب۔ (۵)

صاحب علم و فضل باپ اور نیک نہاد و پاک طینت ماں کی آغوش تربیت کے پروردہ یوں تو چاروں صاحبزادے تھے، اور قدرت نے سب کو علم و فضل سے بھی نوازا تھا لیکن شہرت و نام وری مقدر تھی سب سے بڑے بھائی شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کے لئے۔

ولادت

گذشتہ صفحات میں ہم یہ تحریر کر چکے ہیں کہ مولانا ذوالفقار علی صاحب نے انسپکٹر آف اسکولز کی سرکاری ملازمت اختیار کررکھی تھی جس کی وجہ سے آپ کا مستقل قیام دیوبند میں نہ رہتا تھا۔ ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱ء میں جب کہ آپ بسلسلۂ ملازمت اہل و عیال کے ساتھ بریلی میں مقیم تھے تو وہیں آپ کے سب سے بڑے صاحبزادے کی ولادت ہوئی۔ آپ نے اظہار مسرت کیا اور "محمود حسن" نام رکھا۔ (۶)

۴۔ مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری۔ تذکرہ شیخ الہند۔ ص۔ ۵۲۔ ۵۳

۵۔ مولانا سید اصغر حسین۔ حیات شیخ الہند۔ ص۔ ۷۔ ۸

والدین کی اپنی اولاد سے محبت فطری بات ہے آپ کی والدہ نے انتہائی شفقت و محبت کے ساتھ آپ کی پرورش و تربیت فرمائی۔ حضرت شیخ الہند والدہ محترمہ کی شفقت و محبت کا اکثر تذکرہ فرماتے۔ اپنے ساتھ خصوصی محبت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے کہ ـــ

"میری والدہ کو مجھ سے اس قدر محبت تھی کہ اب کوئی کتنی ہی محبت کرے، ان کے مقابلہ میں قدر نہیں ہوتی میں اپنے درس و تدریس میں مشغول رہتا گھر میں کھانا پک جاتا اور سب کھا لیتے لیکن میری والدہ کسی قدر آٹا بچاکر میری منتظر رہتیں، گرمی کے دوپہر میں جب میں گھر جاتا تو خود تازہ روٹی پکاکر کھلاتیں"۔ (۷)

تعلیم

شیخ الہند کی ابتدائی تعلیم کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا سید اصغر حسین صاحب لکھتے ہیں۔

"چھ سال کی عمر میں یہ صاحب طالع سعید بچہ جو آگے چل کر محدث یگانہ، استاذ العلماء ہونے والا تھا "الف ۔ با" پڑھنے بیٹھا۔ سیرتاً و صورتاً نہایت مقدس اور بہت معمر بزرگ میاں جی منگلوری صاحب سے قرآن مجید کا اکثر حصہ پڑھا اور کسی قدر میاں جی مولوی عبداللطیف صاحب سے، اور فارسی کی ابتدائی کتابیں بھی انھیں سے پڑھیں۔ اس کے بعد فارسی کی سب کتابیں اور ابتدائی کتب عربی اپنے معزز چچا اور مشہور استاذ مولوی مہتاب علی صاحب سے پڑھیں۔ مولانا کے ہم عمر لوگ کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں بھی مولانا کی طبعی صلاحیت ظاہر و ہویدا تھی۔ کوچہ گردی اور رذیل کھیلوں سے ہمیشہ اجتناب رہا۔ البتہ سیر و شکار سے ایک مناسبت اور دلی شوق تھا"۔ (۸)

پندرہ سال کی عمر میں مرحوم ۱۲۸۳ھ مطابق ۸ مئی ۱۸۶۷ء تک قدوری کا اور شرح تہذیب وغیرہ کتابیں پڑھ چکے تھے (۹)

۷۔ مولوی رحمان علی۔ ترجمہ محمد ایوب قادری۔ تذکرہ علماء ہند۔ ص۔ ۴۷۶

۷۔ مولانا سید اصغر حسین۔ حیات شیخ الہند۔ ص۔ ۹

۸۔ 〃 ۔ ص۔ ۹

۹۔ مفتی عزیز الرحمن بجنوری۔ تذکرۂ شیخ الہند۔ ص۔ ۵۶

محرم ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء میں جب حاجی سید عابد حسین صاحب اور آپ کے چچا مولانا مہتاب علی صاحب و دیگر علماء کے مشورہ سے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد پڑی تو اس کے سب سے پہلے طالب علم آپ ہی تھے مولانا ملا محمد محمود صاحب جو مدرسہ دیوبند کے پہلے مدرس تھے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور جو کتابیں پڑھ چکے تھے ان کے بعد کی کتابیں ملا محمود صاحب سے پڑھنا شروع کیا ۔ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی صاحب نے لکھا ہے کہ ۔

"۱۲۸۴ھ مطابق ۱۸۶۷ء میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہ نے کنز الدقائق کو میبذی اور مختصر المعانی کا امتحان دیا اور ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۸ء میں ہدایہ ، مشکوٰۃ اور مقامات وغیرہ کتب کے امتحان میں شریک ہوئے ۔ پھر ۱۲۸۶ھ مطابق ۱۸۶۹ء میں کتب صحاح ستہ اور بعض دیگر کتابیں اپنے فخر زمانہ استاد حضرت مولانا محمد قاسم صاحب سے پڑھیں جو اس وقت میرٹھ میں منشی ممتاز علی صاحب کے مطبع میں تصحیح کی خدمت انجام دے رہے تھے ۔ ۱۲۸۸ھ مطابق ۱۸۷۱ء میں آپ فارغ ہوئے ، اور اسی سال مدرسہ کے معین المدرس بنا دیئے گئے ۔ ۱۹ ذی قعدہ ۱۲۹۰ھ مطابق جنوری ۱۸۷۳ء کو آپ کی دستار بندی ہوئی اور ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء میں آپ مدرس چہارم بنا دیئے گئے ۔ (۱۰)

اس طرح بیس سال کی عمر میں آپ نے درس نظامی سے مکمل فراغت حاصل کر لی اور اس کے بعد درس و تدریس کا سلسلہ شروع فرمایا ۔ مولانا سید اصغر حسین لکھتے ہیں ۔

کتب صحاح ستہ اور بعض دیگر کتب اپنے فخر زمانہ استاد مولانا محمد قاسم نانوتوی صاحب سے شروع کیں ۔ مولانا موصوف میرٹھ میں منشی ممتاز علی صاحب کے مطبع میں تصحیح کا کام کرتے تھے ۔ پھر مطبع دہلی منتقل ہو گیا تو مولانا ممدوح بھی دہلی مقیم ہوئے اور کبھی دیوبند اور اپنے وطن نانوتہ بھی تشریف لیجا کر مقیم رہتے ۔ حضرت مولانا (محمود حسن صاحب) نے ان سب مقامات میں اکثر اپنے باکمال استاد کے ساتھ رہ

---

۱۰ ۔ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی ۔ تذکرۃ الخلیل ۔ ص ۔ ۱۱۰

کر دل و جان سے قابل رشک خدمت کر کے سعادت حاصل کی اور سفر و حضر میں سلسلہ درس جاری رکھ کر استاد کی شفقت اور اپنی ذکاوت سے بکمال تحقیق کتابیں پڑھیں"۔ (۱۱)

مذکورہ بالا کتب متداولہ کے علاوہ دوران تعلیم ہی میں آپ نے حساب و دیگر فنون کی کتابیں مدرسہ میں رہ کر پڑھیں، اور علوم عقلیہ و نقلیہ میں کامل دست گاہ و مہارت تامہ حاصل کر لی۔ اسی دوران ادب کی مختلف کتابیں اپنے والد ماجد مولانا ذوالفقار علی صاحب سے پڑھیں۔ (۱۲)

آپ کے اساتذہ

۱۔ میاں جی منگلوری ۲۔ میاں جی عبداللطیف ان دونوں حضرات سے اردو کی ابتدائی کتابوں کے علاوہ قرآن پاک پڑھا۔ ۳۔ مولانا مہتاب علی صاحب۔ ان سے فارسی کی جملہ کتب کے علاوہ عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ ۴۔ ملا محمد محمود صاحب۔ ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء میں دارالعلوم دیوبند کھلنے کے بعد مزید تعلیم کے لئے آپ دارالعلوم میں داخل ہوئے اور دارالعلوم میں ملا محمود صاحب کے سب سے پہلے شاگرد ہوئے۔ ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء سے ۱۲۸۶ھ مطابق ۱۸۶۹ء تک آپ سے شرف تلمذ حاصل رہا۔ ۵۔ مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی۔ دارالعلوم میں تعلیم کے دوران بعض کتابیں آخر ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۷ء سے ۱۲۸۶ھ مطابق ۱۸۶۹ء تک آپ سے پڑھیں۔ (۱۳) مولانا محمد یعقوب صاحب استاذ العلما مولانا مملوک علی صاحب نانوتوی کے فرزند تھے۔ اپنی اعلیٰ تعلیمی لیاقتوں کے باعث اجمیر میں سو روپیہ ماہانہ مشاہرہ پر تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ پھر بریلی ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولز ہو گئے۔ مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے ایما سے ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء کے آخر میں

۱۱۔ مولانا سید اصغر حسین۔ حیات شیخ الہند۔ ص۔ ۱۱

۱۲۔ مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری۔ تذکرہ شیخ الہند۔ ص۔ ۵۸

۱۳۔ " " " ۔ ص۔ ۵۹

دارالعلوم دیوبند میں آ گئے اور نہایت قلیل مشاہیر (بیس روپیہ کچھ عرصہ کے بعد تیس روپیہ) پر صدر مدرس قرار پائے۔ مولانا موصوف اعلیٰ علمی صلاحیت اور کمال کے علاوہ صاحب قوت قدسیہ بزرگ تھے۔ دارالعلوم میں آپ کی آمد سے بہار تازہ آ گئی۔ آخر عمر تک دارالعلوم کی خدمت انجام دیتے رہے۔ ۱۳۰۲ھ مطابق ۱۸۸۴ء میں ہیضہ میں مبتلا ہو کر نانوتہ میں وفات پائی۔ (۱۴)

۶۔ مولانا ذوالفقار علی صاحب۔ ۱۲۸۸ھ مطابق ۱۸۷۱ء کے بعد ادب کی کچھ کتابیں۔ دیوان متنبی۔ دیوان حماسہ سبعہ معلقہ وغیرہ پڑھیں۔

۷۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی۔ صحاح ستہ اور اس کے بعد فنون کی چند کتابیں آپ سے پڑھیں۔ جس کی ابتدا ۱۲۸۶ھ مطابق ۱۸۶۹ء یا اس کے بعد ہے۔ (۱۵)

مولانا محمد قاسم صاحب ان دنوں منشی ممتاز علی صاحب کے مطبع میں کام کرتے تھے اس لئے مولانا محمود حسن صاحب نے ان کے ساتھ میرٹھ۔ دہلی۔ نانوتہ اور دیوبند کے سفر حضر میں رہ کر متذکرہ کتابیں پڑھیں۔ (۱۶)

مولانا محمد قاسم نانوتوی

۱۲۴۸ھ مطابق ۳۳-۱۸۳۲ء میں قصبہ نانوتہ ضلع سہارن پور میں پیدا ہوئے تاریخی نام "خورشید حسن" رکھا گیا۔ مشہور نام کا کسی وقتی مصلحت سے اگر اخفا مقصود ہوتا تو بجائے "محمد قاسم" کے فرماتے کہ میرا نام "خورشید حسن" ہے۔ (۱۷) ابھی بچے ہی تھے کہ بعض خاندان والوں کی طرف سے آپ کے والد کو یہ خدشہ ہوا کہ وہ آپکی معصوم جان کے درپے ہیں۔ (۱۸)

۱۴۔ مولانا سید اصغر حسین۔ حیات شیخ الہند۔ ص۔ ۱۰۔ ۱۱

۱۵۔ مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری۔ تذکرہ شیخ الہند۔ ص۔ ۵۹

۱۶۔ " تذکرہ مشائخ دیوبند۔ ص۔ ۵۹

۱۷۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی۔ سوانح قاسمی جلد اول۔ ص۔ ۱۴۶ - ۱۴۷

۱۸۔ " " " " ص۔ ۱۰۷ - ۱۷۷

چنانچہ آپ کے والد صاحب نے آپ کو نانوتہ سے دیوبند منتقل کر دیا جہاں قدیم رشتہ داریاں تھیں۔ دیوبند میں شیخ کرامت حسین صاحب کے یہاں آپ رکھے گئے۔(۱۹) ابتدائی کتابیں گھر کے قیام ہی کے زمانہ میں پڑھ چکے تھے۔ دیوبند میں آکر جب شیخ کرامت حسین صاحب کے یہاں رہنا ہوا تو مولوی مہتاب علی صاحب (یہ حضرت شیخ الہند کے سب سے بڑے چچا تھے) نے آپ کو عربی شروع کرائی۔ (۲۰) ذہین اور طباع بہت تھے اس لئے دوران درس غیر معمولی محنت کی ضرورت نہ پڑتی، بلکہ اسی دور سے اجتہادی شان ظاہر ہوا کرتی تھی۔ دیوبند کے عرصہ قیام میں مولوی مہتاب علی صاحب سے عربی کتابیں پڑھتے رہے، کچھ عرصہ کے بعد اپنے نانا شیخ وجیہہ الدین کے یہاں سہارن پور منتقل ہو گئے۔ نانا خود بھی صاحب علم اور فارسی کے اچھے جاننے والے تھے، اردو کے شاعر بھی تھے۔ ان کی صحبت کے علاوہ آپ نے وہاں مولوی محمد نواز صاحب سہارن پوری سے فارسی وعربی کی کچھ کتابیں پڑھیں۔ سنہ ۱۲۵۸ھ مطابق سنہ ۱۸۴۲ء میں اچانک سہارن پور میں سخت وبائی بخار پھیل گیا جس کا شکار ہو کر آپ کے نانا وفات پا گئے۔ اس کے بعد مولانا موصوف سہارن پور سے نانوتہ واپس آ گئے کہ وہاں قیام کی اب کوئی سبیل نہ تھی، اس کے بعد تقریباً ایک سال تک نانوتہ ہی میں قیام رہا(۲۱)۔

استاذ العلماء مولانا مملوک علی صاحب جو مولانا محمد قاسم صاحب کے رشتہ کے چچا بھی ہوتے تھے(۲۲) ان دنوں دلی کی سب سے بڑی درسگاہ دلی کالج میں استاد تھے۔ اس عرصہ میں وہ ایک سال کی رخصت لے کر حج کے لئے گئے تھے، واپسی پر انھوں نے مولانا محمد قاسم صاحب سے کہا کہ میں تم کو اپنے ساتھ دہلی لے جاؤنگا۔ (۲۳) والدین کی اجازت کے بعد آپ مولانا مملوک علی صاحب کے ساتھ محرم سنہ ۱۲۶۰ھ ....

۱۹۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی۔ سوانح قاسمی جلد اول۔ ص۔ ۱۸۰

۲۰۔ " " " " ص۔ ۱۸۶

۲۱۔ " " " " ص۔ ۲۳۰

۲۲۔ محمد سرور۔ مرتب خطبات مولانا سندھی۔ ص۔ ۲۱۴

۲۳۔ مولانا گیلانی۔ سوانح قاسمی جلد اول۔ ص۔ ۲۱۴

مطابق ۱۸۴۴ء میں دلی پہونچ گئے۔ وہاں مولانا مملوک علی صاحب کی نگرانی اور تربیت میں ذوق وشوق کے ساتھ تعلیم حاصل کی۔ (۲۴)

حدیث شریف کی سند مولانا شاہ عبدالغنی صاحب محدث دہلوی سے حاصل کی۔ تحصیل علم کے بعد کچھ دنوں دلی کالج میں شغل تدریس اختیار کیا۔ اس کے بعد مطبع احمدی دہلی اور مطبع مجتبائی میرٹھ وغیرہ میں تصحیح کی خدمت انجام دیتے رہے۔ آخر عمر میں دیوبند آگئے اور دارالعلوم دیوبند کی خدمت جی جان سے کرتے رہے یہاں تک کہ ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۸۸۰ء میں وہیں وفات پائی۔ (۲۵)

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کی معیت میں شاملی کے میدان میں علم جہاد بلند کرنے والوں میں مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی بھی پیش پیش تھے، بلکہ امیر لشکر بھی منتخب ہوئے تھے۔ (۲۶) انتہائی جرأت اور بے جگری کے ساتھ آپ نے دست بدست جنگ کی۔ کنپٹی پر ایک گولی بھی لگی، مگر عجیب بات ہے کہ گولی لگنے سے کپڑے تو خون سے تر ہو گئے، لیکن چند لمحوں بعد عمامہ اتار کر دیکھا تو کہیں گولی کا نشان تک نہ تھا۔ (۲۷)

مولانا موصوف کا ایک قابل ذکر کارنامہ یہ ہے کہ ملک میں عیسائی پادریوں کی تبلیغ عیسائیت کے علاوہ آریہ سماجی شر پسندوں نے بھی سر اٹھا رکھا تھا، اور وقتاً فوقتاً اسلام، پیغمبر اسلام، اور اسلامی احکام و شرائع کو اپنے مطاعن کا نشانہ بنایا کرتے تھے۔ مولانا نانوتوی نے ان ہر دو فتنوں کا مقابلہ کیا اور خوب کیا۔ مولانا کے مناظرانہ نکتے اور لطائف آج بھی دیکھنے کے قابل ہیں۔ پنڈت دیانند سرسوتی۔ پادری تاراچند اور دوسرے عیسائی اور آریہ سماجی مناظرین کو مختلف مواقع پر شرمناک شکست دی۔ (۲۸)

۲۴۔ مولانا گیلانی۔ سوانح قاسمی جلد اول۔ ص۔ ۲۱۷۔ ۲۳۰

۲۵۔ " " جلد سوم۔ ص۔ ۱۳۸

۲۶۔ نسیم قریشی صاحب۔ مرتب علی گڈھ تحریک۔ ص۔ ۲۱۹

۲۷۔ مولانا مناظر احسن گیلانی۔ سوانح قاسمی جلد دوم۔ ص۔ ۱۶۰

۲۸۔ مولوی رحمٰن علی۔ ترجمہ محمد ایوب قادری۔ تذکرہ علمار ہند۔ ص۔ ۴۶۵۔ ۶۶

مذکورہ بالا کارنامہ کے علاوہ حضرت نانوتوی کا سب سے عظیم الشان کارنامہ وہ ہے جس نے رہتی دنیا تک ان کے نام کو زندۂ جاوید بنا دیا۔ہماری مراد قیام دارالعلوم دیوبند سے ہے۔ مولانا نانوتوی کو بانی دارالعلوم تسلیم کرنا گو محل نظر ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بعد کی عظیم الشان شکل کا تصور بانی اول کے دماغ میں نہ تھا یہ تصور تمام تر مولانا نانوتوی کا رہین منت ہے۔ دارالعلوم کو شہرت اور ترقی اور ایک معمولی مدرسہ سے عظیم الشان دارالعلوم کی شکل مولانا موصوف ہی کی کوششوں سے نصیب ہوئی۔ انھوں نے جب اس کا کام اپنے ہاتھ میں لیا تو پھر مرکر ہی اس سے جدا ہوئے۔

استاذ کی خدمت

اس سے پہلے یہ ذکر آچکا ہے کہ شیخ الہند نے مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے ساتھ سفر و حضر میں رہ کر ان سے کسب فیض کیا تھا۔مختلف کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ الہند بڑی تندہی سے استاد محترم کی خدمت کرتے اور فارغ اوقات میں ان سے سبق پڑھتے تھے۔انتہائی خدمت اور استاد سے غایت تعلق کے اثبات کے لئے یہ واقعہ کافی ہوگا کہ ۔

ایک مرتبہ مولانا محمد قاسم صاحب کو دیوبند کا سفر درپیش تھا۔برسات کا موسم تھا اور مولانا کو بخار آرہا تھا۔شیخ الہند نے مولانا کو گھوڑے پر بٹھایا اور لگام اپنے ہاتھ میں لے لی،اور ایک ہاتھ سے رکاب کے قریب ہوکر حضرت کی کمر کو سہارا دیا۔اسی طرح بائیس میل کا راستہ پیدل طے کر کے مولانا کو دیوبند پہونچایا۔ (۲۹)

استاد سے تعلق خاطر کا اندازہ اس واقعہ سے بھی ہوگا کہ آپ کے وصال کے بعد سارے جذبات سرد ہو گئے،درس و تدریس سے دل بالکل بجھ گیا تھا،فرماتے تھے کہ ــ" ہمارے مشاغل علمی اور درس تدریس صرف اس لئے تھے کہ کچھ استعداد و قابلیت پیدا ہو جائے اور حضرت کے مضامین و ارشادات کو سمجھنے لگیں،اب کہ حضرت ہی رخصت ہو گئے اس قیل و قال اور بے نتیجہ اشغال سے کیا فائدہ ؟ فکر معاش نے

۲۹۔ مفتی عزیز الرحمن بجنوری۔ تذکرہ مشائخ دیوبند۔ص۔ ۲۰۲

ایسا ہی تنگ کیا تو گھاس کھود کر بسر کر لیں گے "۔

مولانا محمد قاسم صاحب کے وصال کے بعد سے آپ نے مدرسہ آنا بالکل ترک کر دیا تھا۔ بعد میں مولانا رفیع الدین صاحب (مہتمم مدرسہ) قدس سرہ کے شدید اصرار پر تشریف لائے تو روتے ہوئے درس شروع فرمایا۔ (۳۰)

استاد محترم سے تعلق اور ان کے احترام پر ایک اور مثال سے روشنی پڑتی ہے۔ شیخ الہند فرمایا کرتے تھے کہ ۔

" اس گھر (مولانا محمد قاسم صاحب کے) کا باؤلا کتا بھی اگر مجھے کاٹنے آئے تو اسے چمکار کر ہٹاؤں گا "۔ (۳۱)

استاذ العلماء مولانا مملوک علی صاحب خود آپ کے استاد نہ تھے بلکہ آپ کے استاد مولانا محمد قاسم صاحب کے استاد تھے۔ مولانا مملوک علی صاحب کے پوتے ایک بار تشریف لائے تو برسات کے موسم میں شیخ الہند گھر سے رات کو دس گیارہ بجے برستے پانی میں ان کے لئے کھانا لیکر گئے، جب کہ ان کا قیام مسجد فتح شاہ میں تھا جو کہ بالکل دوسرے سرے پر ہے ۔ (۳۲)

دارالعلوم دیوبند کی مدرسی

۱۲۸۸-۸۹ھ مطابق ۱۸۷۱-۷۲ء میں جب کہ آپ نے ابھی تعلیم سے مکمل فراغت بھی نہ حاصل کی تھی، معین المدرس کی حیثیت سے مختلف کتابوں کے اسباق پڑھایا کرتے تھے۔

طلبہ کی روز افزوں کثرت کی وجہ سے مدرسہ کے منتظمین و ارباب حل وعقد کو ضرورت محسوس ہوئی کہ مزید ایک استاد کا اضافہ کر لیا جائے ۔ اس کے لئے منتظمین کی نگاہ میں چند ذی استعداد طلباء تھے، جنھوں نے تھوڑے ہی عرصے پیشتر دارالعلوم سے

۳۰۔ مولانا سید اصغر حسین ۔ حیات شیخ الہند ۔ ص ۔ ۱۸

۳۱۔ حسب روایت چھوٹی صاحبزادی محترمہ بتول صاحبہ ۔

۳۲۔ " " " " ۔

فراغت حاصل کی تھی، لیکن مولانا شاہ رفیع الدین صاحب (مہتمم دارالعلوم) کی نگہ انتخاب نے شیخ الہند کو جوہر قابل قرار دیا۔ اس طرح ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء سے آپ کا شمار باقاعدہ دارالعلوم کے اساتذہ میں ہونے لگا۔ (۳۳)

حضرت شیخ الہند کے والد مولانا ذوالفقار علی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے علم و فضل کے علاوہ مال و دولت بھی کافی دیا تھا۔ اس پر مستزاد ان کا غنی دل تھا۔ ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء میں جب شیخ الہند کا انتخاب مدرسہ کے استاد کی حیثیت سے ہوا تو آپ نے یہ پسند نہ فرمایا کہ شیخ الہند مدرسہ سے تنخواہ لیکر خدمت کریں لیکن بزرگان مدرسہ کے اصرار پر آپ نے سکوت اختیار فرمایا اور پندرہ روپیہ ماہوار پر شیخ الہند کا تقرر ہو گیا۔ (۳۴)

شیخ الہند کے انتخاب کے بعد حسب ترتیب ذیل چار استاد ہو گئے۔

۱۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی۔ صدر مدرس

۲۔ مولانا سید احمد صاحب دہلوی۔ مدرس دوم

۳۔ مولانا ملا محمد محمود صاحب۔ مدرس سوم

۴۔ مولانا محمود حسن صاحب (شیخ الہند)۔ مدرس چہارم

مولانا محمود حسن صاحب اگرچہ مدرس چہارم تھے، خود فرمایا کرتے تھے کہ ابتدا میں "قطبی اور قدوری پڑھا لینے کو بہت غنیمت سمجھتا تھا"۔ لیکن اس دوران بھی طلبہ آپ سے بڑی کتابیں پڑھا کرتے تھے۔ جلد ہی آپ کی علمی استعداد و صلاحیت اور ذہانت ظاہر ہونے لگی۔ تقرر کے دوسرے ہی سال ۱۲۹۳ھ مطابق ۱۸۷۶ء میں آپ نے صحاح ستہ کی اہم اور مشکل کتاب ترمذی شریف اور مشکوٰۃ شریف، و ہدایہ وغیرہ کو کتابوں کے اسباق پڑھانا شروع کر دیا۔ اور حج سے واپسی کے بعد ۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸۷۸ء سے بخاری شریف کا پڑھانا شروع فرما دیا۔ (۳۵)

۳۳۔ مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری۔ تذکرہ شیخ الہند۔ ص۔ ۶۲

۳۴۔ مولانا سید اصغر حسین۔ حیات شیخ الہند۔ ص۔ ۱۳

۳۵۔ " " ص۔ ۱۳

۱۳۰۲ھ مطابق ۱۸۸۴ء میں جب حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کا انتقال ہوگیا، تو ان کی جگہ مولانا سید احمد صاحب دہلوی چالیس روپیہ ماہانہ مشاہرہ پر مدرس اول اور مولانا ملا محمود صاحب تینتیس روپئے ماہانہ پر مدرس دوم اور مولانا محمود حسن صاحب تیس روپئے ماہانہ پر مدرس سوم مقرر ہوئے اور مدرس چہارم کی جگہ پر مولانا عبدالعلی صاحب کا انتخاب ہوا۔

تقریباً دوسال بعد جب دارالعلوم کے سب سے قدیم استاد ملا محمود صاحب دیوبندی کا انتقال ہوگیا تو ان کی جگہ دارالعلوم کے سب سے پہلے طالب علم یعنی مولانا محمود حسن صاحب کو مدرس دوم بنا دیا گیا۔

۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۷ء میں جب مولانا سید احمد صاحب دہلوی (مدرس اول) نے دارالعلوم چھوڑ دیا تو ان کی جگہ مولانا محمود حسن صاحب مدرس اول ہو گئے۔

اس پورے تدریسی عرصہ میں مدرس اول دوم وغیرہ ہر قسم کی تبدیلی سے بے نیاز ہو کر آپ پوری تندہی اور ذوق وشوق سے تعلیم دیتے رہے ترتیب درجات اور مشاہرہ کا کبھی بھولے سے خیال نہ فرمایا۔ مشاہرہ اگرچہ قبول فرماتے تھے لیکن "بقدر ضرورت اور وہ بھی بکراہت"۔ (۳۶)

اس عرصہ میں مواقع اس کے بھی آئے کہ اگر آپ نے خواہش کی ہوتی تو دولت دنیا قدموں میں ہوتی، لیکن آپ نے پسند نہ فرمایا کہ دارالعلوم چھوڑ کر کہیں اور تشریف لیجائیں۔ پیرجی عبدالرزاق صاحب گنگوہی مہتمم مدارس اسلامیہ دہلی نے بکمال خلوص و محبت دعوت دی کہ آپ دہلی آکر شاہ ولی اللہ کی درس گاہ کو از سر نو آباد کریں، لیکن آپ راضی نہ ہوئے۔ (۳۷)

۱۳۱۲ھ مطابق ۱۸۹۴ء میں جب گرانی کی وجہ سے دیگر مدرسین کے ساتھ آپ کی تنخواہ میں بھی اضافہ ہوا تو وقتی طور پر اگرچہ آپ نے قبول فرمالیا، مگر اسی وقت مشاہرہ قبول نہ کرنیکا ارادہ کرلیا لیکن مولانا رشید احمد گنگوہی کے اصرار سے لیتے رہے۔

۳۶۔ مولانا سید اصغر حسین ۔ حیات شیخ الہند ۔ص ۔ ۲۰

۳۷۔ مفتی عزیز الرحمن بجنوری ۔ تذکرہ شیخ الہند ۔ص۔ ۶۴

مولانا گنگوہی کی وفات کے بعد جب دوبارہ تنخواہ میں اضافہ ہوا اور پچھتر روپیہ آپ کے لئے مقرر ہوئے تو آپ نے اضافہ قبول کرنے سے انکار کر دیا اور کچھ ہی عرصہ بعد مشاہرہ لینا بالکل بند کر دیا اس کے باوجود اسی تندہی و مواظبت سے درس دیتے رہے۔ (۳۸)

شیخ الہند کے عہد کا ایک اہم کارنامہ

یوں تو شیخ الہند کے عہد میں دارالعلوم نے نمایاں ترقی کی ایک معمولی مدرسہ سے عظیم الشان دارالعلوم بنانے میں آپ کا بہت بڑا حصہ ہے تعلیمی اعتبار سے آپ نے دارالعلوم کی سطح بہت بلند کر دی یہاں ہم شیخ الہند کے عہد کے ایک دوسرے کارنامے کا ذکر کرنا چاہتے ہیں، جس کا سہرا بلا شرکت غیرے حضرت شیخ الہند کے سر ہے۔

یہ اہم کارنامہ دارالعلوم دیوبند اور علی گڈھ کے مابین بعد المشرقین کو کم کر کے دونوں کو قریب لانا ہے اس سلسلہ میں شیخ الہند کی خدمات انتہائی قابل قدر ہیں۔ آپ نے بڑی کوشش کی کہ دونوں کے درمیان جو خلیجیں حائل ہوگئی ہیں وہ پر ہو جائیں۔ (۳۹)

مخالفت کی وہ روح اور فضا بد قسمتی سے ختم تو نہ ہو سکی جس کے باعث دونوں میں اختلافات تھے البتہ کم ضرور ہوئی، اور وقتی طور پر کسی حد تک شیخ الہند کی یہ کوششیں بار آور ہوئیں۔

اساتذہ کے ساتھ سفر حج

جیسا کہ ہم پہلے تحریر کر چکے ہیں تدریسی سلسلہ تو حضرت شیخ الہند نے مکمل فراغت سے پہلے ہی شروع کر رکھا تھا، باضابطہ تقرر کے تیسرے سال شوال ۱۲۹۴ھ مطابق دسمبر ۱۸۷۷ء میں ہندوستان کے منتخب بزرگان دین نے سفر حج کا قصد فرمایا، جس میں آپ کے استاد محترم مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی صاحب

۳۸۔ مولانا سید اصغر حسین۔ حیات شیخ الہند۔ ص۔ ۲۰۔ ۲۱

۳۹۔ شیخ محمد اکرام۔ موج کوثر۔ ص۔ ۲۲۲۔ ۲۲۵

مولانا محمد مظہر صاحب اور ان کے بھائی مولانا منیر صاحب، مولانا محمد حسین صاحب صوفی الہ آبادی جیسے فخر روزگار اور یگانۂ وقت لوگ شامل تھے۔ان بزرگوں کے فیض صحبت کی تمنا، مبارک سفر اور مبارک اہل سفر دیکھ کر صدہا عوام بھی اس قافلہ کے ساتھ ہوئے۔ مہتمم دارالعلوم دیوبند مولانا شاہ رفیع الدین صاحب اور مدرس اول مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی بھی شریک قافلہ تھے۔ یہ کیوں کر ممکن تھا کہ ان سب حضرات کی معیت میں حضرت شیخ الہند نہ ہوتے۔ زیارت حرمین کا شوق و اضطراب اور صحبت و خدمت استاد کی تمنا کا سرمایہ لے کر آپ بھی شریک سفر ہو گئے۔ (۴۰)

یہ مبارک و مقدس قافلہ روانہ ہوا تو جس اسٹیشن پر گاڑی پہونچتی صدہا مشتاقان زیارت کا ہجوم ہو جاتا، جتنی دیر ٹرین اسٹیشن پر رہتی عجیب منظر رہتا۔ بمبئی پہونچکر تقریبًا بیس روز جہاز کا انتظار کرنا پڑا وہاں بھی ارادت مندوں کی مستقل آمد اور ہجوم رہتا۔ خدا خدا کر کے جہاز ملا اور تیرہ دن کے سفر کے بعد یہ مقدس قافلہ جدہ پہونچا۔ مکہ معظمہ پہونچ کر طواف و زیارت سے فارغ ہوئے تو مرجع علماء و عوام حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی سے ملاقات کی۔ حج سے فراغت کے بعد یہ قافلہ مدینہ منورہ کے لئے روانہ ہوا، وہاں پہونچ کر بیس روز تک وہیں قیام کیا۔ (۴۱)

مولانا شاہ عبدالغنی صاحب مہاجر مدنی سے شرف ملاقات حاصل کیا۔ مولانا (شیخ الہند) بھی ان کی مجلس میں شریک ہوئے۔ حضرت شاہ صاحب بھی ان کے ساتھ لطف و عنایت کا معاملہ فرماتے۔ احترام استاد دیکھئے کہ شیخ الہند نے شاہ عبدالغنی صاحب سے اجازت و سند حدیث لینا خلاف نیازمندی خیال فرمایا۔ روانگی سے قبل خود مولانا محمد قاسم صاحب کی تحریک پر شاہ عبدالغنی صاحب نے آپ کو اجازت و سند حدیث عنایت فرمائی۔

مدینہ منورہ سے واپسی کے بعد ایک ماہ مکہ معظمہ میں قیام رہا۔ مولانا محمد قاسم صاحب کی استدعا پر شیخ الہند کو حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی نے شرف بیعت و خلافت

۴۰۔ مولانا سید اصغر حسین۔ حیات شیخ الہند۔ ص۔ ۱۳

۴۱۔ 〃 〃 〃 ص۔ ۱۴

خلافت سے نوازا۔ کچھ دلوں کے بعد حاجی صاحب ممدوح کے ایما سے یہ قافلہ ہندوستان کے لئے روانہ ہوا۔ واپسی میں انتہائی تکلیف دہ سفر رہا۔ جہاز میں جگہ کم تھی اور مسافر زیادہ تھے۔

مولانا محمد قاسم صاحب کی طبیعت روانگی سے قبل ہی ناساز تھی سفر کی صعوبتوں نے شدت مرض میں اور اضافہ کر دیا۔ حالت اس قدر خراب ہو گئی کہ لوگ بالکل ناامید ہو گئے، جہاز پر دوا علاج کا بھی کچھ مناسب انتظام نہ تھا۔

پورے سفر میں مولانا محمود حسن صاحب بڑی تندہی سے اپنے استاد محترم کی خدمت میں مصروف رہے، چودھویں دن جہاز بمبئی پہونچا۔ وہاں دو ایک دن قیام کر کے مولانا محمد قاسم صاحب کو لیکر ان کے وطن نانوتہ گئے۔ ان کو پہونچا کر تقریباً چھ ماہ کے بعد دارالعلوم پہونچے، اور حسب سابق ذوق و شوق کے ساتھ سلسلۂ درس شروع فرمایا۔ (۴۲)

درس اور حلقۂ درس

حضرت شیخ الہند اپنے اسباق سخت محنت اور بڑی جاں فشانی کے ساتھ پڑھاتے تھے۔ اپنی صحت و آرام سب سے بے پرواہ ہوکر درس دیتے، شروع شروع میں جب تک قویٰ میں جان تھی، نماز صبح کے بعد سے مسلسل گیارہ بارہ بجے دن تک درس دیتے، کبھی کبھی درمیان میں پیشاب یا وضو کے لئے اٹھنا پڑتا تو اور بات تھی ظہر کے بعد سے پھر یہی مشغلہ رہتا۔ ۱۳۲۰ھ مطابق ۱۹۰۲ء سے جب قویٰ میں اضمحلال پیدا ہوگیا اور تعب و مشقت برداشت کرنے کی قوت نہ رہی تو پانچ چھ گھنٹہ روزآنہ درس دیا کرتے تھے۔ جب ضعف کچھ اور بڑھ گیا تو دو تین گھنٹہ درس دینے لگے اس کے باوجود ترمذی شریف اور بخاری شریف تقریباً ساڑھے نو ماہ میں بہ اطمینان ختم کرا دیتے۔ (۴۳)

عصر کے بعد مدرسہ کی مسجد میں ابو داؤد شریف کا سبق پڑھاتے تھے، مصلے پر

۴۲۔ مولانا سید اصغر حسین۔ حیات شیخ الہند۔ ص۔ ۱۴ ۔ ۱۵

۴۳۔ 〃 〃 〃 〃 ص۔ ۲۱

آپ تشریف فرما ہوتے اور سامنے چٹائیوں پر طلبہ بیٹھ جاتے۔ اس وقت کے درس میں بعض مدرسین مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا انور شاہ کشمیری وغیرہ بھی آکر بیٹھ جاتے تھے (۴۴)
اخیر عمر میں جب آپ مریض بھی رہنے لگے تھے اس وقت بھی وقار و اطمینان کے ساتھ آپ درس دیتے، بڑے سلیس اور نرم اسلوب میں ایک ہی لہجہ میں شروع سے آخر تک تقریر کرتے رہتے طلباء سوال کرتے اور آپ بڑے سکون کے ساتھ ان کے سوالات کا جواب اور شبہات کا ازالہ کر کے انھیں مطمئن کرتے۔

کتاب کے اصل متن پر پوری گرفت کے علاوہ شروح و حواشی پر بھی آپ کی بڑی گہری نظر تھی، بخاری شریف کے درس میں آپ شرح قسطلانی سے کام لیا کرتے تھے۔ مولانا فخرالدین صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کی روایت ہے کہ دوران درس قراءت خود ہی فرمایا کرتے تھے، کبھی کبھی عالم غنودگی میں قراءت فرماتے۔ ایک ایک ورق قراءت کر جاتے لیکن مجال نہیں کہ ایک حرف بھی رہ جائے۔ (۴۵)

بڑے اہتمام اور تیاری کے ساتھ درس دیتے تھے، طرز استدلال بڑا ہی دلکش اور دل نشین تھا، پہلے ہر مسئلہ کا اثبات قرآن پاک کی آیات، پھر احادیث، اس کے بعد آثار صحابہ سے کرتے تھے۔ (۴۶) تمام ائمہ کا احترام کرتے اور کسی امام کے حق میں سوء ادبی گوارا نہ فرماتے۔ جمع بین الاقوال والاحادیث میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے طریقہ کار پر عمل کرتے۔ شاہ صاحب کے اقوال بڑے اعتماد کے ساتھ پیش فرمایا کرتے تھے۔

شروح و حواشی پر اگرچہ آپ کی گہری نظر تھی، لیکن آپ کا درس محض شروح و حواشی سے مستفاد اور ان کے مصنفین کا ممنون احسان نہ ہوتا تھا، بلکہ ان کے مطالعہ سے ذہن کے دریچے کھل جاتے تھے، اور باری تعالیٰ عجیب و غریب مضامین عالیہ آپ کے ذہن میں پیدا کر دیا کرتا تھا، جنھیں آپ اپنی رائے اور اپنی تحقیق

۴۴۔ مفتی عزیزالرحمٰن بجنوری۔ تذکرہ شیخ الہند۔ ص۔ ۶۵

۴۵۔ " " ۔ ص۔ ۶۸

۴۶۔ " " ۔ ص۔ ۶۶

کی حیثیت سے پیش فرماتے تھے کیونکہ وہ کسی اور کے اقوال و خیالات نہ تھے۔ (۴۷)

سند حدیث

مولانا محمود حسن صاحب کی سند حدیث کا سلسلہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ پر ختم ہوتا تھا۔ اگرچہ آپ کو مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور مولانا عبدالرحمٰن صاحب محدث پانی پتی سے اجازت حدیث حاصل تھی، لیکن درس و تدریس اور قرارت حدیث میں آپ مندرجہ ذیل دو سندوں سے روایت فرمایا کرتے تھے۔

۱۔ عن مولانا الشیخ محمد قاسم عن مولانا الشیخ عبدالغنی عن مولانا الشاہ محمد اسحاق عن مولانا الشاہ عبدالعزیز عن مولانا الشاہ ولی اللہؒ۔

۲۔ عن مولانا الشیخ احمد علی (سہارن فوری) عن مولانا الشاہ محمد اسحاق عن مولانا الشاہ عبدالعزیز عن مولانا الشاہ ولی اللہ۔ رحمہم اللہ۔ (۴۸)

دارالعلوم کی صدارت اور عرصۂ تدریس

۱۳۰۵ھ مطابق ۱۸۸۷ء میں جب مولانا سید احمد صاحب دہلوی دارالعلوم چھوڑ کر بھوپال چلے گئے، تو اس وقت سے لیکر ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۲۰ء تک تینتیس چونتیس سال آپ دارالعلوم کے صدر مدرس اور شیخ الحدیث دونوں منصبوں پر فائز رہے۔

۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء میں جب آپ باضابطہ دارالعلوم کے مدرس منتخب ہوئے، اسوقت سے ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۲۰ء تقریبًا اڑتالیس سال اور اگر اس میں وہ مدت بھی شامل کر لی جائے جس میں آپ نے معین مدرس کی حیثیت سے تعلیم دی تو پچاس سال سے زائد عرصہ تک آپ نے دین اور علم دین کی خدمت و اشاعت کا گرانبہا فریضہ انجام دیا۔ (۴۹)

۴۷۔ مولانا سید اصغر حسین۔ حیات شیخ الہند۔ ص۔ ۲۵

۴۸۔ 〃 ص۔ ۲۶

۴۹۔ مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری۔ تذکرہ شیخ الہند۔ ص۔ ۷۰

۱۲۹۴ھ مطابق ۱۸۷۷ء میں مولانا محمد قاسم صاحب اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمہم اللہ کی معیت میں اگرچہ آپ حج وزیارت بیت اللہ سے مشرف ہو چکے تھے لیکن شوق اور تعلق قلبی بار بار تجدید سفر کے لئے اکساتا رہتا۔ ۱۳۰۸ھ مطابق ۱۸۹۰ء میں جب مولانا حافظ محمد احمد صاحب اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب حج کے لئے تشریف لے جا رہے تھے، اس وقت آپ نے بھی ارادہ فرمایا، لیکن مدرسہ کی ذمہ داریاں آڑے آئیں، اور آپ نے ارادہ ملتوی فرمادیا۔

۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۵ء میں پھر ارادہ فرمایا۔ قصد سفر کو اگرچہ آپ نے مختلف مصالح کی بنا پر صیغۂ راز میں رکھا تھا لیکن آہستہ آہستہ شہرت ہو گئی، لوگ اس سفر کو مختلف نظروں سے دیکھ رہے تھے، کسی نے اسے سفر ہجرت کہا، کسی نے یہ شوشہ چھوڑا کہ ترکوں کی مدد کے لئے جا رہے ہیں۔ بہرحال اس طرح ارادۂ سفر پوشیدہ نہ رہ سکا۔ رجب ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۵ء میں حسب معمول بخاری شریف ختم کرائی تو دعا میں معمول سے زیادہ مجمع تھا۔ کسے خبر تھی کہ یہ حضرت کی آخری دعا ہے۔ دعا کے بعد جو درس گاہ سے اٹھے تو عملاً خدمت تدریس کی وہ بساط جو نصف صدی سے بچا رکھی تھی اسے لپیٹ کر اٹھے۔ (۵۰)

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

۵۰۔ مولانا سید اصغر حسین۔ حیات شیخ الہند۔ ص۔ ۲۷۔ ۲۸

سلوک و تصوف

اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسان میں فطری طور پر خیر کے انتخاب اور شر سے اجتناب کی صلاحیتیں ودلیعت کر رکھی ہیں۔ مسلم و غیر مسلم کی تفریق کے بغیر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ زندگی میں کبھی نہ کبھی ایسی منزل آہی جاتی ہے جب اندر کا سویا ہوا انسان جاگ اٹھتا ہے، اور اعتراف حق کے لئے ضمیر میں کسک محسوس کرتا ہے اور بے تابانہ خیر کے حصول کے لئے لپک پڑتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مستقل شر کا ارتکاب اس دھندلے جذبے کو ظاہر نہ ہونے دے، اور فطرت سلیمہ مسخ ہو جانے کی وجہ سے اس کی صحیح رہنمائی نہ کر سکے۔ رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

"كُلُّ مَوْلُودٍ يُولَدُ عَلَى فِطْرَةِ الإِسْلَامِ فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ أَوْ يُنَصِّرَانِهِ أَوْ يُمَجِّسَانِهِ"

اس اصول کلی کے مطابق مسلمان اپنی فطرت سلیمہ پر قائم رہتا ہے، ہاں کبھی کبھی خیر سے بعد اور شر سے قرب کے باعث اس کا آئینۂ قلب گرد آلود ضرور ہو جاتا ہے، جس سے قوت ملکیہ مغلوب اور قوت بہیمیہ غالب آجاتی ہے۔

(سلوک و تصوف یہ نام ہے اسی آئینۂ قلب کی صفائی اور صیقل گری کا۔ جب کبھی قوت بہیمیہ قوت ملکیہ پر غالب آنے لگتی ہے تو فطرت سلیمہ کی محافظت اور آئینۂ قلب کی صیقل گری تصوف کی راہ سے ہوتی ہے۔)

حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری نور اللہ مرقدہ نے "تصوف" کا مقصد بیان کرتے ہوئے ایک مرتبہ فرمایا تھا۔

("خدا معلوم لوگ تصوف کو کیا سمجھتے ہیں۔ تصوف تو بس اخلاص اور عشق پیدا کرنیکا ذریعہ ہے، اور جو کام عشق کی طاقت اور اخلاص کی برکت سے ہو سکتا ہے وہ اس کے بغیر نہیں ہو سکتا"۔) (۵۱)

(اس میں شک نہیں کہ تصوف کے ذریعہ نہاں خانۂ دل سے ماسوا اللہ ہر ایک نقش مٹا دیا جاتا ہے، اور للہیت کی وہ روح پیدا ہو جاتی ہے جو کمال ایمان

۵۱۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ سوانح مولانا عبدالقادر رائے پوری ص۔ ۲۹۹

کا مقتضی ہے۔)

مشہور حدیث قدسی کے یہ الفاظ ــــ الاِحْسَانُ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ ــــ کا بلند مرتبہ سالک طریقت اور جویائے حق کی پہلی منزل ہوا کرتا ہے۔

(سلوک وتصوف اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ رذائل اخلاق کو مٹاکر اوصاف حمیدہ اس کی راہ سے پیدا ہوتے ہیں، اور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی اصطلاح میں اس کے ذریعہ قوت بہیمہ پر قوت ملکیہ کے غلبہ کا سامان کیا جاتا ہے۔)

زیر بحث شخصیت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کی زندگی پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ان کی خوش نصیبی تھی کہ شروع سے ایسا ماحول میسر آیا جس میں آئینۂ دل کے گرد آلود ہونیکا امکان نہیں رہتا۔

آنکھ کھولی تو عابدہ، زاہدہ ماں کی آغوش تربیت میں تھے، اور عالم باعمل باپ کا سایہ سر پر تھا۔ ذرا اور بڑے ہوئے، تعلیم کی ابتدائی منزل سامنے آئی تو مجسمۂ اصلاح وتقویٰ استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ عمر کی کچھ اور منزلیں طے کیں، فطرت سلیمہ اپنا صحیح رخ اختیار کر ہی چکی تھی۔ مہمات کتب حدیث پڑھنے کی نوبت آئی تو قدرت نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب جیسے باصفا بزرگ کی صحبت میسر فرمائی۔ مولانا رشید احمد گنگوہی جیسے بزرگوں کی شفقت و محبت کا محور ومرکز بنے۔

اس ماحول میں پلے اور بڑھے۔ اس عرصہ میں آپ گو تصوف کے مروجہ طریقہ (بیعت) سے نہ گذرے تھے، تاہم یہ ماحول جو آپ کو نصیب ہوا وہ خود کیا کم تھا۔

بیعت وخلافت

آپ کو ابتدا ہی، سے جو ماحول میسر تھا اس نے اگرچہ تصوف کے رواجی ہفت خواں طے کرنے سے بے نیاز کر رکھا تھا، پھر بھی ۱۲۹۴ھ مطابق ۱۸۷۷ء میں جب آپ مولانا محمد قاسم صاحب اور مولانا رشید احمد گنگوہی کی معیت میں حج کے لئے تشریف لے گئے تو مولانا محمد قاسم صاحب کے ارشاد پر حضرت حاجی امداد اللہ صاحب

مہاجر مکی سے بیعت ہوئے۔ حضرت حاجی صاحب کی دوربین نگاہوں نے اس جوہر قابل کو دیکھا، پرکھا، اور کسی مزید اصلاح و تزکیہ کی ضرورت نہ سمجھ کر خلعت خلافت اور اجازت بیعت بھی مرحمت فرمائی۔

ہندوستان واپسی کے دو تین سال بعد جب مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کا انتقال ہوگیا تو اس وقت تک حضرت حاجی صاحب کی طرف سے اجازت بیعت ہونے کے باوجود کسی کو بیعت نہ فرماتے، بلکہ خود حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے اصلاح و تربیت کا تعلق قائم رکھا۔ ہر جمعہ کو دیوبند سے پیادہ پا بائیس میل چل کر گنگوہ تشریف لیجاتے، اور اسی دن شام تک واپس تشریف لاتے۔ خود حضرت گنگوہی کمال شفقت و محبت کا معاملہ فرماتے تھے۔ (۵۲)

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب حضرت گنگوہی سے بڑی محبت کرتے تھے۔ اپنے ہندوستانی مریدوں کو ان سے اصلاح و تربیت کا تعلق قائم کرنے کی ہدایت فرماتے تھے۔ اپنی کتاب "ضیاء القلوب" میں تحریر فرماتے ہیں ۔" جو آدمی اس فقیر سے محبت اور عقیدت رکھتا ہے مولوی رشید احمد صاحب سلمہ اور مولوی محمد قاسم صاحب سلمہ جو تمام کمالات علوم ظاہری اور باطنی کو جامع ہیں بجائے میرے بلکہ مجھ سے بڑھ کے جانے۔ اگرچہ معاملہ برعکس ہے، وہ بجائے میرے اور میں بجائے ان کے ہوتا۔ ان کی صحبت غنیمت جاننی چاہئے، ان جیسے آدمی اس زمانہ میں نایاب ہیں۔" (۵۳)

ان دونوں حضرات سے تعلق و اعتماد ظاہر کرتے ہوئے ایک مرتبہ فرمایا کہ ۔۔" اگر حق تعالیٰ مجھ سے دریافت کرے گا کہ امداد اللہ کیا لیکر آیا؟ تو مولوی رشید احمد اور مولوی محمد قاسم کو پیش کردوں گا کہ یہ لیکر آیا ہوں"۔۔۔ (۵۴)

حضرت شیخ الہند کو اگرچہ مولانا محمد قاسم صاحب، مولانا رشید احمد گنگوہی، اور

۵۲۔ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی۔ تذکرۃ الرشید جلد اول۔ ص۔ ۱۵۵
۵۳۔ حاجی امداد اللہ صاحب۔ ضیاء القلوب۔ ص۔ ۲
۵۴۔ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی۔ تذکرۃ الرشید۔ دوم۔ ص۔ ۳۲۰

حضرت حاجی صاحب تینوں سے اجازت بیعت وخلافت حاصل تھی، لیکن عملاً آپ بیعت لیتے وقت حضرت حاجی امداد اللہ صاحب ہی کی طرف انتساب کرتے تھے۔ (۵۵)

مولانا گنگوہی کی حیات تک خود کسی کو بیعت نہ کرتے تھے لیکن ان کے وصال کے بعد نیاز مندوں کے اصرار پر حضرت حاجی صاحب کے انتساب سے سلاسل اربعہ میں بیعت فرمانے لگے۔

سلاسل اربعہ میں بیعت کی وجہ

حضرت شیخ الہند اور بہت سے دوسرے بزرگوں کا یہ معمول رہا ہے کہ وہ سلاسل اربعہ میں بیعت کیا کرتے تھے۔ مولانا گنگوہی کا بھی یہی معمول تھا۔ شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی نے ایک مکتوب میں مولانا گنگوہی کی اس کے متعلق وضاحت تحریر فرمائی ہے کہ سلاسل اربعہ میں بیعت کی وجہ کیا ہے؟ تحریر فرماتے ہیں۔

("حضرت اقدس قدس سرہ نے جب مجھ کو بیعت فرمایا تو چاروں خاندانوں چشتیہ۔ نقشبندیہ۔ قادریہ۔ سہروردیہ میں بیعت فرمایا۔ پھر فرمایا کہ میں نے چاروں میں بیعت اس لئے کیا ہے کہ لوگ جس طریقہ میں بیعت ہوتے ہیں اس کی تفضیلی وترجیح بلکہ غلو میں پڑ جاتے ہیں اور دوسرے طریقہ کو مرجوح قرار دیتے ہیں اور گرانے میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور یہ صحیح نہیں"۔) (۵۶)

ذاتی اخلاق وعادات

اتباع سنت

(تصوف گو حقیقتاً اصلاح اور رشد وہدایت کا ذریعہ تھا لیکن اس سے : نکار

۵۵۔ مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری۔ تذکرہ شیخ الہند۔ ص۔ ۹۹

۵۶۔ " " ۔ص۔ ۱۰۰

نہیں کیا جاسکتا کہ اس کے نام پر غلط رسوم و رواج اور بدعات نے مذہب کا لبادہ اوڑھ لیا تھا اور تصوف کے نام پر بد باطنوں نے وہ سب کچھ کر ڈالا جسے مذہب و اخلاق تو کیا عام شرافت انسانی سے بھی کوئی علاقہ اور واسطہ نہیں یہی وجہ ہے کہ ہر مجرم ضمیر نے اپنے جرم کو ہلکا دکھانے کے لئے تصوف کے پردے میں پناہ لی۔ چنانچہ اصلاح و تزکیہ کے بجائے فساد و بداطواری نے ترقی کی۔ اس کمزور پہلو کے باوجود تصوف کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ اپنے اصل کے اعتبار سے بہرحال صالح خمیر سے بنا ہے ۔ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَ فَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ ۔

اس کمزوری کی وجہ صرف ایک ہے ۔ سرچشمۂ فیض و ہدایت قرآن کریم اور سنت نبوی سے بعد۔ سنت نبوی سے جوں جوں بعد ہوا بدعات نے گھر کرنا شروع کر دیا۔ اسی لئے جن لوگوں کا مقصود آج بھی رشد و ہدایت اور واقعی اصلاح و تزکیہ ہوتا ہے وہ اتباع سنت نبوی سے ذرا بھی گریز برداشت نہیں کرتے۔ مختلف بزرگان دین کے مکاتیب اس پر شاہد عدل ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات سے اتباع سنت نبوی کا غایت درجہ اہتمام بلکہ اس سلسلہ میں (بجا طور پر کہ حالات کا تقاضا یہی تھا) پر تشدد رویہ ظاہر ہوتا ہے۔

حضرت شیخ الہند کے یہاں بھی اسی اتباع سنت نبوی کا اہتمام تھا۔ ان پر یہ حقیقت روز روشن کی طرح آشکارا تھی کہ اوہام و خیالات کی تاریکیوں میں بھٹک کر منزل مقصود پر پہونچنا دشوار ہو جایا کرتا ہے اس لئے راستے وہی اختیار کرنے چاہئیں جو منزل حقیقی تک پہونچا دیں، اور وہ راستہ سنت نبوی سے ہٹ کر نہیں مل سکتا۔

بمصطفیٰ برسان خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی ست

شیخ الہند اوراد و وظائف تک میں اوراد مسنونہ کا اہتمام کرتے تھے۔(۵۷) لغو و لاطائل خوارق عادات اور بے سند کرامتوں کے ذکر سے سخت احتراز

۵۷۔ مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری۔ تذکرہ شیخ الہند۔ ص۔ ۱۰۱

فرماتے تھے۔

ایک نکتہ

کتنے امور ایسے ہوتے ہیں کہ ہم سب دیکھتے ہیں لیکن ان کی گہرائی اور تہہ تک پہونچنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہوتی، یا اس قدر معمولی ہوتے ہیں کہ ان کی طرف توجہ ہی مبذول نہیں ہوتی۔ ذیل میں ایسے ہی ایک عام مسئلہ سے متعلق حضرت شیخ الہند کی نکتہ رسی کی ایک مثال نقل کر رہے ہیں ۔ یہ بات بہتوں کے ذہن میں آتی ہوگی اور کتنے اللہ کے بندوں کو یہ صورت حال بےچین کر جاتی ہے مگر مرض کی جڑ تک کسی کا خیال نہیں جاتا۔ حضرت شیخ الہند نے اس کی بہت صحیح گرفت فرمائی ہے۔ مولانا عاشق الٰہی سے ایک گفتگو میں فرمایا۔

"وجہ کیا ہے کہ پہلے جو نتیجہ پیسوں میں نکلتا تھا وہ آج ہزاروں میں بھی نہیں نکلتا۔ ذرا سکوت فرماکر خود ارشاد فرمایا کہ میرے خیال میں اس کی وجہ یہ آتی ہے کہ اس زمانہ میں حلت و حرمت کا احترام مسلمانوں کے قلوب سے جاتا رہا، اور حب مال سے روپیہ کمانے کی فکر میں حدود شرعیہ کا تذکرہ بھی لوگوں کو ناگوار گذرنے لگا۔ اس لئے پہلے جو کچھ مدرسوں میں آتا تھا اگرچہ مقدار میں قلیل ہوتا تھا مگر حلال خالص اور محنت و ریاضت کا کمایا ہوا بابرکت آتا تھا، لہٰذا اس کے ثمرات بھی شیریں اور بابرکت مرتب ہوتے تھے۔ اور آج گو مقدار میں کثیر آتا ہے مگر اس میں اکثر وہ حصہ ہوتا ہے جس میں شریعت کے جواز و عدم جواز کا لحاظ نہیں رکھا گیا، لہٰذا وہ یہاں آکر بھی مٹی میں ملانے کے قابل ہوتا ہے، اور فضول تعمیرات میں صرف ہوتا ہے، یا زوائد امور میں خرچ ہو جاتا ہے۔ چھنٹ چھٹا کر جو حلال بچتا ہے وہ مد تعلیم میں صرف ہوتا ہے مگر وہ اقل قلیل ہے، لہٰذا علم موروث عمل کا ثمرہ بھی اقل قلیل ــ اَلْخَبِیْثَاتُ لِلْخَبِیْثِیْنَ وَالْخَبِیْثُوْنَ لِلْخَبِیْثَاتِ وَالطَّیِّبَاتُ لِلطَّیِّبِیْنَ وَالطَّیِّبُوْنَ لِلطَّیِّبَاتِ"۔ (۵۸)

آج بھی یہ شکایت سننے میں آتی ہے۔ شیخ الہند کی بات سے معلوم ہوتا ہے کہ عوام الناس کا یہ شکوہ ان کے سامنے بھی تھا کہ علماء کا معیار پست کیوں ہوتا جارہا ہے، اسی کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ ــ

"عوام شکایت تو کرتے ہیں کہ اب علمار ایسے کیوں نہیں جیسے پہلے تھے مگر اس پر غور نہیں کرتے کہ ان کا کمایا ہوا پیسہ جو مدرسوں میں آتا ہے، ویسا خالص اور پاک نہیں جیسا کہ ان کے بزرگوں اور اسلاف کا تھا۔ وہ اپنا کسب مال اللہ کی مرضی کے موافق کریں اور اس کو طلبہ کا خورد ونوش بنائیں تو پھر علمار پہلے جیسے دیندار اور محتاط اور مخلص اللہ والے، خاشع وخاضع تیار ہونے کیا دشوار ہیں"۔ (۵۹)

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

۵۸۔ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی۔ تذکرۃ الخلیل۔ ص۔ ۱۱۵

۵۹۔ " " "۔ ص۔ "

عبادت کا شوق و انہماک

حضرت شیخ الہند کو جس زاویہ سے بھی دیکھئے، ہر میدان میں سب سے آگے، سب سے فائق۔ علم کا میدان ہو یا سیاست کی رزمگاہ، بزرگوں کی مجلس ہو یا اہل علم کی محفل، ہر جگہ چھائے، ہر قافلہ کے سالار، زندگی میں متصوفانہ رنگ ڈھونڈئے تو وہ بھی غالب — شیخ الہند جیسی ہمہ جہتی صفات کے لوگ کم ہوتے ہیں۔ مشاغل و مصروفیات پر نظر ڈالئے تو بے اختیار کہنا پڑتا ہے ــ "بِاللَّیْلِ رُہْبَاناً وَ بِالنَّہَارِ فُرْسَاناً" کی جیتی جاگتی تصویر ہیں۔

طالب علمانہ مصروفیات، عبادات میں انہماک کا موقع کم دیتی ہیں، لیکن حضرت شیخ الہند تعلیمی زندگی ہی سے قیام لیل کے پابند تھے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی کی خدمت میں رہ کر جس طرح دن تعلیم و تعلم میں صرف ہوتا، اسی طرح رات اوراد و وظائف اور عبادات کی نذر ہوتی۔

تعلیمی زندگی سے فراغت کے بعد جب کہ پورا دن درس و تدریس میں صرف فرماتے، اس وقت بھی یہ اہتمام تھا کہ شب میں دو بجے اٹھ جاتے، اور صبح تک نوافل اور وظائف میں مشغول رہتے۔ کبھی کبھی نوافل کے بعد قدرے آرام فرما لیتے اور فجر کے لئے تجدید وضو فرماتے۔ (۶۰)

ایک طرف مشاغل و مصروفیات میں اضافہ ہو رہا تھا، دوسری طرف ذوق و شوق عبادت میں بھی فراوانی تھی۔ دن بھر تعلیمی، سیاسی، مصروفیات کے علاوہ دیگر ذمہ داریوں کا خیال، مہمانوں کی کثرت اور ان کی دیکھ بھال، سب ایک طرف، مگر آپ کے اہتمام عبادات میں ذرہ برابر کمی نہ ہوتی۔ صلوٰۃ لیل کا اہتمام بہت زیادہ فرماتے تھے، لیکن ساتھ ہی اس کے اخفاء کا بھی خیال رکھتے تھے۔ بسا اوقات دوسروں کو سوتا دیکھ کر نیت باندھ کر کھڑے ہو جاتے، لیکن جہاں کہیں، کسی کی بیداری کی آہٹ محسوس ہوئی، فوراً لیٹ جاتے، کہ یہ نہ محسوس ہو کہ آپ مصروف

۶۰۔ مولانا سید اصغر حسین۔ حیات شیخ الہند۔ ص۔ ۸۸؛

عبادت تھے۔ (۶۱)

رمضان المبارک میں یہ اہتمام اور بڑھ جاتا تھا۔ پوری رات مصروف عبادت رہتے۔ تراویح کے بعد کچھ دیر حاضرین سے خطاب فرماتے۔ ظاہر ہے گفتگو دین و مذہب اور تعلق مع اللہ کے دائرہ سے باہر نہ ہوتی ہوگی۔ اس کے بعد چند منٹ آرام فرماکر پھر نوافل کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے، مولانا خود حافظ قرآن نہ تھے، کوئی دوسرا سناتا۔ دو چار پارے پڑھ کر ایک حافظ آرام کرتا تو دوسرا شروع کردیتا۔ حافظ بدلتے رہتے لیکن مولانا اپنی جگہ جمے رہتے، تمام رات یہی اہتمام رہتا۔ جذب و شوق کا یہ پیکر باری تعالیٰ کے حضور کھڑا رہتا یہاں تک کہ "حتیٰ تورمت قدماہ"۔ کی سنت نبوی پر عمل کی صورت پیدا ہو جاتی۔ (۶۲)

آخر عمر میں جب قویٰ ضعیف ہو گئے تھے عبادات کے انہماک میں اس وقت بھی کمی نہ آئی تھی، زیادہ دیر کھڑے رہنے سے پاؤں پر ورم آجاتا، لیکن صحت و مرض سے بے نیاز ہوکر یہ بندہ اپنے مولا کے حضور مصروف راز و نیاز ہوتا۔

ایک مرتبہ رمضان المبارک میں پاؤں پر ورم آیا ہوا تھا۔ اس کے باوجود زیادہ سے زیادہ قرآن مجید سننے کے لئے مستعد تھے۔ تکلیف کا خیال کرکے مستورات نے مولوی حافظ کفایت اللہ صاحب کے پاس کہلا بھیجا کہ آج کسی بہانہ سے کم مقدار میں پڑھائیں۔ انھوں نے تھوڑا پڑھ کر کسلمندی اور گرانی کا عذر کردیا۔ مولانا بھی آرام کے لئے گئے اور خود حافظ صاحب بھی آرام کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد انھیں محسوس ہوا کہ کوئی آہستہ آہستہ ان کے پاؤں دبا رہا ہے، دیکھا تو خود حضرت شیخ الہند تھے۔ حافظ صاحب کے چہرے بشرے پر شرمندگی کے آثار دیکھ کر مولانا نے فرمایا۔

"بھائی کیا حرج ہے، تمہاری طبیعت اچھی نہیں، ذرا راحت آجائے گی۔ (۶۳)

۶۱۔ مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری۔ تذکرہ شیخ الہند۔ ص۔ ۱۰۵ - ۱۰۶

۶۲۔ " " ص۔ ۱۱۰

۶۳۔ مولانا سید اصغر حسین۔ حیات شیخ الہند۔ ص۔ ۱۸۹

معمولات عبادت میں مالٹا کی اسارت اور قید و بند بھی کچھ تبدیلی نہ کرا سکیں۔ شب میں عموماً ایک بجے یا ڈیڑھ بجے تک اٹھ جاتے پیشاب کے لئے جاتے، پھر آ کر وضو فرماتے اور نوافل میں مشغول ہو جاتے۔ نوافل سے فارغ ہو کر مراقبہ اور ذکر خفی میں مشغول رہتے۔ ہزار دانہ تسبیح سرہانے رکھی رہتی۔ اسے بھی التزام سے پڑھتے تھے۔ مولانا موصوف کو سردی برداشت نہ ہوتی تھی، لیکن اس کے باوجود عبادت کے اس انہماک میں کبھی بھی فرق نہ آیا۔ رات کے علاوہ دن کے بھی مختلف اوقات کو اوراد و وظائف میں صرف فرماتے۔ (۶۴)

شیخ الہندؒ اپنے گھر میں
اخلاق و عادات کی ایک جھلک

شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے علم و فضل کی دولت کے ساتھ اہل ثروت اور صاحب جائداد بھی بنایا تھا۔ شہر میں آپ کے کئی مکان اور دو کانیں تھیں۔ مولانا کے مکان کے زنان خانے والے حصہ کو شیشوں والی حویلی کہا جاتا تھا۔ مولانا ذوالفقار علی صاحب کے انتقال کے بعد ترکہ میں جب تقسیم ہوئی تو زنانہ مکان شیخ الہند اور مولانا حامد حسن صاحب کو ملا، اور مردانہ حصہ مولوی محسن صاحب کو ملا، اور مسجد شیخ کے پاس والا مکان جو مسجد کے مشرق جانب ہے وہ مولانا حکیم محمد حسن صاحب کو ملا۔ مکان کے علاوہ شیخ الہند کے پاس ترکہ کی دوسری جائداد باقی نہ رہ سکی، کیوں کہ شیخ الہند بڑی دریا دلی اور فیاضی سے مہمان نوازی کرتے تھے، اسی میں آپ کی ساری جائداد فروخت ہو گئی۔ (۶۵)

۶۴۔ مولانا سید حسین احمد مدنی۔ اسیر مالٹا۔ ص۔ ۱۴۷۔ ۱۴۸

۶۵۔ حسب روایت چھوٹی صاحبزادی۔

شیخ الہند کی اولاد

شیخ الہند کی عمر بائیس سال تھی کہ مولانا ذوالفقار علی صاحب نے ایک معزز وشریف خاندان کے متوسط الحال رئیس منشی فہیم الدین صاحب کی صاحبزادی سے اپنی عزت و وجاہت کے شایان شان اہتمام کے ساتھ شادی کردی۔ مولانا کی اہلیہ نے اپنے حسن انتظام اور تدبر سے مولانا کو گھر کے معاملات سے بے فکر و مطمئن کر دیا۔ مولانا کے ایک صاحبزادے اور کئی صاحبزادیاں کمسنی میں وفات پا گئیں۔

ان کے بعد چار صاحبزادیاں اور ہوئیں اور ان سب کی شادی اپنی حیات میں آپ نے کی۔ چاروں صاحبزادیاں یہ ہیں۔

۱۔ ام ہانی۔ ۲۔ میمونہ۔ ۳۔ حسینہ۔ ۴۔ بتول

سب سے بڑی صاحبزادی ام ہانی کا انتقال مولانا کی زندگی ہی میں ہوگیا تھا ان کے دو لڑکے مولانا محمد عثمان صاحب اور حافظ محمد حیات صاحب ہیں۔

دوسری صاحبزادی میمونہ کے صرف ایک صاحبزادے ہیں، اور تیسری صاحبزادی حسینہ لاولد تھیں۔

چوتھی صاحبزادی محترمہ بتول صاحبہ ابھی بقید حیات ہیں عمر تقریباً بیاسی سال ہے ان کے دو لڑکے مولوی ہارون صاحب (مدرس دارالعلوم) اور دوسرے ممنون صاحب ہیں ان کے علاوہ تین صاحبزادیاں بھی ہیں۔ مدرسہ عبدالرب کشمیری گیٹ دہلی میں مولانا کے بھانجے محبوب الٰہی صاحب صدر مدرس اور نواسے مدرس دوم ہیں۔

لڑکیوں کی شادی

حضرت شیخ الہند کے لڑکے تو کوئی بڑے ہوئے نہیں، چار لڑکیاں بڑی ہوئیں۔ جن کی آپ نے شادی کی ان شادیوں میں قابل ذکر بات یہ تھی کہ آپ نے سنت کا انتہائی اہتمام فرمایا اور بڑی سادگی کے ساتھ چاروں صاحبزادیوں کی شادی کی۔

کبھی جامع مسجد میں اعلان کر کے لڑکے کو بٹھالیا اور نکاح کر دیا، کبھی مدرسہ میں فیصلہ فرمایا اور وہیں نکاح فرما دیا۔ چنانچہ دوسری صاحبزادی میمونہ صاحبہ کا نکاح اس طرح فرمایا کہ بخاری شریف کے درس سے فارغ ہو کر مولوی محمد شفیع صاحب سے فرمایا کہ ٹھہرو ابھی مت جاؤ، اوپر گئے اور مہتمم صاحب اور بعض دوسرے علماء کی موجودگی میں نکاح پڑھا دیا۔ لوگوں کو اطلاع بعد کو ہوئی۔ چھوٹی صاحبزادی (بتول صاحبہ) کا نکاح اس طرح ہوا کہ عید کی نماز پڑھ کر سب لوگ قاضی مسعود صاحب کے دادا کی تعزیت میں جا رہے تھے، مولانا نے گھر میں فرمایا کہ میں بتول کی شادی کرنے جا رہا ہوں، وہاں جا کر قاضی مسعود صاحب سے نکاح کر دیا، رخصتی بعد میں ہوئی۔ (۶۶)

گھر والوں کے ساتھ آپ کا معاملہ

عجیب بات ہے کہ اس زمانہ میں لوگ دین داری کا معیار اور کمال تقویٰ یہ سمجھتے ہیں کہ گھر والوں سے، خاندان اور اعزاء و اقرباء سے کٹ کر الگ تھلگ رہا جائے، جو جس قدر گھر کے معاملات سے بے فکرا ہو، اسی قدر قابل احترام ہے۔ حالانکہ بزرگان دین اور خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ اس سے بالکل مختلف نظر آتی ہے۔ اعزاء و اقرباء سے لاپرواہی اور بے نیازی کیا معنی، وہاں تو سب سے تعلق اور حسن معاملہ اور ان کی ادنیٰ تکلیف پر بے چینی کا منظر نظر آتا ہے۔

شیخ الہند کی زندگی بھی سلف صالحین اور خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع میں ایسی ہی تھی۔ تمام علمی و سیاسی مصروفیات کے باوجود گھریلو زندگی سے بے تعلق نہ تھے، گھر والوں کے ساتھ تعلق اور ان کی فکر ہر جگہ رہتی تھی۔

آخری سفر حج کے دوران جب آپ کا قیام مکہ معظمہ میں تھا تو ڈاکٹر انصاری نے آپ کے بھانجے اور داماد قاضی مسعود صاحب کو ایک ہزار روپئے لیکر مکہ معظمہ بھیجا، وہ پہونچے تو مولانا نے ایک ایک فرد کی نام بنام خیریت دریافت فرمائی۔ مولانا عزیز گل صاحب جو آپ کے رفیق سفر تھے انھوں نے یہ سن کر کہا کہ مولانا آپ خدا کے مخالف

۶۶۔ حسب روایت چھوٹی صاحبزادی۔

بندے ہوکر گھر والوں کا اتنا خیال کرتے ہیں ۔ شیخ الہند اٹھ کر بیٹھ گئے اور ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ جو اللہ کا جتنا پیارا بندہ ہوگا، اپنے گھر والوں کو اتنا ہی محبوب رکھے گا ۔ " خیارکم خیارکم لاہلیکم " ۔ (۶۷)

توکل علی اللہ

تمام فضلاء و بزرگان دین کا یہ معاملہ رہا ہے کہ ان سے جو ہو سکا انھوں نے کیا، اور نتائج کو اللہ کے بھروسہ پر چھوڑ دیا۔ اللہ پر توکل اور اس کی کارسازی پر یقین کی صفت حضرت شیخ الہند کی زندگی میں بھی بہت نمایاں تھی ۔

صاحب زادی صاحبہ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ کھانا پک چکا تھا کہ کچھ مہمان آ گئے، مولانا اندر تشریف لائے اور اپنے سامنے کھانا نکلوایا اور لے گئے سب نے آسودہ ہوکر کھایا ۔ صاحبزادیوں کے کہنے پر دم فرما دیتے۔ البتہ خود سے اظہار نہ کرتے ۔ بارہا ایسا ہوا کہ کھانا ہو چکا تھا اور مہمان آگئے، لڑکیوں نے کہا کہ کھانا بہت ذرا سا ہے۔ آپ فرماتے کہ اسی کو گرم کر دو، خود کھڑے رہتے اور نکلوا کر لے جاتے، بہ اطمینان سب لوگ کھا کر اٹھتے ۔ (۶۸)

بیرون ملک کے آخری سفر پر روانہ ہوتے وقت اہلیہ نے پوچھا کہ کس پر چھوڑ کر جاتے ہو؟ آپ نے بڑے اعتماد اور اطمینان سے کہا کہ جس حال میں چھوڑ کر جا رہا ہوں اسی حال میں آکر ملوں گا، چنانچہ آپ کی روانگی کے بعد آپ کی اہلیہ بخیر اور مطمئن رہیں ۔ رہائی کے بعد ہندوستان آتے وقت جب حضرت مدنی کا تار آیا کہ ہم لوگ آرہے ہیں اس کے بعد بیمار ہوگئیں، اور شیخ الہند کے پہونچنے کے کچھ دن بعد انتقال فرما گئیں ۔ (۶۹)

مولانا کے طویل عرصۂ سفر میں ڈاکٹر انصاری و حکیم عبدالرزاق صاحب نے مولانا کی اہلیہ کی برابر خبر گیری کی اور ان کا خیال رکھا ۔ (۷۰)

۶۷۔ حسب روایت چھوٹی صاحبزادی ۔

۶۸۔ " "

۶۹۔ " "

مہمان نوازی

اس سے پہلے گذر چکا ہے کہ شیخ الہند کو ترکہ میں ملی ہوئی جائداد مہمان نوازی میں ختم ہوگئی۔ شیخ الہند مہمانوں کے راحت و آرام کا بہت زیادہ خیال فرماتے تھے۔خود ہی مہمانوں کی خدمت فرماتے۔ زنان خانے سے ان کے لئے کھانا خود لیکر آتے۔ بستر لاکر بچھاتے۔ اسارت مالٹا کے بعد جب وطن واپس ہوئے تو کافی نحیف و نزار ہو چکے تھے، اس کے باوجود یہ حال تھا کہ رات کو کھانا کھلانے اور عشاء کی نماز کے بعد ایک ایک مہمان سے جاکر دریافت فرماتے کہ کوئی ضرورت تو نہیں؟ ان دنوں مجمع بھی کافی رہتا تھا لیکن سب کے راحت و آرام کے لئے اہتمام فرماتے۔ (۷۱)

تواضع اور خاکساری

بزرگوں کے خصائص میں ایک اہم خصوصیت تواضع رہی ہے اپنے کو اس قدر مٹا دینا کہ "اَنا" کا شائبہ بھی باقی نہ رہے حضرت شیخ الہند فرمایا کرتے تھے کہ ۔"اگر اللہ تعالی نے ہمیں علم سے نہ نوازا ہوتا تو اپنے کو اس قدر مٹاتے کہ محمود نام کا کوئی رہ نہ جاتا"۔ (۷۲)

حضرت شیخ الہند کی زندگی میں بڑی سادگی تھی۔ گفتار و کردار، عادات و اطوار، اور لباس، کسی طور پر برتری کا اظہار نہ فرماتے۔ غرباء اور معمولی آدمیوں میں رہنا پسند فرماتے تھے، امراء اور اہل دنیا کے تکلفات سے گھبراتے تھے۔ سفر میں تیسرے درجے میں سفر کرنا پسند تھا، مگر اس کے باوجود طبیعت میں چونکہ صفائی بہت تھی اس لئے عموماً کافور ساتھ رکھتے، کیونکہ بدبو سے سخت تکلیف ہوتی تھی۔ گلاب کا عطر بہت پسند تھا۔ (۷۳)

ایک مرتبہ مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کی درخواست پر مدرسہ جامع العلوم

۷۰۔ حسب روایت چھوٹی صاجزادی۔

۷۱۔ مولانا سید اصغر حسین۔ حیات شیخ الہند۔ ص۔ ۱۲۷

۷۲۔ حسب روایت چھوٹی صاجزادی۔

۷۳۔ مفتی عزیز الرحمن بجنوری۔ تذکرہ شیخ الہند۔ ص۔ ۱۲۱

کان پور کے جلسۂ دستار بندی میں وعظ فرما رہے تھے۔ بڑا اہم مضمون بیان فرما رہے تھے، جس میں معقول کا ایک خاص رنگ تھا، تقریر کے دوران دیکھا کہ مولانا لطف اللہ صاحب علی گڈھی بھی آکر بیٹھ گئے، فوراً تقریر بند کر کے بیٹھ رہے، مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی نے دریافت فرمایا کہ بیٹھ کیوں گئے، یہی تو وقت تھا تقریر کا، فرمایا کہ ہاں مجھ کو بھی یہی خیال آیا اسی لئے تو بند کر دیا کہ یہ تو اظہار علم کے لئے ہوگا نہ کہ اللہ کے لئے۔ (۷۴)

طلبہ سے بڑی محبت فرماتے۔ ایک مرتبہ کسی طالب علم نے کہا کہ ایک چارپائی کی ضرورت ہے، فرمایا اچھا شام کو لیجانا۔ اتفاق سے اس طالب علم کو آنے میں دیر ہوگئی آپ خود گھر سے چارپائی اٹھا کر لے چلے، مسجد چھتہ کے پاس اس طالب علم سے ملاقات ہو گئی، فرمایا بہت دیر تک انتظار کیا، میں سمجھا شاید تم بھول گئے ہو۔ یہ کہہ کر چارپائی اس کے حوالہ کر دی۔ (۷۵)

کھانے میں آپ کی عادت

شیخ الہند نے خورد و نوش کے معاملہ میں کبھی تکلف و اہتمام سے کام نہ لیا۔ جس وقت جو مل رہا کھالیا۔ دعوت کرنیوالوں کی دعوتیں حتی الامکان رد نہ فرماتے۔ دعوتوں میں اس کا خیال رکھتے کہ کوئی معمولی چیز بھی ہوتی تو شوق سے کھاتے تھے، کہ میزبان کو گرانی یا اس کی حوصلہ شکنی نہ ہو۔

کھانے میں عموماً ایسی چیزیں پسند فرماتے تھے جن کی عمدگی کا ذکر قرآن یا حدیث میں مذکور ہے۔ چنانچہ سرکہ بہت پسند فرماتے تھے کیونکہ حدیث میں آیا ہے "نعم الادام الخل" ایک دفعہ آپ کے بدن پر پھنسیاں نکلی ہوئی تھیں، اطباء نے سرکہ کا استعمال منع کر دیا تھا اس کے باوجود چکھ ضرور لیتے تھے۔

گوشت کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ "أَطْيَبُ الطَّعَامِ اللَّحْمُ" اس لئے گوشت بھی رغبت سے کھاتے تھے، قربانی کا گوشت تو اور بھی پسندیدگی کے

۷۴۔ مولانا سید اصغر حسین۔ حیات شیخ الہند۔ ص۔ ۱۴۷

۷۵۔ مفتی عزیز الرحمن بجنوری۔ تذکرہ شیخ الہند۔ ص۔ ۱۱۴ – ۱۱۵

ساتھ نوش فرماتے۔اس کا باریک پارچہ نمک لگاکر خشک کرا لیتے اور کافی دنوں تک اس کو استعمال کرتے۔

شہد کے متعلق قرآن میں آیا ہے۔ "فِیْہِ شِفَاءٌ لِّلنَّاسِ"۔ چنانچہ شہد بھی بہت مرغوب تھا۔ حضرت مدنی وغیرہ مدینہ منورہ سے زمزم کا کنستر کبھی کبھی بھیجا کرتے تھے، اس وقت آپ بہت خوش ہوتے، خود بھی پیتے اور دوسروں کو بھی پلاتے۔

زیتون کو قرآن میں "شَجَرَۃٍ مُّبَارَکَۃٍ" کہا گیا ہے۔ رسول اکرمؐ کا ارشاد گرامی ہے "کُلُوا الزَّیْتَ وَادَّھِنُوْا بِہٖ فَاِنَّہٗ مِنْ شَجَرَۃٍ مُّبَارَکَۃٍ" روغن زیتون کا کثرت سے استعمال فرماتے۔ مالٹا کی اسیری کے دوران بہت استعمال فرمایا۔ فرماتے تھے کہ اگرچہ لوگ ہندوستان سے گھی بھیجدیتے تھے مگر مجھے تو گھی کے مقابلہ میں یہی پسند تھا۔میں ایک پیالی میں بھر کر اپنے پاس رکھ لیتا تھا، کبھی انگلی سے کان میں لگا لیتا، کبھی ناک میں، اور کبھی سر پر مل لیتا۔ (۷۶)

پان کی عادت

حضرت شیخ الہند کو پان کی بہت عادت تھی۔اس کے ساتھ خوشبودار تمباکو بھی استعمال فرماتے تھے۔پان کا ڈبہ اور چھالیہ کا بٹوہ اکثر سفر و حضر میں ہمراہ رہتا تھا۔اثناء درس میں بھی کئی مرتبہ پان کھاتے اور منہ میں پان لیکر بلا تکلف تقریر فرماتے تھے۔ مالٹا میں پان چھوڑنے کا ارادہ فرمالیا تھا مگر ہندوستان سے چھالیہ اور خشک پان وہاں پہونچتے رہے اس لئے چھوڑنے کی تکلیف نہ اٹھانی پڑی۔ اسی زمانہ میں فرمایا کہ ہندوستان پہونچکر تھوڑے عرصہ کے بعد پان چھوڑ دوں گا۔یہ ارادہ قدرت نے اس طرح پورا کرادیا کہ یہاں پہونچنے کے کچھ ہی عرصہ بعد حضرت نے دنیا ہی چھوڑ دی۔ (۷۷)

دولت دنیا سے بے نیازی

۔ انسان جب تک دنیا کی دولت کے پیچھے بھاگتا رہتا ہے اس وقت تک دولت اس

۷۶۔ مولانا سید اصغر حسین۔ حیات شیخ الہند۔ ص۔ ۱۶۱ - ۱۶۳

۷۷ 〃 〃 ص۔ ۱۶۴

سے بھاگتی ہے لیکن اگر وہی انسان اس سے بے نیازی کا رویہ اختیار کر لیتا ہے تو دولت وثروت قدموں میں لوٹتی ہے۔ اہل اللہ کا معاملہ ہمیشہ یہ رہا ہے کہ انھوں نے دولت دنیا کی طمع تو کیا پھر آنکھ بھر اسے دیکھنا بھی پسند نہیں کیا ہے یہی وجہ ہے کہ بہ ظاہر کچھ بھی پاس نہ ہوتے ہوئے اللہ تعالیٰ غیب سے ان کی ضروریات پوری فرماتا ہے۔ "وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ"۔

سلف صالحین کی طرح حضرت شیخ الہند نے کبھی دولت دنیا کی پرواہ نہ کی، لوگ روپئے آپ کی خدمت میں پیش کر کے جاتے تھے اور آپ انھیں کھول کر دیکھنا بھی پسند نہ کرتے تھے کہ کتنا ہے؟ کبھی تکیہ کے نیچے ڈال دیا، کبھی مولوی عزیز گل صاحب کی تحویل میں دے دیا، کبھی حساب لینے کی ضرورت نہ پڑتی تھی، کسی نے روپئے کا ذکر کر دیا تو پیشانی پر شکن آجاتی تھی، اور صاف ناگواری کے آثار ظاہر ہوتے تھے۔ (۷۸)

مالٹا سے رہائی اور واپسی

۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۵ء میں شیخ الہند نے سفر کیا تھا جس پر کسی کو ہجرت کا شبہ ہوا، اور کسی نے یہ کہا کہ ترکوں کی مدد کا ارادہ لے کر جا رہے ہیں۔ اسی سفر میں دوسرے حج کے بعد آپ اور آپ کے رفقاء کی گرفتاری اور اس کے بعد طویل اسیری کا حادثہ پیش آیا۔ (جس کی تفصیل آئندہ باب میں پیش کیجارہی ہے)۔

کئی سال کی اسیری سے رہائی کے بعد رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ مطابق جون ۱۹۲۰ء کو آپ کا جہاز بمبئی پہونچا۔ بمبئی میں مختصر قیام کے بعد حضرت شیخ الہند مع رفقاء کے ایک دن دہلی میں ڈاکٹر انصاری کے یہاں قیام فرماکر، ۲۷ر رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۴ر جون ۱۹۲۰ء کو دیوبند پہونچ گئے۔ (۷۹)

۷۸۔ مولانا سید اصغر حسین۔ حیات شیخ الہند۔ ص۔ ۱۶۵
۷۹۔ مفتی عزیز الرحمن بجنوری۔ تذکرہ شیخ الہند۔ ص۔ ۱۸۱-۱۸۲

ہندوستان سے باہر رہ کر کئی سال کے بعد شیخ الہند تشریف لائے تھے، دیوبند میں کچھ عرصہ قیام فرماکر ملک کے مختلف شہروں کا سلسلۂ سفر شروع فرمایا۔ جلد ہی سفر کے ارادہ کی ایک وجہ یہ تھی کہ قیام مالٹا کے دوران آپ کے خادم اور رفیق حکیم نصرت حسین صاحب کا انتقال ہوگیا تھا۔ ان کی بیوہ اور والدہ محترمہ کی تعزیت اوران کی دلدہی مقصود خاطر تھی۔ (۸۰)

علالت اور وفات

ذی الحجہ ۱۳۳۸ھ مطابق اگست ۱۹۲۰ء سے دیوبند میں وبائی بخار پھیل رہا تھا۔ ہر گھر میں کچھ نہ کچھ مریض تھے۔ دارالعلوم کے بہت سے طلباء اور بعض مدرسین بھی اس کا شکار ہو گئے تھے۔ حضرت شیخ الہند چونکہ خود بخیر تھے اس لئے خدام ومتوسلین کی عیادت کے لئے تشریف لیجاتے اور دعاء صحت فرماتے۔

عشرہ محرم کے بعد شیخ الہند کو بھی بخار آگیا، جس نے جلد ہی شدت اختیار کر لی۔ منجھلے بھائی حکیم مولانا محمد حسن صاحب نے دوا تجویز فرمائی، جسے قدرے تامل کے بعد استعمال فرمالیا۔

بیماری کے اس شدید مرحلہ میں اتباع سنت کا خیال دیکھئے کہ ایک دن کنویں کے قریب بیٹھ کر پچاس ڈول تازہ پانی سے غسل فرمالیا۔ ایک دن افاقہ رہا لیکن رات کو بیہوشی ہوگئی۔ چوتھے دن کسی قدر طبیعت ہلکی ہوئی۔

بیماری کی خبر سن کر دہلی سے ڈاکٹر انصاری صاحب پہونچ گئے مگر انگریزی دوا کو حضرت نے کچھ پسند نہ فرمایا، اس لئے ڈاکٹر صاحب کے بھائی حکیم عبدالرزاق صاحب تشریف لائے، ان کے اور حکیم محمد حسن صاحب کے مشورہ سے علاج شروع ہوا، رفتہ رفتہ صحت یاب ہو گئے، مگر ضعف ونقاہت بدستور باقی رہی۔

۶ر صفر ۱۳۳۹ھ مطابق ۲۰ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو دوبارہ بخار ہوگیا۔ عام طور سے یہ خیال کیا گیا کہ ضعف ونقاہت کی وجہ سے ہے، دو ایک دن میں اتر جائیگا۔ مولانا حکیم

۸۰۔ مفتی عزیزالرحمٰن بجنوری۔ تذکرہ شیخ الہند۔ ص۔ ۱۸۳

محمد حسن صاحب نے دوا تجویز فرمائی، اس سے کچھ افاقہ ہوا تو پیچش شروع ہو گئی، جس سے ضعف اور زیادہ بڑھ گیا۔

اسی دوران مولانا محمد علی جوہر اور بعض دوسرے حضرات کی استدعا پر ۱۵ صفر ۱۳۳۹ھ مطابق ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ تشریف لائے، اور اسی حال میں جلسہ کی صدارت فرمائی۔

علالت کے پیش نظر ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں وغیرہ نے علی گڑھ سے علاج کے لئے دہلی چلنے کی درخواست کی، لیکن اس وقت حضرت نے قبول نہ فرمایا اور اسی حالت میں دیوبند واپس تشریف لے گئے۔

دیوبند پہونچنے کے بعد جب مرض میں کچھ تخفیف نہ ہوئی تو ڈاکٹر انصاری صاحب وغیرہ کا پھر اصرار ہوا کہ دہلی تشریف لے چلیں چنانچہ دیوبند کے در و دیوار پر آخری نظر ڈال کر ۲۱ صفر ۱۳۳۹ھ مطابق ۴ نومبر ۱۹۲۰ء کو دہلی کا ارادہ فرمالیا۔ رخصت کرنے کے لئے بڑا مجمع اسٹیشن تک آیا اور ٹرین پر سوار کرا کے لوگ دل گرفتہ اپنے اپنے گھر واپس ہوئے۔

دہلی آنیکا اصرار ڈاکٹر انصاری صاحب کا تھا، اس لئے انھیں کی کوٹھی پر قیام رہا۔ حضرت شیخ الہند کے علاوہ تمام خدام و متعلقین جو آپ کے ساتھ تھے سب کے سب ڈاکٹر انصاری صاحب کے مہمان رہے۔ شروع میں حکیم اجمل خانصاحب کا علاج ہوا۔ لیکن مرض اب علاج معالجہ کی منزل سے بہت آگے نکل چکا تھا اور وہ منزل قریب آگئی تھی جس کے سامنے ساری تدبیریں ناکام ہوجایا کرتی ہیں۔ اسی حالت میں واپسی کی خواہش کا اظہار فرمایا، لیکن خدام اور معالجین سب نے دیوبند میں علاج کی سہولتیں حاصل نہ ہونیکا عذر کیا۔

اسی اثنار میں دہلی میں جمعیۃ العلمار کا اجلاس ہو رہا تھا، مخلصین کی خواہش پر اجلاس میں شرکت کا ارادہ فرمایا۔ خطبۂ صدارت خود لکھنے کا یارا نہ تھا۔ بیماری کا رخ دیکھ کر اطبار نے جلسہ میں جانیکی اجازت نہ دی، اس لئے خود تشریف نہ لے گئے، خطبۂ صدارت مولانا شبیر احمد عثمانی نے لکھا اور انھوں نے ہی پڑھ کر سنایا۔

مرض میں کسی دن قدرے افاقہ ہو جاتا مگر پھر وہی حالت عود کر آتی۔ ۱۵ ربیع

الاول یوم شنبہ سے حالت زیادہ تشویش ناک ہوگئی، یہاں تک کہ ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ مطابق ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء کو حالت بالکل مایوس کن ہوگئی، اسی حالت میں تھوڑی دیر کے لئے قدرے سکون ہوا تو سر اٹھا کر فرمایا کہ۔

"مرنیکا تو کچھ افسوس نہیں مگر افسوس یہ ہے کہ میں بستر پر مر رہا ہوں تمنا تو یہ تھی کہ میں میدان جہاد میں ہوتا اور اعلائے کلمۃ الحق کے جرم میں میرے ٹکڑے کئے جاتے۔" (۸۱)

لحہ بہ لحہ حالت بگڑتی جارہی تھی، شام کو سات بجے کے بعد غافل پڑے ہوئے تھے اور حاضرین آہستگی سے ذکر اللہ میں مشغول تھے، اچانک تین مرتبہ بلند آواز سے اللہ اللہ کہا۔ سورۂ یٰسین کی تلاوت شروع کی گئی، سورۃ ختم کے قریب ہوئی تو خود بخود اپنا بدن سیدھا کرلیا۔ آٹھ بجے جب کہ سورت ختم ہو رہی تھی تو حضرت نے ذرا آنکھ کھولی اور تصدیق قلبی کی تائید کیلئے زبان کو حرکت دی "اور الیہ ترجعون" کی آواز پر قبلہ رو ہوکر ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کرلیں۔ دیکھتے دیکھتے علم و حکمت کی وہ شمع جس نے نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک ظلمت کدۂ ہند کو روشن کر رکھا تھا وہ ہمیشہ کے لئے گل ہوگئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

ڈاکٹر انصاری صاحب نے مولانا مرحوم کے بھائی اور دیگر متعلقین سے دریافت کیا کہ کیا تدفین کا انتظام دہلی میں کیا جائے یا جنازہ دیوبند لیجانیکا خیال ہے؟ صاحب زادیاں دہلی نہ پہونچ سکی تھیں، اس لئے دیوبند لیجانیکی رائے ہوئی، اور دوسرے دن شام کو جنازہ دیوبند پہونچا۔

ڈاکٹر انصاری صاحب کی کوٹھی پر جب غسل دینے کیلئے تختہ پر لٹایا تو پیٹھ بالکل سیاہ ہورہی تھی، اور اس پر نشانات تھے لوگوں کو حیرت ہوئی کہ یہ کیوں کر ہے؟ آپ کے وہ رفقار جو مالٹا میں آپ کے ساتھ تھے انھوں نے اس طلسم حیرت کو توڑتے ہوئے بتایا کہ یہ نشانات ان دروں کے ہیں جو مالٹا کی اسارت میں آپ پر پڑتے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ شیخ الہند نے ہمیں ہدایت کی تھی کہ میرے سامنے ان مصائب کا جو مجھ پر ٹوٹ رہے ہیں کبھی ذکر نہ کرنا۔ شیخ الہند کی صبر و استقامت کا یہ منظر دیکھ کر حاضرین متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ (۸۲)

غسل کے بعد ڈاکٹر انصاری صاحب کی کوٹھی پر پہلی بار نماز جنازہ ادا کی گئی۔ اس کے بعد جنازہ دیوبند لیجانے کے لئے لیکر لوگ اسٹیشن کی طرف چلے۔ اسٹیشن پہونچتے پہنچتے مجمع کئی ہزار ہوگیا۔ اس لئے اسٹیشن پر ایک بار پھر نماز پڑھی گئی۔ دہلی سے روانگی کے بعد میرٹھ وغیرہ بعض اسٹیشنوں پر نماز جنازہ لوگوں نے پڑھی۔ ساڑھے سات بجے شام کو ٹرین دیوبند پہونچی۔ خلقت ٹوٹی پڑ رہی تھی، عجیب سوگواری فضا تھی، کہیں کہیں رونے چیخنے کی بھی آوازیں آجاتی تھیں۔

وفات کی اندوہناک خبر پاکر شیخ الہند کی صاحبزادیاں اور داماد دہلی کیلئے روانہ ہوگئے تھے، غازی آباد پہونچنے پر انھیں اطلاع ہوئی کہ جنازہ دیوبند جارہا ہے۔ جس ٹرین سے جنازہ دیوبند جارہا تھا وہ چھوٹ گئی جس کی وجہ سے یہ حرمان نصیب اور سوگوار قافلہ غازی آباد اسٹیشن پر رہ گیا، دیوبند پہونچنے پر ان لوگوں کی آمد کے انتظار میں تدفین کیلئے تاخیر کی گئی اور صبح کی نماز کے بعد تدفین کا اعلان کر دیا گیا۔

فجر کے بعد ایک مختصر مجمع کو چہرہ کھول کر دکھایا گیا۔ کثیر مجمع جنازہ لیکر دارالعلوم کے قبرستان کی طرف چلا۔ لوگوں کی خواہش پر آخری بار زیارت کا انتظام کیا گیا، مجمع کثیر تھا اس لئے بہت سے لوگ پھر بھی نہ دیکھ سکے۔ اس کے بعد مولانا حکیم محمد حسن صاحب باچشم نم آگے بڑھے اور آخری بار نماز جنازہ ادا کی گئی۔ نو بجے کے قریب تدفین عمل میں آئی۔ (۸۳)

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

۸۱۔ مفتی عزیز الرحمن بجنوری۔ تذکرہ شیخ الہند۔ ص۔ ۲۸۵

۸۲۔ مفتی انتظام اللہ شہابی۔ علماء حق اور ان کی مظلومیت کی داستانیں۔ ص۔ ۶۳

۸۳۔ مولانا اصغر حسین۔ حیات شیخ الہند۔ ص۔ ۱۲۷ ۔ ۱۵۴

باب سوم
شیخ الہند کے علمی کارنامے

شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کی شخصیت قریب قریب تمام شعبۂ حیات میں مخصوص انفرادیت کی حامل رہی ہے اس اعتبار سے آپ کی انہتر سالہ زندگی گوناگوں مصروفیات کی نذر ہوئی ہے۔ طبیعت کا سیاسی میلان۔ علم سے ذہنی مناسبت۔ تصوف سے قلبی اور روحانی رشتہ، یہ وہ موٹے موٹے عنوان حیات ہیں جن کے گرد شیخ الہند کی شخصیت گردش کرتی ہے بایں وجوہ ان کے ذیل میں اور بھی بہت سے گوشے آتے ہیں جو بالواسطہ ان کا مظہر یا ذہن و دماغ اور قلب و روح کی پاکیزگی کا سچا پرتو ہے۔

سیاست کی تگ و دَو، تحریک آزادی کی ہماہمی اور دارالعلوم دیوبند کی مسند نشینی کسی شخصیت کی ہمہ وقت مصروفیت کے لئے کافی ہے۔ تاہم شیخ الہند کی زندگی کسی ایک منزل یا کسی ایک کام کے لئے وقف نہیں ہو پاتی بلکہ زندگی کے عمومی سدھار اور صالح معاشرہ کی تشکیل پر ہمہ وقت آمادہ نظر آتی ہے۔ ہم بجا طور پر ان کے علمی سرمایہ کو چار اہم نقاط میں بانٹ سکتے ہیں۔

۱۔ کتابیں۔ ۲۔ فتاوی۔ ۳۔ تقریریں۔ ۴۔ شاعری۔

مولانا کی کتابیں حدیث۔ فقہ۔ علم کلام جیسے اہم موضوعات پر اپنی نوعیت کی ممتاز کتابیں شمار کیجاتی ہیں۔

تذکرہ شیخ الہند کے مصنف نے مولانا کے گیارہ کتابی سرمایہ کا ذکر کیا ہے جس کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ ادلہ کاملہ۔ ۲۔ ایضاح الأدلہ۔ ۳۔ احسن القریٰ۔ ۴۔ الجہد المقل۔ ۵۔ افادات محمودیہ ۶۔ الابواب والتراجم۔ ۷۔ کلیات شیخ الہند۔ ۸۔ حاشیہ مختصر المعانی۔ ۹۔ تصحیح ابی داؤد۔ ۱۰۔ فتاوی۔ ۱۱۔ ترجمہ قرآن پاک۔ (۱)

جب کہ مولانا سید اصغر حسین صاحب نے کل سات کتابوں کا ذکر

کیا ہے ۔ (۲) البتہ یہ بات قابلِ غور ضرور ہے کہ شیخ الہند کی تقریر بعنوان "عظمت دی" کو مولانا سید اصغر حسین صاحب "امالی" میں شمار کرتے ہیں ۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس طرح کی جمع شدہ چیزیں "امالی" کا علمی، اصطلاحی اور فنی مفہوم پورا کرتی ہیں ؟ آئندہ صفحات میں ہم شیخ الہند کے علمی سرمایہ کا تعارف اور تبصرہ پیش کر رہے ہیں ۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂
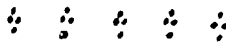
۱۔ مفتی عزیز الرحمن بجنوری ۔ تذکرہ شیخ الہند ۔ ص ۔ ۲۷ ۔ ۸۱

۲۔ مولانا سید اصغر حسین صاحب ۔ حیات شیخ الہند ۔ ص ۔ ۱۷۸ ۔ ۱۸۲

الابواب والتراجم

شیخ الہند کی تصانیف میں ایک اہم کتاب "الابواب والتراجم" ہے، یہ کتاب امیر المومنین فی الحدیث امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب صحیح البخاری کے مشکل ترین موضوع یعنی "تراجم بخاری" سے متعلق ہے۔ مقدمہ فتح الباری میں حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں۔

"وہٰذا الموضوع ہو معظم ما یشکل من تراجم ہٰذا الکتاب لہٰذا اشتہر من قول جمع من الفضلاء۔ فقہ البخاری فی تراجمہ۔ یعنی بخاری کے تراجم مشکل ترین موضوعات بخاری میں سے ہیں چنانچہ محدثین نے کہا ہے کہ امام بخاری کی فقہ ان کے تراجم میں نمایاں ہے۔"

حدیث ومتعلقات حدیث سے متعلق موضوعات پر متقدمین ومتاخرین علماء حدیث نے سیر حاصل بحثیں کی ہیں، ہندوستان میں گو علم حدیث حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے پہلے آچکا تھا اور حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنے گراں قدر حواشی سے اس میں اضافے کئے تھے، تاہم ان حضرات کی فنی بحثیں جزئیات کا احاطہ نہ کرسکیں، وجہ بھی ظاہر ہے کہ کوئی بھی کام اپنے ابتدائی مراحل میں تزئینات سے معرا ہوتا ہے، اور آگے چل کر بعد میں آنے والے اپنے پیشتر والوں کے کام کو بنیاد بناکر فن میں باریکیاں پیدا کرتے جاتے ہیں، یہ اصول کسی خاص فن یا علم کے دائرہ تک مخصوص نہیں، بلکہ قدرت کا عمومی اصول ہے، اور آج علوم وفنون کی بہتی ہوئی گنگا اسی اصول کی رہین منت ہے۔ بے شبہ ہندوستان میں شاہ ولی اللہ اور ان کے سلسلۂ درس کے اجل اساتذۂ فن نے علم حدیث کے کاروان کو آگے بڑھایا۔

بخاری کے تراجم ابواب پر خود شاہ صاحب کا ایک رسالہ ہے جو عام طور پر بخاری شریف کے ساتھ مطبوعہ شکل میں ملجاتا ہے، نیز اسی کے ساتھ حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری کا حاشیۂ بخاری بھی ہے۔ یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ مولانا احمد علی صاحب کا حاشیۂ بخاری موصوف کے ہاتھوں اپنی تکمیل کو نہ پہونچ سکا بلکہ نصف سے کچھ ہی کم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نور اللہ مرقدہ کا لکھا ہوا ہے۔

تحریری شکل میں فن حدیث سے متعلق رسالۂ "الابواب والتراجم" اور "تقریر ترمذی" کے علاوہ مولانا کی کوئی اور چیز ہمیں نہیں ملتی ۔ تقریر ترمذی ۔ کا بھی حال کچھ یونہی سا ہے ان کے تلامذہ نے اپنی یادداشت اور تیار کردہ نوٹس کی مدد سے ترتیب دیکر چھپوا دیا کہ خاص و عام استفادہ کرسکیں ۔ جہاں تک الابواب والتراجم کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی وہ تحریر قابل غور ہے جو موصوف نے اسی کتاب (الابواب والتراجم) کے صفحہ ۲ پر بشکل تمہید لکھی ہے ۔

" حضرت شیخ الہند قدس سرہ کی آخری تحریر تراجم بخاری کے متعلق تھی جس کو اس خیال سے کہ آپ کا فیض علمی تا قیامت جاری رہے شائع کیا جاتا ہے ۔ عدم مساعات مشیت ایزدی کیوجہ سے اگرچہ حضرت شیخ الہند قدس سرہ ان تمام علمی لآلی و جواہر کو کاغذ کی سطح پر نہ رکھ سکے ہوں جن کا آپ نے ارادہ کر لیا تھا لیکن بحالت موجودہ بھی یہ گنجینۂ گرانمایہ سر آنکھوں پر رکھنے کے قابل ہے، ارباب نظر اور اصحاب علم اس مختصر سی تحریر سے جو فوائد حاصل کریں گے اس سے خود ہی واقف ہو جائیں گے "

شیخ الہند کا یہ رسالہ چونسٹھ صفحات پر مشتمل ہے جن میں سے پہلا اور دوسرا صفحہ حضرت مدنی کے مقدمہ اور ڈھائی صفحہ اسمیں تمہید کے ہیں جو حضرت شیخ الہند کے اپنے تحریر کردہ ہیں پھر صفحہ ۵ کے نصف آخر سے صفحہ ۱۶ تک مولانا نے تراجم بخاری کے اصول بیان فرمائے ہیں جسکی حیثیت یقینی طور پر مقدمۃ الکتاب کی ہے، گو اسے مقدمہ کا نام نہیں دیا گیا ہے ان گیارہ صفحوں میں تراجم بخاری کے پندرہ اصول تفصیلی طور پر بیان کئے گئے ہیں نیز اسکی ابتدائی سطروں میں مولف نے یہ بات صاف کردی ہے کہ یہ اصول امام بخاری سے منقول نہیں اور نہ تو ان کے اپنے وضع کردہ ہیں بلکہ تراجم بخاری پر غور و خوض کرنیکے بعد علماء حدیث نے وضع کئے ہیں حضرت شیخ الہند مقدمہ میں لکھتے ہیں ۔

" حضرات اکابر کو اتنی گنجائش نہیں ملی کہ تراجم کی تحقیق میں زیادہ غور فرمائیں اور بالاستقلال اس خدمت کو انجام دے سکیں، اس لئے حضرات اکابر نے قدر ضرورت پر اکتفاء کو غالبا مناسب سمجھا اور اگر کسی نے غالبا ایسا کیا ہو تو ہم اس وقت تک اس

سے محروم رہے بالجملہ شروح موجودہ میں جو تراجم کے متعلق تحریر فرمایا ہے وہ ہم لوگوں کو کافی نہیں ۔ بیشک اس کی حاجت ہے کہ کوئی ایسا شخص جو اس خدمت کو انجام دے سکے، غور کامل اور جد وجہد تام سے اس کو بالاستقلال انجام دینے میں کوشش کرے اور محققین اکابر کی شروح میں غور کر کے جو بات اقرب اور احق بالقبول ہو اس کو اختیار کرے لیکن اپنی حالت جو سب کو معلوم ہے، وہ ہرگز اس قابل نہیں کہ اس مہتم بالشان خدمت کے کسی ادنیٰ درجہ میں بھی کامیاب ہو سکے محض شوق قلبی سے کام چلتا ہے (ص۴)

حافظ ابن حجرؒ عسقلانی نے مقدمہ فتح الباری میں تراجم الابواب پر اصولی اور فنی بحث کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اس موضوع پر اب تک تین شخصوں نے کام کئے ہیں ۔

لیکن ابن حجر خود بھی صراحت نہیں کرتے کہ ان کے ماسبق تین مصنفوں کے کام ان کی نذر سے گذرے ہیں ۔ ہاں ایک کے متعلق انھوں نے کچھ ایسا خیال ظاہر کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے کام سے وہ واقف ہیں، اور وہ ان کی نظر میں ہے۔ مگر لبقیہ کے بارے میں سکوت اختیار کرتے ہیں، جس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس وقت یہ مسائل متداول نہیں ہوئے تھے، اور چونکہ اب تک ان رسالوں کا نام صرف مقدمہ فتح الباری یا اسی پایہ کی لبعض دوسری کتابوں مثلاً عینی وغیرہ میں تو آتا ہے، ورنہ خاموشی ہی ہے، اسو جہ سے کوئی بعید نہیں کہ مولانا نے بھی ان کتابوں کو نہ دیکھا ہو ۔

جہاں تک ابن حجرؒ عسقلانی کا تعلق ہے تو ان کے متعلق یہ بات واضح ہے کہ انھوں نے مستقل موضوع بناکر تراجم بخاری پر کوئی کام نہیں کیا ہے ۔ مقدمہ فتح الباری میں تراجم سے متعلق ایک مختصر سی فصل انھوں نے قائم کی ہے اور لبعض موٹے موٹے اصول بتائے ہیں، البتہ جب شرح حدیث پر گفتگو کرتے ہیں تو ترجمۃ الباب سے مطابقت حدیث کی ضرور کوشش کرتے ہیں، گو ہر باب میں ان کا یہ معمول نہیں ۔ ہاہے ۔ بعد میں آنے والے شارح بخاری میں اکثریت انہیں کی خوشہ چیں ہے اور انھیں کے متعین کردہ اصول کی روشنی میں ان لوگوں نے تلاش وجستجو بھی کی ہے مگر پھر بھی ان کے اضافے قابل قدر ہیں اور اپنی انفرادیت قائم کئے ہوئے ہیں۔

حضرت شیخ الہند کے رسالہ" الابواب والتراجم " کی خصوصیت یہ ہے کہ اردو زبان میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا کام ہے، فہم حدیث کے سلسلہ میں شیخ الہند کا جو اسلوب

رہا ہے، بجائے خود ایک اہم کام ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا نے انہیں اصولوں پر تفہیم حدیث کی اساس رکھی ہے جو صحابہ کرام کا انداز فہم رہا ہے۔

حضرت شیخ الہند اگرچہ کثرت مشاغل کے باعث کام پایۂ تکمیل تک نہ پہونچا سکے تاہم چونسٹھ صفحہ کا یہ رسالہ اپنی نوعیت کا واحد رسالہ ہے اور انتہائی مفید معلومات سے پُر ہے۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

ادلہ کاملہ

ہندوستان کے انگلش دور حکومت میں منجملہ اور ہنگاموں کے ایک بڑا ہنگامہ جو اٹھ کھڑا ہوا تھا وہ تقلید اور عدم تقلید کا مسئلہ تھا۔ اور چونکہ ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت فقہ حنفی یعنی حنفی اسکول آف تھاٹ (SCHOOL OF THOUGHT) سے متاثر رہی ہے، اس وجہ سے یہاں کے مخصوص حالات میں تقلید کے مخالفین کی ٹکر متعین طور پر فقہ حنفی سے رہی ہے، اس سلسلہ میں فقہ کے مکتبوں میں خاصے اضافے ہوئے ہیں اور بعض مباحث پر سنہری اور جامع علمی بحثیں بھی سامنے آئی ہیں، خاص کر نواب صدیق حسن خاں (بھوپال) اور مولانا عبدالحئی فرنگی محلی کی باہمد گر چھیڑ چھاڑ اور علمی موشگافیوں نے ہندوستان کی فقہی زندگی کی خاصی تربیت کی ہے۔

عدم تقلید کے علم بردار خود کو سلفی یا اہل حدیث کہتے ہیں، تاریخ مذاہب فقہیہ کے مطالعہ سے یہ بات صاف طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ عہد رسالت سے لے کر ہندوستان کے اس فرقہ کے وجود میں آنے تک کوئی بھی فقہی اسکول آف تھاٹ (SCHOOL OF THOUGHT) اس نام سے نہیں پایا جاتا، البتہ کلامی فرقوں کی بھیڑ میں سلف صالحین کے عقائد پر سختی سے جمنے والے اپنے کو "فرقہ سلفی" کہا کرتے تھے، علاوہ ازیں گروہ تابعین میں جب مسائل فقہیہ کے استنباط و استخراج کے بارے میں اختلاف رائے ہوا تو وہ حضرات دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ کو "اہل الرائے" اور دوسرے کو "اہل الحدیث" کہا جانے لگا۔

بہرحال برطانوی ہند میں ایک زمانہ تھا کہ حنفیوں اور اہل حدیث کے باہمی اختلافات بڑی شدت پکڑ گئے تھے اور آئے دن ان دونوں طبقات میں تحریر اور تقریر میں مناظرے اور مباحثے ہوتے رہتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ طبقۂ اہل حدیث کے مشہور عالم مولانا محمد حسین بٹالوی نے ایک اشتہار شائع کیا جس کا مضمون اس طرح تھا۔

"ہندوستان کے احناف رفع یدین۔ قرات فاتحہ خلف الامام۔ آمین بالجہر۔ نفاذ قضاء قاضی وغیرہ دس مسئلوں کو اگر آیات قرآنی یا صحیح حدیث سے غلط ثابت کر دیں تو فی مسئلہ دس روپیہ نذر کریں گے"۔

مولانا سید اصغر حسین صاحب لکھتے ہیں کہ۔
"یہ اشتہار دیوبند میں پہونچا۔ یہ سخت حملہ عموماً تمام حنفیوں کو شاق گذر رہا تھا اور پنجاب کے کسی حنفی عالم نے اپنی وسعت کے مطابق کچھ جواب بھی لکھا تھا حضرت مولانا اور آپ کے محترم استاد مولانا محمد قاسم صاحب کو یہ ناگوار طرز اور یہ تعلی نہایت ہی ناپسند آئی، اور اہل علم کی شان سے بڑی نظر آئی۔ اس صورت میں بالالتزام گویا صاحب مذہب امام الائمہ کی توہین محسوس ہوئی اور خیال فرمایا کہ اگر معقول جواب نہ دیا گیا تو تمام احناف کیلئے باعث خفت ہوگا اور معترضین کو عوام کی ابلہ فریبی کا موقع ملے گا۔ حضرت مولانا نے استاد مکرم کی اجازت واشارہ سے قلم اٹھایا اور اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایسا جواب لکھا کہ قلم توڑ دیا"۔ (۴)

ادلہ کاملہ کا دوسرا نام اظہار الحق ہے۔ یہ دو جزء کا مختصر رسالہ مولانا شیخ الہند کی پہلی تصنیف ہے۔ چنانچہ جوانی کی شوخی عبارت میں نمایاں ہے۔ (۵)

احسن القری فی اوثق العری

ہندوستان میں وہ مسائل فقہیہ جو عرصہ دراز تک وجہ نزاع بنے رہے اور جن کے اوپر مثبت اور منفی دونوں زاویوں سے بحثیں کی گئیں ہیں، ان مہمات مسائل فقہیہ میں دیہات میں انعقاد جمعہ کا مسئلہ بھی ہے۔ اس موضوع پر اچھی اور علمی بحثیں سپرد قلم کیجا چکی ہیں اس سلسلہ کی بنیادی کتاب " اوثق العری" ہے۔ جسے ہم بے شبہ دیوبند کے مکتب فکر کی صحیح ترجمانی کہہ سکتے ہیں۔ اوثق العری نہ تو کتاب کی نیت سے لکھی گئی تھی اور نہ کتاب لکھنے کا تصور ہی مصنف کے ذہن میں تھا بات صرف اتنی تھی کہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کی خدمت میں بعض حضرات نے استفتار پیش کیا کہ دیہات میں انعقاد جمعہ جائز ہے یا نہیں۔

اس سلسلہ میں حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہ نے جو جواب تحریر فرمایا اسے بعض متوسلین نے افادۂ عام کے خیال سے طبع کرا دیا جس کے نتیجہ میں " اوثق العری" نامی کتاب وجود میں آگئی۔

دیہات میں انعقاد جمعہ کے متعلق حضرات حنفیہ کی رائے ہے کہ جمعہ جائز نہیں،

کیوں کہ ان شرطوں پر پورا نہیں اترتا جو شرطیں نماز جمعہ کے انعقاد کے لئے اساسی حیثیت رکھتی ہیں۔ اہل حدیث حضرات اس رائے سے اتفاق نہیں کرتے بلکہ وہ اس بارے میں حضرت امام احمد بن حنبل پر بعض دوسرے ائمہ کے اس قول کو کہ "نماز جمعہ کے انعقاد کے لئے نمازیوں کی تعداد کا اعتبار ہوگا" بنیاد بنا کر احادیث اور اصول کو اس پر چسپاں کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہندوستان کے فقہی اور دینی حلقوں میں خاصی معرکہ آرائی رہی ہے۔

"اوثق العری" نامی کتاب کی طباعت سے گروہ غیر مقلدین میں خاصی کھلبلی مچی، چنانچہ اس وقت دو مشہور اہل حدیث عالم مولوی محمد سعید صاحب بنارسی اور مولوی ابوالمکارم اعظمی نے خاصی خامہ فرسائی کی ہے۔

مولوی محمد سعید صاحب نے مستقل طور پر "اوثق العری" کی تردید میں ایک تحریر سپرد قلم کی جسکا نام "کسر العری باقامۃ الجمعۃ فی القری" تجویز کیا اور مولوی ابوالمکارم صاحب نے مولانا ظہیر احسن صاحب شوق نیموی کے رسالہ کا جواب لکھا جو موضوع سے متعلق تھا اور آخر میں "اوثق العری" کے دلائل پر بھی نکتہ چینی کی۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب نے مناسب سمجھا کہ ان دونوں تحریروں کا جواب دیا جائے، لیکن اس موضوع پر مستقل لکھنے کے بجائے آپ نے "اوثق العری" کی تشریح و توضیح پر اس پر بعض اضافے بھی ضروری سمجھے اور "احسن القری" کے نام سے کتاب "اوثق العری" کی شرح تفصیل سے سپرد قلم فرمائی، اس کا پورا نام یہ ہوا۔ احسن القری فی توضیح اوثق العری۔ حضرت شیخ الہند صفحہ چار پر مقدمہ میں رقم طراز ہیں۔

اس لئے ہم بھی مناسب سمجھتے ہیں کہ مولوی محمد سعید صاحب کے رسالہ کا جواب مستقل طور پر لکھا جائے اور اس کے ذیل میں حسب موقع مولوی ابوالمکارم کے استدلالات و اعتراضات کی کیفیت بھی بیان کر دی جائے۔

مذکورہ تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح مولوی ابو المکارم صاحب نے ضمناً اوثق العری کو ہدف ملامت بنایا تھا اسی طرح مولانا نے بھی ضمناً ہی ان کے دلائل کا رد کیا ہے، البتہ چونکہ مولوی محمد سعید صاحب نے مستقل رسالہ تحریر فرمایا تھا

اس لئے مولانا نے "احسن القری" میں انہیں کی کتاب اور دلائل کو بنیادی طور پر سامنے رکھ کر گفتگو کی ہے۔

احسن القری فی توضیح اوثق العری ۔ ۲۲۶ صفحوں پر مشتمل ہے جس میں آٹھ صفحات پر کتاب کا دیباچہ مشتمل ہے اور صفحہ نو سے اصل کتاب شروع ہوتی ہے۔ اس کتاب میں چند باتیں بنیادی طور پر پیش نظر رہی ہیں۔

۱۔ مولانا رشید احمد گنگوہی کی تحریر میں جو اجمال و اختصار تھا اس کی تفصیل کیجائے۔

۲۔ مغلق و مبہم عبارتوں کو شرح و بسط سے بیان کیا جائے۔

۳۔ مسئلہ کو فقہی دائرہ سے نکال کر خالص حدیث کی روشنی میں دیکھا جائے۔

۴۔ غیر مقلد حضرات سے اس سلسلہ میں جو فکری کوتاہی ہو رہی ہے اسے بتایا جائے۔

۵۔ مولوی ابوالمکارم اور مولوی محمد سعید صاحب کے طرز استدلال میں جو خامیاں ہیں ان کی نشاندہی کرتے ہوئے استنباط مسائل کے صحیح دھاروں سے روشناس کرایا جائے۔

کتاب احسن القری فی توضیح اوثق العری۔ بلاشبہ اس پایہ کی کتاب ہے کہ علماء متقدمین کے کسی بھی علمی اور فقہی رسالہ کے مقابلہ میں پیش کی جا سکتی ہے۔

الجہد المقل

حضرت شیخ الہند کی یہ معرکۃ الآراء تصنیف درحقیقت بدعت اور حامیان بدعت کی تردید اور حامیان سنت اور متبعین شریعت کی حمایت میں لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب فن مناظرہ کی ایک علمی کتاب ہے، اور جس مسئلہ پر سپرد قلم کی گئی ہے وہ مسئلہ کلامی حیثیت سے ایک اہم مسئلہ ہے۔ اس کی تصنیف کی وجہ یہ ہے کہ حضرت مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ نے اپنی کتاب "تقویۃ الایمان" میں ذات باری تعالیٰ کو امکان نظیر اور قضیہ غیر مطابق الواقع کے انعقاد پر قادر ثابت کیا ہے۔ خیرآبادی خاندان کے ہونہار چشم و چراغ مولوی فضل حق صاحب خیرآبادی نے ابطال امکان نظیر میں ایک رسالہ لکھا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نظیر کا امتناع ذاتی ثابت کیا۔

شیخ الہند کی یہ کتاب "الجہد المقل" امکان کذب باری تعالیٰ اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مثل کی تخلیق جیسے موضوع کے گرد گردش کرتی ہے یہ کتاب ۱۳۰۳ھ میں تصنیف کیگئی۔

مولانا اسماعیل شہیدؒ کے خلاف مولانا فضل حق خیرآبادی اور ان کے مکتبۂ خیال کے افراد نے جو شور محشر بپا کر رکھا تھا وہ مولوی حیدر علی صاحب وغیرہ کے جوابات سے دب گیا مگر رام پور کے عبد السمیع نامی ایک مولوی صاحب نے جو کہ ایک مدت سے میرٹھ میں بچوں کے معلم کی حیثیت سے شیخ الٰہی بخش کے در دولت پر مقیم اور بدعات کی حمایت میں منہمک تھے، انھوں نے "انوار ساطعہ" نامی ایک رسالہ ۱۳۰۳ھ میں لکھ کر نئے سرے سے سوئے ہوئے فتنہ کو جگا دیا۔

"انوار ساطعہ" میں مصنف نے امکان کذب کے قائلین اور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اخوت کے قائلین جواز اور وتر کی ایک رکعت نماز پڑھنے والوں کو ہدف ملامت بنایا۔ چونکہ مولوی عبد السمیع صاحب نے مسئلہ کے علمی و تاریخی پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا تھا اور یہ نہ سوچا کہ ان کی تیشہ زنی سے کتنے علمار حق زخمی ہو رہے ہیں اور یہ بات براہ راست طبقۂ صحابہؓ اور فقہار مجتہدینؒ کی نیتوں پر اثر انداز ہوتی ہے کیونکہ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ اور عبداللہ ابن عباسؓ طبقۂ صحابہ میں اور حضرت امام شافعیؒ اور امام احمدؒ بن حنبل مجتہدین فقہار میں ایک رکعت نماز وتر کے قائل تھے اس صورت حال کو شیخ الہند کی علمی دیانت گوارا نہ کر سکی کہ خالص علمی مسئلہ کی بنیاد پر امت اسلامیہ کی مسلمہ شخصیات کو ہدف ملامت بنایا جائے، مولانا کی علمی حمیت بیدار ہوئی اور بالآخر "انوار ساطعہ" کا جواب "الجہد المقل" کی شکل میں دیا۔

کتاب میں تین باب ہیں۔ پہلا باب باون صفحات پر مشتمل ہے جو بجائے خود ایک کتاب ہے۔ باب دوم اور سوم، ایک سو اسی صفحات پر مشتمل ہے، اس طرح ہم کتاب کو دو جلدوں میں تقسیم کر سکتے ہیں، جیسا کہ کتاب کی طباعت سے ظاہر ہے۔ کتاب کے دیباچہ میں صفحہ ۱۱ پر مولانا رقم طراز ہیں۔

"ہم جملہ کتاب میں تین باب ذکر کریں گے، اول باب میں اپنے مدعا کے ہنبت دلائل نقلیہ و عقلیہ مذکور ہونگے، اور دوسرے باب میں انشاء اللہ ان اعتراضات

عقلیہ ونقلیہ کا جواب عرض کیا جائیگا جو اعتراضات ہمارے بعض دلائل پر فریق ثانی نے پیش کئے ہیں۔ رسالہ بابِ ثالث سو اس میں ہماری جانب سے ان دلائل پر اعتراضات پیش کئے جائیں گے جو دلائل مولف انوار ساطعہ نے اپنے اثبات مدعا کے لئے ذکر فرمائے ہیں۔ واللہ الموفق والمعین"۔ (۶)

مولانا کی اس عبارت کی روشنی میں پوری کتاب کا جائزہ لینے سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ اس نظریہ کو سامنے رکھ کر کتاب کی تصنیف و تالیف عمل میں آئی ہے۔

کتاب مذکور کا مقدمہ جو الیس صفحات پر مشتمل ہے جس میں سات مقدمات ہیں جن کا بنیادی مقصد صرف یہ ہے کہ خالص منطقی اصولوں کی روشنی میں اثبات مدعا کیا جائے۔

کتاب "الجہد المقل" کا مرکزی موضوع امکان کذب باری تعالیٰ اور امکان نظیر ہے مگر اس سلسلہ میں علم کلام کے بعض اہم اور دقیق مسائل بھی زیر بحث آ گئے، اور وہ بھی اس طور پر کہ تاریخی حیثیت سے مولانا نے دوسرے اسلامی فرقوں کا جائزہ لے کر ان کے نظریات سے بحث کی ہے۔ یہ بتانے کے لئے کہ مولوی فضل حق صاحب اور ان جیسے حضرات کی یہ رائیں کوئی نئی بات نہیں کیونکہ امت میں معتزلہ، مرجیہ، کرامیہ، نظامیہ جیسے فرقے گذر چکے ہیں کہ جنھوں نے تنزیہ باری تعالیٰ کی ماہیت سمجھی نہیں اور تنزیہ باری تعالیٰ میں اس حد تک سلبی رویہ اختیار کیا کہ تقدس کو نقیض میں مبدل کر دیا اور نمونہ کے طور پر مولانا نے "خلق افعال اور وجوب اصلح" جیسے اہم مسائل پر روشنی ڈالی ہے کہ ظاہر کیا جائے کہ کس طرح اعتزال پسندوں نے خدا کو خالق خیر ٹھہرایا اور بندہ کو خالق شر اور نتیجۃً وہ بات کہہ گئے جس کا رشتہ شرک سے ملتا ہے یعنی تخلیق میں خالق اور مخلوق دونوں کو برابر کا درجہ دیدیا، گو ان کی نیت یہ نہ تھی بات صرف اتنی تھی کہ وہ شر کی نسبت ذات باری تعالیٰ کی طرف کرنا نہیں چاہتے تھے۔ مولانا تحریر فرماتے ہیں۔

"وکم فہموں نے یہ بھی نہ سمجھا کہ اس صورت میں تو نصوص قطعیہ اور اقوال سلف صالحین ہست کا خلاف سر پر آ کھڑا ہوگا کہ کسی طرح درست نہیں۔ دوسری خرابی عظیم یہ آئے گی کہ اس صورت میں یک خیال تقدس ذات پاک ایزد متعال کیلئے ثابت کر

---

(۶) الجہد المقل ص

کے تمام عالم کو خالق کہنا پڑے گا جس سے خداوند کریم کی صفت خالقیت اور وحدہ لاشریک ہونے میں سخت اشکال اور خرابی پیدا ہوگی کیونکہ جب معتزلہ ہر ایک کو اپنے جملہ افعال اختیاری کا خالق کہتے ہیں تو اس سے خدائی گھر گھر آگئی اور ہر بندہ خالق ہوگیا" ۔ (۷)

آگے چل کر ان کے ذہنی الجھاؤ کا حل پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کاش اگر یہ مدہوشان ستایش عقل ۔ خلق اور کسب دو چیز متفاوت سمجھ کر اول خالق کے لئے اور ثانی عباد کے لئے ثابت سمجھ لیتے تو جملہ نصوص شرعیہ اور اجماع سلف بھی معمول بہا رہتے اور قاعدۂ تکلیف اور افعال خداوندی سراسر موافق حکمت و عدل ہونے میں بھی کسی قسم کا خلل نہ آتا" (۸)

الجہد المقل میں جامی ۔ شرح مقاصد ۔ جلالی ۔ خیالی ۔ شرح مواقف ۔ شرح فقہ اکبر وغیرہ کے حوالے ملتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا مسلکاً حنفی اور مذہباً اشعری تھے ۔

ایک ایسی کتاب جو وقتی مسئلہ کے دفیعہ کیلئے لکھی جائے اس میں علمی رنگ پیدا کر دینا اور ٹھوس کلامی مباحث کا ضمناً موضوع بحث بنانا یہی وہ چیز ہے جو اس کتاب کو دوام بخشتے ہوئے ہے اور ہمیشہ اس کی افادیت برقرار رکھے گی ۔ یہی وہ طغرائے امتیاز ہے جو براہ راست مصنف کی ٹھوس علمیت اور دیانت دارانہ تجزیہ و تنقید کا حقیقی عنوان بلیں آئینہ دار ہے ۔

مقدمہ ترجمۂ قرآن شریف

ترجمۂ قرآن کا یہ مقدمہ اکتیس صفحات پر مشتمل ہے یہ درحقیقت شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمۂ قرآن کا مقدمہ ہے مولانا سے بعض متوسلین نے درخواست کی کہ کلام پاک کا ترجمہ فرمائیں لیکن مولانا نے اسے پسند نہ فرمایا کیونکہ اکابر کے

---

۷ ۔ شیخ الہند ۔ الجہد المقل ۔ ص ۔ ۷۹

۸ ۔ ص ۔ ۱۴۰ ۔ ۱۴۱

فارسی اردو تراجم موجود ہیں جن سے استفادہ کیا جا سکے۔ مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

"اس عاجز نے اپنی بے بضاعتی کا عذر کیا اور کہا کہ متقدمین اکابر کے فارسی کے تراجم موجود ہیں ثانیاً علمار متقدمین کے زمانۂ حال میں متعدد تراجم یکے بعد دیگرے شائع ہو چکے ہیں جو اہل اسلام کے نفع پہونچانے اور خرابی سے بچانے کیلئے بحمداللہ کافی سے کچھ زائد ہیں۔"(۹)

کچھ اور آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں۔

"... الحاصل اس خیال سے قلق ہوا تو اس قلق میں یہ بات ذہن میں آئی کہ وہ شکایات جنکا یہ افسوس ناک نتیجہ نظر آتا ہے اگر ان کا تدارک اس طرح پر ہو جائے کہ الفاظ متروکہ اور غیر مشہورہ کی جگہ الفاظ مستعملہ اور مشہورہ بدل دیا جائے اور ابہام کے مواقع پر کوئی مختصر لفظ بڑھاکر یا الفاظ میں کوئی تصرف مناسب کر کے واضح کر دیا جائے تو بعون اللہ اس صدقہ جاریہ کے بقا کی صورت نکل سکتی ہے"۔(۱۰)

"ـــ بالآخر یہی قرار پایا کہ بیشک مستقل ترجمہ سے مفید اور زیادہ کار آمد یہی امر ہے کہ ترجمۂ موصوفہ کی خدمت گذاری صحیح کیجائے"۔ (۱۱)

ـ آگے چلکر صفحہ ۲۸ پر رقم طراز ہیں۔

"اتنی بات پہلے معلوم ہو چکی ہے کہ ترمیم صرف دو امر میں ہو گی۔ ۱۔ لفظ متروک کو بدل دینا۔ ۲۔ حسب ضرورت اجمال اور ابہام کو کھولدینا۔ اس کے متعلق اتنا اور عرض ہے کہ ہم نے جن مواقع میں کوئی تصرف کیا ہے تو یہ نہیں کہ اپنی رائے محض سے سرسری طور پر جو مناسب دیکھا بدل دیا یا بڑھا دیا نہیں! بلکہ حضرات اکابر کے تراجم میں سے حتی الوسع لینے کی کوشش کی ہے"۔(۱۲)

حضرت شیخ الہند نے شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمہ کے اصول بھی منضبط فرمائے ہیں، تحریر فرماتے ہیں کہ ـــ

۹۔ شیخ الہند ۔ مقدمہ ترجمہ قرآن ۔ ص ۔ ۳
۱۰۔ " " ۔ ص ۔ ۷
۱۱۔ " " ۔ ص ۔ ۸
۱۲۔ " " ۔ ص ۲۸

"جو کچھ عرض کیا جائے گا موضح القرآن سے مستنبط ہو گا۔ ظاہر ہے کہ اس کے سوا ہمارے پاس ذریعہ علم اور کیا ہے، اور اس کی مثال بعینہ ایسی سمجھئے کہ جیسا کہ علمار کرام نے خاتم المحدثین حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب صحیح بخاری سے استنباط فرماکر ان کے اصول و قواعد، شرط و قیود، اغراض و مقاصد کو بیان کر دیا ہے"۔ (۱۳)

باوجود پابندی، محاورات ترتیب قرآن کا ہر جگہ لحاظ رہتا ہے۔ صفحہ ۱۲ سے آگے لکھتے ہیں۔

"یہ مختصر بات بھی ملحوظ رکھنے کے قابل ہے کہ حضرت ممدوح کو چونکہ محاورات کا بتلانا ہرگز مقصود نہ تھا بلکہ محاورات کے ذریعہ سے معنی اور مطلب قرآن کا بسہولت عوام کو سمجھانا مقصود تھا۔ زبان عربی میں مضاف مقدم اور مضاف الیہ موخر ہوتا ہے، مگر اردو میں مضاف الیہ مقدم اور مضاف موخر ہوتا ہے، جیسے " غلام زید"۔ زید کا غلام۔ مگر اس پر بھی حضرت ممدوح مضاف الیہ کو ہر جگہ مقدم نہیں لاتے بلکہ جہاں گنجائش مل جاتی ہے وہاں بوجہ عدم ضرورت اس قلیل تغیر کو بھی ترک فرماکر ترتیب قرآن ہی کو قائم رکھتے ہیں۔ مثلاً الحمدللہ رب العالمین۔ ۔ چونکہ رب العالمین۔ مضاف اور مضاف الیہ صفت واقع ہیں تو اس کے ترجمہ میں یہ گنجائش نکل آئی کہ ترجمہ ترتیب قرآنی کے مطابق بھی رہے اور محاورہ کے خلاف بھی نہ ہو۔ یہی حال فعل اور مفعول اور دیگر متعلقات فعل اور صفت موصوف، حال، تمیز وغیرہ کا ہے۔ اکثر مواقع میں ترتیب قرآنی کی مناسبت فرماتے ہیں، ور بعض مقامات میں بوجہ رعایت محاورہ وسہولت اسی تغیر خفیف مذکورہ بالا سے کام لیتے ہیں۔

حروف ربط جن کو حروف جر کہتے ہیں جگہ جگہ بکثرت مستعمل ہیں، جیسے لام۔ باور کاف۔ علیٰ۔ الیٰ۔ من۔ عن۔ فی وغیرہ کلام عرب میں یہ حروف ہمیشہ اپنے معمول پر مقدم ہوتے ہیں۔ لیکن ہماری زبان میں عموماً مؤخر بولے جاتے ہیں ۔۔ ان سب امور کے بعد وہی بات ہے جو پہلے عرض کر چکا ہوں، یعنی جہاں کہیں گنجائش ہوتی ہے، وہاں

۱۳۔ شیخ الہند۔ مقدمہ، ترجمہ قرآن، ص۔ ۱۱

اس خفیف تغیر کو بھی پسند نہیں کرتے بلکہ ترتیب قرآن کی رعایت فرماتے ہیں اور ایسا ترجمہ اختیار کرتے ہیں جو ترتیب قرآن اور محاورہ دونوں کے موافق ہو۔ اس کی مثالیں حروف مذکورہ کے متعلق جگہ جگہ موجود ہیں، مثلاً الاّ علی الخاشعین ۔ کا ترجمہ "مگر انہیں پر جن کے دل پگھلے ہوئے ہیں"۔ فرمایا ہے۔ جسمیں لفظ "علی" کا ترجمہ "خاشعین" کے ترجمہ سے مقدم ہے اور محاورہ کے بھی مطابق ہے۔

بعض جگہ ان کا ترجمہ نہیں کرتے ۔ یا ابت ۔ کا ترجمہ اے باپ فرماتے ہیں اے میرے باپ نہیں فرماتے ۔ ایسے ہی یا بنی کا ترجمہ اے میرے چھوٹے بیٹے کی جگہ صرف اے بیٹے فرمایا ہے۔

ترجمۂ موصوف کے مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ عامۃً ترجمہ میں چند امر کا التزام و لحاظ بہت رکھا ہے۔ اختصار و سہولت و وضاحت اور الفاظ قرآنی لفظی و معنوی مطابقت اور معنی مرادی یعنی غرض و مقصود کلام کی رعایت "۔ (۱۴)

ترجمۃ القرآن ۔ پر اظہار خیال کرتے ہوئے مولانا اصغر حسین صاحب لکھتے ہیں ۔

"بعض اہل علم کی استدعا اور بہت مصالح سے اور حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب رائپوری کی غایت آرزو دیکھ کر حضرت مولانا کو قرآن مجید کا ترجمہ کرنیکا خیال ہوا۔ لیکن بجائے ترجمہ کرنے کے۔ آپ نے مولانا شاہ عبدالقادر صاحب کے ترجمہ کی خدمت تصحیح و ترمیم اختیار کی اور خلافِ محاورہ الفاظ کی تبدیلی و تغیر کا التزام فرمایا اور حاشیہ پر فوائد و نکات بھی بیان کرنے شروع کئے۔ (۱۵)

افادات محمودیہ

یہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب کی دو اہم تقریروں کا مجموعہ ہے۔ یہ دونوں تقریریں مضامین کی شکل میں رسالہ "القاسم" میں جو کہ دارالعلوم دیوبند کے ترجمان کی حیثیت سے برسوں نکلتا رہا ہے اس کے ابتدائی شماروں ۲۹-۱۳۲۸ھ مطابق

۱۴۔ شیخ الہند ۔ مقدمہ ترجمہ قرآن ۔ ص۔ ۱۳ - ۱۷

۱۵۔ مولانا سید اصغر حسین صاحب ۔ حیات شیخ الہند ۔ ص ۔ ۱۸۴

۱۹۱۱ء میں شائع ہو چکی ہیں۔ پہلی تقریر کا عنوان "وحی اور اسکی عظمت" ہے اور دوسری کا عنوان۔ "لا ایمان لمن لا امانۃ لہ"۔ ہے۔

عظمت وحی کے سلسلہ میں مولانا نے پہلے وحی کے لغوی معنی سے بحث کی ہے، اس کے بعد عرفی اور اصطلاحی معنی سے کلام کیا ہے اور آگے چل کر کلام الٰہی اور کلام رسول کے درمیان فرق کرتے ہوئے دونوں کو حجت مانا ہے اور یہ بتایا ہے کہ علوم شرعیہ کی بنیاد وحی پر ہے۔ وحی کی دو قسمیں ہیں۔ وحی متلو۔ وحی غیر متلو۔ وحی متلو۔ تو کلام پاک ہے، اور وحی غیر متلو حدیث نبوی ہے۔ پھر وحی محمدی سے بحث کرتے ہوئے مشہور آیت۔ اِنَّآ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ کَمَآ اَوْحَیْنَآ اِلٰی نُوْحٍ الخ کو استدلال میں پیش کیا ہے۔ تقریر کا اسلوب اور اس کا تیور بتا رہا ہے کہ یہ درس بخاری کا ایک جزو ہے کیونکہ انداز کلام پر درسی چھاپ نمایاں ہے۔

آگے چل کر مولانا نے تحریف معنوی سے بحث کی ہے، اور بتایا ہے کہ معنوی تحریف کی وبا کس طرح پھیل رہی ہے، اسی ذیل میں یہود ونصاریٰ کی تحریف کا تذکرہ کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کے سامنے حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "الفوز الکبیر" رہی ہے جسمیں حضرت شاہ صاحب نے یہ بتایا ہے کہ تحریف کی دو قسمیں ہیں۔ تحریف لفظی اور تحریف معنوی۔ اور امت محمدیہ میں بھی تحریف کا مرض پایا جاتا ہے۔ شاہ صاحب نے آگے چل کر یہود ونصاریٰ کی نسبت تحریف معنوی کا اثبات کیا ہے۔ مولانا کی عبارت سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ آپ بھی تحریف معنوی ہی کے قائل تھے۔ مؤلف کی یہ تقریر بائیس صفحات پر مشتمل ہے۔

دوسری اہم تقریر۔ لَآ اِیْمَانَ لِمَنْ لَآ اَمَانَۃَ لَہٗ۔ یہ تقریر تریبن صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اس کا مرکزی مضمون آیت۔ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَۃَ عَلَی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ کَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا۔ (۱۶) کے ارد گرد گردش کرتا ہے۔ اس تقریر میں مولانا نے لفظ "امانت" کے مفہوم کی توضیح اور انسان کے "ظلوم وجہول" ہونیکا مفہوم بیان کیا ہے اور حدیث

۱۶۔ سورۂ احزاب

شریف کے الفاظ ۔ لا ایمان لمن لا امانۃ لہ ۔ کا مصدر و ماخذ اسی آیت پاک کو قرار دیا ہے جس سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ مولانا حدیث نبویؐ کی بنیادیں کلام پاک میں تلاش کرتے ہیں ۔ یہ ذوقی وصف خالص ولی اللّٰہی علم و حکمت کا طغرائے امتیاز ہے کیوں کہ اس موضوع پر شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ نے ایک رسالہ بھی تحریر فرمایا تھا جو اب نایاب ہے ۔

شیخ الہند نے مفاہیم کی توضیح اور معانی کی تبیین کے ذیل میں بڑی وضاحت سے اس مسئلہ پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ حدیث اور قرآن اپنے مصدر کے اعتبار سے ایک ہی ہیں البتہ متلو اور غیر متلو کے خالص فنی فرق کیوجہ سے احکام میں دونوں کی نوعیتیں بدل جاتی ہیں ۔

تقریر ترمذی

شیخ الہند کی یہ تقریر عربی اور اردو دونوں زبانوں میں چھپ کر آگئی ہے، اردو والی تقریر مولانا کی اپنی لکھی ہوئی نہیں بلکہ وہ خالص درسی تقریر ہے جسے مولانا اختر حسین صاحب نے طبع کرایا ہے ۔ یہ تقریر ترمذی عربی والی تقریر ترمذی کا اردو جامہ ہے۔ اس کا نام "الورد الشذی علی جامع الترمذی" ہے ۔

حضرت شیخ الہند کے درس ترمذی میں مولانا سید اصغر حسین صاحب نے بڑی احتیاط کے ساتھ اسے قلم بند فرمایا چنانچہ کتابی شکل میں ترتیب دینے کے وقت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی نے اسے دیکھ کر فرمایا کہ اس کا نام "کحل البصر" ہے ۔

۱۲ محرم ۱۳۶۸ھ مطابق ۱۹۵۰ء کو پہلی بار اس کی اشاعت کتب خانہ اصغریہ دیوبند سے ہوئی ۔ یہ تقریر ایک سو بانوے صفحات پر مشتمل ہے، اس میں امام ترمذی کی اپنی وضع کردہ اصطلاحات پر بحث کی گئی، نیز ما فی الباب کے متعلقات احادیث اور ان کے معانی پر روشنی ڈالی گئی ہے، چونکہ ترمذی کا انداز فقہی ہے اس لئے مولانا کی اس تقریر پر تفقہ کا رنگ غالب ہے ۔

جہاں تک عربی کی تقریر ترمذی کا تعلق ہے تو وہ بھی مطبع مجتبائی کی چھپی ہوئی جامع ترمذی کے آخر میں کتاب العلل کے ساتھ بطور ضمیمہ

شامل کردی گئی ہے۔

تصحیح ابی داؤد

امام ابوداؤد سجستانی کی جمع کردہ روایات مرفوعہ کے مجموعہ کو "سنن ابی داؤد" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

طالبان حدیث کی زبانوں پر دو بہت اہم لفظ ہر وقت رہتے ہیں۔ ایک "جامع" دوسرا "سنن"۔ درحقیقت یہ دونوں لفظ مجموعۂ احادیث کی ترتیب و تدوین پر روشنی ڈالتے ہیں۔

جامع:- اس مجموعۂ حدیث کو کہتے ہیں کہ جس میں آٹھ ابواب پائے جائیں۔ ۱۔ سیر۔ ۲۔ آداب۔ ۳۔ تفسیر۔ ۴۔ عقائد۔ ۵۔ فتن۔ ۶۔ احکام۔ ۷۔ اشراط۔ ۸۔ مناقب۔ جیسے جامع صحیح بخاری۔

سنن:- اس مجموعہ حدیث کو کہتے ہیں جس کی ترتیب و تبویب فقہی ہو۔

امام ابوداؤد کی یہ معرکۃ الآرا تصنیف انہیں معنوں میں "سنن" کہی جاتی ہے۔ حضرت شیخ الہند سالہا سال تک ابوداؤد شریف کا درس حدیث دیتے رہے۔ دوران درس آپ کو عبارتوں میں جو فرق نظر آیا اور مختلف نسخوں کے تقابل سے کچھ اور کبھی لفظی خامیاں نظر آئیں، اسے سالہا سال کی عرق ریزی کے بعد آپ نے ایک فہرست کی شکل میں جمع کر دیا۔ اس سلسلہ میں مولانا سید اصغر حسین صاحب لکھتے ہیں۔

"ابوداؤد کے قلمی و مطبوعہ قدیم و جدید نسخوں کو جمع فرماکر آپ نے ان کے مطالعہ اور مقابلہ سے ایک صحیح نسخہ مرتب فرمانیکا ارادہ کیا۔ درس و تدریس سے فراغت پانیکے بعد آپ منتخب فارغ التحصیل طلبہ کی جماعت کو لے کر اور تمام نسخے سامنے رکھ کر تصحیح پر متوجہ ہوتے، ہر لفظ و اعراب کو صحیح فرماتے۔ مغلقات عبارت کی رموز حبط فرماتے اور دوسرے نسخوں کی عبارات زوائد جو قلم ناسخین سے متن میں شامل ہوگئی تھی ان کو بحسن ترتیب حاشیہ پر درج کراتے اور جو عبارت و الفاظ غلطی سے چھوٹ گئے تھے ان کو اضافہ

فرماتے اور دیگر کتب حدیث وشروح سے بھی مدد لیکر صحت میں کوشش فرماتے۔ طویل مدت اور کمال محنت سے ایک نسخہ بغایت صحت مرتب ہوا جو ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۰ء میں مطبع مجتبائی میں طبع ہوگیا ہے۔ یہ مخفی نہ رہے کہ حضرت نے صرف متن کی صحت کی ہے۔ اہل مطبع نے حاشیہ وبین السطور کو ایک مولوی صاحب سے سرسری اور معمولی نظر سے صحت کرا کے قدیم مطبوعہ نسخوں سے نقل کر لیا ہے پس اس قسم کی غلطیاں حضرت مولانا کی تصحیح متن میں قادح و مخل نہیں ہو سکتی ہیں"۔ (۱۷)

ایضاح الأدلہ

حضرت شیخ الہند کی یہ تصنیف تین سو بانوے صفحات پر مشتمل ہے۔ درحقیقت یہ کوئی مستقل کتاب نہیں بلکہ ادلہ کاملہ کی تشریح و توضیح کیلئے لکھی گئی ہے۔ اس لئے مستقل تصنیف کہنے کے بجائے اسے ادلہ کاملہ کی شرح کہا جاسکتا ہے مگر وہ شرح جو مستقل کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ مولانا سید اصغر حسین صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"ادلہ کاملہ شائع ہونیکے بعد حضرت مولانا منتظر تھے کہ دیکھئے نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ حق واضح دیکھ کر مخالف خاموش ہوجاتے ہیں یا حق سے چشم پوشی کر کے دفع عار کے لئے جواب لکھتے ہیں۔ مولوی محمد صاحب کچھ عرصہ تک اپنے ماہوار رسالہ "اشاعۃ السنۃ" میں وعدہ فرماتے رہے کہ عنقریب جواب لکھیں گے لیکن کچھ دنوں کے بعد خاموش ہو رہے اور خلاف امید اہل حدیث کے لقب دادہ احسن المناظرین مولوی سید محمد احسن صاحب امروہی کے نام سے ادلہ کاملہ کے جواب میں ایک رسالہ "مصباح الادلہ لدفع الادلہ" طبع ہوکر مشتہر ہوا۔ حضرت مولانا نے جواب لکھنے میں توقف فرمایا کہ شاید مولوی محمد حسین صاحب بھی کوئی جواب لکھیں تو ایک ہی تالیف میں دونوں کا جواب دیدیا جائے لیکن مولوی صاحب موصوف نے اپنے رسالہ میں اعلان کر دیا کہ ہمارا قصد جواب لکھنے کے لئے مصمم تھا لیکن محمد احسن صاحب کی کتاب لاجواب و باصواب ہے اب ہمارے لئے اس کا جواب لکھنا فضول ہے"۔ (۱۸)

۱۷۔ مولانا اصغر حسین۔ حیات شیخ الہند۔ ص۔ ۱۸۶۔

خود حضرت شیخ الہند کتاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

"اسے دیکھ کر میں نے جواب لکھنا شروع کیا اور کچھ ہی صفحات لکھے تھے کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کا سفر حج پیش آگیا اور ان کی واپسی پر ان کا انتقال بھی ہو گیا۔ چنانچہ اسی باعث دل بجھ گیا، پھر ہمت نہ پڑتی تھی کہ کوئی کام کیا جائے مگر صاحبزادہ محمد احمد صاحب کے اصرار پر جواب لکھنا پڑا۔" (۱۹)

اسی میں کچھ آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"چونکہ مجتہد صاحب باوجود دعوئ اجتہاد مطلب عبارت ادلہ اکثر مواقع پر نہیں سمجھے اس لئے ہمکو عبارت ادلہ کی تشریح و توضیح کرنی پڑی، تو اب مناسب یہ ہوا کہ اس کا نام" ایضاح الادلہ" رکھا جائے"۔ (۲۰)

مولانا اصغر صاحب لکھتے ہیں۔

"حضرت مولانا نے اس کتاب میں شرح معانی حدیث اور تطبیق بین الروایات اور توفیق اقوال المجتہدین بالحدیث میں اپنے خدا داد تفقہ فی الدین کا نمونہ دکھلایا ہے، اور مختلف ابحاث کے ضمن میں ایسے ایسے مضامین عالیہ بیان فرمائے ہیں کہ اذہان متوسطہ کو ان کی ہوا بھی نہیں لگی، اور آیات قرآنی اور احادیث نبویہ بلکہ اقوال فقہاء و مجتہدین کی بھی اس خوبی سے شرح فرمائی ہے کہ بے ساختہ "إِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْحَقُّ الْمُبِينُ" زبان سے نکل جاتا ہے۔ (۲۱)

کتاب" ایضاح الادلہ" کے مرکزی مضامین یہ ہیں۔

۱۔ فقہاء کرام کی فضیلت ۔۲۔ ائمہ مجتہدین کا فن حدیث میں مقام ۔۳۔ رفع یدین ۔۴۔ آمین بالجہر ۔ ۵۔ زیر ناف ہاتھ باندھنا ۔۶۔ قرارت فاتحہ خلف الامام ۔۷۔ وجوب جمعہ اور اس کے شرائط ۔ ۸۔ تقلید کی ضرورت اور اس کی اہمیت ۔ ۹۔ تقلید کی قسمیں اور اس کے احکام ۔ ۱۰۔ وقت نماز ظہر اور مثلین ۔ ۱۱۔ حقیقت ایمان ۔ ۱۲۔ ایمان میں زیادتی اور کمی

۱۹۔ شیخ الہند ۔ دیباچہ ایضاح الادلہ ۔ ص ۔ ۳ ۔ ۵

۲۰۔ " " ص ۔ ۶

۲۱۔ مولانا سید اصغر حسین ۔ حیات شیخ الہند ۔ ص ۔ ۱۸۰

کا شرعی مفہوم - ۱۳ - فرقۂ مرجیہ اور خوارج کا بنیادی فرق - ۱۴ - امام ابو حنیفہ کے مرجیہ ہونیکی تردید - ۱۵ - نفاذ قاضی کے نفاذ کی شرعی و عقلی بحث - ۱۶ - حکومت اسلامیہ کی حقیقت - ۱۷ - اسلامی حکومت اور الٰہی حکومت اور ان دونوں کا باہمی فرق - ۱۸ - اسباب ملک اور حقیقت ملک - ۱۹ - شرعی قبضہ کی حقیقت - ۲۰ - بیع فاسد کی تحقیق - ۲۱ - بیع فاسد اور بیع باطل کا فرق - ۲۲ - نکاح محارم - ۲۳ - مسئلہ تلثین اور دہ در دہ ۲۴ - ماء کثیر کے متعلق ائمہ ثلاثہ کی رائیں اور انکا تجزیہ -

ان مباحث علمیہ اور کلامیہ کے ذیل میں بہت سے ذیلی عناوین ہیں جن پر مولانا نے سیر حاصل بحث کی ہے اور کتاب میں جابجا شوخی اور مزاح بھی نمایاں ہے - مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب لکھتے ہیں -

"سب سے پہلے یہ کتاب ۱۲۹۹ھ میں میرٹھ سے شائع ہوئی، اور دوسری مرتبہ ۱۳۳۰ھ مطابق ۱۹۱۲ء میں مولانا سید اصغر حسین صاحب نے اس کو شائع کیا - کتاب کے لکھنے کی ابتدا غالباً ۱۲۹۲ھ یا ۹۴ھ ہے - میاں نذیر حسین صاحب نے نشان دہی فرمائی ہے کہ اس وقت حضرت کی عمر پچیس سال تھی - کیونکہ حضرت شیخ الہند کی پیدائش ۱۲۶۸ھ ہے اور پچیس سال ۱۲۹۳ھ میں پورے ہوتے ہیں"۔(۲۲)

حضرت شیخ الہند ایضاح الادلہ کے دیباچہ میں لکھتے ہیں -

" فقط تین یا چار دفعات کا جواب لکھا تھا کہ اتنے میں اس ضلع کے مجمع علماء ربانیین اور مقتدایان دین و جماعت صالحین نے حج کا عزم فرمایا"- (۲۳)

یہ ملحوظ رہے کہ یہ زمانہ ۱۲۹۴ھ کا ہے لہٰذا معلوم ہوا کہ ایضاح الادلہ کی ابتدا ۱۲۹۳ھ میں ہوئی - اور اس سے قبل ادلہ کاملہ کا سن تصنیف بھی ۱۲۹۳ھ ہے - (۲۴)

* * * * *

۲۲- مفتی عزیز الرحمٰن - تذکرہ شیخ الہند - ص - ۴،

۲۳- شیخ الہند - دیباچہ ایضاح الادلہ - ص - ۴

۲۴- مفتی عزیز الرحمٰن - تذکرہ شیخ الہند - ص - ۷۵

حاشیہ مختصر المعانی

علم بلاغت، معانی اور محسنات بدیع پر علامہ سعد الدین تفتازانی کی معرکۃ الآرار تصنیف مختصر المعانی عربی ادب کے مکتبوں میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ ہندوستان میں درس نظامیہ نے اسے اپنے نصاب میں جگہ دی ہے، اس لحاظ سے آج ساری دنیا میں صرف ہند وپاک ہی کو یہ خصوصیت حاصل ہے جہاں درسًا درسًا یہ کتاب پڑھی اور سمجھی جاتی ہے۔ طلبہ اور اساتذہ دونوں متفق الآرار ہیں کہ مختصر المعانی مہمات کتب درسیہ میں سے ہے۔ حضرت مولانا شیخ الہند کو تدریس کے زمانہ میں کتاب پڑھانیکا موقع ملا۔ مولانا کے سامنے طلبہ کی دشواریاں بھی آئیں، کیونکہ کتاب مختصر المعانی گو فصاحت وبلاغت کے موتی بکھیرتی ہے مگر اسے کیا کیجئے کہ اس کا اسلوب الغاز میں شمار ہوتا ہے۔ یہ بات سچ ہے کہ نویں صدی کے بعد جلتنی بھی کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں تخلیقی عنصر کا فقدان ہے، گو تحقیقات ضرور پائی جاتی ہیں۔ مصنفین کی پوری قوت لفظ، اس کا مفہوم۔ عبارت، اور عبارت سے معانی کا اخراج جیسی کیفیات پر صرف ہوتی ہے۔

سچ پوچھئے تو مختصر المعانی کسی نہ کسی حیثیت سے خود بھی شرح کے دائرہ میں آجاتی ہے کیونکہ علامہ سعد الدین تفتازانی نے تلخیص المفتاح کی شرح لکھی اور اسی ذیل میں انہیں مختصر المعانی کی سوجھی، جس کے نتیجہ میں یہ کتاب مختصر المعانی کے نام سے ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے۔

مولانا نے کتاب کی افادیت کی راہ میں عبارت کے الجھاؤ کو بڑی رکاوٹ سمجھا نیز انہیں یہ بھی نظر آیا کہ نامانوس اور غیر متداول الفاظ جو اس کتاب میں استعمال کئے گئے ہیں وہ بھی مفہوم کی تہہ تک پہونچنے میں بڑی رکاوٹ ہیں۔ اس لئے آپ نے حاشیہ لکھ کر اس کمی کو دور کرنا چاہا ہے۔ مولانا کے حاشیہ مختصر المعانی کو دیکھنے کے بعد چند باتیں بنیادی طور پر معلوم ہوتی ہیں۔

مختصر کی شرح دسوقی کو سامنے رکھ کر حاشیہ کو ترتیب دیا ہے کیونکہ پوری کتاب میں جتنے حواشی ہیں ان میں سے پچانوے فیصد بحوالہ دسوقی ہیں اور پانچ فیصد میں

"تجرید" اور "چلپی" وغیرہ ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہےکہ حضرت شیخ الہند معانی اور بلاغت کی تفہیم کے لئے دسوقی کی کتاب کا مطالعہ اور اس کی مراجعت ضروری سمجھتے ہیں، اگرچہ اطناب اور تطویل کے باعث اس کے مطالعہ کا مشورہ تو نہ دیا مگر حاشیہ میں اس کے حوالوں کو بھر کر یہ ضرور بتایا کہ اسکا مطالعہ اور اس کی مراجعت ایک امر ضروری ہے۔

اس حاشیہ کے چھپ جانے سے ایک بڑا فائدہ جو اساتذہ اور طلبار کو یکساں طور پر پہونچا ہے وہ وقت کی بچت ہے، کہ تھوڑے سے وقت میں دسوقی کا پورا نچوڑ معلوم ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی کتاب کے معاقد اور غوامض روز روشن کی طرح آشکارا ہو جاتے ہیں۔

مولانا کا یہ حاشیہ پانچ سو چوالیس صفحات پر مشتمل ہے۔ حاشیہ کے آخر میں محمد عبدالاحد مالک مطبع مجتبائی کی یہ عبارت قابل غور ہے۔

" مولانا المولوی محمود حسن صانہ اللہ عن الآفات والفتن الدیوبندی لتحلیة بالحواشی الجدیدة المفیدة وحل العولیسات الصعبة العدیدة فصحح المتن بمقابلة النسخ القلمیة والمصریة وحشاہ ثانیا تحشیة انیقة وحلاہ حلیة رقیقة بتلخیص الحواشی والشروح الجلیلة مثل الدسوقی والتجرید حتی کانہ لاحتوائہ علی المطالب الفخیمة مغن عن سائر الشروح والزبر القدیمة وناسخ للحواشی المعتبرة والتعلیقات الکریمة"۔ (۲۵)

نیز مولانا شیخ الہند آخر میں لکھتے ہیں۔

" وقد تم ما اردناہ بمنہ ونوالہ والصلوٰة والسلام علی سید البشر وآلہ۔

بندہ محمود حسن عفی عنہ دیوبندی"۔ (۲۶)

* * *

۲۵۔ تتمہ کتاب

۲۶۔ حاشیہ مختصر المعانی۔ ص۔ ۵۴۴

فتویٰ نویسی

مولانا کے فتاویٰ کے ضمن میں یہ بات جملہ تذکرہ نویس لکھتے چلے آئے ہیں کہ آپ کی خدمت میں فتاویٰ پیش کئے جاتے تھے اور آپ ان پر نگاہ ڈال کر مہر تصدیق ثبت کر دیا کرتے تھے۔ (۲۷) لیکن ہم اپنے آپ کو اس اختلاف رائے سے بچا نہیں سکتے جو اس سلسلہ میں تذکرہ شیخ الہند کی عبارت اور مولانا سید اصغر حسین صاحب کی رائے میں پایا جاتا ہے۔ تذکرہ شیخ الہند کے مصنف لکھتے ہیں کہ "حضرت شیخ الہند ہمیشہ اس اہم کام سے مجتنب رہے تاہم دارالعلوم دیوبند سے جاری ہونے والے تھے۔ فتاویٰ پر "الجواب صحیح" کے بعد آپ کے دستخط ضرور ہوتے تھے"۔ (۲۸)

تعجب ہے کہ مصنف تذکرہ کے سامنے مولانا سید اصغر حسین صاحب کی کتاب نہ رہی جب کہ یہی کتاب صحیح معنوں میں حیات شیخ الہند کے سلسلہ میں مرجع اول ہے۔ مولانا سید اصغر حسین صاحب لکھتے ہیں "فتاویٰ حضرت مولانا کے بقیدِ حیات ضبط و مرتب نہیں ہو سکے کیونکہ غایت تواضع کی وجہ سے اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں سمجھتے تھے اور دیگر مشاغل سے فرصت بھی نہیں ہوتی تھی۔ دارالعلوم میں باضابطہ دار الافتاء کے پہلے جس قدر سوالات و استفتاء دارالعلوم میں اور خاص حضرات کے نام آتے تھے وہ سب فارغ التحصیل اور ذی استعداد طلبہ لکھتے تھے اور دارالافتاء قائم ہو جانے کے بعد حضرت مولانا کی خدمت میں آئے ہوئے استفتاء کا جواب بھی حضرت مفتی صاحب تحریر فرمایا کرتے تھے اس لئے خود تحریر فرمانے کی نوبت نہیں آتی تھی، اور اگر ضرورتاً کبھی لکھتے بھی تو فتویٰ کو صورت مراسلت اور خط و کتابت کے طرز میں بدل دیتے۔ علیٰ ہذا القیاس جو خطوط صورت استفتاء میں نہیں بلکہ شناسا اور خدام ضمناً معروضات میں مسائل آپ دریافت کر لیتے، ان کے جواب خود تحریر فرماتے، اور بعض مدرسین اور فارغ التحصیل حضرات مشکل مسائل آپ سے زبانی دریافت کر کے فتویٰ تحریر

۲۷۔ مولانا سید اصغر حسین۔ حیات شیخ الہند۔ ص۔ ۱۸۷

۲۸۔ مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری۔ تذکرہ " ۔ ص۔ ۸۰

کرتے"۔ (۲۹)

سطور بالا سے مندرجہ ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

۱۔ مولانا کا تواضع اور کسر نفسی فتویٰ نویسی کی راہ میں حائل رہا۔ ۲۔ کثرت کار کے باعث فرصت نہیں مل پاتی تھی۔ ۳۔ دارالافتاء قائم ہو جانیکے بعد مفتی دارالعلوم دیوبند اس کام کو انجام دیتے تھے۔ ۴۔ شیخ الہند جو فتاویٰ لکھتے تھے وہ خطوط کے انداز پر تحریر فرماتے تھے۔ ۵۔ اپنے تلامذہ کو مراجع بتا دیتے تھے پھر وہ لوگ لکھتے تھے۔ ۶۔ تمام فتاویٰ پر آپ دستخط فرماتے تھے۔

مذکورہ بالا نقاط سے یہ مسئلہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ شیخ الہند نے فتویٰ نویسی کی خاصی خدمت انجام دی ہے، گو اس کام کی ذمہ داری نہیں قبول فرمائی، نیز وہ تمام فتاویٰ جو بالواسطہ آپ کی ذات کی طرف منسوب ہیں اگرچہ ان کی لکھائی میں غیروں کا حصہ ہے مگر اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ وہ بھی آپ ہی کی علمی دین ہے۔ مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کا یہ کہنا کہ آپ تمام عمر مجتنب رہے کسی بھی شکل میں قابل قبول نہیں، کیوں کہ فتاویٰ پر آپ کی بے شمار دستخطیں موجود ہیں، اور پھر اسی پر اکتفا نہیں بلکہ خالص سیاسی مسائل میں بھی آپ نے فتوے دیئے ہیں۔

اسلامیان ہند کے لئے شیخ الہند کا فتویٰ ترک موالات یا کسی بھی سیاسی موڑ کیلئے مشعل راہ ہے۔ اس کے لکھنے کا وقت گو تحریک آزادی کا زمانہ ہے، مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ اس کے مضمرات کتنے معنی خیز اور دور رس نتائج کے حامل ہیں۔ مولانا سید اصغر حسین صاحب لکھتے ہیں۔

"احقر کو بھی اپنے اخیر زمانہ طالب علمی میں تحریر فتویٰ، کا شوق ہوا تھا اور کتاب دیکھنے کی فرصت نہ تھی تو حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ سے اور حضرت مفتی صاحب سے صدہا مشکل مسائل دریافت کر کے لکھ دیتا۔ غرض ان تمام اقسام کے فتاویٰ حضرت مولانا کے اگر شمار کئے جائیں تو ہزارہا ہو سکتے ہیں، مگر مجموع و مکتوب نہ ہو سکے۔" (۳۰)

۲۹۔ مولانا سید اصغر حسین صاحب۔ حیات شیخ الہند۔ ص۔ ۱۸۷

۳۰۔ " " " ص۔ ۱۸۳

مفتی عزیزالرحمٰن صاحب لکھتے ہیں کہ " میرے پاس حضرت شیخ الہند کا ایک فتویٰ جنگ بلقان اور اوقاف کے متعلق ہے"۔(۳۱) موصوف نے اس کا ذکر کرنے کا وعدہ بھی کیا ہے مگر تذکرہ کے صفحات اس کے ذکر سے خالی ہیں۔

چونکہ حضرت شیخ الہند کے فتاویٰ مدون نہیں کئے جاسکے، اس وجہ سے آج تحریری شکل میں ان کا وجود ناپید ہے۔ البتہ فتاویٰ دارالعلوم کی پرانی جلدوں، نیز دارالافتار کے سابقہ ریکارڈ سے ضرور اس پر روشنی پڑسکتی ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے صرف ایک فتویٰ ہے، جو مسئلہ ترک موالات کے متعلق ہے۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب وسیاست میں کس تدقیق کے ساتھ آپ نے امتزاج فرمایا ہے، نیز مذہب وسیاست میں موہوم اور فرضی وبُعد کی آپ کی نظروں میں کیا حیثیت ہے۔ مذکورۃ الصدر فتویٰ آئندہ سیاسیات کے باب میں درج کیا جائیگا۔

خطابت

خطابت قوموں کی زندگی میں مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ تقریر کے سہارے ہارا ہوا میدان قوموں نے جیتا ہے۔ تاریخ میں ایسے بھی مقررین گذرے ہیں جنھوں نے اپنی شعلہ بیانیوں سے مردہ دلوں میں روح پھونکی، سوتوں کو جگایا، مایوس طبیعتوں کو عمل کی قوت اور توانائی عطا کی۔ حجاج بن یوسف، طارق بن زیاد، عالم عربی کے مانے ہوئے خطیب گذرے ہیں جن کے خطبات نے دنیا کے جغرافیہ کا نقشہ بدل ڈالا۔ (۳۲)

قوموں کو جب بھی آڑے وقتوں کا سامنا پڑا ہے خطابت ہی کی راہ سے زعمار اصلاح نے جوش عمل کی روح پھونکی ہے، کچھ یہی نوعیت ہندوستان میں جنگ آزادی کے سورماؤں کی رہی ہے۔ یہ جنگ جسے ہم تحریک آزادی کے نام سے یاد کرتے ہیں، گو انگریزی سامراج کے ہندوستان میں پاؤں جمنے کیساتھ ہی شروع ہوجاتی ہے اور

۳۱۔ مفتی عزیزالرحمٰن صاحب۔ تذکرہ شیخ الہند۔ ص۔ ۸۰

۳۲۔ جرجی زیدان۔ تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ۔ جلد ۲۔ ص۔ ۱۷۵

اس کا سلسلہ کسی فرد یا خاندان کے ختم ہو جانے سے ختم نہیں ہوتا بلکہ یہ وہ جذبۂ دروں اور سوز باطن تھا جو ہر جانے والی نسل آنیوالی نسل کو امانتاً سونپ جایا کرتی تھی، اور اسی طرح سرزمین ہند پر ملک کی آزادی کا مطالبہ کرنیوالوں کی تعداد بڑھتی ہی گئی۔ یہ مطالبے عدالت کی راہ سے کئے گئے، کونسلوں میں کئے گئے، اور عوام کے سامنے تقریر و تحریر کے ذریعہ کئے گئے، لیکن سب سے زیادہ موثر خطابت ہی ثابت ہوئی، کیوں کہ رہنمایان تحریک آزادی کو اگر ایک طرف انگریز آقاؤں سے مطالبہ کی حقیقت منوانی تھی تو دوسری طرف مختلف طبقات اور گروہوں میں بٹی ہوئی ہندوستانی قوم کے دلوں کو آزادی کے جوش اور ولولہ سے پرکرنا تھا، کیونکہ یہ کچی فکر کے لوگ ان میں نہ تھے کہ بآسانی ان کی سمجھ میں کوئی بات آجاتی، اور ایسی کوئی بات سبھی ہو اس کے لئے خطابت ہی ایک سہارا ہے، جس سے قومی زندگی میں کوئی بھی شعور پیدا کیا جاسکتا ہے۔

جنگ آزادی کے آخری دور کی ابتدا میں جن شخصیات نے ہندوستانی تاریخ پر اپنی یادوں کے گہرے نقوش چھوڑے ہیں، اور جن کی ولولہ انگیز خطابت، سوز میں ڈوبی ہوئی آواز، قوم کے غم میں پگھلی ہوئی ہڈیاں، زندگی کے غم و آلام سے تپا ہوا چہرہ، چشم فلک کے دیکھنے میں آیا ہے، ان میں شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کی شخصیت سب سے نمایاں ہوکر ابھرتی ہے۔ خطابت مولانا کا پیشہ نہیں تھا، مگر قومی شعور کے باعث شیوہ ضرور بن گیا تھا۔ جن آنکھوں نے انہیں اسٹیج پر بولتے ہوئے دیکھا ہے اور جن کانوں نے شدت کرب میں ڈوبی ہوئی ان کی گفتار سنی ہے، ان میں سے مرحوم صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے اپنی آنکھوں دیکھا حال یوں لکھا ہے۔

" مجھے وہ وقت یاد ہے اور میرے متعدد ساتھیوں کو بھی جب علی گڈھ کالج کی مسجد میں ایک وجود مقدس قید، جلا وطنی، علالت اور تفکرات نے جس کی ہڈیاں پگھلادی تھیں، جس کے چہرے کی زردی سے معلوم ہوتا تھا کہ غم کی آنچ نے خون کا ایک ایک قطرہ خشک کر دیا ہے، لیکن جس کی روشن آنکھیں اس یقین کی غمازی کررہی تھیں کہ اگرچہ سب کچھ بگڑا ہوا دکھائی دیتا ہے لیکن مردوں کی طرح ہمت کی جائے تو مدد خداوندی سے سب کچھ بن سکتا ہے۔ یہ وجود مقدس دیوار کا سہارا لئے بیٹھا

ہے، ناتوانائی کے باعث مجمع کو خطاب بھی نہیں کر سکتا، اور اس کا پیام اس کے شاگرد مولانا شبیر احمد عثمانی سناتے ہیں۔

صاحبو! یاد رہے کہ وہ جس دیوار کا سہارا لئے بیٹھے تھے وہ خالی اینٹ پتھر کی دیوار نہ تھی، وہ ایمان محکم اور اس ایمان کا نتیجہ یعنی ایک عظیم الشان ملی ماضی کی دیوار تھی، اور وہ نہ صرف ان نوجوانوں کو مخاطب فرما رہے تھے جو ان کے سامنے تھے۔ انکا روئے سخن قوم کی ساری آنیوالی نسلوں کی طرف تھا۔ اس وقت کسی بڑے مکان کا سنگ بنیاد نہیں رکھا گیا تھا، کہ یہ قافلہ سرو سامان چھوڑ کر بے سرو سامانی کی طرف رواں ہو رہا تھا۔ یہ وقتی فائدے کے بدلے دقتی نقصان کا سودا کر رہا تھا، اسے عاجلہ کے مقابلہ میں آخرہ زیادہ عزیز تھی، وہ محنت و مشقت کا عزم لیکر تعمیر نو کیلئے نکلا تھا اور اس کی کلفتوں اور محنتوں کو دوسری سہولتوں اور تن آسانیوں سے زیادہ عزیز رکھنا چاہتا تھا۔ یوں اور اس فضا میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا کام شروع ہوا تھا۔"(۴۳)

شیخ الہند کا انداز خطابت سلف صالحین کے انداز کا تھا۔ الفاظ کی نشست اور جملوں کی ساخت سے کہیں زیادہ زور اظہار مدعا اور مقصد کی وضاحت پر دیا کرتے تھے۔ ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء بروز جمعہ جامعہ ملیہ کی تاسیس ان کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس کے بعد مولانا شبیر احمد عثمانی نے مولانا کا خطبۂ تاسیس پڑھ کر سنایا، کیوں کہ مولانا کی طبیعت ناساز تھی۔

"اے نونہالان وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے درد کے غمخوار (جس سے میری ہڈیاں پگھلی جارہی ہیں) مدرسہ اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں، تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڈھ کی طرف بڑھایا، اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں (دیوبند اور علی گڈھ) کا رشتہ جوڑا"۔ (۴۴)

جامعہ کے بارے میں مولانا فرماتے ہیں۔

"بارے خدا کا شکر ہے کہ اس نے میری قوم کے نوجوانوں کو توفیق دی کہ

۴۳۔ عبدالغفار مدہولی۔ جامعہ کی کہانی۔ ص۔ ۲۷۔ ۲۸

۴۴۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب۔ خطبۂ صدارت مع فتوی (غنی المطابع دہلی) ۔ ۱۳۳۹ھ۔ ص۔ ۵

وہ اپنے نفع و ضرر کا موازنہ کریں، اور دودھ میں جو زہر ملا ہوا ہے اس کو کسی جھپکے کے ذریعہ سے علیحدہ کر دیں۔ آج ہم وہی جھپکا نصب کرنے کیلئے یہاں جمع ہوئے ہیں، اور آپ نے مجھ سے پہلے سمجھ لیا ہوگا کہ وہ جھپکا مسلم نیشنل یونیورسٹی ہے"۔ (۳۵)

اپنے عہد کی مروجہ تعلیم پر نقد و تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"ہماری عظیم الشان قومیت کا اب یہ فیصلہ نہ ہونا چاہئے کہ ہم اپنے کالجوں سے بہت سستے داموں کے غلام پیدا کرتے رہیں، بلکہ ہمارے کالج نمونہ ہونا چاہئیں بغداد اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں کے اور عظیم الشان مدارس کے جنھوں نے یورپ کو اپنا شاگرد بنایا اس سے پیشتر کہ ہم اسکو اپنا استاد بناتے"۔ (۳۶)

مولانا کے خطبات سیاسی اور سماجی موضوعات کے حامل ہیں، چونکہ ان کی زندگی سپاہیانہ تگ ودَو کا عہد آفریں مرقعہ تھی، یہی وجہ ہے کہ زبان نطق اور زبان قلم دونوں سے اس موضوع کی آبیاری کی ہے۔ مولانا چونکہ مسلمانوں کے دینی رہنما اور ان کی سیاسی جد و جہد کے ہراول تھے اس لئے بھی ان کے خطبات کی روشنی میں اس عہد کی مکمل تصویر مل جاتی ہے۔ خطابت میں عزم۔ حوصلہ۔ ٹھہراؤ۔ پوری طرح اپنی تمام تفصیلات کیساتھ پایا جاتا ہے۔ جملوں میں وقار۔ الفاظ کا مناسب استعمال۔ تقریر نظری سے زیادہ عملی۔ اور مثالیں خالص تجرباتی اور واقعاتی۔ جمعیۃ علماء ہند کے دوسرے سالانہ اجلاس منعقدہ ۷۔ ۸۔ ۹۔ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۔ ۲۰۔ ۲۱ نومبر ۱۹۲۰ء کے خطبہ صدارت کی چند جھلکیاں یہ ہیں۔

"آج جس اجلاس میں آپ تشریف فرما ہیں اور طویل و عریض سفر برداشت کر کے شریک ہوئے ہیں یہ وہ مقدس اجتماع ہے جس کا سنگ بنیاد بحکم "وشاورہم فی الامر۔ وامرہم شوریٰ بینہم۔ وتناجوا بینہم بالتقوی" رکھا گیا ہے"۔ (۳۷)

خطبہ کی مذکورہ عبارت سے اس امر پر روشنی پڑتی ہے کہ شیخ الہند کی سیاست

۳۵۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب۔ خطبہ صدارت مع فتوی۔ (غنی المطابع دہلی ۱۳۳۹ھ) ص۔ ۶

۳۶۔ 〃 〃 〃 〃 〃 ص۔ ۶

۳۷۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب۔ خطبہ صدارت اجلاس دوم جمعیۃ علماء ہند۔ منعقدہ

خالص ملی اور اسلامی سیاست تھی، اور انگریز دشمنی کی بنیاد صرف تعلق مع اللہ اور امت محمدیہ کے مصالح کلیہ پر منحصر تھی۔ آگے کی عبارت سے بات اور واضح ہو جاتی ہے۔ فرماتے ہیں۔

"چونکہ دور حاضر میں دشمنان اسلام نے مقامات مقدسہ کو غصب کر کے اقتدار خلافت کو پامال کر کے مسلمانوں کے واجب الاحترام جان ومال سے زیادہ عزیز مذہب کی توہین کی اور ان کے دینی بھائیوں کی جان ومال۔ عزت وآبرو، کو برباد کیا، اس لئے تمام روئے زمین کے مسلمانوں پر فرض ہو گیا ہے کہ وہ اپنے دینی بھائیوں کی نصرت واعانت اور اپنے پاک اور مقدس مذہب کی حفاظت اور اعدائے اسلام کی مدافعت کے لئے کھڑے ہو جائیں"۔ (۳۸)

شیخ الہند کی نگاہوں میں انگریزوں کی ناقابل معافی جرأت وجسارت یہ تھی کہ انھوں نے اس سرزمین کی گردن میں غلامی کا طوق ڈالا، جس سے مسلمانان عالم کے روحانی وملی جذبات وابستہ تھے۔

خلافت کا خاتمہ چونکہ انگریزوں کے ہاتھوں ہوا تھا، اس لئے بھی ان کی مدافعت کے لئے مسلمانوں کا اٹھ کھڑا ہونا ایک قدرتی بات تھی، شیخ الہند کے خطبۂ صدارت کی اس عبارت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اس سے غرض نہ تھی کہ خلافت اپنی پہلی شکل میں تھی یا نہ تھی ان کے سامنے خلافت عالمی مسلم برادری کی شیرازہ بندی کا ایک سمبل (SYMBOL) تھا۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ اس میں کہیں سے بھی رخنہ اندازی براہ راست اسلام کے اس بنیادی تصور کی جڑوں پر حملہ تصور کیا جائیگا جو ایک وسیع اور عظیم انسانی معاشرہ کی تشکیل کا خواہاں ہے۔ اسی خطبہ صدارت میں آگے چل کر اسلامیان ہند اور بیرون ہند کے مسلمانوں کے باہمی روابط پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں۔

"اسلام نے اپنے پیروؤں اور کلمہ گویوں کے درمیان ایک ایسا رشتہ اتحاد و

۔۔۔ ۷ ۔ ۸ ۔ ۹ ۔ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ ۔ ص ۔ ۳

۳۸ ۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب ۔ خطبہ صدارت اجلاس دوم جمعیۃ علماء ہند ۔ منعقدہ

اخوت قائم کیا ہے جو تمام قومی مصنوعی اتحادات سے بالاتر ہے اس میں قومیت اور لباس اور رنگت کا امتیاز نہیں، صرف خدائے واحد پر ایمان ایک مغربی شخص کو اقصائے مشرق میں رہنے والے کا بھائی بنا دیتا ہے، اور ان بعد المشرقین کے رہنے والوں کے درمیان وہ تمام تعلقات قائم ہو جاتے ہیں، جو ایک بھائی کو دوسرے بھائی کیساتھ حاصل ہوتے ہیں۔" (۳۹)

شیخ الہند کا یہ جملہ بھی سنہرے حروف سے لکھنے قابل ہے۔

"کسی انسانی اور قانونی طاقت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ان کے مذہبی فرائض سے روکے یا ان کی جائز مذہبی جد وجہد کو غیر آئینی قرار دے"۔ (۴۰)

خلافت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"دنیائے اسلام میں گذشتہ چند صدیوں سے سلطان ٹرکی کی واحد سلطنت اسلامی شوکت کی ضامن تھی، اور حرمین محترمین۔ بیت المقدس۔ عراق وغیرہ کے تمام اماکن مقدسہ اور مقامات محترمہ کی حفاظت کی کفیل تھی۔ جمہور اسلام کے اتفاق سے سلطان ٹرکی خلیفۃ المسلمین مانے جاتے تھے۔ اور خلافت کے فرائض نہایت خوبی سے انجام دیتے تھے، انکا عروج و ترقی اور ان کی سلطنت کی وسعت جابر و غاصب مسیحی سلطنتوں کی آنکھ میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی، اور وہ ہمیشہ اسی فکر میں لگی رہتی تھیں کہ خلیفۃ المسلمین کا اقتدار گھٹایا جائے اور مستقر خلافت پر قبضہ کر کے یورپ سے اسلام کا نام ونشان مٹا دیا جائے"۔ (۴۱)

۔۷۔۸۔۹۔ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ۔ ص۔ ۳

۳۹۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب۔ خطبۂ صدارت اجلاس دوم جمعیۃ علمار ہند۔ منعقدہ۔ ۷۔ ۸۔ ۹۔ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ۔ ص۔ ۴

۴۰۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب۔ خطبہ صدارت اجلاس دوم جمعیۃ العلمار ہند منعقدہ ۷۔ ۸۔ ۹۔ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ۔ ص۔ ۸

۴۱۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب۔ خطبہ صدارت اجلاس دوم جمعیۃ العلمار ہند منعقدہ ۷۔ ۸۔ ۹۔ ربیع الاول ۱۳۳۱ھ۔ ص۔ ۹

انگریزوں کی ریشہ دوانیاں اور دسیسہ کاریاں خلافت کے وقار کے لئے ایک چیلنج تھیں، مسلمانان عالم نے اس چیلنج کو قبول کیا، اور ان کی ہر طرح مدافعت کی اور خلافت کے وقار کو قائم رکھنے کیلئے تن من دھن کی بازی لگا دی، جب عوام الناس کا یہ حال تھا تو سوچئے کہ مدبرین قوم کے درد وکرب کا کیا عالم رہا ہوگا۔

۱۸۵۷ء سے لوٹ کھسوٹ کا جو سامراجی سلسلہ شروع ہوا اس کی زد میں چھوٹی بڑی دسیوں مسلم ریاستیں آ گئیں، اور اب لے دے کر خلیفہ ترکی کا دم خم تھا جو اپنے دست وبازو سے مغربی فتنہ گروں سے نبرد آزما رہا۔ علامہ شبلی نے ان حالات سے متاثر ہو کر جو درد بھری نظم کہی وہ اپنی مثال آپ ہے۔

مراکش جا چکا فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریض سخت جاں کب تک

انگریز قوم کو خطاب کر کے شبلی کہتے ہیں۔

کہاں تک لوگے ہم سے انتقام فتح ایوبی
دکھاؤ گے ہمیں جنگ صلیبی کا سماں کب تک
یہ مانا تمکو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پر ہوگا اسکا امتحاں کب تک
یہ مانا تمکو شکوہ ہے فلک سے خشک سالی کا
ہم اپنے خون سے سینچیں تمھاری کھیتیاں کب تک

اب معلوم ہوتا ہے کہ عالم اسلام کی بیچارگی اور مسلمانوں کی اس پر آشوب داستان سے پوری مسلم قوم کے دل دھڑک رہے تھے۔ مرد، عورت، بوڑھے، بچے، جوان سب اس غم میں مبتلا تھے۔ شیخ الہند کا حالات کو سمجھ کر اس کے مرض کی صحیح تشخیص کرنا اور اس کے درد کا درماں بن جانا صرف اس لئے نہ تھا کہ ایک مسلم گھرانے کی فرمانروائی کو تسلیم کیا جائے بلکہ اس کے پیچھے یہ روح کار فرما تھی کہ دشمنان اسلام کو حدود اسلام میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس خطبۂ صدارت میں شیخ الہند نے مسلمانان ہند کے مسائل کو کم چھیڑا

ہے ان کا اصل مطمح نظر عالم اسلام کی زبوں حالی ہے اور بحیثیت ملک و سلطنت ہندوستان پر انگریزوں کا جابرانہ تسلط ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ ان کے پیش نظر یہ مقصد رہا ہے کہ اگر ہندوستان سے انگریزوں کو دیش نکالا مل جاتا ہے تو خود بخود یہ چھوٹی چھوٹی عرب ریاستیں آزاد اور خود مختار ہوتی چلی جائیں گی، اور پھر کسی مرکز تلے آکر اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا پرچم اٹھائیں گی۔

اسی اجلاس کے آخر میں حضرت شیخ الہند کا پیغام صدارت پڑھا گیا جس میں آپ نے فرمایا تھا۔

"میں اس وقت آپ سے رخصت ہو رہا ہوں اور جو کچھ مجھے کہنا تھا خطبہ صدارت میں کہہ چکا ہوں اور جو مبسوط مضمون مولوی شبیر احمد عثمانی نے آج ہی کے اجلاس میں سنایا ہے، اس کے ضمن میں بھی میرے مقاصد و محسوسات نہایت خوبی سے ادا ہو گئے ہیں، اور حضرات علماء متدینین نے بحث و تمحیص کے بعد جو امور طے کئے ہیں ان سے بھی یہ بندۂ ضعیف عملاً علیحدہ نہیں ہے، اس لئے مجھ کو اس سے زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اب ہم سب کو مل کر متوکلا علی اللہ ان تجاویز پر عمل کرانا چاہئے جن سے ہمارے ایمان - ہمارے کعبہ - ہماری خلافت - ہماری عزت و آبرو - اور ہمارے قومی و وطنی حقوق کا تحفظ ہو سکتا ہے"۔ (۴۲)

آگے چل کر کہتے ہیں۔

"کچھ شبہ نہیں کہ حق تعالیٰ شانہ نے آپ کے وطن اور ہندوستان کی سب سے زیادہ کثیر التعداد قوم (ہنود) کو کسی نہ کسی طریق سے آپ کے ایسے پاک مقصد کے حصول میں مؤید بنا دیا ہے، اور میں دونوں قوموں کے اتفاق و اجتماع کو بہت ہی مفید اور منتج سمجھتا ہوں، اور حالات کی نزاکت کو محسوس کر کے جو کوشش اس کے لئے فریقین کے عمائد نے کی ہے اس کی میرے دل میں بہت قدر ہے، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ صورت حال اگر اس کے خلاف ہو گی تو وہ ہندوستان کی آزادی کو آئندہ ہمیشہ کیلئے ناممکن بنا دے گی، اور دفتری حکومت کا آہنی پنجہ روز بروز اپنی گرفت کو سخت کرتا جائے گا اور اسلامی

۴۲۔ شیخ الہند پیغام صدارت اجلاس جمعیۃ علماء ہند - ۹ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ مطابق

اقتدار کا اگر کوئی دھندلا سا نقش باقی رہ گیا تو وہ بھی حرف غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹ کر رہے گا"۔ (۴۲)

٭ ٭ ٭

۲۱ر نومبر سنہ ۱۹۲۰ء۔ ص۔ ۳

۴۲۔ شیخ الہند۔ پیغام صدارت اجلاس جمعیۃ علماء ہند۔ ۹ر ربیع الاول سنہ ۱۳۳۹ھ مطابق ۲۱ر نومبر سنہ ۱۹۲۰ء۔ ص۔ ۴

شاعری

عام طور سے یہ رائے قائم کرلی گئی ہے کہ شعر و شاعری "شیوۂ رندان بلاکش باشد" - یاران طریقت نے اسی پر اکتفا نہ کیا ساتھ ہی یہ بھی کر دکھایا کہ غزلیات میں جا بجا "واعظ" "ناصح" - "محتسب" کو اپنا ہدف ملامت بنایا - شعراء کی روش کوئی نئی نہیں ہے اردو میں یہ چیز فارسی سے آئی اور فارسی میں عربی سے - گو فارسی شاعری نے اس میدان میں خاصے پینترے دکھائے مگر عربیت کو جو اولیت حاصل ہوگئی ہے وہ بہرحال قائم رہے گی - اس طرز فکر کا ایک اثر تو یہ ہوا کہ طبقہ علماء کا ادبی دنیا میں جو مقام ہونا چاہئے تھا وہ انہیں نہیں مل سکا دوسری چیز یہ ہوئی کہ ان کی شاعری مطلقاً نظرانداز کر دی گئی - اس میدان میں اس بات سے بھی فائدہ اٹھایا گیا کہ علماء نے شاعری کی لامقصدیت کو سمجھتے ہوئے اس سے بے اعتنائی برتی اور میدان سخن دوسروں کے ہاتھ میں آتا گیا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ غیر شعوری طور پر یہ رائے قائم کر لی گئی کہ "زہاد" کو سوز و گداز سے کیا ربط - دوسری طرف ایسے افراد نے شعر و شاعری کو اپنا شعار بنایا کہ جنکا خود بھرم قائم نہ رہ سکا تو وہ شعر کی کیا مشاطگی کرتے نیز اخلاق و آداب کی وہ اعلیٰ قدریں جن پر معاشرہ کی سدھار کا دار و مدار ہے وہ ان کی زندگی میں کلیتہً مفقود ہے -

ایسے ماحول اور فضا میں کسی عالم باعمل کے ساتھ شعری تصورات قائم کرنا غلط نہیں تو عجیب تر ضرور ہے مگر کیا کیجئے اسکو کہ منطق اور واقعہ میں بڑا فرق ہوتا ہے - لوگ خواہ کچھ بھی سمجھیں مگر واقعہ یہ ہے کہ ان حضرات کے شعری نمونے جا بجا ادب اردو کی کتابوں میں بکھرے ہوئے ہیں جن کا مطالعہ اس رائے تک پہونچاتا ہے کہ ان حضرات کا تجزیہ کائنات بڑا ہی سچا اور واقعاتی ہے ان کی شاعری گل و بلبل کی داستان نہیں بلکہ سوز کائنات سے ان کے قلب و دماغ تپ رہے ہوتے ہیں یہ الگ بات ہے کہ انہیں بھی استعارے اور کنائے کی زبان استعمال کرنا پڑتی ہے مگر دونوں کے مطمع نظر میں بعد المشرقین ہے - ایک کو "شراب" مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کر کے سزا کا مستحق بتاتی ہے اور دوسرے کی "شراب" اس کے لئے حیات سرمدی کا باعث ہوتی ہے۔

حضرت شیخ الہند کو قدرت نے بڑی فیاضی سے شعر گوئی کا ملکہ ودلیت کیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی ادبی تربیت میں آپ کے والد صاحب کے ادبی ریاض کو بڑا دخل رہا ہے نیز خاندانی روایات بھی ایک موثر عامل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ شیخ الہند کے والد بزرگوار مولانا ذو الفقار علی صاحب کو ادبیات کا بڑا اچھا ذوق تھا ان کے ادبی سرمائے عربی زبان کی معرکۃ الآرا کتابوں کی شرح معانی کی شکل میں موجود ہیں۔ ابو تمام کی حماسہ، دیوان متنبی، اور سبعہ معلقہ کی اردو شرحیں ملک کے ارباب علم سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ شیخ الہند نے معانی وبدیع کی مشہور عربی کتاب "مختصر المعانی" کی شرح لکھی، یہ اسی ادبی کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے،

شیخ الہند کی شخصیت کے انہیں داخلی اور خارجی موثرات نے ان کی زندگی میں سوز وگداز پیدا کر دیا تھا جس کا لازمی نتیجہ انفعال ہوتا ہے اور یہی انفعالی کیفیات جب الفاظ۔ تعبیر۔ کنایہ۔ رمز و استعارے کے پیکر میں جلوہ گر ہوتی ہیں تو شعر ہو جاتا ہے چنانچہ اس زاویہ نگاہ سے شیخ الہند کی شاعری کا مطالعہ ہمیں ان کی داخلیت تک پہونچاتا ہے۔ نیز ان کی شاعری اپنے مزاج، سج دھج اور تیور کے اعتبار سے دبستان دہلی کی پابند اور مقلد نظر آتی ہے، اور ایسا کیوں نہ ہوتا جب کہ دیوبند کا علمی وادبی لگاؤ دہلی سے ملتا ہے نیز اس کے علاقہ کی جغرافیائی حالت بھی بڑی حد تک دہلی کی تابع ہے زبان بھی کھڑی اور خاصی پنجاب زدہ ہے۔ ذیل میں ہم ان کے مرثیہ کے چند اشعار نقل کرتے ہیں جس سے اندازہ ہوگا کہ شاعر کو شخصیت کے فقدان کا تنہا غم نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ امت کی گمرہی و بے راہ روی کا بھی صدمہ ہے۔ شیخ الہند کا یہ مرثیہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی وفات پر لکھا گیا ہے، بے شبہ اس سے پہلے بھی مراثی لکھے گئے اور بعد میں بھی، مگر سوز وحزن۔ رنج والم۔ یاس وحرماں وقعیت محاکات کا صحیح نمونہ یہ قصیدہ ہے۔ اردو اور فارسی کی وادیوں سے گذرتے ہوئے شیخ الہند عربیت کی سرحد میں داخل ہوتے ہیں اور پھر وہی کچھ نوک زباں سے ادا ہوتا ہے جو اس سے پہلے خنساء و متمم کے مراثی میں آچکا ہے، میری مراد حقیقت کے اظہار۔ واقعہ کی سچائی، اور الفاظ کا دل کی گہرائی سے ڈھل ڈھل کر منظوم ہو جانا ہے۔ لکھتے ہیں۔

متاعِ دہر پر غرّہ نہ کر ہے سخت نادانی
غذائے مور ہیں دیکھا جو کرتے تھے سلیمانی

عجب نادان ہیں جن کو ہے تخت و تاج پر غرّہ
کسی کی قیصری باقی رہی اس جا نہ خاقانی

دریغا صرصرِ بادِ حوادث سے ہوئی برباد
کہاں ہے گنجِ بادآور اور تختِ سلیمانی

جہاں ہے خندۂ شادی وہاں ہے نوحۂ ماتم
جو تاجِ خسروی تھا آج ہے کشکول سامانی

سراغ یا تلک ملتا نہیں پہونچے کہیں ایسے
تلاشِ رفتگاں میں گرچہ ہم نے خاک ہے چھانی ۔ (۴۴)

مذکورہ اشعار اپنی صنعت اور فن کی باریکیوں کے لحاظ سے اردو کے کسی بھی اچھے سے اچھے "مرثیہ" کے مقابلہ میں رکھے جا سکتے ہیں۔ شاعر ان اشعار میں کائنات کی بے ثباتی اور زندگی کی کم مائیگی کا اظہار کرتا ہے اور دلیل میں تاریخہائے گذشتہ کی عظیم شخصیات اور مسلمہ حکومتوں کو پیش کرتا ہے کہ ایران کا عہد ساسانیاں اپنے مخصوص کردار اور روایات کی وجہ سے تاریخ کا عہد زریں تھا مگر اب اسی ایران میں جو شاہ خسرو کا تاج تھا جس سے ایران کی عظیم شہنشاہیت کی شوکت قائم تھی وہ اب کاسہ گدائی بن چکا ہے۔ یہی کائنات کا الٹ پھیر اور یہی فلسفہ زیر و زبر اور یہی کشمکش موت و حیات کا چکر ہے جس کے باعث کسی شئی کو کسی جا قرار نہیں اور کسی منزل پر ٹھہراؤ نہیں۔

ہزاروں غم ہیں دنیا میں بتائیں نام کس کس کا
غمِ مرشد ہے پیر مرشد غموں کا ہے یہ وجدانی

خبر بھی ہے کہ اس جانِ جہاں نے ہم سے منہ موڑا
کوئی بے وجہ ہم اپنے ہوئے ہیں دشمن جانی
(۴۵)

۴۴۔ مرثیہ۔ شائع کردہ کتب خانہ اعزازیہ دیوبند۔ ص۔ ۲-۳
۴۵۔ " " " ص۔ ۴

شیخ الہند اس شعر میں اپنے مرشد مولانا گنگوہی، کے وصال کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا سانحہ قرار دیتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ یوں تو دنیا میں ہزاروں غم و آلام نے گھیر رکھا ہے، کچھ قوم مسلم کی زبوں حالی اور تباہی، جس پر جتنا غم کیا جائے کم ہے، اور اس پر سے شیخ طریقت کا اس دار فانی سے کوچ کر جانا میرے لئے کیا ہے گویا غم واندوہ کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے جس کے باعث زندگی اجیرن ہوگئی، اور ایسا کیوں نہ ہو جب کہ سارے لوگوں میں وہ پیر طریقت اور مرشد کامل تھے تو ان کا غم بھی غم زندگی و آلام روزگار کا مرشد ہے۔ یہی نہیں بلکہ زندگی ان کے بغیر سونی ہے گو تم لوگ اسے بے وجہ سمجھ رہے ہو۔

نہ ہو صبح وطن کیوں کر بتر شام غریباں سے
فراق دلربا میں گھر ہے رشک کنج زندانی

خبر ہے جان کو دل کی نہ دلکو جان کی پروا
فقط سینہ پہ ہے ہاتھ اور زانو پر ہے پیشانی۔ (۴۶)

انسان ہمیشہ سے نئی صبح کا تصور کرتا رہا ہے اور ہر دن طلوع ہونیوالے سورج سے اسے نئی دنیا کے خوش آئند تصورات کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری میں صبح کا تصور اپنے لفظی جامہ میں پہنائیاں لئے ہوئے ہے مگر ہمارے شاعر کا یہ عالم ہے کہ وہ "وطن کی صبح" کو "شام غریباں" سے بھی زیادہ بھیانک تصور کرتا ہے کیوں کہ جن دریچوں سے حیات کے رموز و اسرار وا ہوتے تھے اب وہ بند ہو چکے ہیں، اس لئے لطف حیات جاتا رہا ہے اور "مرشد" کے چلے جانے سے نشیمن جیل کی کوٹھری کے مانند ہو کر رہ گیا ہے، جو اسے کاٹنے دوڑتی ہے۔ وارفتگی کا یہ عالم ہے کہ نہ تو دل کو جان کی پرواہ اور نہ جان کو دل کی پرواہ۔ بس سینہ کوبی اور گریہ و ماتم اپنا شعار بنا رکھا ہے، نیز انتہائی خستگی اور شکست خوردگی کے عالم میں نڈھال ہو کر سر کو پہلو میں ڈال کر بیٹھے ہیں۔ شعر کا ہر ہر لفظ شہادت دیتا ہے کہ یہ صرف "شاعری" نہیں ہے، بلکہ حقیقت حال اور شاعر کی اپنی آپ بیتی ہے، جو عالم بیخودی میں شعر کے قالب میں ڈھل

۴۶۔ مرثیہ۔ شائع کردہ کتب خانہ اعزازیہ دیوبند۔ ص۔ ۴

گئی ہے۔

نکل کر کس نے آبادی سے صحرا کو کیا مسکن
چمن ہے دشت اور گھر میں ہے ویرانی سی ویرانی

وہ صحرا دیکھنے سے جس کے گھر یاد آہی جاتا ہے
اب اس کو یاد دلواتی ہے میرے گھر کی ویرانی۔(۴۷)

"شہر خموشاں" کے بارے میں کہہ رہے ہیں کہ جہاں ہر گھڑی ایک "ہو" کا سا عالم رہتا تھا وہاں ہمارے شیخ کی "تربت" سے رونق آگئی ہے، اور اب صحرا صحرا نہیں رہا بلکہ چمن زار بن چکا ہے اور یکا شانہ جہاں ان کا اٹھنا بیٹھنا تھا اب ان کے جانے کے بعد ویرانہ میں تبدیل ہو چکا ہے۔

امید مرگ پر جن کا مدار زندگانی ہو
ہے قابل دیکھنے کے انکی مایوسی و حیرانی (۴۸)

درحقیقت شیخ الہند کا یہ شعر غالب کے مشہور شعر کی ترجمانی ہے۔ غالب کا شعر ہے۔

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
ناامیدی اس کی دیکھا چاہئے

صوفیار کرام کا چلتا ہوا جملہ ہے " الموت جسر یوصل الحبیب من الحبیب" ۔ (موت ایک پل ہے جو محبوب سے محب کو ملاتا ہے)۔ اور چونکہ وصال ہی سے حقیقی زندگانی کا آغاز ہوتا ہے اور یہ وصال بغیر موت ممکن نہیں، اس وجہ سے دنیا کی زندگی حیرانی و مایوسی کی نذر ہو جاتی ہے، اور پھر موت کا پیالہ پی کر جب حجابات اٹھ جاتے ہیں تو دیدار محبوب ہو جاتا ہے۔

نہ سمجھے تھے کہ اس جان جہاں سے یوں جدا ہوں گے
یہ سنتے گو چلے آتے تھے اک دن جان ہے جانی

۴۷۔ مرثیہ۔ شائع کردہ کتب خانہ اعزازیہ دیو بند۔ ص۔ ۵

۴۸۔ " " " " " "

تڑپتے تربت اقدس پہ اس کی ہیں کہ ہوتی تھی

در دولت پہ جس کے نفس امارہ کی قربانی

(۴۹)۔

شاعر کا کہنا ہے کہ روایات صحیحہ اور واقعات ہمیشہ ہی سے موت کے برحق ہونے کا اعلان کرتے رہے ہیں، نیز اس کا یقین بھی ہے مگر یہ لاشعور میں بھی نہ تھا کہ اسطرح اچانک یہ سلسلۂ حیات منقطع ہو جائیگا اور ہم سے شیخ کی جدائی ہو جائیگی، چونکہ ناگہانی اور غیر شعوری واقعات وحوادث ذہن و دماغ اور اعصاب پر بہت برا اثر ڈالتے ہیں، وقتی طور پر حواس معطل ہوجاتے ہیں، ذہن و فکر سلب ہو جاتا ہے، دل و دماغ پر سکتہ طاری ہو جاتا ہے، اور اس وقت تو اور بھی حالت دگرگوں ہو جاتی ہے جب کسی ایسے کی وفات واقع ہو جائے جو مرجع خلائق اور مرشد ہدایت ہو، تو اپنے پیچھے ماتم کناں اور نوحہ خوانوں کا انبوہ گراں چھوڑ جاتا ہے، اور یہ لوگ وہ ہوتے ہیں جو اپنی ساری توجہات کا مرکز اسی ایک ذات کو سمجھتے ہیں، چنانچہ اس کے وصال سے ان حلقہ بگوشوں کا وہی حال ہوتا ہے جو شمع کے گل ہو جانے سے پروانوں کا ہوتا ہے، ہرایک پریشان اور ہرایک ہراساں نظر آتا ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ اس وجہ سے ہم اس کی قبر کے گرد لوٹتے نظر آتے ہیں کہ انہیں کی چوکھٹوں سے ہمیں بے نفسی۔ تواضع۔ انکساری اور بے لوث خدمت کرنے کی تعلیم ملتی تھی، جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ "نفس امارہ" کی قربانی ہو جاتی تھی، اور "نفس لوامہ" کو موقع ملتا تھا کہ شر و فساد کی بنیادیں کھوکھلی کر کے "نفس مطمئنہ" کے لئے راستہ ہموار کر دے۔

غبار کوئے جاناں اب تلک باقی ہے آنکھوں میں
سمائے خاک نظروں میں مری کحل صفاهانی

نہ ہوتے گر جدا قدموں سے اس سالار خوباں کے
تو پھر ہم دیکھ لیتے زال دنیا کی نزہمانی

۴۹۔ مرثیہ۔ شائع کردہ کتب خانہ اعزازیہ دیوبند۔ ص۔ ۔

الٰہی کیا کریں کیوں کر سنیں وہ لحن داؤدی
خدایا کس طرح آوے نظر وہ شکل نورانی ۔ (۵۰)

ان اشعار میں شیخ الہند اپنے دلی جذبات واحساسات کی ترجمانی کر رہے ہیں، جس سے اس تعلق خاطر کا پتہ چلتا ہے جو آپ کو حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کی ذات سے تھا۔

مقدر تھا سو پیش آیا یہی حسرت ہے اب دل میں
کہ اس فخر اکابر کی نہ ہم نے قدر پہچانی ۔ (۵۱)

پیر کی رحلت پر آنسو بہانے کے بعد تحسر کی کیفیات کا اظہار کرتے ہیں کہ قضاء وقدر کی باتیں تو پیش آتی ہی رہتی ہیں، مگر افسوس اس پر ہے کہ ہم نے اس نمونۂ سلف کی ناقدری کی، اور اس سے جو معاملہ کرنا چاہئے تھا وہ ہم نہ کر سکے۔

دل طالب میں کھینچی شاہد مقصود کی صورت
بنام ایزد وہ سلطان المشائخ تھے عجب مانی ۔ (۵۲)

اس شعر میں شاعر کا کہنا ہے کہ ہمارے پیر طریقت نے "سالک" کے قلب پر ذات الٰہی کا نقش بٹھا دیا، اور اس اعتبار سے آپ ایران کے "مانی" سے بڑھے ہوئے تھے، کہ وہ تو صرف کینوس پر تصویریں بناتا تھا اور وہ بھی مادی شکلوں کی، مگر ہمارے مرشد نے خدا کی تصویر بنائی، جو نہ صرف ان دیکھی بلکہ غیر مادی اور لامکان ہے، محض ریاضت اور مراقبہ ومحاسبۂ نفس کی راہ سے آپ نے لامکان کو خانۂ دل میں بٹھا دیا۔

تمہارے خوان نعمت سے نہیں تھے فضلہ چیں ورنہ
کلیسا کی طرف ہرگز نہ جاتے شیخ صنعانی

تو اسنخ انا الحق فیض یاب ہوتے اگر تم سے
انانیت کو اپنی جانتے ایک حظ نفسانی ۔ (۵۳)

۵۰۔ مرثیہ۔ شائع کردہ کتب خانہ اعزازیہ دیوبند۔ ص۔ ۷
۵۱۔ " " " " ص۔ ۸
۵۲۔ " " " " ص۔ ۹

یہ دونوں شعر تاریخ و تصوف کے تلمیحات میں سے ہیں۔ پہلے شعر کے سلسلہ سے یہ بات کہی جاتی ہے کہ شیخ صنعانی اپنے زمانہ میں بڑے پایہ کے عالم، بزرگ، اور سالک گذرے ہیں کسی وجہ سے ایک مرتبہ سودائے محبت سوار ہوگیا اور ایک کلیسا زادی کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہو گئے جس کے باعث انہیں بڑی آزمائش اور سخت ابتلار کے دور سے گذرنا پڑا اسی عالم میں وہ حیران و پریشان تھے کہ انابت الی اللہ کی توفیق نصیب ہوئی اور دوبارہ راہ حق کی ہدایت ملی۔

دوسرے شعر میں منصور حلّاج کی طرف اشارہ ہے جسے شاعر نے "نواسنج انا الحق" سے تعبیر کیا ہے منصور نے نعرہ دیا تھا" انا الحق" یعنی میں ہی حق ہوں۔ جس کی پاداش میں اسے گردن زدنی کی سزا ملی تھی۔ شیخ الہند اس کے نعرہ کو خالص" انانیت" پر محمول کرتے ہیں، ان کی رائے میں یہ بات انانیت و بدنفسی کے باعث پیدا ہوئی تھی کیوں کہ سالک تو راہ کی وسعتوں اور پہنائیوں میں ایسا محو ہوجاتا ہے کہ اسے اس قسم کے نعروں کی فرصت ہی نہیں رہتی پیر محرم اسرار" " افشائے راز" کے جرم کا مرتکب نہیں ہوتا۔

چھپائے جامۂ فانوس کیونکر شمع روشن کو
تھی اس نور مجسم کے کفن میں وہ ہی عریانی ۔ (۵۴)

اس شعر میں تشبیہ ملاحظہ ہو۔ کہتے ہیں کہ شمع جلاکر فانوس میں رکھدی جاتی ہے، تو شیشے اس کی روشنی کا حجاب نہیں بنتے بلکہ انہیں شیشوں سے روشنی چھن چھن کر آتی ہے، اور محفل منور رہتی ہے، بالکل اسی طرح "کفن" کبھی شخصیت کے جسم کو تو ڈھانک کر چھپا سکتا ہے، مگر اس کا علم۔ زہد و تقوی۔ نورانیت، اس سے بلند ہیں کہ وہ چند گز کپڑوں میں چھپ جائیں۔

فقط اک آپکے دم سے نظر آتے تھے زندہ
بخاری وغزالی، بصری و شبلی و شیبانی .

۵۳۔ مرثیہ۔ شائع کردہ کتب خانہ اعزازیہ دیوبند۔ ص۔ ۱۰
۵۴۔ " " " " ۔ ص۔ ۱۱

نہ آئے مہدی موعود اور تم کبھی چلے یاں سے
کریگا گلشن اسلام کی کون اب نگہبانی ۔ (۵۵)

ان اشعار میں کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے مرشد کی ریاضت اور سلف سے اظہار عقیدت کا یہ حال تھا کہ امام بخاری امام غزالی، حسن بصری، شبلی، و محمد بن حسن شیبانی کے تذکرے جب دوران درس یا کسی اور مجلس میں کرتے، تو یوں معلوم ہوتا کہ وہ نفوس قدسیہ باحیات ہیں، اور ان کا فیض جاری ہے گو انہیں گذرے ہوئے صدیاں بیت گئیں ۔

شیخ کو خطاب کر کے کہتے ہیں کہ اے گلشن اسلام کے رکھوالے! تو کبھی چل دیا تو اب اس امت مرحومہ کی شیرازہ بندی کس کے ہاتھوں ہوگی، ابھی تو "مہدی موعود" بھی نہیں آئے ۔ مہدی موعود کا تصور اسلام میں بڑا اہم تصور ہے، روایات بتاتی ہیں کہ انہیں کے ہاتھوں تجدید و احیاء دین کی بنیاد پڑیگی، گو بعض محققین اس تصور کے مخالف ہیں اور مہدی موعود کے متعلق روایات کو غلط گردانتے ہیں تاہم امت کا ایک گروہ اور حلقۂ علماء کا دیانت دار گروہ اس کو صحیح سمجھتا ہے ۔

تمہاری تربت انور کو دیکر طور سے تشبیہ
کہوں ہوں بار بار أرنی، مری دیکھی بھی نادانی

اجمل تھی آپ کی مرموز "لبطن الارض خیر" میں
کہو پھر دوستو کیا ہم نے تہہ کی بات پہچانی ۔ (۵۶)

اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ جس طرح موسیٰ علیہ السلام نے طور پر تجلیات کا فیضان دیکھ کر کہا تھا "رب ارنی انظر الیک" ۔ (اے مالک مجھے اپنا دیدار کرائیے میں دیکھوں گا)۔ اسی طرح شاعر بھی وفور جذبات میں مغلوب ہو کر تربت پر سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے "ارنی ۔ ارنی" مگر خود ہی ایک عالم دانا کی حیثیت سے کہتے ہیں یہ ہماری نادانی تھی ۔

۵۵۔ مرثیہ ۔ شائع کردہ کتب خانہ اعزازیہ دیوبند ۔ ص ۔ ۱۲

۵۶۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے مرثیہ کے بعد حضرت شیخ الہند نے دوسرا مرثیہ مولانا عبد الرحیم صاحب رائپوری قدس سرہ کے سانحۂ وفات سے متاثر ہو کر بزبان فارسی لکھا ہے یہ قصیدہ مسدس ہے، اس مرثیہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ شاہ عبد الرحیم صاحب کے انتقال کی خبر شیخ الہند کو مالٹا کی نظربندی کے زمانہ میں پہونچی، اور وہیں یہ مرثیہ لکھا گیا۔ چند اشعار درج ذیل ہیں۔

قبلہ و کعبہ امانی مرد   عالم و حافظ مثالی مرد
عارف حکمت یمانی مرد   طائر عرش آشیانی مرد

زینت و زیب الف ثانی مرد
شاہ عبد الرحیم ثانی مرد

رہنمائے مسالک ایماں   رہ گرائے منازل ایقان
رہ نورد مراحل احساں   ساقی بزم وحدت و عرفان

زینت و زیب الف ثانی مرد
شاہ عبد الرحیم ثانی مرد

رأس صلحاء و سید علماء   رونق افزائے حلقۂ فقرا
مسند آرائے محفل عرفا   شمع وہاج مجلس غربا

زینت و زیب الف ثانی مرد
شاہ عبد الرحیم ثانی مرد

صوفی و صافی و صفی آداب   فانی و باقی و نقی تواب
خاشع و خاضع و رضی رحاب   لم یکن فاحشا و لا سخاب

زینت و زیب الف ثانی مرد
شاہ عبد الرحیم ثانی مرد ۔ (۵۷)

اس مرثیہ میں حضرت شیخ الہند نے جن دلی جذبات کا اظہار کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کے بعد ان کی عقیدت کا مرکز شاہ عبد الرحیم صاحب

۵۷۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب۔ رسالہ القاسم دیوبند۔ ص۔ ۱۰۳۔ (بابت ماہ رمضان ۱۳۳۸ھ)

کی ذات بابرکات تھی۔

مالٹا کی اسیری کے زمانہ میں مولانا کے رفیق سفر مولوی حکیم سید نصرت حسین صاحب کا جیل کی کوٹھری میں انتقال ہوگیا۔ مولانا پر اس واقعہ کا بہت برا اثر پڑا۔ افسردگی و پژمردگی کا خاصا غلبہ رہا۔ ملول خاطر ہوکر دردانگیز قطعہ تاریخ لکھا۔ اشعار یہ ہیں۔

فغاں کہ مولوی نصرت حسین حامی دین
کہ بود جامع فضل و کمال ولطف وکرم

بہ اسر مالطہ درعین عنفوان شباب
قدم ز قید فرنگ وحیات زد بعدم

بہ غیر قتل وسلاح درجہ شہادت یافت
زفضل رحمت رب غفور جل وعم

سروش گفت چہ نالی مگر نمی بینی
رہائی یافتہ ازہر دو قید یک دم۔ (۵۸)
۱۳۳۷ھ

ان مراثی اور تاریخ قطعات وفات کے علاوہ اور بھی شیخ الہند کے اشعار ہیں۔ جو وفیات سے متعلق ہیں۔ ایک تو جناب دیوان محمد یٰسین صاحب مرحوم کا قطعہ تاریخ وفات ہے۔ دیوان محمد یٰسین صاحب حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے خادم خاص تھے، شیخ الہند کا یہ قطعہ القاسم جلد ۴ شمارہ ۲ بابت ماہ رمضان المبارک ۱۳۳۱ھ، مطابق ۱۹۱۳ء صفحہ ۴۴ پر مطبع قاسمی واقع دیوبند میں چھپا۔

یادمہجوراں کے نام سے دوسرا قطعہ تاریخ مولانا سید احمد حسین صاحب امروہوی کی وفات پر ہے۔ مولانا سید احمد حسین صاحب کا جلسہ تعزیت جس روز دارالحدیث میں ہونے والا تھا، اس روز بعض خدام کی درخواست پر آپ نے اسے لکھ کر دیا، اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے اسے پڑھ کر سنایا۔

۵۸۔ مولانا سید اصغر حسین صاحب۔ حیات شیخ الہند۔ ص۔ ۹۹

گم ہوئی ہے آج صد حسرت ہمارے ہاتھ سے
حضرت قاسم نشانی دے گئے تھے اپنی جو

سید العلماء امام اہل عقل و اہل نقل
پاک صورت پاک سیرت صاحب خلق نکو۔ (۵۹)

شعر سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ مولانا سید احمد حسین صاحب مولانا محمد قاسم نانوتوی کے خلفاء میں سے تھے۔

حضرت شیخ الہند نے مراثی کے علاوہ دوسری اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی فرمائی ہے۔چنانچہ آپ کے شعری سرمایہ میں مختلف مراثی کے علاوہ متعدد قصائد اور دوسرے اشعار بھی ملتے ہیں۔

کل کی ہے بات کہ تھی جہل کی گھنگھور گھٹا
جس طرف آنکھ اٹھاتے تھے محیط عالم

آب حیوان کی طرح علم ہوا تھا مخفی
ظلمت جہل سے مخلوق تھی اعمیٰ و اصم

حافظ علم تھا اک سینۂ صندوق فقط
نہ کوئی حامیٔ وغمخوار نہ کوئی ہمدم

رحمت حق ہوئی حامی تو یکا یک اٹھے
چند مردان خدا باندھ کے صف ٹھونک کے خم

یوسف علم شریعت کے خریدار بنے
جمع کر کے سر اخلاص سے معدود درم

سلسلہ ڈالا فقیرانہ بنام ایزد
کور دہ میں کہ جہاں بیٹھے ہیں ارباب ہمم

شوق کہتا تھا بڑھو منعف کہے تھا ٹھہرو
ناتوانوں کا تھا کیا کہیئے عجب منیق میں دم

۵۹۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب۔ رسالہ القاسم جلد ۲ شمارہ ۱۰، بابت ماہ جمادی الاولی ۱۳۳۱ھ ص۔ ۴۰

اتنے میں دیکھتے کیا ہیں کہ اک مرد خدا
آرہا تیز روی سے ہے لئے ساتھ علم
بے نیازی و توکل رخ روشن سے نمود
قطع منزل کے لئے دونوں قدم تیغ دو دم
چہرۂ خوب سے انوار تواضع ظاہر
نظر نیک سے آثار غنا مستفہم
کس بلا کی تھی نظر پڑتے ہی جس کی فی الفور
پڑ گئی جان میں جان آہی گیا دم میں دم۔(۶۰)

بانوے اشعار پر مشتمل شیخ الہند کا یہ قصیدہ دارالعلوم دیوبند کے احوال و واقعات سے متعلق ہے۔ حضرت شیخ الہند یہ قصیدہ پڑھ کر سنایا جسے سنکر سامعین کے دل بیقرار ہو بیٹھے اور آنکھیں پُرنم ہو گئیں چونکہ یہ قصیدہ دارالعلوم سامنے رکھ کر کہا گیا ہے۔ اس وجہ سے اس میں ہندوستان کی علمی و دینی زندگی پر خاص روشنی پڑتی ہے، پہلے جہل و ضلالت کی گھٹا ٹوپ سیاہیوں کا تذکرہ کہ علمی و اخلاقی پستی کس قدر آچکی تھی، اور ضرورت اس بات کی متقاضی تھی کہ ایک علم کی شمع روشن کی جائے، چنانچہ دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ڈالی گئی۔

جہل کو بھی سبھی کہنے لگے اخسار اخسار
چل دیا پاؤں دبے چپکے سے باتحت ذرم
علم کو لا کے ثریا سے ثری پر رکھا
آنکھوں سے دیکھ لیا علم مالم یعلم
دولت علم سے سیراب کیا عالم کو
قاسم علم بھلا کیوں نہ ہو پھر اسکا علم

۶۰۔ قصیدہ مع مرثیہ۔ کتب خانہ اعزازیہ دیوبند۔ ص۔ ۱۵۔ ۱۶

اس کی آواز تھی بیشک قم عیسیٰ کی صدا
جس کے عدفے سے لیا علم نے دوبارہ جنم ۔ (۶۱)

ان اشعار میں شیخ الہند نے مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی ان کوششوں کو سراہا ہے، جو انھوں نے قیام دارالعلوم اور اس کے علمی و دینی مقاصد کو بلند کرنے کے لئے کی تھیں، کہ اس کی روشنی اور تابندگی سے لوگوں کو جہل سے نفرت ہو گئی، اور اسے کہنے لگے "کھسک کھسکو" نتیجۃً اسے رخت سفر باندھنا پڑا۔ آگے چل کر مولانا محمد قاسم صاحب کے متعلق کہتے ہیں ان کی آواز میں حضرت عیسیٰ کے لفظ "قم" کی تاثیر تھی یعنی جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو "قم" کہہ کر قبروں سے زندہ نکال دیا کرتے تھے، اسی طرح آپ کی جد وجہد احیاء علوم نبوت کی راہ میں مفید و کارگر ثابت ہوئی۔

داغ ہے لفظ لِعَم کو کہ خلافت حق پر
منہ سے اس کے کبھی نکلا نہ خدا ہی کی قسم

لا کو حسرت ہے یہی اور نہ ہوئے کیوں کر
شکل دیکھی نہ کبھی اس کی دعا کی اک دم ۔ (۶۲)

یہ دونوں شعر فرزدق کے اس شعر سے ماخوذ ہیں جو اس نے امام زین العابدین کی شان میں کہے تھے۔ واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ مروان بن حکم حج کرنے آیا ہوا تھا، مجمع بے قابو ہو رہا تھا، مروان کو موقع ہی نہیں مل رہا تھا کہ وہ حجر اسود کا بوسہ لے، بہر حال دھکا کھاتے، گرتے پڑتے پہونچا اور بوسہ دیکر لوٹ ہی رہا تھا کہ دیکھتا کیا ہے کہ مجمع کائی کی طرح پھٹ گیا، اور لوگ باادب ہوکر دو رویہ کھڑے ہو گئے، اور درمیان سے امام زین العابدین علیہ السلام حجر اسود کو بوسہ دینے کے لئے چلے۔ مروان نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے پوچھا یہ کون ہے؟ یہ سوال سن کر فرزدق نے ان کا تعارف کرانا شروع کیا، اور اسی میں پورا

۶۱۔ قصیدہ مع مرثیہ شائع کردہ کتب خانہ اعزازیہ دیوبند۔ ص۔ ۱۸
۶۲۔ 〃 〃 〃 ۔ص ۔ ۲۲

قصیدہ کہہ ڈالا۔ اسی قصیدہ کا ایک شعر ہے۔

ماقال لاقط الا فی تشہدہ۔ لولا التشہد کانت لائہ نعم۔(یہ وہ ہیں جنھوں نے "نہیں" کبھی نہ کہا، سوائے کلمۂ شہادت اور اگر کلمۂ شہادت نہ ہوتا تو ان کا "نہیں" بھی ہاں ہوتا۔)

حضرت شیخ الہند کی فارسی کی ایک نظم ہے، جو راندیر ضلع سورت کی بڑی مسجد کی تعمیر پر آپ نے کہی تھی، اسی میں تاریخ تعمیر کا بھی ذکر کیا ہے۔ نظم کے چند اشعار یہ ہیں۔

اللہ اللہ اہل راندیر ..	برہمت شان صدآفرین است
تجدید نمودہ مسجدے کو	زآثار قدیم فاتحین است
درزینت و خوبی و نکوئی	خجلت دہ نقشہائے چین است
ہررنگ کزو دل فریب است	ہرنقش درست و دلنشین است
برروئے زمیں زرحمت حق	فردوس برائے مومنین است
بشنو کہ چساں زباں حالش	برذات عماد نکتہ چین است
ایں مسجد اگر دیگر مساجد	ہتسند ببیں بہترین است
حیرت چہ کنی مگر نہ بینی	متولی و امام دین است

مسجد کی تعریف و توصیف کے بعد آخری شعر میں تاریخ تعمیر بیان کرتے ہیں

تاریخ بنالیش بے شش و پنج۔ زیبا باللناظرین است۔ (۶۳)

فارسی زبان میں قطعہ تاریخ لکھنے کے بعد اردو میں بھی قطعہ تاریخ رقم فرمایا، جو حسب ذیل ہے۔

جس گھڑی اتمام مسجد کا ہوا۔ کان میں یہ غیب سے آئی صدا

ہے یہ اے محمود تاریخ بنا سجدہ گاہ اغنیار با صفا

اختتام کار مسجد جب ہوا۔ میں نے چاہا لکھوں تاریخ بنا

۶۳۔ پروفیسر سعید احمد اکبرآبادی صاحب۔ مدیر رسالہ برہان دہلی جلد ۱۷

بالقف غیبی نے دی فوراً ندا ۔ ثانی بیت المقدس ہے سنا یہ ۱۳۲۳ھ
بشنو بشنو ز بانِ مصنف ۔ سال او ثانی بیت معمور (۶۴)
(۱۳۲۳ھ)

اب ہم حضرت شیخ الہند کا ایک اور فارسی قصیدہ اس غرض سے پیش کریں گے تاکہ یہ جانا جا سکے کہ فارسی ادبیات کا ذوق شیخ الہند کتنا ستھرا اور پاکیزہ رکھتے تھے۔ یہ قصیدہ امیر حبیب اللہ خاں والی افغانستان کی آمد پر کہا گیا تھا، غالباً ۱۹۰۶ء کے آخری مہینوں کی بات ہے یا ۱۹۰۷ء کے ابتدائی دنوں کی ۔ بہر حال، امیر حبیب اللہ خاں کی آمد سے متعلق ہے ۔ بجائے کسی تبصرے یا اظہار خیال کے ہم بعینہ اس عبارت کو نقل کریں گے جو پروفیسر مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی نے اس کی اشاعت کیوقت برہان میں تحریر کی تھی ۔

" اگرچہ دنیا میں نہ تو شیخ الہند ہیں اور نہ امیر حبیب اللہ خاں، دونوں مرحوم ہو چکے ہیں، لیکن اس قصیدہ میں حضرت اقدس نے لطیف و شیریں زبان میں جن دلی جذبات ملی و اسلامی کا اظہار فرمایا ہے، آج اتنے برسوں کے بعد بھی مسلمانوں میں ان سے حرارت دینی و ایمانی پیدا ہو سکتی ہے، اور اس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہندوستان میں روایات اسلامی کی پامالی کا منظر شیخ الہند کو کس درجہ آتش زیر پا رکھتا تھا، اور وہ کس طرح اسلام کی " نشاۃ ثانیہ " کے لئے تڑپتے رہتے تھے ۔ ان جذبات کو لطیف بیان اور قدرت کلام نے چار چاند لگا دئے ہیں ۔ (۶۵)

اس تبصرہ کے بعد قصیدہ کے بعض اشعار ملاحظہ ہوں ۔

فزودہ شوکت اسلام در روحم رواں آمد
سوئے ہندوستاں شاید حبیب اللہ خاں آمد

مہ اسلامیاں آمد شہ ایمانیاں آمد
امیر خسرواں آمد شہ گیتی ستاں آمد

شمارہ ۱ ماہ جولائی ۱۹۴۶ء ۔ ص ۔ ۵۶

۶۴ ۔ پروفیسر سعید احمد اکبر آبادی صاحب ۔ مدیر رسالہ برہان دہلی جلد ۱۷ شمارہ ۱ ماہ جولائی ۱۹۴۶ء ۔ ص ۔ ۵۷

۶۵ ۔ پروفیسر سعید احمد اکبر آبادی صاحب ۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃

نہنگے سوئے بحر و شیر سوئے نیستاں آمد
بملک ہند یعنی والی کابلستاں آمد
فروغ اختر ما بین و نور طالعم بنگر
سراج ملت و دیں بر سر ما میہماں آمد
فطوبیٰ لک زہر سو بر لب روحانیاں رفتہ
اتیتم اہلا وسہلا کلام انس وجاں آمد
امیر حق پسند و نکتہ داں فضل خداوندست
ز فضل او امیر حق پسند و نکتہ داں آمد
برد ظل الٰہی قہرماں مہرباں بر خلق
فدائے رحمت او قہرماں مہرباں آمد
بعقل و بخت گر شاہ خوش آمد نے بتاج و تخت
امیر ما بعقل پیر و با بخت جواں آمد
وجود خسرو حامی دیں عنقاست در عالم
بحمد للہ شاہ دین حق را پاسباں آمد
بہ بحر ابر مہ نیساں و در کنعانیاں یوسف
بجوئے خشک آب و در چمن سرو رواں آمد
بجوش خرمی و شادمانی صوفی و ملا
زشوق نغمہ سنجی در شمار شاعراں آمد
ہمہ آتش کہ کفار سیہ را کرد خاکستر
بہندوستان پئے سیرابی لب تشنگاں آمد
تعالی اللہ آمد از در ما معدلت کیشے
کہ بر خوان سخایش ماہ و پر دیں میہماں آمد
شہنشاہے کہ بر بہائے جاں از عالم علوی
سنبلش مقدمش در ہند تاج خسرواں آمد۔

امیر حبیب اللہ خاں والی کابل کی ہندوستان میں آمد اسلامیان ہند کیلئے مژدہ جاں فزا سے کم نہ تھی، غالباً اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کسی مسلمان بادشاہ کو دیکھے ہوئے خاصا عرصہ گذر چکا تھا، اور شہنشاہیت کے تصورات (جس کے عملی ذائقہ سے مسلمانان ہند کے کام و دہن اب تک آشنا تھے) اب تک اپنے ذہنوں میں قائم رکھے تھے، یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے ہر حلقہ نے ان کی آمد کو سراہا اور دلی میں ان کے چند روزہ قیام کو خدا کی بڑی نعمت سمجھا۔ یہاں پر یہ واقعہ غیر دلچسپ نہ ہوگا کہ امیر حبیب اللہ خاں والی کابل کی دلی میں آمد جمعہ کے دن ہوئی تھی، اور حسن اتفاق سے اسی روز عید الفطر بھی واقع ہوگئی تھی، چنانچہ شام کو جب شہر کے برآوردہ حضرات کا وفد پہونچا تو ڈپٹی نذیر احمد صاحب نے موقع و مناسبت کو دیکھتے ہوئے مشہور عربی شاعر ابوالطیب المتنبی کا یہ شعر ان کی نذر کیا۔

عید و عید و عید جار مجمعا وجہ الحبیب و یوم العید والجمعا

روایت یوں بیان کی جاتی ہے کہ امیر حبیب اللہ خاں اس شعر کو سن کر تڑپ اٹھے، اور اچک اچک کر ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے خاطر خواہ بوسے لے ڈالے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کا کہنا ہے کہ ہمارے مولانا بڑے چٹخارے لیکر اس واقعہ کا ذکر کرتے تھے۔ (۶۷)

شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب اپنے مذکورہ قصیدے کے علاوہ تین قصیدے اور بھی کہے ہیں، گو ایک حیثیت سے ہم ان تینوں کو ایک بھی کہہ سکتے ہیں۔ اب ہم ان کے دوسرے قصیدے سے جستہ جستہ اشعار نقل کرتے ہیں۔

زعدلش شمع بر پروانہ شد نار خلیل اللہ
پئے کنجشک بین بال و پر باز آشیاں آمد

۶۶۔ پروفیسر سعید احمد صاحب اکبرآبادی۔ رسالہ برہان دہلی۔ شمارہ ۳ جلد ۶ بابت ماہ مارچ سنہ ۱۹۴۷ء۔ ص۔ ۲۳۰

۶۷۔ مرزا فرحت اللہ بیگ۔ ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی۔ ص۔ ۷۸

زانفاسِ نفیس ہبر عالی جاہ من کابل
بڑائے دولت ودین واماں دارالاماں آمد۔ (۶۸)

امیر حبیب اللہ خاں کی مدح و ستایش کے بعد مسلمانانِ ہند کی خوشی اور ان کے اظہارِ عقیدت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں، کہ مسلمانوں کو کیوں نہ خوشی ہو اور وہ کیوں نہ سرشار ہوں، کہ مدتوں کے پیاسے ہونٹوں کو برسوں کے بعد کوئی ساقی میسر آیا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں۔

قلوبِ مومناں چوں جائے او آمد غلط نبود
اگر کوئی مکانش خوبتر از لامکاں آمد

عجب دارم سراپا حیرتم محوِ تماشایم
کہ نزدِ تشنگاں یارب چہ شیریں چساں آمد

سپاس حق بجا آرم فروغ بخت را نازم
کہ تیر آرزوئے ماغریباں بر نشاں آمد

زذکر احتساب اوکہ در بتخانہا رفتہ
بجائے نالۂ ناقوس گلبانگ اذاں آمد

ہماں زندے کہ برا و ضاع زاہد طعنہا ئے زد
برنش و جبہ و تسبیح مثل زاہداں آمد

بکفر و زندقہ خوانید بر بندید محملہا
کہ آں غارت گر الحاد در ہندوستاں آمد۔ (۶۹)

سنہ ۱۹۱۴ء میں درۂ دانیال کے دہانہ پر انگریزوں اور ترکوں میں زبردست جنگ ہوئی۔ اس جنگ کی تاریخی نوعیت مسلم تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے کیوں کہ انگریزی سامراج سے مسلم حکومتوں کا جہاں کہیں بھی ٹکراؤ ہوا انہیں پسپا ہونا پڑا لیکن یہی ایک ایسا معرکہ ہے کہ جس میں انگریز طاقت کو منہ کی کھانی پڑی، اور فتح و نصرت کے غرور سے سرشار قوم کو شکست و ہزیمت کی شراب چکھنی پڑی۔

۶۸۔ پروفیسر سعید احمد صاحب اکبر آبادی۔ مدیر رسالہ برہان دہلی بابت ماہ مارچ سنہ ۱۹۶۴ء شمارہ ۳ جلد ۱ [illegible]

سامراجیوں کے لئے تو یہ یقیناً تلخ گھونٹ تھے، لیکن کوئی مسلمانوں کے دل سے پوچھتا کہ اس شکست کے کتنے دور رس اور معنی خیز نتائج مرتب ہو رہے تھے۔ مسلمانان ہند جو بحیثیت مجموعی خلافت کے ماننے والے تھے، ان کی خوشی کا اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے، کہ ہندوستان میں قوم مسلم کے واحد نمائندہ مولانا شیخ الہند نے ایک پر جوش اور ولولہ انگیز نظم کہی۔ مالٹا کی جیل کی چہار دیواریوں کے اندر سے اپنے جوش اور ولولۂ حیات کا اظہار کیا چند اشعار نمونہ کے طور پر درج ذیل ہیں۔

کیا کہوں اللہ اکبر کیا ہے شان درد نیل
سجدہ گاہ اشقیاء ہے آستان درد نیل

رستم و سہراب کے قصے ہیں تقویم کہن
ہم سے سن لے کوئی آکر داستان درد نیل

بے تکلف آئیں سب اعدا کو دعوت عام ہے
کچھ نہ پوچھو کس قدر بہتا ہے خوان درد نیل

ہم نے یہ مانا نہیں ہیں گو عزیز و مہرباں
لندن و پیرس مگر ہیں میہمان درد نیل

ہر پیاسے کو پلایا جام لبریز اجل
آفریں صد آفریں اے ساقیان درد نیل

بس ہوئی ایسی کہ بس کہنے کو بھی مہلت نہ دی
مرحبا صد مرحبا اے میزبان درد نیل

مست ہوئے ایسے قیامت ہی کو اب آئینگے ہوش
اللہ اللہ کون ہے پیر مغان درد نیل

خر جو پیتا خم ہے سمجھو لگے چلیٹی کے پر
اس کو سمجھے گا جو ہوگا رازدان درد نیل

(۷۰)۔

۷۰۔ حضرت شیخ الہند۔ کلیات شیخ الہند مطبع قاسمی دیوبند ۱۳۳۰ھ ص۔ ۲۷

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سلسلۂ شعر و سخن ختم کرنے سے پہلے حضرت شیخ الہند کی مناجات کے بھی چند شعر نقل کر دیئے جائیں۔

سب مراتب ہیں تری ذات مقدس سے ورے
کس زباں سے کہوں ہے مرتبہ اعلیٰ تیرا

نور خورشید چمکتا ہے ہر ایک ذرہ میں
چشم بینا ہو تو ہر شے میں ہے جلوہ تیرا

بیم دوزخ ہے اسے اور نہ شوق جنت
جس کو مطلوب ہے اک درد کا ذرہ تیرا

تیرے دیوانوں کو کیا قید علائق سے گزند
دونوں عالم سے کبھی آزاد ہے بردا تیرا

دل صد پارہ ہو ہر پارہ میں ہو داغ جنوں
نام کندہ ہو ہر اک داغ پہ مولا تیرا

نفس و ابلیس کے پھندے میں پھنسا ہوں لیکن
دل سے اقرار یہی ہے کہ ہوں بندہ تیرا

ہم سیہ بخت اگر ایسے ہی ناکام رہے
کیسے جانیں گے کہ کیا فضل ہے ربا تیرا

(۷۱)۔

۷۱۔ مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری۔ تذکرہ شیخ الہند۔ ص۔ ۳۶۵

باب چہارم

شیخ الہند محمود حسن کے اصلاحی کارنامے

یہ کلی بھی اس گلستان خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

گذشتہ ابواب میں ملک کی عمومی حالت اور انگریزوں کے تسلط سے پیدا ہونے والے اثرات کے جائزہ کے علاوہ شیخ الہند کے ابتدائی حالات اور ان کی گراں قدر علمی خدمات پر ہم تفصیل سے روشنی ڈال چکے ہیں۔ بلا شبہ شیخ الہند کی علمی خدمات عرصہ دراز تک ان کا نام روشن رکھنے کے لئے کافی ہیں، لیکن آئندہ صفحات میں ہم شخصیت کا وہ رخ پیش کر رہے ہیں جو اگر اب تک نگاہوں سے اوجھل نہیں تو دھندلا ضرور رہا ہے، اور اسے وہ تاریخی اہمیت جسکا وہ مستحق ہے اب تک نہیں مل سکی۔ مختلف کتابوں میں، اگرچہ ان کی تعداد بھی کم ہی ہے؛ لیکن پھر بھی مولانا شیخ الہند کے عام حالات، درس کی خصوصیات، اور علمی خدمات کا تذکرہ مل جاتا ہے لیکن آپ کی سیاسی خدمات کا تذکرہ خال خال ہی نظر آتا ہے۔ جس کا سبب ہمارے خیال میں یہ ہے کہ آزادی سے قبل ان واقعات و حالات کی صحیح تفصیل پیش کرنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ آزادی کے بعد اس طرف سے بے توجہی اور صرف نظر کی وجہ یہ رہی ہے کہ ذرائع معلومات محدود تر ہو گئے۔ تحریک کے زمانہ میں ان خدمات کو کاغذ کی امانت نہیں بنایا جا سکا۔ لے دیگر اشخاص و افراد جو اس میں شیخ الہند کے شریک اور معاون رہے تھے، ان کے حافظہ اور یادداشت کی مدد سے اسے محفوظ کر لینا اگرچہ ممکن تھا، لیکن اس کی طرف بھی کماحقہ توجہ نہ دی جا سکی۔

ایک اور سبب جو آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد دونوں میں مشترک ہے، وہ تذکرہ نویس ذہنوں کا وہ چور ہے کہ کہاں ایک صاحب تسبیح و سجادہ بزرگ اور کہاں میدان سیاست؟ مذہب و سیاست میں فرضی اور خیالی بعد نے بھی ہمیں اس طرف توجہ

۔یہے سے باز رکھا ہے چنانچہ ہماری نظر سے ایسی متعدد تحریریں گذریں جن میں شیخ الہند کے دامن سے یہ مرحوم "داغ" دھونے کی کوشش کی گئی ہے، لیکن ہم ان افراد سے کیوں کر کہیں جنھوں نے اس طرح کی کوششیں کی ہیں، کہ یہ "داغ" داغ نہیں، بلکہ یہ پائے کمال کا وہ خلخال ہے، جس نے شیخ الہند کو اپنی پوری جماعت میں امتیاز اور انفرادیت بخشی ہے۔

شیخ الاسلام حضرت مدنی شیخ الہند کے عزیز شاگرد تھے، اور مالٹا کی اسیری میں آپ کے ساتھ رہ چکے تھے۔ انھوں نے "اسیر مالٹا" اور "نقش حیات" کے صفحات میں ان تاریخی حقائق کو جن تک ان کی رسائی ہو سکی جمع کر دیا ہے۔ اس حیثیت سے یہ دونوں کتابیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان دونوں کتابوں کے علاوہ بعض دوسری کتابوں میں بھی اس سلسلہ سے کچھ چیزیں مل جاتی ہیں۔ مگر یہ تاریخی خزانہ بہت ہی منتشر اور بکھرا ہوا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کو صحیح ترتیب اور مناسب تجزیہ کے ساتھ وہ تاریخی اہمیت دیجائے جس کا وہ مستحق ہے، اور اس طرح دستاویزی حیثیت دیکر قوم کی امانت قوم کے ہاتھوں میں دیدی جائے۔

آئندہ صفحات میں ہم نے یہی کوشش کی ہے۔ ہم نے اس امر سے احتراز کیا ہے کہ واقعات کی رنگ آمیزی کر کے انہیں افسانوی حیثیت دی جائے، بلکہ کوشش کی ہے کہ واقعات کی ترتیب و تحقیق اس طرح کیجائے جس سے "تاریخیت" پر آنچ نہ آسکے۔

یہ عین ممکن بلکہ ضروری ہے کہ واقعات کو حقیقت پسندانہ نگاہ سے دیکھنے پر ہمیں کچھ ایسے تہ در تہ تاریخی پردے اٹھانا پڑیں، جنھوں نے اپنی ظاہری چمک دمک سے نگاہوں کو خیرہ کر رکھا ہے، لیکن ان کے پیچھے غلاظتوں کے ڈھیر پر لوگوں کی نگاہیں نہیں پڑ سکیں، ہمیں اس سلسلہ میں معاف کیا جائے کیوں کہ تاریخ نگاری اور علمی دیانت کا تقاضا ہم سے یہی ہے۔

شاہ ولی اللہؒ کی تحریک کا حسب ضرورت تذکرہ پہلے باب میں کیا جا چکا ہے شاہ صاحب کی تحریک کا رخ اگرچہ اندرون ملک غلط عناصر سے نبرد آزمائی کی طرف تھا، تاہم اس میں ایسے واضح پیغامات تھے کہ اس کی روشنی میں وقت ضرورت بیرونی

طاقت سے الجھنا بھی آسان تھا۔

انیسویں صدی میں سید احمد شہیدؒ کی تحریک کو روشنی شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تحریک سے ملی۔ سید صاحب کی شہادت کے بعد آپ کے پیروکاروں اور متعین کی جو جماعت بچ رہی تھی اس نے ۱۸۵۷ء کا میدان کارزار سجایا، جس کا تذکرہ گذر چکا ہے۔ اس اعتبار سے سید احمد شہیدؒ کی تحریک کو شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک کا پرتو یا نقش ثانی کہا جا سکتا ہے۔ شاہ صاحب کی تحریک کا نقش ثالث شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کی تحریک ہے، جس کی ضرورت کا احساس ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد دلوں میں پیدا ہو چلا تھا۔ اسی احساس کا ایک مظہر دارالعلوم دیوبند کا قیام تھا، جس نے عملاً پر پرزے انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں نکالے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ نقش ثالث بھی نقش ثانی کی طرح مکمل کامیابی سے ہم کنار نہ ہو سکا، بلکہ اس کی نوعیت تو کچھ یہ تھی کہ ۔رع۔ اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہو گئے ۔ مولانا غلام رسول مہر نے شیخ الہند کی کوشش و کاوش کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"حضرت شیخ الہند اپنی عملی زندگی کے آغاز ہی میں ایک نقشۂ عمل تیار کر چکے تھے اور اسے لباس عمل پہنانے کی کوششیں انھوں نے اس وقت شروع کر دی تھیں جب ہندوستان کے اندر سیاسی سرگرمیاں محض برائے نام تھیں۔ ملک کے حالات کسی تیز تحریک کے لئے ہرگز سازگار نہ تھے، مسلمانوں پر حیرانی اور افسردگی طاری تھی۔ وہ ثریا سے تحت الثری میں جا گرے تھے۔ اور کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اپنی کھوئی ہوئی حیثیت حاصل کرنے کے لئے کون سا راستہ اختیار کریں، اور کس طریق عمل پر گامزن ہوں۔ ایسے اصحاب بہت کم نظر آتے تھے جن کے خلوص پر اعتماد کیا جا سکے، اور جو پیش نظر مقاصد کیلئے بے تکلف ہر قسم کی قربانیوں پر آمادہ ہوں۔ پھر حضرت شیخ الہند کے سامنے ایک بڑی مصلحت یہ بھی تھی کہ دارالعلوم دیوبند کو حکومت کے عتاب سے حتی الامکان محفوظ رکھیں"۔ (۱)

۱۔ مولانا غلام رسول مہر۔ سرگذشت مجاہدین ۔ص۔۳۔ ۵۵۲

شیخ الہند کے اس جواب سے جو انھوں نے دارالعلوم کے مقصد قیام کے متعلق دیا تھا، نہ صرف مہر صاحب کے مندرجہ بالا تجزیہ کی تائید ہو جاتی ہے بلکہ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دارالعلوم کے قیام کا مقصود محض علمی قیل و قال نہ تھا بلکہ اس کے بلند نظر بانیین کے پیش نظر فکر ولی اللہی کا احیا بھی تھا۔

دیوبند کے تذکرہ میں ہم شیخ الہند کا وہ جواب تحریر کر چکے ہیں، یہاں پھر اس خیال سے پیش کر رہے ہیں کہ بات ذہن میں تازہ ہو جائے۔ مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی کے استفسار پر شیخ الہند نے فرمایا کہ۔

"حضرت الاستاذ نے اس مدرسہ کو کیا درس و تدریس، تعلیم و تعلم کے لئے قائم کیا تھا؟ مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا، جہاں تک میں جانتا ہوں ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کی ناکامی کے بعد یہ ادارہ قائم کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے، تاکہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کیجائے۔" (۲)

اسی سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ۔

"صرف تعلیم و تعلم، درس و تدریس، جن کا مقصد اور نصب العین ہے، میں ان کی راہ میں مزاحم نہیں ہوں، لیکن اپنے لئے تو اسی راہ کا انتخاب میں نے کیا ہے جس کے لئے دارالعلوم کا یہ نظام میرے نزدیک حضرت الاستاذ نے قائم کیا تھا۔" (۳)

شیخ الہند کے اس جواب کی روشنی میں ان کا طرز فکر اور طریقہ عمل بھی واضح ہو جاتا ہے، نیز اس مقصد قیام کو مدنظر رکھتے ہوئے لازمی طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ دیوبند تحریک کا حاصل شیخ الہند کی ذات گرامی ہے۔ باقی جن حضرات نے دارالعلوم کے اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر کام کیا، ان سب کی حیثیت شیخ الہند کے متبعین یا پیروکاروں کی ہے۔

مولانا ذوالفقار علی صاحب جب بریلی میں بسلسلۂ ملازمت مقیم تھے تو وہیں حضرت شیخ الہند پیدا ہوئے۔ چھ سات سال کی عمر ہو گی کہ مولانا ذوالفقار علی

۲۔ مولانا مناظر احسن گیلانی۔ سوانح قاسمی جلد دوم۔ ص۔ ۲۲۶

۳۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃

صاحب کا تبادلہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ سے کچھ قبل میرٹھ ہوگیا۔ (۴) میرٹھ ہی سے ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کی وہ چنگاری اٹھی تھی جس کی آگ نے سارے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ شیخ الہند اگرچہ عمر کے ابتدائی مراحل میں تھے؛ بے شعوری اور ناپختگی کا سن تھا، تاہم چونکہ ذہین تھے اس لئے واقعات کا مدھم سا نقش دماغ پر باقی تھا، جسے سن شعور نے رفتہ رفتہ واضح کر دیا۔ بڑے ہونے پر جن بزرگوں کی صحبت میسر آئی انھوں نے اس شعور کو پختہ تر کر دیا۔

دیوبند کے مقصد قیام کے متعلق شیخ الہند کا جواب اوپر ہم نقل کر چکے ہیں، دیکھا جائے تو اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ دارالعلوم دیوبند جن بزرگوں کی کوششوں اور تمناؤں کا مظہر تھا، وہ خود ۱۸۵۷ء کے معرکۂ کشت وخون میں حصہ لے چکے تھے؛ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی؛ مولانا رشید احمد گنگوہی؛ مولانا قاسم نانوتوی وغیرہم کی شرکت جہاد کا تذکرہ گذر چکا ہے۔ یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ ان بزرگوں کو ۱۸۵۷ء کی ناکامی اور اس کے نتائج واثرات نے بےچین کر رکھا تھا، اور اب ان کو یہ فکر تھی کہ اس کی تلافی کیوں کر ہو؟ چنانچہ قیام دارالعلوم کے ذریعہ انھوں نے داخلی طور پر انقلابی عناصر پیدا کرنے کی کوشش کی۔

شیخ الہند کی سیاسی کارگذاریوں کے ترتیب وار مطالعہ سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ انقلاب کا جو ڈھنگ مذکورۃ الصدر بزرگوں کے پیش نظر تھا، اسی طریقہ پر آپ نے بھی اپنی انقلابی کوششوں کو ترتیب دیا تھا۔

یوں تو شیخ الہند کی حیات کا لمحہ لمحہ اسی فکر اور اسی ادھیڑبن کی نذر ہوا، لیکن اس کے جو مظاہر سامنے آئے وہ یہ ہیں: ثمرۃ الترتیب کا قیام؛ جمعیۃ الانصار کا قیام، دینی مدارس کی بنیاد، نظارۃ المعارف کی سرپرستی، اور سب سے واضح طور پر تحریک ریشمی رومال، جس کے نتیجہ میں قید وبند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔ آئندہ صفحات میں ان سب کا حسب ترتیب تذکرہ کیا جارہا ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

۴۔ مولانا سید حسین احمد مدنی۔ نقش حیات دوم۔ ص۔ ۱۳۱

ثمرۃ الترتیب کا قیام

گذشتہ صفحات میں ہم اس طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ شروع سے شیخ الہند کے پیش نظر دارالعلوم کے ذریعہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں ناکامی کی تلافی تھی۔ مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کی صحبتوں نے اس تصور کو بہت واضح کر دیا تھا چنانچہ شیخ الہند کے شب و روز اسی فکر میں گذرتے تھے کہ اس ناکامی کی تلافی کیوں کر ہو اور اس کے لئے کون سے طریقے اختیار کئے جائیں۔

اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ الہند کا تعلیمی دور بھی اس جذبہ اور خیال سے خالی نہیں گذرا۔ تکمیل تعلیم کے بعد ۱۸۷۳ء میں آپ دارالعلوم دیوبند کے باضابطہ مدرس منتخب ہوئے اور ۱۲۹۴ھ مطابق ۱۸۷۵ء میں مولانا محمد قاسم صاحب وغیرہ کے ساتھ حج کے لئے تشریف لے گئے۔ اس سفر کیوجہ سے تقریباً چھ ماہ تک آپ تدریس سے علیحدہ رہے۔ ۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸۷۶ء میں سفر حج سے واپسی کے بعد حسب سابق درس و تدریس کا سلسلہ شروع فرمایا۔

چند ہی سال بعد مولانا محمد قاسم نانوتوی کا سانحۂ ارتحال پیش آیا، جس نے شیخ الہند کے تصورات و عزائم کو زیر و زبر کر دیا۔ یہاں تک کہ درس و تدریس کے مشغلہ سے بھی دل اچاٹ ہوگیا۔ اس میں شک نہیں کہ آپ کے لئے یہ غم بہت بڑا تھا، لیکن آخر کب تک رہتا، دوسروں کے سمجھانے اور اپنے عزم و ہمت کے سہارے، پھر مشغلۂ درس جاری فرمایا۔ (۵)

استاد محترم کے افکار و خیالات اور عزائم کو زندہ جاوید بنا دینے کے خیال سے اسی سال ۱۸۷۸ء میں آپ نے "ثمرۃ الترتیب" نامی ایک تنظیم کی تشکیل کی۔

مولانا محمد میاں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"باخبر حضرات واقف ہیں کہ ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۸۷۸ء میں حضرت شیخ الہند اور آپ کے احباب نے فضلاء اور بہی خواہان تحریک دارالعلوم دیوبند کی ایک جماعت

۱- ۵۔ مولانا سید اصغر حسین حیات شیخ الہند ص۔ ۱۸

بنائی، جس کا نام "ثمرۃ الترتیب" (یعنی تعلیم و تربیت کا پھل) تھا۔ ایک عرصہ تک اس جماعت نے کام کیا، مگر پھر وہ بظاہر سست پڑ گئی، اور ۱۸۷۸ء سے تیس سال بعد ایک دوسرے نام سے اس کا ظہور ہوا"۔ (۶)

یہ انجمن شیخ الہند کی کوششوں اور آپ کے افکار و خیالات کے اولین مظہر کی حیثیت سے وجود پذیر ہوئی۔ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے قیام سے تنظیمی مشکلات کا تجربہ، اور آئندہ اقدام کے سلسلہ میں اس کے بانیین اور منتظمین کو طریقۂ کار اور طرزِ عمل کے تعین کا سلیقہ بھی اس سے حاصل ہوا۔

یہ تحریک اس وقت محدود پیمانہ پر چلائی گئی، جس کا فائدہ بہرحال کچھ نہ کچھ سامنے آیا۔ یہی کیا کم ہے کہ اس کی روشنی میں آئندہ تحریک کیلئے کوئی واضح قدم اٹھانا ممکن ہوسکا۔ مولانا محمد میاں کی مندرجہ بالا تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ انجمن زیادہ دنوں تک سرگرم عمل نہ رہ سکی۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ حالات دن بدن اس کے دائرہ کار سے زیادہ کے طالب ہو رہے تھے۔

بہرحال یہ مختصر تحریک جو بظاہر جلد ہی ختم بھی ہو گئی، لوگوں کے ذہنوں کو ایک پیغام دے گئی، جس نے آئندہ ان کے لئے مشعلِ راہ کا کام کیا۔

جمعیۃ الانصار کا قیام

اس سے پہلے، ہم یہ تحریر کر چکے ہیں کہ شیخ الہند کی کارگذاریوں کے غائر مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے، کہ آپ نے اپنے ذہن میں انقلاب کا جو نقشہ تیار کیا تھا، اور اس کے لئے جو طریقۂ کار اختیار کیا، وہ اپنے بزرگوں مولانا محمد قاسم صاحب، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب اور مولانا گنگوہی کے طرز پر تھا۔ یعنی قوم کی مذہبی بنیادیں اس قدر استوار و مستحکم کر دی جائیں، کہ ہر وہ چیز جو دوسری راہوں سے آئے اس کے یہاں ناقابل قبول ٹھہرے۔ نیز مذہبی بنیادوں پر کام کرنیکا ایک مقصود یہ بھی تھا کہ عوام میں صحیح دینی روح پھونک کر انکو منحد کیا جائے، تاکہ جب وقت

۶۔ مولانا سید محمد میاں۔ علماء حق جلد اول۔ ص۔ ۱۱۲

پڑے وہ بلا پس و پیش میدان کارزار میں در آئیں۔ شیخ الہند کی کوششوں کا جو شخص بھی مرتب طور پر مطالعہ کریگا، ہمیں یقین ہے وہ اسی نتیجہ پر پہونچے گا۔
حضرت شیخ الہند نے رمضان المبارک ۱۹۰۹ء میں انتہائی غور و خوض کے بعد "جمعیۃ الانصار" کے نام سے ایک وسیع تنظیم کا خاکہ مرتب کیا۔ دارالعلوم دیوبند چونکہ دن بدن وسعت اختیار کرتا جارہا تھا، اور اس کے طالب علموں میں ملک کے مختلف حصوں کے علاوہ صوبہ سرحد اور افغانستان وغیرہ سے بھی کافی تعداد میں طلبار آنے لگے تھے؛ شیخ الہند نے اس طرح سب کو متحد کرنے اور ان کے ذریعہ دوسروں کو قریب لانیکا منصوبہ بنایا۔ (۷)
دارالعلوم میں اس وقت تک متعدد جلسہائے دستار بندی ہو چکے تھے۔ شیخ الہند نے اپنے مذکورہ بالا مجوزہ پروگرام کی ہمہ گیر اشاعت کے لئے جلسۂ دستار بندی کو عمدہ ذریعہ خیال کیا۔ یوں بھی حالات سیاست کے نام پر کچھ کرنے کیلئے سازگار نہ تھے، اس کے برعکس مذہبی راہوں سے کوئی کام نسبتاً آسان سمجھا جاتا تھا۔ (۸)
اس خیال سے ۱۹۱۰ء میں ایک عظیم الشان جلسۂ دستار بندی کیا گیا۔ مستحقین دستار فضیلت کی تعداد اگرچہ چھ سو کے قریب تھی، لیکن سب آ نہ سکے تھے، اس لئے اس اجلاس میں دو سو علمار کے دستار فضیلت باندھی گئی۔
اس جلسہ میں ملک کے کونے کونے سے آکر لوگوں نے شرکت کی حاضرین کی تعداد کا اندازہ کوئی تیس ہزار کے قریب کیا گیا ہے، جس میں علمار و صالحین اور اولیار اللہ کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز تھی۔ اسی اجلاس سے رسالہ "القاسم" کے اجرار کا اعلان ہوا، اور اسی میں جمعیتہ الانصار کے مقاصد اور نظام کار کی بھی تشہیر کی گئی، اور مولانا عبید اللہ سندھی جو اس کے لئے موزوں ترین آدمی تھے، انہیں جمعیتہ الانصار کا ناظم بنایا گیا۔ (۹)

۷۔ مولانا سید محمد میاں۔ علمار حق جلد اول۔ ص۔ ۱۳۰
۸۔ 〃 〃 ۔ص۔ ۱۳۰۔ ۱۳۱

مولانا سندھی نے جمعیۃ الانصار کے حسب ذیل بنیادی مقاصد کا اعلان کیا۔
الف :۔ قرآن پاک وحدیث شریف کے اسرار و لطائف سے عام مسلمانوں کے کان مانوس ہوں۔
ب :۔ عقائد واعمال کی اصلاح کے متعلق علمی مضامین پڑھے جائیں۔
ج :۔ مسلمانوں کے مذہبی علوم ومعارف کی حفاظت واشاعت کے وسائل پر عموماً اور مدارس کی اصلاح وعمارت پر خصوصاً بحث ومشورہ ہو۔۔۔ ان سب امور میں کامیاب ہونا اس پر موقوف ہے کہ مختلف اوقات اور متفرق مقامات میں جمعیۃ الانصار کی جانب سے ایسے شاندار جلسے ہوا کریں جن میں اسلام کی برگزیدہ جماعت مسلمانوں کی دینی ودنیوی فلاح کے متعلق کچھ مفید ہدایتیں لوگوں کے گوش گذار کر سکے، نیز ان جلسوں میں خدا اور رسول کی سچی تعلیمات اور بزرگان سلف کے حوصلہ افزا کارنامے سنا کر افراد قوم کے مردہ دلوں میں روح تازہ پھونکنے کی کوشش کیجائے۔(۱۰)

مولانا عبیداللہ سندھی دارالعلوم دیوبند سے تکمیل تعلیم کے بعد جب سندھ واپس ہوئے تو ایک عرصہ تک خاموشی سے مطالعہ اور غور وفکر میں منہمک رہے جس میں زیادہ تر فکر ولی اللّہی آپ کا موضوع مطالعہ رہا۔ کچھ عرصہ کے بعد آپ نے خود فکر ولی اللّہی کی ترویج واشاعت کا کام سنبھال لیا تھا اور حجۃ اللہ البالغہ کی تعلیم بڑے زور وشور سے دے رہے تھے۔ اسی کی روشنی میں اپنے شاگردوں کی مختصر سی جماعت بھی بنا لی تھی۔ (۱۱)

شیخ الہند ان سب حالات سے باخبر تھے اس لئے جب آپ نے جمعیۃ الانصار کا خاکہ مرتب فرمایا تو اس کے لئے آپ کی نظر انتخاب مولانا سندھی پر پڑی، جو اپنے سابقہ حالات کیوجہ سے شیخ الہند کے ذہن وفکر سے قریب تر تھے۔

دستار بندی کے اسی اجلاس میں یہ طے کر لیا گیا تھا کہ جمعیۃ الانصار کا پہلا

۹۔ مفتی عزیزالرحمٰن بجنوری۔ تذکرہ شیخ الہند۔ ص۔ ۱۴۷ - ۱۴۸
۱۰۔ مولانا حبیب الرحمٰن۔ مدیر رسالہ القاسم ربیع الاول ۱۳۲۹ھ مطابق ۱۹۱۲ء۔
۱۱۔ مولانا عبیداللہ سندھی۔ کابل میں سات سال۔ ص۔ ۹۸ - ۱۰۴

اجلاس مرادآباد میں ہوگا چنانچہ اس سے فراغت کے بعد جمعیۃ الانصار کے اجلاس کی طرف توجہ دی گئی، اور جمعیۃ الانصار کا پہلا عظیم الشان اجلاس مرادآباد میں ۱۵-۱۶-۱۷ - اپریل ۱۹۱۱ء کو منعقد ہوا۔

انہیں دنوں مرادآباد شہر میں طاعون کی وبا پھیلی ہوئی تھی، اس لئے کلکٹر نے جلسہ کی ممانعت کر دی، لیکن منتظمین جلسہ نے کلکٹر سے کہا کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ علماء کی تشریف آوری سے طاعون ختم ہوجاتا ہے۔ یہ کچھ اس قدر موثر انداز میں کہا تھا، کہ کلکٹر کے دل میں بات اتر گئی، اس نے جلسہ کی اجازت دیدی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کہنے والوں کی لاج رکھ لی کہ شہر سے طاعون واقعی ختم ہوگیا۔ (۱۲)

مولانا عبیداللہ سندھی ناظم جمعیۃ الانصار نے جلسہ کی روداد میں جمعیۃ الانصار کی ابتدا کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرمایا تھا:

"رمضان ۱۹۱۰ء کی ستائیسویں شب بھی عجیب زندگی بخش اور متبرک شب تھی جبکہ ہم چند ضعیف الاثر طالب علموں نے اپنے حقیقی مربیوں سے جمعیۃ الانصار کے افتتاح کی درخواست کی، اور گو جمعیۃ کے وسیع مقاصد ہم غریبوں کے پیمانہ مقدرت سے زائد معلوم ہوتے تھے، مگر ہمارے اکابر نے اپنی عالی قدر تائید و امداد کے وعدے کے ساتھ ان کو شرف قبول بخشا، اور غایت شفقت سے جمعیۃ کی سرپرستی منظور فرمائی۔ جن لوگوں نے اس وقت جمعیۃ کے بلند مقاصد پر نظر فرما کر شیخ چلی کے خیالات سے تشبیہ دی تھی، وہ بیشک ہماری خستہ حالی اور بے سروسامانی کے اعتبار سے بالکل درست تھی۔ لیکن میں معاف کیا جاؤں اگر یہ کہوں کہ انھوں نے ہمارے بزرگوں کی ہمت و اخلاص اور توجہ الی اللہ کا ہرگز کافی طور پر اندازہ نہیں کیا"۔ (۱۳)

شیخ الہند کی سرپرستی اور مولانا سندھی کی نظامت میں جمعیۃ الانصار نے کافی ترقی کی، جو بالواسطہ طور پر خود دارالعلوم دیوبند کی شہرت اور ترقی کا ذریعہ بنی۔ ملک کے مختلف حصوں میں مسلمانوں نے اس تحریک اور اس کی کارگزاریوں سے دلچسپی

۱۲- مولانا سید محمد میاں۔ علماء حق جلد اول۔ ص۔ ۱۳۲

۱۳- مولانا حبیب الرحمٰن۔ مدیر رسالہ القاسم۔ ربیع الثانی ۱۳۲۹ھ مطابق ۱۹۱۲ء جلد اول شمارہ ۹ ص۔ ۵

لینا شروع کیا۔ مرادآباد میں جمعیۃ الانصار کے پہلے اجلاس منعقدہ ۱۵-۱۶-۱۷-اپریل ۱۹۱۱ء میں مولانا سندھی نے جمعیۃ الانصار کے حسب ذیل تفصیلی اغراض و مقاصد کا اعلان کیا۔

جمعیۃ الانصار کے اغراض ومقاصد

جمعیۃ الانصار مدرسہ عربیہ دیوبند کے فارغ التحصیل طلبار کی اس مددگار جماعت کا نام ہے، جو مخصوص شرائط کی پابند ہوکر مدرسہ کی ہمدردی میں ہر طرح پر حصہ لے یا بالفاظ دیگر سرپرستان مدرسہ دیوبند کے دست و بازو بن کر کام کرے۔

اس جمعیۃ کی غرض مدرسہ کے مقاصد کی تائید وحمایت اور اس کے پاک اثر کی ترویج واشاعت ہے، ملکی معاملات سے اس کو کوئی تعلق نہیں۔

اس جمعیۃ کے ارکان مدرسہ عالیہ دیوبند کے سابق تعلیم یافتہ حضرات ہیں، جن میں سے ہرایک کا فرض ہے کہ مدرسہ کی تعلیمی، انتظامی اور مالی ترقی میں انتہائی کوشش کرے۔

ان فرائض کے اداکرنے کے لئے جمعیۃ نے پانچ شعبے قرار دیے ؛ الف۔ تکمیل التعلیم۔ ب۔ نظام التعلیم۔ ج۔ الارشاد۔ د۔ التالیف واشاعت۔ ہ۔ جلسہ علمیہ۔

درجہ تکمیل میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہ کی تالیفات اور شاہ ولی اللہؒ اور ان کے خاندان کی کتابیں مثلاً حجۃ اللہ البالغہ۔ خیر کثیر۔ عبقات۔ تکمیل الاذہان اور حضرت مجدد صاحب الف ثانی کے بعض مکتوبات پڑھائے جائیں گے۔ علم تفسیر۔ کلام وادب وغیرہ فنون کی اعلیٰ کتابیں بھی داخل درس ہوں گی۔ تقریر وتحریر کی خاص مشق کرائی جائیگی۔ طریقۂ درس وانتظام سکھایا جائیگا۔ (۱۴)

مدرسہ عربیہ دیوبند کی سرپرستی جو مدرسہ قبول کرے، اور اس کے نظامات تعلیمیہ اپنے یہاں نافذ کرے، کہ ایسے مذکر (واعظ) اور خطیب تیار کرے، جو مختلف زبانوں میں اسلامی خدمت بوجہ احسن اداکریں، اور تحریری وتقریری مناظرہ کرنے والے

۱۴۔ مولانا حبیب الرحمٰن۔ مدیر رسالہ القاسم۔ ماہ ربیع الثانی ۱۳۲۹ھ مطابق

ایسے فاضل تیار کئے جائیں جو مشرکین ۔ دہریئین ۔ ملحدین ۔ اہل کتاب اور مبتدعین پر اتمام حجت کرسکیں ۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے خاندان یعنی حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب ۔ شاہ عبدالقادر صاحب ۔ شاہ رفیع الدین صاحب ۔ شاہ محمد اسماعیل صاحب اور شاہ محمد اسحاق صاحب ۔ اور مولانا محمد قاسم صاحب اور مولانا رشید احمد صاحب کی تالیفات و تصنیفات کی حفاظت یعنی کتب خانہ مدرسہ عالیہ میں جمع کرنا اور اشاعت بذریعہ طبع و نسخ ہوگی، اور اسی منہاج پر جدید رسائل ۔ کتابیں مختلف زبانوں میں تصنیف و شائع کرائی جائیں گی ۔

موتمر الانصار

جمعیۃ الانصار کا وہ جلسہ علمیہ جس میں ۔ قرآن و حدیث شریف کے اسرار و لطائف بیان کئے ہوں ۔ اصلاح عقائد و اخلاق و اعمال کے متعلق علمی مضامین پڑھے جائیں ۔ مسلمانوں کے مذہبی علوم کی حفاظت و اشاعت کے وسائل پر عموماً اور مدارس کی اصلاح و عمارت پر خصوصاً بحث و مشورہ ہو اور تجاویز پر عمل کا تہیہ ہو ۔ ایسا جلسہ " موتمر الانصار" کے نام سے موسوم ہوگا ۔ اس کی شاخ قاسم المعارف کے نام سے موسوم ہوگی ۔ (۱۵)

یہ شاخ شروع ہی میں مراد آباد میں قائم ہوئی تھی بعض کاغذات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا سندھی نے جمعیۃ الانصار کی شاخ " قاسم المعارف" سندھ میں بھی قائم کی تھی ۔ قاسم المعارف کی شاخیں بعض دوسری جگہوں پر بھی قائم ہوئیں، جنکے زیر اہتمام مجالس وعظ و تقریر کا انعقاد ہوتا رہا ۔

اسی مذکورہ اجلاس میں یہ بھی طے ہوا تھا کہ " موتمر الانصار" ہر سال کسی ایسے ضلع میں منعقد ہوا کرے گی، جہاں اس کی خواہش اور ضرورت محسوس کی جائے، یا وہاں کے مسلمان از خود اس کے لئے دعوت دیں ۔ (۱۶)

سنہ ۱۹۱۲ء ۔ جلد ۱ شمارہ ۹ ۔ ص ۔ ۲

جمیعۃ الانصار کا یہ پہلا جلسہ جو مرادآباد میں ہوا اس میں عمومی اندازہ کے مطابق شرکاء کی تعداد تقریباً دس ہزار تھی ۔ تین دن تک یہ عظیم الشان اجلاس جاری رہا ۔ اس میں مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی ۔ مولانا اشرف علی تھانوی ۔ مولانا احمد حسن صاحب امروہوی اور مولانا شبیر احمد عثمانی وغیرہم کی متعدد مفید اور کارآمد تقریروں کے علاوہ بعض دوسرے علماء نے بھی حاضرین کو اپنے وعظ و ارشاد سے مستفید فرمایا ۔ (۱۷)

موتمر الانصار کی منظور شدہ تجاویز

مذکورۃ الصدر موتمر الانصار منعقدہ مرادآباد میں حسب ذیل تجاویز منظور ہوئیں۔

۱۔ انگریزی مدارس ۔ گورنمنٹ اسکول و کالجوں میں مسلمان طلباء کی مذہبی تعلیم جس قدر کہ ان کو ضروری ہے خواہ ہفتہ میں ایک مرتبہ ہو اور ان کے دار الاقامہ (بورڈنگ ہاؤس) میں مسلمان طلبہ کی مذہبی تربیت یعنی وضع ۔ طریقہ اسلام کی پابندی اور اسلامی شعائر و اخلاق کے لئے جمیعۃ الانصار دیوبند ہر ایک اسکول و کالج میں حسب ذیل معلم مقرر کرے جن کی تنخواہ ۲۵ / ۳۰ روپئے سے کم نہ ہو ۔

۲۔ انگریزی مدارس میں کم از کم ۲۵٪ فیصدی وہ طلباء جن کی دوسری زبان عربی ہو ان کے لئے جمیعۃ انعامی وظائف جاری کرے اور ان کی تعلیم کے لئے لائق استاد بہم پہونچائے ۔

۳۔ ایسے غریب گریجویٹ یا انڈر گریجویٹ طلبہ جن کی دوسری زبان عربی ہو ان کے لئے مدرسہ عالیہ عربیہ دیوبند میں تعلیم دینیات کا خاص انتظام ہو اور جمیعۃ ۳۰/- سے ۴۰/- روپئے ماہوار تک وظائف ان کے واسطے جاری کرے ۔

---

۱۵ ۔ مولانا حبیب الرحمٰن ۔ مدیر رسالہ القاسم ماہ ربیع الثانی ۱۳۲۹ھ مطابق ۱۹۱۲ء جلد ا شمارہ ۹ ۔ ص ۔ ۸ ۔ ۱۳ ۔

۱۶ ۔ ″ ″ ″ ″ ″ ″ ″

۱۷ ۔ ″ ″ ″ ″ ″ ″ ″

۴۔ جمعیۃ مدرسہ عالیہ دیوبند میں ایک ایسی جماعت کھولے جو قرآن شریف پر مخالفین اسلام کے ان اعتراضات کا جواب دے سکے جو عربی و اردو زبان میں ہوں ۔ ان زبانوں کے سوا دوسری زبانوں کے اعتراضات متعلقہ قرآن مجید کے جوابات جمعیۃ دینے کی ذمہ دار نہیں ہے؂

۵۔ مساجد کے انتظام و امامت کیلئے اگر کسی جگہ کے لوگ جمعیۃ سے خواہش کریں تو وہ ان کے لئے لائق عالم امامت و وعظ کیلئے بہم پہونچا ئے ۔

۶۔ قرآن شریف اور دینی کتب کی طبع و تجارت کیلئے مسلمانوں کو آمادہ کرنا اور ان کیلئے ان کو دوسری قوموں کا محتاج نہ رہنے دینا ۔

۷۔ ایسے چھوٹے چھوٹے رسائل بکثرت مفت شائع کرنا جن میں عقائد اسلام کی تعلیم، فرقہ آریہ کے جوابات، اور وفاداری گورنمنٹ کی ہدایات ہوں ۔ (۱۸)

؂ حالانکہ ضرورت اردو اور عربی سے زیادہ دوسری عالمی اہمیت رکھنے والی زبانوں میں اعتراضات کے جواب دینے کی تھی جن میں اعتراضات تازہ بتازہ رہتے ہیں عربی میں جو اعتراضات آتے ہیں وہ بالعموم ان زبانوں سے ترجمہ ہوکر ہی آتے ہیں ۔ بالخصوص اردو زبان میں ۔۔ ترجمہ ہوکر آتے آتے ان پر اتنی منزلیں اور اتنی مدت گذر جاتی ہے کہ اعتراضات کی نوعیت بھی بسا اوقات بدل جاتی ہے اور بات اس سے کہیں آگے پہونچ جاتی ہے ۔ اس طرح ہماری قوتیں وقت کے مسائل سے سالہا سال پیچھے کے مسائل پر صرف ہوتی ہیں ۔

ہماری اس بات کا مقصود یہ نہیں کہ اردو عربی میں جواب دینا یکسر خالی از نفع ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ مسئلہ کی اصل اہمیت کی طرف توجہ دلائی جائے، یہ ضرورت اس وقت جس قدر تھی ، آج بھی اسی طرح تازہ ہے ۔

جمعیۃ الانصار کا دوسرا اجلاس

دوسرے سال ۱۶ ۔ ۱۷ ۔ ۱۸ ۔ اپریل ۱۹۱۲ء مطابق ۷ ۔ ۸ ۔ ۹ ۔ ربیع الثانی

۱۸۔ مولانا حبیب الرحمٰن ۔ مدیر رسالہ القاسم ماہ ربیع الثانی ۱۳۲۹ھ مطابق ۱۹۱۲ء جلد ۱ شمارہ ۹ ۔ ص ۔ ۱۴ ۔ ۱۵

۱۳۳۰ھ کو جمعیۃ الانصار کا دوسرا اجلاس میرٹھ میں مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔

اجلاس مذکور میں صدر جلسہ مولانا تھانوی اور مولانا شبیر احمد عثمانی وغیرہ علمار واکابر وقت کی متعدد مفید تقریریں ہوئیں۔ اس اجلاس کی کاروائی دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں اجلاس اول منعقدہ مراد آباد کی منظور شدہ تجاویز کو عملی شکل دینے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔

اس کے علاوہ مذکورہ اجلاس میں شبینہ اسکول قائم کرنیکا بھی پروگرام طے ہوا، اور "الانصار" نامی ایک ترجمان بھی نکالنے کی تجویز طے ہوئی۔ (۱۹)

انگریزوں پر اسکا ردعمل

جمعیۃ الانصار کے مذکورۃ الصدر اغراض ومقاصد اور مؤتمر الانصار میں منظور شدہ تجاویز گو بظاہر بے ضرر سی تھیں لیکن اس کے باوجود انگریزوں نے اس کی طرف سے بے اطمینانی محسوس کی۔ کسی ہندوستانی جماعت پھر جبکہ اس کا تعلق علمار سے ہو جنھوں نے انگریزوں کو اس سے قبل سخت ترین دشواریوں میں مبتلا کر دیا تھا اس کے زیر سایہ کوئی بڑا اجتماع ان کی توجہ اپنی طرف کھینچنے کیلئے کافی تھا۔ چنانچہ اس کے باوجود کہ ایک تجویز حکومت کی وفاداری کی پاس کر دی گئی تھی کہ انگریز مطمئن نہ رہ سکے، اور اس کی کارگذاریوں پر نظر رکھی جانے لگی۔ مراد آباد میں منعقدہ پہلے اجلاس کے ختم ہوتے ہی صدر جلسہ مولانا احمد حسن صاحب سے پوچھ گچھ ہوئی، اور حضرت شیخ الہند کی آمدنی پر ٹیکس لگا دیا گیا۔ (۲۰)

دیوبند کے ارباب حل وعقد اور جمعیۃ الانصار

جمعیۃ الانصار کیجانب سے انگریزوں کی بے اطمینانی سمجھ میں آنیوالی چیز ہے البتہ حیرت

۱۹- مولانا حبیب الرحمٰن - مدیر رسالہ القاسم جمادی الاولی ۱۳۳۰ھ مطابق ۱۹۱۲ء جلد ۲ شمارہ ۱۰ - ص - ۳۵ - ۴۰

دار العلوم کے ان ارباب بست وکشاد پر ہے جنھوں نے مولانا سندھی کے نام کی آڑ میں اس کے خلاف ایک طوفان برپا کر دیا۔ یہاں تک کہ جمعیۃ الانصار کا کام دار العلوم کے دائرہ میں رہ کر مولانا سندھی کے لئے ناممکن ہوگیا اور انھوں نے آخر کار شیخ الہند کے ایمار پر دار العلوم چھوڑ دیا۔ جمعیۃ الانصار گو مولانا سندھی کی علحدگی کے بعد زندہ رہی لیکن اس کی وہ روح اور مقصد فوت ہوگیا جو شیخ الہند اس سے لینا چاہتے تھے۔ شیخ الہند جو کام اس سے لینا چاہتے تھے مولانا سندھی اس کے لئے واحد موزوں شخص تھے۔ اس لئے جمعیۃ الانصار مولانا سندھی کی علحدگی کے بعد ارباب دار العلوم کے اپنے مقصد برآری کا ذریعہ بن کر رہ گئی۔ حاشا وکلا ہمارا مقصود یہ نہیں کہ انھوں نے اس سے اپنا ذاتی نفع کرنا چاہا۔ بلاشبہ انھوں نے اسے دار العلوم کی بہبود کے لئے استعمال کرنا چاہا، لیکن حضرت شیخ الہند کی سطح فکر اور بلند مقصد سے ان لوگوں کی پرواز خیال کوسوں دور تھی۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں اپنی طرف سے کوئی بات پیش کرنے کے بجائے شیخ الاسلام حضرت مدنی، اور تذکرہ شیخ الہند کے مصنف مفتی عزیز الرحمٰن صاحب بجنوری کے خیالات ان حالات کے متعلق پیش کر دیئے جائیں، پھر اسی کی روشنی میں مناسب تجزیہ اور صحیح محاکمہ کیا جائے۔ حضرت مدنی تحریر فرماتے ہیں۔

"انھوں نے (دار العلوم کے ارباب اہتمام) مولانا عبید اللہ سندھی کی سرگرمیوں کو نہ صرف دار العلوم دیوبند بلکہ عام مسلمانوں کیلئے بھی خطرناک تصور کیا، اور اپنے خیالات کے مطابق ضروری سمجھا کہ مولانا سندھی کا تعلق اس مرکز سے نہ رہے۔ اسی زمانے میں اتفاق سے چند علمی مسئلوں میں مولانا سندھی اور دار العلوم کے دوسرے علمار کے درمیان اختلاف پیدا کر دیا گیا۔ اسی اختلاف کو وجہ قرار دیکر مولانا سندھی کو دار العلوم سے علحدہ کر دیا گیا۔ . . . اس اختلاف نے اگرچہ دار العلوم کے اساتذہ۔ ملازمین اور عام طلبار کو حضرت مولانا سندھی سے بہت زیادہ بعید کر دیا تھا، لیکن حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز سے تعلق میں کوئی فرق نہیں آیا۔ خفیہ آمد ورفت جاری رہی، رات کی اندھیریوں میں دیوبند کے باہر ملاقاتیں ہوتی تھیں، اور ضروری باتیں انجام دی جاتی تھیں"۔ (۲۱)

۲۰۔ مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری۔ تذکرہ شیخ الہند۔ ص۔ ۱۷۲ - ۱۷۳

حضرت مدنی کی اس تحریر سے تین باتیں واضح طور پر معلوم ہوتی ہیں۔

۱۔ حضرت مدنی اس اختلاف کو حقیقی اور واقعی نہیں سمجھتے جیسا کہ ان کی تحریر سے ظاہر ہے۔

۲۔ حضرت شیخ الہند بھی اس اختلاف کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اور اس کی وجہ سے مولانا سندھی سے ان کے تعلقات میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا ہے۔

۳۔ بذات خود کوئی کدورت نہ رکھنے کی وجہ سے شیخ الہند مولانا سندھی سے ملتے ہیں، لیکن لوگوں سے چھپ کر۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ الہند یہ محسوس فرماتے تھے کہ علانیہ اس طرح کی ملاقاتیں ان کے اور ارباب دارالعلوم کے درمیان بھی دیواریں کھڑی کر دیں گی، اور خواہ مخواہ ان لوگوں سے الجھ کر وقت ضائع کرنا ہوگا۔

مفتی عزیزالرحمٰن صاحب کسی قدر وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

"ارباب اہتمام دارالعلوم دیوبند مولانا سندھی کی ان سرگرمیوں کو اپنے اور دارالعلوم دیوبند کے لئے خطرہ کی گھنٹی سمجھتے تھے، اور اس خطرہ کو مول لینے کیلئے ارباب اہتمام کسی طرح تیار نہ تھے، اس لئے انھوں نے علامہ سندھی کے خلاف چند مسائل نکال کھڑے کئے تاکہ ان کو دارالعلوم سے یہ کہہ کر نکال دیا جائے کہ وہ اکابر کے مسلک سے ہٹ گئے ہیں، یا گمراہ ہو گئے ہیں، یا ان کے نظریات گمراہ کن ہیں، لہٰذا ایسے شخص کا دارالعلوم کی چہار دیواری میں رکھنا طلباء کے لئے مضر ہے۔ چنانچہ ارباب اہتمام نے چند مسائل کھڑے کئے اور مولانا کشمیری اور علامہ عثمانی کی ٹکر علامہ سندھی سے کرا دی۔ دیوبند میں ان ہر سہ حضرات کے درمیان مناظرہ ہوا جو حقیقت میں مولانا سندھی کے نکالنے کے لئے ایک بہانہ تھا، چنانچہ مولانا سندھی کے خلاف ایک ہلڑ بازی کھڑی کر دی گئی اور ان کی پوزیشن کو ملک میں مجروح کرنے کی ناکام کوشش کی گئی۔" (۲۲)

حضرت مدنی نے اپنی تحریر کے ذیل میں مولانا سندھی کے نام مولانا انور شاہ کشمیری کا ایک پیغام درج کیا ہے، اس سے بھی مسئلہ کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ مولانا

۲۱۔ مولانا سید حسین احمد مدنی ۔ نقش حیات دوم ۔ ص ۔ ۱۴۴

۲۲۔ مفتی عزیزالرحمٰن بجنوری ۔ تذکرہ شیخ الہند ۔ ص ۔ ۱۷۴

مدنی تحریر فرماتے ہیں کہ مولانا انور شاہ صاحب نے مولانا سندھی کے نام مکہ معظمہ کے قیام کے زمانہ میں یہ پیغام بھیجا تھا کہ:۔

"قیام دیوبند کے زمانہ میں غلط فہمی کی وجہ سے میں آپ کے لئے تکلیف کا باعث بنا تھا۔اب میرے دل میں، آپ سے کوئی رنج نہیں ہے، امید ہے کہ آپ بھی معاف فرمائیں گے"۔ (۲۳)

مفتی عزیز الرحمٰن صاحب مولانا کشمیری کے اس پیغام کو نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں۔

"سوال یہ ہے کہ اگر یہ سب کچھ علمی اختلافات تھے تو کیا یہ اختلافات اس قابل تھے کہ ایک سرگرم کارکن کو ضائع کر دیا جائے؟ اور کیا پھر یہ حالات صرف علامہ سندھی ہی کے پیدا کئے ہوئے تھے؟ اگر غور کیا جائے تو اصل تحریک کے محرک اعلیٰ حضرت شیخ الہند تھے لیکن حضرت شیخ الہند سے کون ٹکر لیتا۔ حقیقت یہ ہے کہ جمعیۃ الانصار کے پروگرام، اس کی تجاویز سے جہاں انگریزوں کو بوکھلاہٹ تھی وہاں دارالعلوم دیوبند کے ارباب اہتمام کے اقتدار پر بھی شدید ضرب واقع ہو رہی تھی، جس کے لئے انھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ علامہ سندھی پر علمی اور مذہبی الزامات لگا کر ان کو علحدہ کر دیا جائے"۔ (۲۴)

ان مختلف تحریروں کی روشنی میں یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ارباب دارالعلوم کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ دارالعلوم کو تعلیم کے علاوہ کسی مسئلہ سے تعلق نہ رہے، اور ملکی معاملات اور سیاسی حالات سے بکسر بیگانہ و بے تعلق ہو کر، یہاں تعلیمی خدمات انجام دی جائیں۔ تعلیمی اہمیت پیش نظر رکھتے ہوئے یہ نقطۂ نظر غلط نہیں کہا جا سکتا، لیکن اسی ضمن میں مجبوراً یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس صورت میں ارباب اہتمام، قیام دارالعلوم کے بنیادی مقصد، یعنی ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں ناکامی کی تلافی سے بہت دور جا پڑے تھے، اور اس بنیادی مقصد پر صرف حضرت شیخ الہند اور آپ کے ہمنواؤں کی نگاہیں تھیں۔

شیخ الہند کی شخصیت چونکہ بذات خود اہمیت کی حامل تھی اس لئے باوجودیکہ

۲۳۔ مولانا سید حسین احمد مدنی۔ نقش حیات دوم۔ ص ۱۴۴

۲۴۔ مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری۔ تذکرہ شیخ الہند۔ ص۔ ۱۷۵۔ ۱۷۶

تحریک کے اصل محرک بلکہ رہبر و رہنما سب آپ ہی تھے، لیکن آپ سے اختلاف رکھتے ہوئے بھی سامنے آنیکی کسی میں جرأت نہ تھی، اس لئے شیخ الہند کو عملاً عضو معطل کر دینے کیلئے مولانا سندھی کے خلاف وہ طوفان برپا کیا گیا جس کے نتیجہ میں مولانا سندھی نے دارالعلوم چھوڑ کر دہلی میں قیام کیا۔

جمعیۃ الانصار سے مولانا سندھیؒ کا استعفار

دارالعلوم کے ارباب اہتمام کیجانب سے مندرجہ بالا حالات پیدا کئے جانے کے بعد اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ مولانا سندھی علحدگی اختیار کر لیں۔ شیخ الہند کے ایماء سے انھوں نے ایسا ہی کیا۔ ذیل میں انکے استعفار کی نقل پیش ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی۔ اما بعد

بخدمت شریف مولانا امیر جمعیتہ الانصار دامت برکاتہم۔ بعد سلام مسنون معروض آنکہ جلسہ انتظامیہ کے تمام ممبر جہاں تک مجھے معلوم ہوا میری نسبت اچھے خیالات نہیں رکھتے اگر الجامعۃ القاسمیۃ تک معاملات کا مرافعہ کیا جاوے اور میں اپنی برأت ثابت کر لوں تو بھی اتفاق سے کام چلانا مشکل ہے، لہٰذا جمعیتہ الانصار کیخدمت سے استعفار پیش کرتا ہوں۔ اس کے بعد مجھے جمعیۃ الانصار کے کسی شعبے سے کوئی تعلق نہ ہوگا اور اپنے معاملات کا ذاتی حیثیت سے ذمہ دار ہونگا۔ جناب والا جس قدر جلد ممکن ہو منظور فرماکر اعلان کی اجازت مرحمت فرما دینگے تاکہ مجھے اپنے طور پر کام کرنا آسان ہوسکے۔

والسلام ۔ ۴ جمادی الثانیہ (۱۱ رمئی)۔ عبید اللہ عفی عنہ۔ دیوبند۔ (۲۵)

نظارۃ المعارف

جمعیۃ الانصار سے علیحدگی کے بعد دہلی میں قیام کا ذکر گذر چکا ہے، دہلی کے زمانہ

۲۵۔ مولوی سراج احمد صاحب۔ رسالہ القاسم ماہ صفر ۱۳۳۲ھ مطابق ۱۹۱۵ء جلد ۴ شمارہ ۷۔ ص۔ ۵

قیام میں مولانا سندھی نے ایک نئی انجمن کی بنیاد ڈالی جو "نظارۃ المعارف القرآنیہ" کے نام سے مشہور ہوئی ۔ اس کی حیثیت ایک مدرسہ کی سی تھی جس کا مقصد حضرت مدنی کے الفاظ میں یہ تھا کہ ۔

" انگریزی تعلیم سے نوجوانان اسلام کے عقائد اور خیالات پر جو بے دینی اور الحاد کا زہریلا اثر پڑتا ہے اس کو زائل کیا جائے، اور قرآن کی تعلیم اس طرح دیجائے کہ ان کے شکوک وشبہات دین اسلام سے دور ہو جائیں اور وہ سچے اور پکے مسلمان ہو جائیں"۔ (۲۶)

مولانا سندھی نظارۃ المعارف کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں ۔

" حضرت شیخ الہند کے ارشاد سے میرا کام دیوبند سے دہلی منتقل ہوا، ۱۹۱۴ء میں نظارۃ المعارف قائم ہوئی، اس کے سرپرستوں میں حضرت شیخ الہند کے ساتھ حکیم اجمل خاں اور نواب وقار الملک ایک ہی طرح شریک تھے ۔ حضرت شیخ الہند نے جس طرح چار سال دیوبند میں رکھ کر میرا تعارف اپنی جماعت سے کرایا، اسی طرح دہلی پہونچ کر مجھے نوجوان طاقت سے ملانا چاہتے تھے ۔ اس غرض کی تکمیل کیلئے دہلی تشریف لے آئے اور ڈاکٹر انصاری سے میرا تعارف کرایا۔ ڈاکٹر انصاری نے مجھے مولانا ابوالکلام اور محمد علی مرحوم سے ملایا ۔ اس طرح تخمیناً دو سال مسلمانان ہند کی اعلیٰ سیاسی طاقت سے واقف رہا" ۔ (۲۷)

مولانا سندھی کی جمعیۃ الانصار سے علیحدگی، اور دہلی آکر نظارۃ المعارف قائم کرنے پر ارباب دارالعلوم دیوبند کی طرف سے جس روش کا اظہار کیا گیا، اور جس طرح کی تحریریں سامنے آئیں، ان سے اندرونی جذبات اور ذہن وفکر پر کافی روشنی پڑتی ہے ۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا حالات پیدا کئے جانے کے بعد جب مولانا سندھی علیحدہ ہو گئے، تو بجائے اس کے کہ مولانا سندھی کے اس فیصلہ کو ان حالات کا لازمی نتیجہ اور ردعمل سمجھا جاتا الٹے مولانا سندھی کو مورد عتاب خیال کیا گیا ۔

---

۲۶ ۔ مولانا سید حسین احمد مدنی ۔ نقش حیات دوم ۔ ص ۔ ۱۳۸ ۔ ۱۳۹

۲۷ ۔ مولانا عبیداللہ سندھی ۔ (مرتبہ محمد سرور) ۔ کابل میں سات سال ۔ ص ۔ ۱۰۴ ۔ ۱۰۵

ذیل میں ہم رسالہ "القاسم" سے بعض تحریروں کے اقتباس پیش کرتے ہیں۔ ایک مضمون جسکا عنوان ہے "جمعیۃ الانصار زندہ ہے"۔ اس میں تحریر ہے کہ ۔

"..... بدقسمتی سے اسی پرآشوب زمانہ میں جناب مولوی عبیداللہ صاحب جمعیۃ کی نظامت سے علحدہ ہوئے ۔ نہ صرف نظامت سے علحدہ بلکہ اپنی جماعت سے مفارقت گوارا فرماکر اور ایسے نازک وقت میں جمعیۃ کو زیر بار چھوڑ کر دہلی میں نظارۃ المعارف قائم کرلی ۔ اناللہ وانا الیہ راجعون ؎

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے ۔" (۲۸)

سطور بالا میں مولانا سندھی کو جس طرح مطعون کیا گیا ہے اور نظارۃ المعارف کے قیام پر جس جذبہ کا اظہار کیا گیا ہے وہ الفاظ سے ظاہر ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا سندھی کی جمعیۃ الانصار سے علیحدگی کی بنا پر لوگ جمعیۃ الانصار سے بددل اور نا یوس ہونے لگے تھے ۔ بعضوں کو یہ بھی خیال گذرا تھا کہ جمعیۃ کسی وجہ سے توڑ دی گئی ہے اس لئے متذکرہ مضمون میں اس طرف سے صفائی کی کوشش کی گئی ہے ۔ تحریر سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا سندھی کی علیحدگی پر چیں بجبیں لوگوں کو تھپکیاں دینے کی کوشش کی گئی ہے، تحریر فرماتے ہیں ۔

"کسی اہلکار کی علحدگی یا معزولی سے کیا کوئی محکمہ کوئی سررشتہ کوئی مدرسہ کوئی انجمن ختم ہو جاتی ہے بڑے بڑے کالجوں میں بڑے بڑے پروفیسر ۔ پرنسپل ۔ ناظم ۔ سکریٹری علحدہ ہو جاتے ہیں اور معزول کر دئے جاتے ہیں اور معًا ایک دوسرا ان کا جانشین ہو جاتا ہے ہم نہیں سمجھتے کہ اس سے جناب مولوی عبیداللہ صاحب کی علحدگی پر یہ فطور دلوں میں کیوں ہوا ؟ .....

..... کل کی بات ہے کہ حضرت شبلی نظامت ندوہ سے علحدہ ہوئے کیا خدا نخواستہ ندوہ کا خاتمہ ہو گیا ۔ علی گڈھ کالج سے بھی کبھی کبھی بعض جلیل القدر عہدہ دار جدا ہوئے ہیں کیا کالج بند ہو گیا، ہم نہیں سمجھتے کہ جمعیۃ کے متعلق ان بے معنی

---

۲۸ ۔ مولوی سراج احمد ۔ مدیر ۔ رسالہ القاسم ذی الحجہ ۱۳۳۱ھ جلد ۴ شمارہ ۵ ۔ ص ۔ ۳۱ ۔ ۳۲

وساوس کی پیدائش کا مادہ کیوں ہیجان میں ہے۔" (۲۹)

ان سطور کے لب ولہجہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا سندھی کی علحدگی سے کافی ہیجان پیدا ہوگیا تھا، اور خطرہ تھا کہ اس کے اثرات دور رس ہوں۔ مضمون بالا کی یہ بات بجائے خود صحیح ہے کہ کسی ذمہ دار عہدیدار کی علحدگی سے کوئی انجمن یا تحریک ختم نہیں ہوجاتی، لیکن یہ ضرور ہے کہ بسا اوقات ایک فعال شخص کی علحدگی برسہابرس کی کارگذاریوں پر پانی پھیر دیتی ہے، اور آئندہ کے لئے افادیت ختم کر دیتی ہے۔ جمعیۃ الانصار ہی کو لے لیجئے مولانا سندھی کی علحدگی سے گو ختم نہ ہوئی لیکن اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ اپنی افادیت کھو بیٹھی۔

محولہ بالا مضمون میں علامہ شبلی کو ندوہ کا ناظم بتایا گیا ہے یہ صحیح نہیں، مولانا شبلی ناظم نہیں معتمد تعلیمات تھے اور اسی سے برداشتہ خاطر ہوکر علحدہ خاطر ہوئے تھے۔ ندوہ سے موصوف کی علحدگی کی بھی مثال دی گئی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مولانا شبلی کی علحدگی سے ندوہ ختم نہیں ہوگیا لیکن کیا اس سے بھی کسی کو مجال انکار ہے کہ اس کا اثر یہ ہوا کہ ترقی معکوس شروع ہو گئی۔ جس طرح تاریخ ندوہ سے علامہ شبلی کے اخراج کے بعد ندوہ خاک کا ڈھیر نظر آتا ہے اسی طرح جمعیۃ الانصار مولانا سندھی کی علحدگی کے بعد بے روح لاشہ ہوکر رہ گئی۔

نتائج واثرات

شیخ الہند کی سرپرستی اور چار سال تک مولانا سندھی کی نظامت میں جمعیۃ الانصار نے نمایاں خدمات انجام دیں۔ شیخ الہند اس کے ذریعہ جو کام لینا چاہتے تھے اس کے علاوہ بالواسطہ طور پر دارالعلوم کو بھی اس سے کافی فائدہ پہونچا، اور اسی کے ذریعہ اس کی شہرت ہندوستان سے نکل کر عالم اسلام تک پہونچ گئی۔ مولانا سندھی جمعیۃ الانصار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"مولانا شیخ الہند نے مدرسہ دیوبند کے پرانے فارغ شدہ عالموں کو جمعیۃ الانصار میں جمع کرنا شروع کیا، اس طرح دیوبندی نظام کی تعلیم یافتہ جماعتوں کی ساری اجتماعی طاقت منظم ہوگئی۔ اس نظام میں جس طرح ہندوستانی علماء داخل ہوئے اسی طرح افغانی اور

۲۹۔ مولوی سراج احمد۔ مدیر۔ رسالہ القاسم ذی الحجہ ۱۳۳۱ھ ج۔ ۴۔ ش۔ ۵۔ ص۔ ۳۲۔ ۳۳

ترکستانی علماء بھی شامل ہو گئے"۔ (۳۰)

اس کے علاوہ نظام تعلیم میں ترقی ۔ دولت عثمانیہ کی تائید ۔ ڈاکٹر انصاری ۔ مولانا محمد علی جوہر وغیرہ سے قرب اور تعلق، انڈین نیشنل کانگریس کی تائید وحمایت سب اسی دور کی یادگاریں ہیں ۔ (۳۱)

انڈین نیشنل کانگریس سے آج بھی بزرگان دیوبند اور ان کے متوسلین کی ایک بڑی تعداد وابستہ ہے لیکن اس وقت جب کانگریس کی تائید وحمایت کی واقعی ضرورت تھی اور اس کے دوش بدوش چل کر حصول آزادی کی راہ میں قدم بڑھانا ضروری تھا تو شیخ الہند پہلے شخص ہیں جنھوں نے کانگریس کی تائید وحمایت کی۔ یہ تائید وحمایت اندرون ملک تھی، لیکن بیرون ملک نیشنل کانگریس کے قیام کا سہرا بھی ایک مسلمان کے سر ہے۔ اس در کے نکالے ہوئے مگر شیخ الہند کے عزیز شاگرد مولانا عبیداللہ سندھی جب شیخ الہند کے ایماء سے کابل گئے تو انہوں نے وہاں نیشنل کانگریس قائم کی۔

مولانا سندھی خود لکھتے ہیں ۔

"میں سات سال تک حکومت کابل کی شرکت میں اپنا ہندوستانی کام کرتا رہا۔ ۱۹۱۹ء میں امیر حبیب اللہ خاں نے ہندوؤں سے مل کر کام کرنیکا حکم دیا۔ اس کی تعمیل میرے لئے فقط ایک ہی صورت میں ممکن تھی کہ میں انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہو جاؤں۔ اس وقت سے میں کانگریس کا ایک داعی بن گیا۔

یہ بات عجیب معلوم ہو گی کہ امیر صاحب مرحوم اتحاد اسلامی کے کام سے ہندوستانی کام کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ ۱۹۲۲ء میں امیر امان اللہ خاں کے دور میں میں نے کانگریس کمیٹی کابل بنائی، جس کا الحاق ڈاکٹر انصاری کی کوششوں سے کانگریس کے گیا سیشن نے منظور کر لیا۔ برٹش امپائر سے باہر یہ پہلی کانگریس کمیٹی ہے۔ اور میں اس پر فخر محسوس کرتا ہوں کہ میں اس کا پہلا پریسیڈنٹ ہوں"۔ (۳۲)

---

۳۰ ۔ مولانا عبیداللہ سندھی ۔ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ۔ ص ۔ ۲۰۹

۳۱ ۔ 〃 〃 〃 〃 ۔ ص ۔ ۲۱۰ ۔ ۲۱۳

۳۲ ۔ 〃 مرتبہ ۔ محمد سرور ۔ خطبات مولانا سندھی ۔ ص ۔ ۶۸ ۔ ۶۹

غرض یہ کہ شیخ الہند اور مولانا سندھی کی کوششوں سے جمعیۃ الانصار کے خاصے مفید نتائج برآمد ہوئے اور اگر مولانا سندھی کی علٰحدگی کے ناگزیر حالات نہ پیش آئے ہوتے تو اثرات ونتائج کا شاید کچھ اور ہی رنگ ہوتا۔ جو کچھ اور جس قدر سرمایہ ذہن وفکر اشخاص و افراد کا اس کے ذریعہ تیار ہوسکا شیخ الہند نے اسے اپنی آئندہ تحریک (ریشمی رومال) کی نذر کردیا۔

اسلامی مدارس کے قیام کی تحریک

حضرت شیخ الہند کی تحریک کی سید احمد شہید اور بالواسطہ طور پر حضرت شاہ ولی اللہ سے وابستگی پر ہم روشنی ڈال چکے ہیں، جس طرح سید احمد شہید نے اپنے مخصوص انداز اور اسلوب میں سلسلہ رشد وہدایت اور لائق افراد سے بیعت جہاد لینا شروع کیا تھا۔ شیخ الہند کی زندگی مدرسی تھی اور ایک عمر اسی میں آپ کی گذری تھی، اس لئے حالات کو دیکھتے ہوئے آپ نے اسی مدرسی کی راہ سے افراد تیار کرنے چاہے، چنانچہ جمعیۃ الانصار کے ذریعہ اس طرح کی کوششیں آپ نے فرمائیں۔ صوبہ سرحد وغیرہ میں آپ کے جو شاگرد تھے ان سے اس سلسلہ میں مدد لی۔ انھوں نے آپ کی مرضی سے حسب ضرورت مناسب جگہوں پر مدارس قائم کئے۔ متعین طور پر تو یہ بتانا کہ کون کون سے مدارس شیخ الہند کے اشارے پر قائم ہوئے، مشکل ہے، لیکن اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ آپ نے مدارس قائم کرائے۔ مولانا غلام رسول مہر شیخ الہند کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"میرے اندازے کے مطابق انھوں نے یہ طے کیا تھا کہ جن جن اصحاب میں عملی صلاحیت پائیں انہیں جابجا خصوصًا یاغستان کے مختلف حصوں میں دینی اور اسلامی درس گاہیں قائم کرنیکی ترغیب دیں۔ ملا صاحب سنڈا کے نے بھی حضرت شیخ الہند سے ملاقات کی تھی، انھوں نے جب کام شروع کیا تو ابتدا میں ایک اہم اسلامی درسگاہ ہی قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ حاجی صاحب ترنگ زئی شیخ الہند سے استفادہ کر چکے تھے، ان کے پیش نظر بھی درس گاہیں قائم کرنیکا ہی سلسلہ تھا" (۳۲)

۳۲۔ مولانا غلام رسول مہر۔ سرگذشت مجاہدین۔ ص۔ ۵۵۳

مہر صاحب نے اسی مناسبت سے اپنی کتاب میں سید عبدالجبار شاہ استھانوی کی ایک تحریر نقل کی ہے، اس سے اس مسئلہ پر بھی مزید روشنی پڑتی ہے۔

"سید عبدالجبار شاہ استھانوی لکھتے ہیں، جب مجھے نمائندگان صوات نے بتایا کہ ملا صاحب سنڈا کے اسلامیہ کالج پشاور کے بالمقابل ایک عالیشان اسلامی درسگاہ کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں، تو میں نے ان پر صاف واضح کر دیا کہ یہ اصطلاح ایک خاص جماعت کا شعار ہے، جس میں مولوی صاحبان اور علماء شامل ہیں۔ اسلامی درس گاہوں کو حکومت برطانیہ کیخلاف تنظیمات کا پردہ بنالیا گیا ہے، اور حاجی صاحب ترنگ زئی جو اپنے ضلع میں ایسی درس گاہیں قائم کرنا چاہتے ہیں وہ بھی اسی حلقہ کے ایک رکن ہیں۔ سید صاحب کہتے ہیں کہ مجھے یہ تو علم نہ تھا کہ یہ اصطلاح کس نے ایجاد کی، اور اس کا مرکز کہاں تھا، لیکن جنگ طرابلس اور جنگ بلسقان نے واضح کر دیا تھا کہ یورپ کی بڑی بڑی سلطنتیں ترکوں کے دشمن حملہ آوروں کی پشتیبانی کر کے خلافت اسلامیہ کو برباد کر دینے کے درپے ہیں، اس پر مسلمانوں میں ہمہ گیر بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ علماء حق خلافت اسلامیہ اور مقامات مقدسہ کی حفاظت کے لئے سرگرم عمل ہو گئے، اس سلسلہ میں تبلیغ و اشاعت کے لئے بہترین طریقہ یہ سمجھا گیا کہ گاؤں گاؤں اور بستی بستی میں اسلامی درس گاہیں قائم کی جائیں۔" (۴۳)

اس سلسلہ میں مزید وضاحت کرتے ہوئے مہر صاحب لکھتے ہیں۔

"شیخ الہند کا ابتدائی منصوبہ یہی تھا اور اسے حضرت کے تعلیمی مشاغل سے خاص مناسبت تھی، یاد رہے کہ سید احمد شہید نے جب مسلمانوں کو بغرض جہاد منظم کرنیکا قصد فرمایا تھا تو پیروں کے شیوے کے مطابق مختلف علاقوں کے دورے شروع کر دئے تھے، جگہ جگہ وعظ بھی ہوتے، بیعت بھی لیجاتی، "توجہ" بھی دیجاتی۔ اس طریقہ کو سید احمد شہید کے مشاغل سے خاص مناسبت تھی، میرے نزدیک مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی بانیان دارالعلوم دیوبند کا اصل مقصد و نصب العین بھی وہی تھا جس کے لئے کارفرمایان دیوبند میں صرف حضرت شیخ الہند سرگرم عمل ہوئے۔ اس

۴۳۔ غلام رسول مہر۔ سرگذشت مجاہدین۔ ص۔ ۵۵۳-۵۵۴۔

طریقہ اور شیوے کے مطابق جلد حسب مراد نتیجے برآمد ہونیکی توقع نہ رکھی جاسکتی تھی، تاہم ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ انقلابی مساعی کے ساتھ ساتھ عوام کی صحیح تربیت کا کام بھی انجام پاتا جاتا، جس طرح سید شہید کی دعوت میں انجام پاتا تھا۔ اس انقلاب سے بڑھ کر مصیبت خیز اور تباہ کن شے کوئی نہیں ہوسکتی جس کے عوام پیش نظر مقاصد سے کاملاً بے بہرہ ہوں۔ دریا کا پانی نہروں کے ذریعہ سے کھیتوں میں پہونچتا ہے تو زمین کی اندرونی صلاحیتیں پیداوار کے انبار فراہم کر دیتی ہیں، لیکن اگر وہ پانی بے پناہ سیل کی شکل اختیار کرے تو بستیوں کی ویرانی اور فصلوں کی بربادی کے سوا کیا نتیجہ نکلے گا"۔ (۳۴)

یہ اقتباسات اگرچہ کافی طویل ہو گئے لیکن اس خیال سے ہم نے نقل کر دیے کہ ان سے حضرت شیخ الہند کے ترتیب کار پر روشنی پڑتی ہے، نیز یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ شیخ الہند کے پروگرام میں مدارس کا قیام بھی ایک جزو رہا ہے۔

ندوۃ العلماء جس کی بنا قدیم و جدید کی درمیانی راہ کی حیثیت سے پڑی تھی اور جو اپنے مقصد قیام، سابقہ خدمات اور اپنے خوشگوار ماضی کے اعتبار سے آج بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے، مدرسہ فیض عام کان پور کی چٹائی پر بیٹھ کر اس کا خواب دیکھنے والوں میں حضرت شیخ الہند کی ذات گرامی بھی شامل تھی۔ (۳۵)

جامعہ ملیہ کے قیام میں بھی شیخ الہند کے یہ جذبات و احساسات شامل تھے، انتہائی بیماری اور کمزوری کی حالت میں آپ نے اس کی بنیاد رکھی اور جلسۂ تاسیس میں شرکت فرمائی، ضعف پیری اور اس پر مستزاد مرض نے نڈھال کر رکھا تھا، مگر عزم و حوصلہ پر کہیں ضعف کے آثار نہ تھے۔ تشریف لائے، خطبۂ صدارت خود پڑھ نہ سکے تو مولانا شبیر احمد عثمانی نے پڑھ کر سنایا۔

"اے نونہالان وطن۔ جب میں نے دیکھا کہ میرے درد کے غم خوار (جس سے میری ہڈیاں پگھلی جارہی ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڈھ کی طرف بڑھایا

۳۴۔ غلام رسول مہر۔ سرگذشت مجاہدین۔ ص۔ ۵۵۴

۳۵۔ علامہ سید سلیمان ندوی۔ حیات شبلی۔ ص۔ ۳۰۳۔ ۳۰۴

اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں (دیوبند اور علی گڈھ) کا رشتہ جوڑا ہے"۔ (۳۶)

۳۶۔ عبدالغفار مدہولی۔ جامعہ کی کہانی۔ ص۔ ۲۶

باب پنجم

سیاسی زندگی ہندوستان سے باہر
آزادی کی جدوجہد
انگریزوں سے نفرت اور ان کی مخالفت

شیخ الہند نے ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ کم سنی میں دیکھا، لیکن انگریزوں کی طرف سے انتقامی کارروائیوں کا سلسلہ سن شعور تک جاری رہا، جس سے واقعات پر غور و فکر کا موقع ملا۔ مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی۔ مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب وغیرہ حضرات جو خود ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں انگریزوں کے دست بدست مقابل رہ چکے تھے اور ایک خطہ میں اسلامی نظام قضا جاری کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔(۱) ان حضرات سے شرف تلمذ اور ان کے فیض صحبت نے حضرت شیخ الہند کے دل میں ایک آگ لگادی تھی اور آپ سر میں آزادی کا سودا سمائے ہوئے وقت گذار رہے تھے۔

شیخ الہند کی زندگی دیکھا جائے تو درس و تدریس کی مصروفیات کے باوجود بڑی مجاہدانہ شان سے گذری، اور ملک سے انگریزوں کو نکالنے کی فکر دل میں ہمیشہ رہی، جس کا مظہر آپکی وہ مختلف تحریکات ہیں جنکا ذکر ان صفحات کا موضوع ہے ظاہر ہے کہ ساری تحریکات خواہ وہ جمعیۃ الانصار کے نام سے چلی ہوں یا ریشمی رومال کے نام سے مشہور ہوئی ہوں سب کا رخ انگریزوں ہی کی طرف تھا۔

انگریزوں سے شدید نفرت اور مخالفانہ جذبہ کا یہ حال تھا کہ جب آپ کے سامنے ترک موالات کا استفتاء پیش کیا گیا تو آپ نے اپنے تین شاگردوں، مفتی محمد کفایت

۱۔ مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی۔ سوانح قاسمی جلد دوم ص۔ ۱۲۲ - ۲۰۴

اللہ، مولانا سید حسین احمد مدنی اور مولانا شبیر احمد عثمانی کو جمع کر کے فرمایا کہ یہ فتویٰ آپ لوگ لکھیں، ان حضرات نے یہ کہا کہ آپ کی موجودگی میں ہم کیا لکھیں؟ تو فرمایا کہ ۔

" مجھ میں انگریزوں سے نفرت کا جذبہ اتنی شدت لئے ہوئے ہے کہ مجھے اپنے نفس پر اطمینان نہیں ہے کہ حدود کی رعایت ہو سکیگی۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ۔ ولا یجرمنکم شنآن قوم علیٰ ان لاتعدلوا ۔ اس لئے آپ ہی لوگ لکھیں "۔ (۲)

انگریزوں کے متعلق شیخ الہند کے شدید جذبات کا انداز خود انگریزوں کو بھی تھا۔ چنانچہ سر جیمز مسٹن گورنر یو پی نے ایک موقع پر کہا تھا کہ ۔

" اگر اس شخص کو جلا کر راکھ کر دیا جائے تو وہ بھی اس کوچہ سے نہیں اڑے گی جس میں کوئی انگریز ہوگا ۔ اسی نے ایک موقع پر کہا تھا کہ اگر اس شخص کی بوٹی بوٹی کر دیجائے تو ہر بوٹی سے انگریزوں کی عداوت ٹپکے گی "۔ (۳)

شیخ الہند کی زندگی میں مشاغل گو درس و تدریس سے زیادہ رہے، لیکن مولانا قاسم وغیرہ کی صحبت نے محض درس و تدریس اور خانقاہی پر قناعت نہ کرنے دیا۔ آخر کار آپ نے وہ کام کیا جس کی توقع عام حالات میں ایک مدرسی عالم اور خانقاہی بزرگ سے نہیں کیجا سکتی ۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں شیخ الہند کی سیاسی خدمات کے سلسلہ میں پروفیسر سعید احمد صاحب اکبرآبادی کے ایک مضمون سے جستہ جستہ اقتباسات پیش کر دیں۔ مولانا موصوف اپنے مضمون " علماء ہند کا سیاسی موقف " میں لکھتے ہیں ۔

" ہر چند کہ مولانا شبلی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے زبان و قلم نے غفلت کدۂ ہند کے خس و خاشاک میں آگ لگا رکھی تھی، لیکن حریت طلبی کے ذوق کی خامی کا ابھی یہ عالم تھا کہ ملک کی سب سے بڑی ترقی پسند جماعت " انڈین نیشنل کانگریس " کا قدم بھی حقوق طلبی کی منزل سے آگے نہ بڑھنے پایا تھا۔ ٹھیک اسی زمانہ میں

۲۔ مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی ۔ سوانح قاسمی جلد دوم ۔ ص ۔ ۴۸

۳۔ " " " " " "

"دیوبند نامی قصبہ کے ایک گوشہ میں ایک عالم ربانی اور عارف یزدانی تھا جو اپنے کام و ذہن میں نہ ابوالکلام کی زبان رکھتا تھا اور نہ ہاتھ میں شبلی کا قلم، اس نے نہ انقلاب فرانس کی تاریخ پڑھی تھی اور نہ روسو اور ٹالسٹائی کے انقلاب انگیز لٹریچر کا مطالعہ کیا تھا وہ نہ گلیڈسٹون کے مجموعۂ قوانین سے واقف تھا اور نہ ملٹن و اسپنسر کے افکار و نظریات سے۔ اس نے نہ تمدن جدید کی کسی دلکشی کا حظ اٹھایا تھا اور نہ اس نے عشرت کدۂ افرنگ کی کسی لذت سے کام جوئی کی تھی۔ ان سب چیزوں کے برعکس اس کا شیرازۂ حیات قال اللہ و قال الرسول اور اس کی زندگی کا خمیر اتباع سنت نبوی تھا، اس کے فکر و نظر کا تار و پود احکام الٰہی کے انوار سے بنا اور شریعت اسلام کے آفتاب جہاں تاب کی شعاعوں سے گوندھا گیا تھا۔ وہ دیکھنے میں منحنی اور لاغر و نحیف تھا مگر سینہ میں صبر و استقامت کا ایک کوہ گراں رکھتا تھا۔ بظاہر وہ اپنے گوشۂ عزلت میں سب سے الگ تھلگ تھا لیکن اس کی نظر جہاں بیں میں زمانہ کی تمام کروٹیں اور لیل و نہار کی تمام گردشیں سمٹ کر جمع ہوگئی تھیں۔ عمر کے لحاظ سے کبھی شباب کی منزل سے بہت آگے نکل چکا تھا لیکن بایں ہمہ اس کے درد و گداز اور جذب و سوز کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنی خلوتوں اور جلوتوں میں رات کی تاریکیوں میں اور دن کے اجالے میں کبھی جنگ بلسقان و طرابلس کے واقعات پڑھ کر خوننابہ فشانی کرتا تھا اور کبھی اپنے ملک و وطن کی زبوں حالی و واماندگی پر نوحہ کناں ہوتا تھا۔" (۴)

اسی مضمون میں آگے چل کر پروفیسر اکبرآبادی لکھتے ہیں۔

"سنا ہے کہ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کا یہ معمول تھا کہ عصر اور مغرب کے درمیان طلباء اور اساتذہ کا اجتماع آپ کے مکان پر ہوتا تھا تو آپ کسی سے الہلال اور البلاغ بڑی پابندی سے خود سنتے اور دوسروں کو سنواتے تھے۔ ترکوں کی مظلومیت و بیکسی کا کوئی واقعہ سنتے تو رو پڑتے اور ان کی اولوالعزمی اور بہادری کا ذکر آتا تو جوش و خروش اور فرط انبساط کے باعث چہرہ تمتما اٹھتا اور آنکھیں روشن ہو جاتیں۔ اسی روزآنہ مجمع کے کسی مولوی صاحب نے ایک روز کہا کہ حضرت! الہلال اور البلاغ میں تو تصاویر ہوتی ہیں آپ پھر بھی ان کو اس قدر

۴۔ پروفیسر مولانا سعید احمد اکبرآبادی صاحب۔ رسالہ برہان دہلی ستمبر ۱۹۴۸ء جلد ۲۱ شمارہ ۳۔ ص۔ ۲۲۔ ۲۳

محبوب رکھتے ہیں" حضرت کم سخن اور کم گو مگر نہایت حاضر جواب اور بذلہ سنج تھے جواب میں یہ شعر پڑھ کر خاموش ہوگئے۔ ؎

کامل اس فرقۂ زہاد سے اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندان قدح خوار ہوئے

نیشنل کانگریس حکومت سے حقوق طلبی کی جنگ لڑ رہی تھی لیکن حضرت شیخ الہند اس حکومت کا تختہ ہی الٹ دینے کا نقشہ تیار کر رہے تھے"۔ (۵)

انگریزوں سے جذبات نفرت پر ایک اور مثال سے روشنی پڑتی ہے۔ پروفیسر اکبر آبادی صاحب لکھتے ہیں:۔

"سیوہارہ ضلع بجنور میں ایک بزرگ ہیں جو فتویٰ پوچھے بغیر لقمہ بھی نہیں توڑتے، انھوں نے ایک مرتبہ خط کے ذریعہ حضرت شیخ الہند سے دریافت کیا کہ گاندھی ٹوپی اوڑھنا مذہبًا کیسا ہے؟ آپ نے جواب لکھ بھیجا کہ گاندھی ٹوپی چونکہ ایسی جماعت کا شعار ہے جو حریت طلب اور انگریزی حکومت کی شدید مخالف ہے اور اسی وجہ سے انگریز بھی اس کو دیکھ کر آگ بگولہ ہو جاتا ہے، اس بنا پر بندہ کے نزدیک گاندھی ٹوپی کا استعمال نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کے لئے جائز بلکہ باعث ثواب اور مستحسن ہے"۔ (۶)

شیخ الہند کے اس جواب سے انگریزوں کے متعلق ان کے جذبات کا اندازہ ہوتا ہے۔ انگریزوں کے خلاف آپ نے جو تحریکیں چلائیں وہ ان صفحات کا موضوع ہی ہے جس کا مرتب تذکرہ ہم پیش کر رہے ہیں۔

مراکز کا قیام اور مولانا سندھی کا سفر کابل

حضرت شیخ الہند نے جو انقلاب کا راستہ اختیار کیا تھا اگرچہ اس سے دور رس نتائج برآمد ہونے کی توقع تھی، لیکن فطری بات تھی کہ اس کے لئے ایک طویل مدت کا انتظار کیا

۵۔ پروفیسر سعید احمد صاحب اکبر آبادی ۔ رسالہ برہان دہلی ستمبر ۱۹۴۸ء جلد ۲۱ شمارہ ۳ ۔ ص ۔ ۲۴

۶۔ 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ص ۔ ۲۸ ۔ ۲۹

جاتا۔ وہ مفید نتائج جن کی توقع تھی ان کا جلد نکل آنا ممکن نہ تھا چنانچہ شیخ الہند نتائج کے جلد بر آمد ہونے کی موہوم توقع سے بے نیاز ہوکر مصروف عمل تھے۔ اچانک حالات نے ایسا رخ اختیار کر لیا جس سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ رہنا ممکن نہ تھا بلکہ ضرورت اس بات کی تھی کہ جو بھی کوشش اس وقت بن پڑے کر گذرا جائے، مولانا سید حسین احمد مدنی تحریر فرماتے ہیں :

"حضرت کی گہری نظر واقعات عالم، بالخصوص ہندوستان اور ترکی پر مرکوز رہتی تھی، طرابلس اور بلسقان کے زہرہ گداز مظالم اور اندرون ہند میں انگریزوں کی روز افزوں چیرہ دستیوں نے انھیں اس قدر متاثر کیا کہ آرام وچین تقریباً حرام ہوگیا گویا وہ اپنے اختیار سے نکل گئے، نتائج وعواقب سے بے پروا ہوکر انھیں سر بکف اور کفن بر دوش میدان انقلاب میں نکلنا پڑا۔ اہل ہند بالخصوص مسلمانوں کی ناگفتہ بہ کمزوریاں رکاوٹ بن کر سامنے آئیں، اور کچھ عرصہ اسی غور وخوض میں گذرا مگر پانی سر سے گذر چکا تھا، اس لئے خوب سوچ سمجھ کر صرف قادر مطلق پر اعتماد اور بھروسہ کرکے کام شروع کر دیا۔" (۷)

حضرت شیخ الہند کی نظر میں کام کا نقشہ چونکہ ایک عرصہ سے تھا اس لئے شاگردوں اور ملنے جلنے والوں میں سے لائق اور موزوں افراد آپ کی نگاہ میں رہتے تھے۔ مختلف افراد کو پرکھ کر اپنے منصوبہ میں شریک کرلیا تھا جس میں سب سے پہلا نام مولانا عبید اللہ سندھی کا آتا ہے۔ رولٹ کمیٹی کی رپورٹ میں ہے کہ مولانا سندھی نے حضرت شیخ الہند کے خیالات پر اثر ڈالا، حالانکہ خود شیخ الہند کا بیان ہے کہ۔

"مولوی عبید اللہ تو تعلیمی جدوجہد میں منہمک اور مشغول تھے۔ میں نے ان کو ادھر سے کھینچ کر سیاسیات اور برطانیہ کے خلاف جنگ میں ڈالا۔" (۸)

مولانا سندھی کے علاوہ دوسرے شاگردوں اور نیازمندوں کی ایک بڑی تعداد بھی آپ کے شریک عمل تھی۔ حاجی صاحب ترنگزئی، ملا صاحب سنڈاکے وابستگان تحریک میں تھے۔ مولانا محمد میاں عرف منصور انصاری۔ مولانا فضل ربی۔ مولانا فضل محمود۔ مولانا محمد اکبر کا شمار اہم ارکان میں ہے۔ مولانا عبدالرحیم رائپوری، مولانا خلیل احمد صاحب۔ مولانا محمد احمد چکوالی۔ مولانا محمد صادق

۷۔ مولانا سید حسین احمد مدنی۔ نقش حیات دوم۔ ص۔ ۱۳۵ - ۱۳۶

۸۔ " " " ص۔ ۱۴۰ - ۱۴۱

(کراچی)۔شیخ عبدالرحیم سندھی۔ مولانا محمد ابراہیم راندیری۔ مولانا غلام محمد دین پوری۔ مولانا تاج محمود (امروٹ) ڈاکٹر مختار احمد انصاری۔ حکیم عبدالرزاق انصاری وغیرہ سب مخلصین بھی تحریک سے وابستگی اور تعلق اخلاص رکھتے تھے ان کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد۔ مولانا محمد علی جوہر۔ حکیم اجمل خاں۔ نواب وقارالملک وغیرہ بھی آپ کے مشیر و معاون تھے۔ (۹)

مولینا سندھیؒ کی کابل کو روانگی

اگرچہ انجمن نظارۃ المعارف حضرت شیخ الہند کی سرپرستی میں قائم ہوئی تھی، لیکن اس کے کام کی رفتار سے آپ مطمئن نہ تھے چنانچہ ایک مرتبہ مولانا عبیداللہ سندھی ہی سے فرمایا:

"جب کہ انگریزی حکومت اور اقتدار ہندوستان میں قائم ہے تو جس مدت میں تم اپنی اس تعلیم سے اور اس مدرسہ سے دس بیس آدمی صحیح الخیال مسلمان بناؤ گے اسی مدت میں انگریز ہزاروں کو ملحد اور زندیق بنا دیں گے۔" (۱۰)

چنانچہ آپ نے مولانا سندھی کو کابل جانے کا حکم دیا۔اس کا ذکر کرتے ہوئے حضرت مدنی تحریر فرماتے ہیں۔

"حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو بالکل اپنا ہم خیال اور ہم عمل بنالیا، چونکہ ان کے بہت سے احباب اور جان پہچان والے سندھ، پنجاب، سرحد وغیرہ میں تھے۔ انھوں نے اپنے معتمد علیہ حضرات کو بار بار سفر کر کے استوار کیا، اور اس تحریک کا ممبر بنایا۔ خود دہلی میں بھی رفتہ رفتہ ہم خیال لوگ ہوتے گئے، ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی۔ مولانا شوکت علی۔ مولانا آزاد وغیرہ حضرات کے لئے بھی مولانا عبیداللہ صاحب ذریعہ بنے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بار بار مولانا عبیداللہ صاحب کو فرنٹیر۔ یاغستان۔ سندھ وغیرہ میں بھیجا اور وہاں کے لوگوں سے تعلقات قائم کر کے اس اسکیم کو جاری کیا۔" (۱۱)

حضرت شیخ الہند نے خود مولانا سندھی کو بھی پہلے سے نہ بتایا کہ انھیں کابل کیوں بھیج

۹۔ مولانا غلام رسول مہر۔ سرگذشت مجاہدین۔ ص۔ ۵۵۵ - ۵۵۶

۱۰۔ مولانا سید حسین احمد مدنی۔ نقش حیات دوم۔ ص۔ ۱۴۰

۱۱۔ " " " " ۱۴۱ - ۱۴۱

رہے ہیں۔

مولانا سندھی اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"۱۹۱۵ء مطابق ۱۳۳۳ھ میں شیخ الہند کے حکم سے کابل گیا، مجھے کوئی مفصل پروگرام نہیں بتایا گیا تھا اس لئے میری طبیعت اس ہجرت کو پسند نہیں کرتی تھی، لیکن تعمیل حکم کے لئے جانا ضروری تھا، خدا نے اپنے فضل سے نکلنے کا راستہ صاف کر دیا اور میں افغانستان پہونچ گیا۔" (۱۲)

مولانا سندھیؒ کو کابل بھیجنے کا مقصد

شیخ الہند نے مولانا سندھی کو کابل اس خیال سے بھیجا تھا کہ وہ وہاں جاکر حالات کا صحیح اندازہ کریں، تاکہ دیگر خادمین اور متعلقین نے باغستان وغیرہ قبائل میں جو اصلاحی کوششیں کی ہیں، ان کی روشنی میں آئندہ طریق کار کے لئے تدبیریں کی جاسکیں۔ مولانا مدنی تحریر فرماتے ہیں۔

"۔۔۔۔ چونکہ بغیر تشدد ہندوستان سے انگریزوں کا نکالنا ممکن نہیں ہے، اس کے لئے مرکز اور اسلحہ اور سپاہی (مجاہدین) وغیرہ ضروری ہیں، بنابریں مرکز باغستان (آزاد قبائل) قرار دیا گیا کہ وہاں اسلحہ اور جانباز سپاہیوں کا انتظام ہونا چاہئے، اس کے علاوہ چونکہ آزاد قبائل کے نوجوان ہمیشہ جہاد کرتے رہتے ہیں اور قوی ہیکل اور جانباز ہوتے ہیں اس لئے ان کو متحد اور متفق کرنا اور ان میں جہاد کی روح پھونکنا بھی ضروری تصور کیا گیا، اور انھیں سے کامیابی کی امید قائم کی گئی ۔۔۔۔" (۱۳)

شیخ الہند ایک طرف ان سب کو منظم کر کے بغاوت کرانا چاہتے تھے، دوسری طرف مولانا سندھی کے ذریعہ کابل حکومت کو دخل اندازی کے لئے آمادہ کرنا چاہتے تھے۔

ابتدائی مراکز

افسوس یہ ہے کہ ان تمام کارروائیوں اور کارگذاریوں کی ایسی تفصیلات ہمیں دستیاب

۱۲۔ مولانا عبید اللہ سندھی۔ کابل میں سات سال۔ ص۔ ۱۰۵

۱۳۔ مولانا سید حسین احمد مدنی۔ نقش حیات دوم۔ ص۔ ۲۰۹

نہیں ہوئیں جنھیں تاریخی اہمیت تو کیا صحیح واقعات تک پہونچنے کا ذریعہ ہی ہم بنا سکیں۔ متفرق نامکمل تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ الہند نے اولین مرکز عمل باغستان کو بنانا چاہا تھا۔ اس کے بعد کابل کو مرکز بنا کر حکومت افغانستان کو تیار کرنا مقصود تھا۔ اندرون ملک دیوبند کو مرکزی حیثیت دیکر آپ خود وہاں تھے اور مراکز کو ہدایات دے رہے تھے، حالات نے جب ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کیا تو آپ حجاز ہوتے ہوئے ترکی میں آکر ایک مرکز قائم کرنا چاہتے تھے اور وہاں رہ کر ترکی اور افغانستان دونوں حکومتوں سے بیک وقت حملہ کرانا چاہتے تھے۔ باغستان کو پہلے ہی سے تیار کر رکھا تھا اس طرح آپ نے دوران تحریک دیوبند کے علاوہ تین مرکز قرار دیئے : باغستان، کابل اور ترکی۔ (۱۴)

مقابلہ اور ناکامی

انہیں دنوں ۱۹۱۴ء مطابق ۱۳۳۳ھ میں عالم گیر جنگ چھڑ گئی، جس کی بناپر کام کا نقشہ کسی قدر بدلنا ضروری ہوگیا۔ مولانا حسین احمد مدنی لکھتے ہیں۔

"ترکی پر آٹھ یا نو محاذوں سے حملہ کیا گیا، انگریزوں نے عراق (بصرہ) پر عدن پر چناق قلعہ پر، اسی طرح روس نے تین چار محاذوں پر۔ اس یورش کی وجہ سے مسلمانوں میں جس قدر بھی بے چینی ہوتی کم تھی، چنانچہ احوال موجودہ سے حضرت شیخ الہند نے حاجی ترنگ زئی کو مطلع کیا اور ضروری قرار دیا کہ وہ باغستان چلے جائیں اور ضروری کارروائی عمل میں لائیں۔ اسی طرح مرکز باغستان اور اس کے کارکنوں کو لکھا چنانچہ جب حاجی صاحب مرحوم پہونچے، مجاہدین کا جمگھٹا زیادہ ہوگیا، مجاہدین چمرقند (حضرت سید احمد شہید) کی جماعت بھی آکر مل گئی، بالآخر کچھ عرصہ کے بعد جنگ چھڑ گئی، اور بفضلہ تعالیٰ مجاہدین کو غیر متوقع کامیابی ہونے لگی" (۱۵)

سید احمد شہید کی جماعت مجاہدین کا تذکرہ کرتے ہوئے رولٹ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ۔

"انھوں نے مختلف سرحدی لڑائیوں میں حصہ لیا، اس کے بعد ۱۹۱۵ء میں انھوں نے بلوؤں کی طرف توجہ دی، جس کے نتیجہ میں رستم اور شب کا دار کے مقام پر لڑائیاں ہوئیں، آخری لڑائی کے بعد ان کے بارہ ممبران لڑائی کے میدان میں اپنی کالی پوشاک میں مرے ہوئے پائے گئے" (۱۶)

۱۴۔ پروفیسر نور الحسن شیر کوٹی۔ حیات امداد۔ ص۔ ۲۰

جنگ کا یہ فیصلہ چونکہ انتہائی ناقص، ناموافق اور ناسازگار حالت میں کیا گیا تھا اس لئے تھوڑی وقتی کامیابی کے بعد پھر ناکامی کے آثار شروع ہو گئے، مجبور ہو کر مجاہدین کو یہ پیغام بھیجنا پڑا۔

"بحمد اللہ ہمارے پاس بہادر آدمیوں کی کمی نہیں مگر اسلحہ اور رسد کے بغیر ہم بالکل بے دست و پا ہیں، ساتھ کی لائی ہوئی روٹیوں کے ختم ہو جانے پر مجاہد بے ہتھیار ہو جاتا ہے، اگر کارتوس اور رسد کافی تعداد میں موجود ہو تو ہم بخوبی مقابلہ کر سکتے ہیں۔ آپ جلد از جلد کسی حکومت کو ہماری پشت پناہی اور امداد کے لئے تیار کیجئے۔ چنانچہ اس امر کی بنا پر حضرت شیخ الہند کا ارادہ بدلا۔ مولانا عبید اللہ صاحب کو کابل اور خود کو استنبول پہونچنا ضروری قرار دیا۔" (۱۷)

انگریزوں کو سرحدی مجاہدین کے مقابلہ میں گو تھوڑی دشواری کا سامنا ہوا لیکن دوسری راہ سے انھوں نے مجاہدین کی تلوار کو بالکل کند کر دیا۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے ہنٹر لکھتا ہے۔

"جس کام کو ہماری فوج سرانجام نہ دے سکی اسے اندرونی اختلافات اور ڈپلومیسی اور حکمت عملی نے پورا کرنا شروع کر دیا ... پشاور کا کمشنر قبائل کے اتحاد کو توڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے ایک گروہ کو جس کی تعداد دو سو تھی اپنے گھروں کو واپس جانے کے لئے بھی آمادہ کر لیا اور سوات کے پلیشوا کو بھی اپنے خاص مریدوں کو منتشر کرنے پر راضی کر لیا تھا۔ بہت سے چھوٹے چھوٹے سردار اس برگشتگی کو بھانپ کر خود علحدہ ہو گئے اور باقی ماندہ لوگوں میں بے اعتمادی کا بیج بو گئے۔" (۱۸)

اس طرح مختلف حربوں سے انگریزوں نے مجاہدین کی قوت ختم کر دی اور نتیجہ میں انھیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ مولانا سندھی تحریر فرماتے ہیں۔

"انگریزوں نے کافی روپیہ امیر کو دیا کہ باغستان میں تقسیم کرے، اور اپنی سلطنت کے نام پر قبائل افغانیہ سے بیعت حاصل کرے اور پشاور میں افغانوں کو کہا جاتا کہ امیر

۱۵۔ مولانا سید حسین احمد مدنی۔ نقش حیات دوم۔ ص۔ ۲۱۰

۱۶۔ رولٹ رپورٹ۔ ص۔ ۱۲۴

۱۷۔ مولانا سید حسین احمد مدنی۔ نقش حیات دوم۔ ص۔ ۲۱۲

۱۸۔ ڈبلیو۔ ڈبلیو۔ ہنٹر۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان۔ ص۔ ۸۵

کابل جہاد کرے تو اس وقت تم بے شک جہاد میں شریک ہوجاؤ لیکن بغیر بادشاہ کے جہاد ناجائز ہے، اس عام بدنظمی سے پرہیز کرو۔ اس طرح حاجی ترنگ زئی اور دوسرے مجاہدین کا کام رک گیا، بلکہ حاجی ترنگ زئی کے آدمی اور ہندوستانی مجاہدین کے کارندے سب اسی کام پر مامور ہو گئے کہ وہ امیر کابل کے نام بیعت نامے حاصل کریں۔ یہ انگریزی روپیہ انھیں لوگوں کے ہاتھ باغستان میں تقسیم ہوا۔ اس کے سرانجام دینے والے نائب السلطنت (امیر نصراللہ خاں) تھے تمام بیعت نامے ان کے دفتر میں محفوظ رہتے ہیں۔" (۱۹)

ایک تاریخی غلطی

حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرہ میں گذر چکا ہے کہ آپ نے مجاہدین کی ایک بڑی جمعیت تیار فرمائی تھی، اور ان سب کو لے کر صوبہ سرحد، اور آزاد قبائل وغیرہ سے جا ملے تھے انھیں علاقوں میں آپ کی تمام تر قوت ٹوٹ گئی اور اس قابل نہ رہ سکے کہ آئندہ اس سطح کا کوئی مقابلہ کر سکیں، یہاں تک کہ سید صاحب خود اسی علاقہ میں شہید بھی ہو گئے۔ آپ سے وابستہ کچھ افراد جو بچ رہے تھے انھوں نے بھی اتباع سلف کے نام پر اسی دیار میں معرکہ آرائی ضروری سمجھیں ۔ ان حضرات کے خلوص وللہیت اور جذبہ جہاد میں مجال شک نہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان قبائل کی قوت اور ان کو پرکھنے میں ان حضرات سے غلطی ہوئی، انھوں نے یہ تو دیکھا کہ ان کے اندر جوش ہے معرکہ آرائی، اور جدال وقتال کے وہ عادی ہیں، انھیں تھوڑی تربیت سے آمادہ جہاد کیا جا سکتا ہے لیکن دوسرا رخ ان بزرگوں کی نگاہ سے اوجھل رہا، اور وہ اس طرف غور نہ کر سکے کہ باہم دگر بھی وہ برسرپیکار رہتے ہیں، اور گروہ در گروہ بٹے ہوئے ہیں، آپس میں شدید نفاق کی فضا ہے، جس جوش وجذبہ کو ہم جہاد کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں اس سے ہمارے دشمن بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اور باہمی نفاق کو ہوا دے کر خود ان کو ایک دوسرے کے مقابل صف آرا کر سکتے ہیں، صورت حال کے اس پہلو سے غفلت کا نتیجہ جو ہوا وہ ظاہر ہے۔

اسی کی روشنی میں اب شیخ الہند کی کوششوں پر نظر ڈالئے۔ اولیں مرکز باغستان کو

۱۹۔ مولانا عبیداللہ سندھی ۔ ذاتی ڈائری ۔ ص ۔ ۱۲۵

بنایا اور وہاں خاصی قوت صرف کی۔ حکومت افغانستان سے مدد طلب کرنے کے سلسلہ میں مولانا سندھی کو کابل بھیجا، اور ترکی کو میدان جہاد میں صف آرا کرنے کی غرض سے خود قصد سفر فرمایا۔ لیکن نتیجہ کیا ہوا؟ آپ کی تحریک کے مخصوص متعلقین نے جس قدر جمعیت تیار کی اسے میدان میں لاکھڑا کیا، وہ لڑتے مرتے رہے لیکن کب تک؟ بالآخر تاب مقاومت جواب دینے لگی، اسی دوران انگریزوں کی ریشہ دوانیاں رنگ لائیں، اور لوگ اس جہاد سے دست کش ہونے لگے، یہاں تک کہ حالات اس منزل میں پہونچ گئے کہ شکست اٹھانی پڑی۔

مولانا سندھی افغانستان حکومت سے مدد حاصل کرنے کے لئے گئے تھے لیکن خود شاہ افغانستان کا حال مولانا سندھی کے الفاظ میں یہ تھا کہ۔

"جو گفتگو اعلیٰ حضرت (امیر حبیب اللہ خاں) سے ہوتی وہ حرف بحرف برٹش قونصل کے ذریعہ وائسرائے کو بھیجدی جاتی، اس کے معاوضہ میں کافی روپیہ انگریزوں نے اعلیٰ حضرت کے لئے بھیجا، اور ان کے سالانہ گرانٹ میں مستقل اضافہ ہوگیا۔" (۲۰)

شاہ تو شاہ انگریزوں نے اپنے مقصد برآری کے لئے خالص مذہبی افراد تک کو استعمال کیا، چنانچہ مولانا سندھی نے کابل کے زمانہ قیام میں یہ نقشہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ۔

"حضرت صاحب چہار باغ جو کہ معین السلطنت سردار عنایت اللہ خاں کے مرشد تھے ان کو انگریزوں نے مکہ معظمہ سے اس خدمت کے لئے بلایا تھا، اور معین السلطنت کو اپنے قومی و مذہبی فیصلہ سے علیحدہ رکھنے میں کامیاب ہوگئے، انھوں نے یوں خواب سنائے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے مامور کیا ہے کہ میں اس کام کو پورا کروں۔" (۲۱)

ترکی حکومت کی روش گو افغانستان کی سی نہ تھی، لیکن وہ خود اس قابل نہ رہ گئی تھی کہ کوئی اہم اقدام اس وقت کر بیٹھتی۔ غرض یہ کہ یہ صالح اور انتہائی پرخلوص کوششیں اس طرح رائیگاں ہوگئیں۔

ان بزرگوں کے کارناموں کی توہین یا استخفاف حاشا وکلا ہمارا مقصود نہیں، لیکن یہ ضرور ہے کہ تاریخ کی روشنی میں واقعات کا دیانت دارانہ تجزیہ کرنے پر ایک تاریخ نگار کا قلم مجبور ہے کہ

۲۰۔ مولانا عبید اللہ سندھی۔ کابل میں سات سال۔ ص۔ ۶۱

۲۱۔ " " " ص۔ ۸۱

معاملات کو جیسا دیکھے جوں کا توں رکھدے ایسی صورت میں وہ یہ ذکر کرنے پر مجبور ہے کہ کس نے دن کی روشنی میں شاہد مقصود کی تلاش کی اور کون سواد شب میں نصف النہار کا تمنائی تھا۔

محمد سرور صاحب مرتب "کابل میں سات سال" اپنے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

"ساری گذشتہ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ باغستان کے آزاد قبائل آپس میں اس طرح بٹے ہوئے ہیں کہ ان کو متفق اور متحد کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ اور جب بھی کبھی مشرق یا مغرب سے کسی منظم حکومت کی طرف سے ان پر حملہ ہوا ہے تو یہ اس کا مل کر مقابلہ نہیں کر پائے، وہ حملہ خواہ مغلوں نے کیا ہو، یا نادر شاہ ایرانی نے۔ یہ قبائل ایک مجتمع قوت نہیں، اور دوسرے آج توپوں کا توڑے دار بندوقوں سے مقابلہ کرنا کھلی شکست کی دلیل ہے، علاوہ ازیں ان قبائل پر روپئے کا جادو جتنا کارگر ہوتا ہے اس کا تو ذکر ہی رہنے دیجئے۔ نیز ان کی آپس کی رقابتوں کو جتنی آسانی سے ابھارا جاسکتا ہے اس کا علم کسی کو نہیں، ایسی بٹی ہوئی بنیادی طور پر کمزور اور ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ منتشر ہوجانے والی طاقت پر اتنی امید رکھنا یہ سادہ لوحی گذشتہ سو ڈیڑھ سو سال سے ہندوستانی مسلمانوں کی خصوصیت رہی ہے۔" (۲۲)

مزید وضاحت کرتے ہوئے سرور صاحب لکھتے ہیں۔

"بزرگوں کے اس "سہو" کو بدقسمتی سے بعد والوں نے مشعل راہ بنالیا اور حضرت سید احمد شہید کی شہادت کے بعد ان کے نام لیوا اسی باغستان میں مجاہدین کا ایک مرکز بنا کر بیٹھ گئے .... حضرت شیخ الہند بھی اسی سہو میں مبتلا تھے اور اسی بنا پر انھوں نے اپنی تمام توجہ بھی باغستان کے مرکز کی طرف مبذول رکھی، اور اس سے اس قدر امیدیں وابستہ کیں۔" (۲۳)

ان اقتباسات سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ کس طرح ہماری قوتیں دوسروں سے امید باندھ کر ماضی میں ضائع ہوتی رہیں، یوں بھی ایک ملک کے معاملات میں کسی دوسرے ملک کی اس حد تک دخل اندازی کی امید خوشنما خواب سے زیادہ نہیں، لیکن اس کو کیا کہئے کہ یہ

۲۲۔ مولانا عبیداللہ سندھی۔ مرتبہ محمد سرور۔ دیباچہ کابل میں سات سال۔ ص۔ ۱۳

۲۳۔ " " " " ص۔ ۱۴

ایسا "خواب شیریں" ہے جس نے عوام و خواص سب کو مسحور کیا ہے ۔ ماضی کے اس خواب شیریں کا بھرم کھولتے ہوئے سردر صاحب نے بہت صحیح لکھا ہے ۔

" بدقسمتی سے برطانیہ کا غلام ہونے کے بعد ہندوستانی مسلمان ہمیشہ اس توقع میں رہا کہ اس کی آزادی کا آفتاب کسی دوسرے اسلامی ملک میں طلوع ہوگا اور وہاں سے آزادی کی شعاعیں اس تک پہونچیں گی اور ان سے اس کے وطن کے غلامی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے چھٹیں گے " ۔ (۲۴)

ان بزرگوں نے جو کوششیں کیں وہ بہر حال قابل قدر ہیں ۔ جہاں تک کامیابی اور ناکامی کا سوال ہے تو اس حیثیت سے کسی تحریک کو پرکھنا دشوار ہے ۔ تجزیہ خدمات و کارگذاریوں کا کیا جاسکتا ہے جذبۂ شوق اور قلبی لگن کا نہیں ۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو گرفت و تجزیہ کی منزل سے بہت اوپر رہتی ہیں ، اس اعتبار سے ہزار خطرے مول لے کر ان بزرگوں کی مخلصانہ کوششیں اور جرأت مندانہ اقدام مستحق صد آفریں ہیں ۔

"خطائے بزرگان گرفتن خطا است" کا مقولہ ہو سکتا ہے کبھی صحیح سمجھا جاتا ہو ، اور عین ممکن ہے کہ اب بھی ایک تعداد ایسے افراد کی نکل آئے جن کا اس پر ایمان ہو ۔ مقصود اگر استہزا ہو تو یقیناً یہ نامناسب بات ہوئی ، لیکن اس خیال سے ان کی مناسب گرفت مستحسن ہی نہیں بلکہ ضروری ہے کہ کہیں بزرگوں کی لغزش خوردوں کے ٹھوکر کھانے کا ذریعہ نہ بن جائے ، اور وہ بزعم خود بزرگوں کے موہوم اتباع میں اپنی قوت گنوا بیٹھیں ۔ آج بھی ایسے محوِ خواب لوگوں کی کمی نہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے بخت خفتہ کا ستارہ کسی اور دیس میں طلوع ہوگا ۔ انھیں ان موہوم ظلماتی تمناؤں کے گرداب سے نکل کر اپنی قسمت کا ستارہ اپنے گرد و پیش ہی ڈھونڈنا چاہئے ۔

یہی زمیں ترا مسکن یہی مدفن ~
اسی زمیں سے تو مہر و ماہ پیدا کر

---

۲۴ ۔ مولانا عبیداللہ سندھی ۔ مرتبہ محمد سردر ۔ دیباچہ کابل میں سات سال ۔ ص ۔ ۱۵

غیر ممالک کے سفر

پہلا سفر

۱۸۶۳ء میں مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی، مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور دوسرے بہت سے بزرگان ہند نے حج کے خیال سے قصد سفر کیا تو ان بزرگوں کے ساتھ کیوجہ سے اہل تعلق عوام کی بھی ایک بڑی تعداد تیار ہوگئی۔ استاد محترم کی صحبت ومعیت کے خیال اور حرمین شریفین کی زیارت کے شوق اور تمنا میں شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب نے بھی ان بزرگوں کے ساتھ رخت سفر باندھا۔ (۲۵)

بمبئی پہونچنے کے بعد بیس دن تک جہاز کا انتظار کرنا پڑا۔ بیس دن کے انتظار کے بعد جہاز ملا تو یہ قافلہ سوار ہوا اور تقریبًا تیرہ چودہ یوم کا سفر طے کر کے سرزمین حجاز مقدس پر اترا۔ حج وزیارت کے علاوہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی اور مولانا شاہ عبدالغنی صاحب مہاجر مدنی جیسے بزرگوں سے بھی اس سفر مبارک میں شرف صحبت وملاقات حاصل ہوا۔ اسی سفر میں حضرت شیخ الہند اپنے استاد مکرم مولانا محمد قاسم صاحب کے ایما سے حضرت حاجی صاحب نور اللہ مرقدہ سے بیعت ہوئے، اور انھوں نے آپ کو خلعت خلافت سے بھی نوازا۔ نیز اسی سفر میں مولانا شاہ عبدالغنی صاحب نے آپ کو سند واجازت حدیث بھی مرحمت فرمائی۔

بیس روز تک مدینہ منورہ میں قیام کرنے کے بعد یہ حضرات پھر مکہ معظمہ واپس آگئے اور ایک ماہ کے قیام کے بعد حضرت حاجی صاحب کے اشارہ سے ان سب حضرات نے واپسی کا ارادہ فرمایا۔ مولانا محمد قاسم صاحب کی طبیعت روانگی سے کچھ قبل ہی سے ناساز تھی، ستم یہ ہوا کہ جہاز میں جگہ کم تھی اور مسافر زیادہ ہو گئے، جس کی وجہ سے پریشانی اور بڑھ گئی، اور مولانا کے مرض میں بھی اضافہ ہو گیا۔ اسی حالت میں انتہائی تکلیف دہ سفر کے بعد بمبئی پہونچے اور وہاں سے شیخ الہند صاحب فراش مولانا نانوتوی کو لے کر ان کے وطن چلے

۲۵۔ مولانا سید اصغر حسین صاحب۔ حیات شیخ الہند۔ ص۔ ۱۴۔

گئے اور انھیں وہاں پہونچاکر پھر دیوبند تشریف لائے۔ (۲۶)
بیرون ملک شیخ الہند کا یہ پہلا سفر تھا، اس سفر کی روداد کسی قدر تفصیل کے ساتھ ہم گذشتہ باب میں تحریر کر چکے ہیں۔

دوسرا سفر

بیرون ملک کا دوسرا سفر شیخ الہند نے شوال ۱۳۳۳ھ مطابق ستمبر ۱۹۱۵ء میں ارادہ حج کے نام سے کیا، جس میں سیاسی مقاصد کارفرما تھے۔ ذیل میں اس کے اسباب و وجوہات اور مقاصد ہم تحریر کر رہے ہیں۔

وجہ سفر

گذشتہ صفحات میں یاغستان کے آزاد قبائل کی جنگی مہمات اور معرکہ آرائی کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔ مجاہدین اپنی بساط بھر مخالفین سے مصروف پیکار رہے لیکن ان کے مقابلہ کیلئے ضروری سامان حرب اور رسد کا خاطر خواہ انتظام نہ تھا، پھر اسی دوران انگریزوں کی ریشہ دوانیاں رنگ لائیں اور مجاہدین کی اپنی صفوں میں انتشار بھی پیدا ہونے لگا جس نے میدان میں جمے رہنے والوں کی بھی ہوا خیزی کا سامان فراہم کر دیا۔ ان حالات میں شیخ الہند کے پاس میدان چھوڑ کر نہ ہٹنے والوں نے یہ پیغام بھیجا کہ۔

"آپ جلد از جلد کسی حکومت کو ہماری پشت پناہی اور امداد کے لئے تیار کیجئے"۔ (۲۷)

اس وقت شیخ الہند نے مولانا سندھی کو حکومت افغانستان سے مدد حاصل کرنے کی غرض سے کابل کے لئے روانہ کیا، اور خود ترکی جانے کا قصد فرمایا۔ (۲۸)
انھیں دنوں ترکی کی دولت عثمانیہ کے قلمرو پر مختلف سمتوں سے دشمنان اسلام نے

۲۶۔ مولانا سید اصغر حسین صاحب۔ حیات شیخ الہند۔ ص۔ ۱۴۔ ۱۵
۲۷۔ مولانا سید احمد حسین مدنی۔ نقش حیات دوم۔ ص۔ ۲۱۲
۲۸۔ " " " ص۔ ۲۱۲

یورش کی، جس سے مولانا موصوف کی بےچینی اور بڑھ گئی۔ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت مدنی رقم طراز ہیں۔

"بلقان کے خونخوار اور طرابلس کے سنگین واقعہ نے مولانا کے دل و دماغ پر نہایت عجیب مگر بےچین کنندہ اثر ڈالا چنانچہ مولانا نے پوری جان توڑ کوشش امداد اسلام میں فرمائی۔ فتوے چھپوائے، مدرسہ کو بند کرایا، طلبار کے وفود بھیجے، خود بھی ایک وفد کے ساتھ نکلے، چندے کئے اور ہر طرح سے مدد کی ترغیب دے کر ایک اچھی مقدار بھجوائی، مگر اس پر بھی چین نہ پڑا، کیوں کہ جنگ بلقان کے نیتجہ نے دوربینوں کو بالکل غیر مطمئن کر دیا تھا، کہ یورپ کے سفید عفاریت اسلام کے ٹمٹماتے چراغ کو گل کرنے کی فکر میں ہیں، جو مقاصد مسیحی دنیا کے زمانہ دراز سے چلے آتے تھے اور جن چالوں سے اسلامی دنیا اور خلافت مقدسہ کے بوٹی تکے چکے سجا رہے تھے اب ان کے انتہا کا زمانہ آگیا ہے، اب کوئی دن میں اسلامی وجود دنیا سے اس طرح مٹا دیا جائے گا جس طرح یہودیت تمام عالم، اور اسلامیت اسپین و پرتگال سے، مولانا مرحوم کو اس فکر نے سخت بےچین کر دیا۔" (۲۹)

شیخ الہند جو بلسقان و طرابلس کے معرکہائے خونریز میں انتہائی بےچین اور پریشان خاطر ہو گئے تھے، جب براہ راست ترکی سے ٹھن گئی تو قدرتاً فکر و تردد میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ مولانا مدنی لکھتے ہیں۔

"اس حالت نے مولانا مرحوم کے قلب حزیں پر نہایت زہریلا اثر ڈالا، ان کو ناانصافیوں نے بیحد بےچین کر دیا، ہر وقت اس جنگ کی فکر لگی رہتی تھی۔ چونکہ عالم اسلامی کی حامی فقط ایک خلافت ٹرکی باقی رہ گئی تھی، اس لئے جملہ اہل ایمان کو اسی سے لگاؤ اور تعلق تھا.... مگر اس زمانے میں... خلافت کی ہمدردی گناہ شمار ہونے لگی، یہاں تک کہ بعض مقامات میں خلافت کے لئے دعا کرنا بھی جرم شمار کیا گیا.... ایمان فروشوں نے ٹرکی سے اپنی بے تعلقی اور برطانیہ سے ہر طرح ہمدردی کا اظہار کیا۔ بہت سے علمار سور نے خلافت ٹرکی کے متعلق فتاویٰ میں زہر اگلنا شروع کر دیا... مولوی عبدالحق حقانی نے ایسا ہی ایک فتویٰ خلافت ٹرکی کے خلاف لکھا، اور یہ فتویٰ تائید حاصل کرنے کے لئے شیخ الہند کے سامنے

۲۹۔ مولانا سید حسین احمد مدنی۔ اسیر مالٹا۔ ص۔ ۱۰۔ ۱۱

بھی پیش ہوا۔ آپ نے اہل فتویٰ کے متعلق سخت کلمات استعمال کئے اور مجمع عام میں اس فتویٰ کو پھینک دیا جو حکومت کے اشارہ پر لکھا گیا تھا ۔" (۳۰)

مولانا سندھی کو شیخ الہند کابل روانہ کر چکے تھے۔ اندرون ملک مخالفت ترکی کی یہ فضا چل رہی تھی، مولانا کو خود ترکی جانا چاہتے تھے لیکن براہ راست جانا ممکن نہ تھا ادھر اندرون ملک حامیان خلافت ترکی کی گرفتاریاں بھی شروع ہو گئی تھیں، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خاں وغیرہ گرفتار ہو چکے تھے ۔ (۳۱)

اس کا امکان تقریباً یقینی تھا کہ خود شیخ الہند بھی گرفتار ہو جاتے ایسی صورت میں مجاہدین باغستان کی امداد کا کام بھی بند ہو جانا ظاہر تھا۔ اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ ملک فوراً چھوڑ دیا جائے، ڈاکٹر انصاری وغیرہ کی یہی رائے تھی کہ حجاز ہوتے ہوئے حسب ارادہ ترکی کے لئے جلد از جلد روانہ ہو جائیں ۔ (۳۲)

لیکن مولانا آزاد کی رائے قطعی طور پر یہ تھی کہ اندرون ملک رہ کر کام کریں اور باہر نہ جائیں۔ لیکن حضرت نے پہلی رائے کو ترجیح دی اور شوال ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۵ء میں حجاز مقدس کے لئے روانہ ہو گئے ۔ (۳۳)

قصد سفر اور افواہیں

حضرت شیخ الہند نے گو اپنے طور پر فیصلہ فرما لیا تھا لیکن اس سفر کے ارادہ کا عام اظہار نہ فرمایا، اخفا رہی ضروری سمجھا، مگر بات کہاں تک چھپتی؟ رفتہ رفتہ اس امر کی شہرت ہو گئی کہ حضرت سفر فرما رہے ہیں۔ لوگ چونکہ مقصد سفر سے ناواقف تھے اس لئے ہر شخص نے الگ الگ توجیہیں کیں، عام خیال یہ تھا کہ آپ ہجرت کر کے تشریف لیجا رہے ہیں۔ بعضوں نے اپنی بساط فہم کے مطابق یہ بھی خیال کیا کہ برطانیہ کے خلاف ترکی کی مدد کے

---

۳۰ ۔ مولانا سید حسین احمد مدنی ۔ اسیر مالٹا ۔ ص ۔ ۱۴ ۔ ۱۵ ۔ ۱۶

۳۱ ۔ " " " ص ۔ ۱۶

۳۲ ۔ " " نقش حیات دوم ۔ ص ۔ ۲۱۲

۳۳ ۔ مولانا غلام رسول مہر ۔ سرگذشت مجاہدین ۔ ص ۔ ۵۵۸ ۔ ۵۵۹

لئے جارہے ہیں، غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ عوام تو عوام، ارباب دارالعلوم تک سے آپ نے مقصد سفر صیغۂ راز میں رکھا تھا، وہ لوگ بھی اسی قسم کے اوہام و خیالات میں مبتلا تھے۔ چنانچہ ۲۹ رشوال ۱۳۳۳ھ مطابق ستمبر ۱۹۱۵ء کو روانگی سے قبل ظہر کے بعد اپنی قدیم درس گاہ نودرہ میں منتظمین دارالعلوم و اساتذہ و طلبہ وغیرہ کو جمع کرکے آپ نے خطاب فرمایا، جس میں عام افواہوں کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ۔

"میرا ارادہ صرف زیارت حرمین شریفین کا ہے، یہ بتلا دینا تو مشکل ہے کہ کتنی مدت میں واپس ہوں گا مگر انشاء اللہ ضرور اور حتی الوسع جلد واپس ہونگا۔ مدرسہ کا کام خدا تعالی کا کام ہے اس کی امانت سمجھ کر ہر شخص کو کوشش کے ساتھ اس کو انجام دینا چاہئے" (۳۴)

اس تقریر سے اہل دارالعلوم میں آپ کے متعلقین کو تقویت ہوئی اور عام افواہوں کا ازالہ ہوگیا۔ سفر کے متعلق اس طرح کی افواہیں چونکہ عام ہوگئی تھیں اس لئے ایک شخص نے اسٹیشن پر آپ سے سفر کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے اسکو جواب دیا کہ

"نہیں بھائی ہجرت کا قصد نہیں ہے البتہ اگر خدا تعالی نے توفیق دی تو کسی قدر قیام کا خیال ہے، جس کی نسبت ابھی کچھ پوری تعین نہیں ہو سکتی۔ خدا جانے آئندہ کیا پلٹش آجائے" (۳۵)

سفر اور رفقار سفر

مولانا شیخ الہند ۲۹ رشوال ۱۳۳۳ھ مطابق ستمبر ۱۹۱۵ء کی شام کو دیوبند سے روانہ ہوئے۔ مرحوم ڈاکٹر انصاری صاحب کے بڑے بھائی حکیم عبدالرزاق صاحب پہلے سے بمبئی پہونچ گئے تھے، وہاں پہونچکر انھوں نے سفر کے متعلق جملہ سہولتیں بہم پہونچائیں اور ٹکٹ اور دیگر ضروریات سفر وغیرہ فراہم کیا۔ (۳۶)

حسب ذیل اشخاص حضرت کے رفقار سفر تھے۔

۱۔ مولانا محمد میاں عرف مولانا منصور انصاری

۱۔ مولانا محمد سہول صاحب بھاگل پوری

۳۴۔ مولانا سید اصغر حسین۔ حیات شیخ الہند۔ ص۔ ۲۹

۳۵۔ " " " ص۔ ۳۰

۳۶۔ مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی۔ اسیر مالٹا ص۔ ۱۲

۳۔ مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری
۴۔ مولوی عزیز گل صاحب
۵۔ حاجی خان محمد صاحب
۶۔ مولوی مطلوب الرحمٰن صاحب دیوبندی
۷۔ حاجی محبوب خاں صاحب
۸۔ حاجی عبدالکریم صاحب سرونجی
۹۔ مولوی وحید احمد صاحب ۔ (۳۷)

مولانا سید محمد میاں صاحب نے "علماء حق" میں حکیم نصرت حسین صاحب کو بھی رفیق سفر قرار دیا ہے ۔ (۳۸)

لیکن یہ صحیح نہیں، کیوں کہ حکیم صاحب مولانا کے ساتھ نہیں گئے تھے، مالٹا کی اسارت کے زمانہ میں حکیم صاحب موصوف مولانا موصوف کے رفیق سفر ضرور تھے، اور وہیں دوران اسارت ان کا انتقال بھی ہوگیا لیکن ہندوستان سے وہ حضرت شیخ الہند کی روانگی کے ایک سال بعد ۱۹۱۶ء میں روانہ ہوئے تھے، اور حج کے بعد شیخ الہند کی صحبت میسر آئی تھی اس کے بعد سے وفات تک شیخ الہند کے ساتھ رہے ۔ (۳۹)

خفیہ پولیس اور افواہیں

مولانا کے مقاصد سفر کے متعلق جو طرح طرح کی افواہیں عوام الناس میں پھیلی تھیں، شدہ شدہ وہ ارباب حکومت اور ان کی خفیہ پولیس تک پہونچ گئیں، اور مولانا کے پیچھے خفیہ پولیس لگادی گئی ۔

بمبئی سے جہاز میں سوار ہوتے وقت بعض لوگوں نے چند افراد کی نشاندہی کرتے ہوئے بتایا کہ یہ خفیہ پولیس کے افراد ہیں، ان سے احتیاط برتی جائے ۔ ان افراد کے متعلق ترکی

۳۷۔ مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی اسیر مالٹا ۔ص ۔ ۱۷ ۔ ۱۸
۳۸۔ مولانا سید محمد میاں صاحب ۔ علماء حق جلد اول ۔ص ۔ ۱۳۹
۳۹۔ مولانا سید اصغر حسین صاحب ۔ حیات شیخ الہند ۔ص ۔ ۷۳

پولیس کو بھی معلوم ہوگیا اور اس نے ان مشتبہ افراد کو اپنی حراست میں لیکر حج کے بعد ان سب کو ہندوستان واپس کر دیا۔ (۴۰)

یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ بمبئی سے روانگی کے وقت ہی مولانا کی گرفتاری کا حکم آگیا تھا لیکن معتقدین و مخلصین کے کثیر مجمع کی وجہ سے پولیس کو اس پر عمل درآمد کی جرأت نہ ہوسکی۔ (۴۱)

گرفتاری کا دوسرا حکم گورنر یوپی نے مرکزی حکومت کے ذریعہ عدن کے گورنر کے پاس بھیجا کہ مولانا کو گرفتار کر لیا جائے لیکن ڈاکٹر انصاری کی کوششوں سے اس تار میں اس قدر تاخیر کی گئی کہ جہاز عدن سے روانہ ہوگیا، جدہ میں جب جہاز کے کپتان کو یہ تار دیا گیا تو اس سے پہلے مولانا دیگر حجاج کے ساتھ جزیرۂ سعدی میں اتر چکے تھے۔ (۴۲)

حج وزیارت اور قصد مدینہ منورہ

۲۷ ذلیقعدہ ۱۳۳۳ھ مطابق نومبر ۱۹۱۵ء کو شیخ الہند وغیرہ اونٹوں کی سواری پر جدہ سے روانہ ہوئے اور ۲۸ ذلیقعدہ کی شام کو مکہ معظمہ میں داخل ہوئے اور حج وزیارت کی سعادت حاصل فرمائی۔ اسی سال مولانا خلیل احمد صاحب انبیٹھوی نے بھی سفر حج فرمایا تھا لیکن راستہ میں رفاقت نہ ہوسکی۔ رفقاء سفر میں سے مولوی مطلوب الرحمٰن صاحب مکہ معظمہ ہی سے ہندوستان واپس ہو گئے تھے اور حاجی خان محمد صاحب کا وہیں انتقال ہوگیا تھا۔ بقیہ رفقاء سفر اور مولانا خلیل احمد صاحب انبیٹھوی اور شیخ الہند ۲۱ ذی الحجہ کو مدینہ منورہ کے لئے روانہ ہوئے۔ (۴۳)

مدینہ منورہ میں حضرت شیخ الہند کے شاگرد رشید مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی اور دیگر اہل علم اور مشتاقان زیارت کو مکہ معظمہ سے آپ کی روانگی کی اطلاع مل گئی تھی سب کے سب پہلے سے دیدہ و دل فرش راہ کئے ہوئے آپ کے منتظر تھے کئی دن کا سفر طے کر کے ۶ محرم الحرام ۱۳۳۴ھ مطابق ۱۹۱۶ء کو آپ مدینہ منورہ پہونچے۔ مولانا احمد حسین صاحب اور دیگر اہل علم پیشوائی کے لئے بڑھے، ان حضرات کی معیت میں مولانا سید حسین احمد صاحب

۴۰۔ مولانا سید احمد حسین صاحب مدنی۔ اسیر مالٹا۔ ص۔ ۲۰

۴۱۔ 〃 〃 〃 ص۔ ۲۱

۴۲۔ 〃 〃 〃 نقش حیات دوم۔ ص۔ ۲۱۳

کے گھر آکر آپ نے قیام فرمایا۔

حضرت شیخ الہند نے مدینہ منورہ میں چندے قیام کا ارادہ ظاہر فرمایا، اور دیگر رفقار سفر سے فرمایا کہ میں تمہاری ضروریات اور ذمہ داریوں سے واقف ہوں، اس لئے تم لوگ ہندوستان واپس چلے جاؤ، میں ابھی یہاں قیام کرونگا چنانچہ مولوی عزیز گل صاحب، مولانا ہادی حسن صاحب، اور مولوی وحید احمد صاحب کے علاوہ سب ہندوستان واپس آگئے۔ مولانا خلیل احمد صاحب کے رفقار بھی ہندوستان واپس ہوگئے البتہ خود مولانا موصوف، آپ کی اہلیہ اور حاجی مقبول احمد صاحب واپس نہ ہوئے اور وہیں قیام فرمایا۔ (۴۴)

رفقار سفر کی روانگی کے بعد شیخ الہند نے قیام مدینہ کے دوران اپنے عزائم و مقاصد کے سلسلہ میں تگ و دو شروع کی، جس کے نتیجہ میں طویل قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔ مدینہ منورہ میں شیخ الہند کی یہ کوششیں جو تحریک "ریشمی رومال" کے نام سے مشہور ہوئیں، ان کا مفصل تذکرہ آئندہ صفحات میں ہم پیش کر رہے ہیں۔ ترتیب واقعات کا لحاظ کر کے حجاز مقدس میں حضرت شیخ الہند کی کوششوں کے ذکر سے پہلے تحریک سے متعلق ان امور کا ذکر پیش کیا جا رہا ہے جنھیں وابستگان تحریک نے ہندوستان یا ہندوستان کے باہر جاکر انجام دیا، اور اس کے بعد حضرت شیخ الہند کو سفر حجاز کرنا پڑا۔

تحریک ریشمی رومال

زیر نظر باب کا یہ سب سے اہم حصہ ہے جس میں شیخ الہند کی قیام حجاز کے دوران مصروفیات کے مفصل تذکرہ کے علاوہ سفر حجاز سے پہلے کے چند وفود جو چین۔ جاپان۔ فرانس۔ امریکہ وغیرہ بعض ممالک میں بھیجے گئے تھے، جن کا مقصد عالمی رائے عامہ کو ہموار کرنا تھا، آئندہ صفحات میں ان سب کا تذکرہ پیش ہے۔

ان وفود اور شیخ الہند کے قیام حجاز کے دوران کاموں کی صحیح تفصیل کے ضمناً تذکرہ کے علاوہ، مستقل موضوع کی حیثیت سے کوئی تحریر نہیں ملتی۔ اسیر مالٹا میں بھی زمانۂ اسارت

۴۳۔ مولانا سید حسین احمد مدنی۔ اسیر مالٹا۔ ص۔ ۲۳۔ ۲۴

۴۴۔ " " " ص۔ ۲۸۔ ۳۰

کے واقعات کے علاوہ تحریک کی کوئی خاص تفصیل نہیں ہے۔ نقش حیات دوم میں اسیر مالٹا
کے بعض مضامین کے اعادہ کے سوا کسی قدر اشارے ہیں مگر مجمل۔ اس لئے یہ کتابیں معاون
تو بن سکتی ہیں مگر ان کو بنیاد بنا کر بات آگے نہیں بڑھائی جا سکتی، البتہ اس سلسلہ میں کسی حد
تک وضاحت سے رہنمائی کرنیوالی دو کتابیں ہیں۔

۱۔ تحریک ریشمی رومال۔ ۲۔ کابل میں سات سال

اول الذکر کتاب کے نام سے یہ خیال ہوتا ہے کہ اس سے تحریک پر بڑی حد تک روشنی
پڑتی ہوگی، لیکن ایسا نہیں۔ شروع کتاب سے صفحہ ۱۳۷ تک انگریزی مظالم کا مفصل تذکرہ ہے
صفحہ ۱۳۸ سے لیکر آخر کتاب صفحہ ۲۶۱ تک تحریک اور متعلقات تحریک پر بحث کی گئی ہے، یہ کتاب
شیخ الاسلام حضرت مدنی کے افادات میں سے ہے، جسے مولانا عبدالرحمٰن صاحب نے ترتیب دیا
ہے، فاضل مرتب نے اپنی معلومات اور تحقیق کی بنیاد پر جابجا مفید اضافے کئے ہیں، اور آخر میں
تحریک کی ناکامی پر خود بھی کئی صفحات لکھے ہیں۔ اپنے مضامین کی اہمیت کے اعتبار سے کتاب
اس لائق ہے کہ اسے بنیاد بنا کر تحریک پر واقعاتی ترتیب کے ساتھ کام کیا جائے۔

دوسری کتاب مولانا عبیداللہ سندھی کی ڈائری ہے جس میں انھوں نے اپنے سفر کابل کا
تذکرہ کیا ہے، اس سے بھی بعض امور پر روشنی پڑتی ہے، خود نوشت ہونیکی وجہ سے یہ کتاب بھی
استناد و اہمیت کے قابل ہے، اس میں مولانا سندھی نے کابل میں پیش آنے والے حالات کا
بالاجمال مگر واضح تذکرہ کیا ہے۔

ملک کے مختلف کتب خانوں کی خاک چھاننے کے باوجود ان دونوں کتابوں کے علاوہ بنیادی
امور کی طرف رہنمائی کرنیوالی کوئی تحریر ہمیں دستیاب نہ ہو سکی۔ رولٹ کمیٹی رپورٹ سے بعض
امور کی نشاندہی ہوتی ہے، لیکن یہاں ہم اس حقیقت سے صرف نظر نہیں کر سکتے کہ رپورٹ
انگریزی مصالح کو پیش نظر رکھ کر مرتب کی گئی ہے، نیز اس کے بعض مشتملات کی تردید بھی
واقف کار حضرات نے کر دی ہے۔ تذکرہ شیخ الہند کے صفحات بھی اس سلسلہ میں کوئی رہنمائی
کرنے سے عاجز ہیں۔ ظفر ایبک کی آپ بیتی سے بعض امور پر روشنی پڑتی ہے، نیز کچھ دوسری
کتابوں سے پیدا ہونے والی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ مذکورۃ الصدر دو کتابوں کے علاوہ
ان تحریروں سے بھی کسی نہ کسی حد تک اس سلسلہ میں مدد ملتی ہے۔ ان کے علاوہ بھی جن
تحریروں سے جہاں کہیں افادہ کیا گیا ہے ان کا ذکر کر دیا گیا ہے۔

حجاز میں شیخ الہند کے کاموں کا تذکرہ کرنے سے پہلے ان وفود کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جو چین و برما۔ جاپان۔ فرانس اور امریکہ کو بھیجے گئے تھے۔ (۴۵)

بظاہر ان وفود کی حیثیت عام سی ہے لیکن درحقیقت یہ شیخ الہند کی تحریک ہی کی ایک کڑی ہے گو متعین طور پر اس کا ثبوت نہیں ملتا لیکن مختلف قرائن سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔ کتاب "تحریک ریشمی رومال" میں جن وفود کا تذکرہ ہے وہ ۱۹۰۵ء سے لے کر ۱۹۱۴ء تک کے ہیں۔ (۴۶)

اور یہ ہندوستان ہی سے بھیجے گئے تھے۔ ان کے تذکرہ میں دہلی اور دیوبند کا نام مرکز کی حیثیت سے آتا ہے۔ (۴۷)

دیوبند کا ذکر ضمناً اور دہلی کا براہ راست ملتا ہے۔ اندازہ یہ ہوتا ہے کہ اصل تعلق دہلی سے تھا، اور دیوبند میں شیخ الہند سے وقتاً فوقتاً اہم مشورے ہوتے تھے۔ دیوبند میں حضرت شیخ الہند کے علاوہ کسی کو اس سے دلچسپی نہ تھی، دہلی میں اس کا تعلق حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری سے ہوسکتا ہے، کیوں کہ یہ دونوں حضرات شیخ الہند سے قریب بھی تھے، اور آپ کے معاون و مشیر بھی، چنانچہ سر چارلس کلولینڈ ڈائرکٹر خفیہ پولیس کی نگاہوں میں یہ دونوں حضرات مشکوک تھے، اور وہ انھیں درمیانی کڑی سمجھتا تھا۔ (۴۸)

مولانا سندھی نے اپنی خود نوشت تحریر میں بھی کچھ وفود کا تذکرہ کیا ہے جو ۱۹۱۶ء کے معلوم ہوتے ہیں، کیونکہ مولانا ۱۵ر اکتوبر ۱۹۱۵ء کو کابل پہونچے۔ (۴۹)

اور ابتدائی مہینوں میں اتنا کام نہ کر سکے تھے کہ وفد بھیجنے کی نوبت آتی، اس لئے آپ کی تحریر کے مطالعہ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ وفود جو کہ روس، ترکی اور جاپان گئے تھے، (۵۰) ۱۹۱۶ء میں بھیجے گئے۔

۴۵۔ مرتبہ مولانا عبدالرحمٰن صاحب۔ تحریک ریشمی رومال۔ ص۔ ۱۳۸۔ ۱۴۷

۴۶۔ 〃 〃 〃 ص۔ ۱۸۲

۴۷۔ 〃 〃 〃 ص ۔ ۱۴۶

۴۸۔ قاضی عبدالغفار۔ حیات اجمل۔ ص۔ ۲۲۴

۴۹۔ مولانا عبیداللہ سندھی۔ کابل میں سات سال۔ ص۔ ۲۶

حضرت مدنی اور مولانا سندھی دونوں کے تذکرہ کردہ وفود میں یہ بات مشترک ہے کہ ان کا مقصد ان ممالک کو آزادئ ہند کا حامی اور مؤید بنا کر ترکی کو تقویت دینا تھا۔ کیونکہ مجوزہ پروگرام کے مطابق ترکی کو افغانستان کی راہ سے حملہ کرنا تھا اور اسی وقت اندرونی طور پر بغاوت کرانے کا بھی منصوبہ تھا۔ آئندہ صفحات میں ہم دونوں بزرگوں کے تذکرہ کردہ وفود کی کارگزاریوں کی الگ الگ تفصیلات پیش کریں گے۔

چینی و برمی مشن

سب سے پہلے مولانا مقبول الرحمان صاحب سرحدی اور مسٹر شوکت علی کی سرکردگی میں ایک وفد چین کے لئے روانہ ہوا۔ (۵۱) حضرت مدنی نے صرف اتنا ہی بتایا ہے، البتہ مرتب کتاب مولانا عبدالرحمٰن صاحب نے ۱۹۴۲ء میں مولانا مقبول الرحمٰن صاحب سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے ان کی روایت سے کچھ مفید اضافے کئے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وفد کل آٹھ آدمیوں پر مشتمل تھا۔ (۵۲)

"وفد میں کچھ ہندو ممبر بھی تھے لیکن مولانا مقبول الرحمٰن اور مسٹر شوکت علی کے علاوہ کسی کا نام نہیں بتایا گیا۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ مسلمان کتنے تھے اور ہندو کتنے؟ مولانا مقبول الرحمٰن صاحب نے جو باتیں بتائیں ان کا خلاصہ یہ ہے۔

"وفد آٹھ آدمیوں پر مشتمل تھا۔ چین میں مذہبی طریقہ پر کام کرنا مناسب سمجھا گیا لیکن ہندو ممبران کو اس سے اتفاق نہ تھا، مگر جب یہ تجویز کامیاب ہوتی نظر آئی تو وہ بھی متفق ہو گئے۔ چنانچہ ایک مرکزی جگہ متعین کر کے سیرت کمیٹی بنائی گئی اور اس کی مختلف شاخیں ملک کے دوسرے حصوں میں بنائی گئیں، اس طرح پہلے وہاں کے مسلمانوں کو پھر عام لوگوں کو ہم خیال بنایا گیا۔ یہ تجویز خاصی کامیاب رہی۔ ایک ماہانہ رسالہ "الیقین" بھی جاری کیا گیا، جو چینی اور اردو دونوں زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۹ء تک وہاں کام

۵۰۔ مولانا عبیداللہ سندھی۔ کابل میں سات سال۔ ص ۶۲۔ ۷۳

۵۱۔ مرتبہ مولانا عبدالرحمٰن صاحب۔ تحریک ریشمی رومال۔ ص ۱۳۸

۵۲۔ " " " " ص ۱۳۹

کرکے مرکز کے حکم پر وفد برما چلا گیا جہاں آخر ۱۹۱۵ء تک کام کیا گیا۔ چینی عوام کیوں کہ خالی الذہن تھے اس لئے وہاں نسبتاً کامیابی زیادہ ہوئی۔ لیکن برما کے لوگ برطانیہ کے زیر اثر تھے اس لئے وہاں وہ کامیابی زیادہ نہ ہوسکی تاہم وہاں کام کرنا بے سود بھی نہ رہا۔ برما میں مذہبی افتراق عروج پر تھا اس لئے مذہبی بنیادوں پر وہاں کام کرنے میں کامیابی کے امکانات کم تھے وہاں عام انسانی خدمت کی بنیاد پر کام شروع کیا گیا۔ "انسانی برادری" کے نام سے ایک انجمن بنائی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں "الانسان" نامی اخبار نکالا گیا تھا۔ لیکن یہ صحیح نہیں، مولانا مقبول صاحب نے اس نام کی ایک کتاب عربی میں لکھی تھی، جسکا ترجمہ انگریزی اور برمی زبان میں مسٹر شوکت علی نے کیا تھا۔

چین کے قیام کے دوران اخراجات پورے کرنے کے لئے وفد نے ایک مطب کھولا تھا جس میں مولانا مقبول صاحب یونانی، اور مسٹر شوکت علی ڈاکٹری علاج کرتے تھے۔ اس کی آمدنی سے وفد کا خرچ پورا ہو جاتا تھا۔ برما جاتے وقت مطب فروخت کر کے سفر خرچ نکالا گیا نیز ان تین آدمیوں کے خرچ کے لئے کچھ رقم دی گئی جو کام کی نگرانی کے لئے چین میں رہ گئے تھے۔ وفد کے ایک ممبر وہیں سے وطن واپس آگئے۔ برما میں اخراجات کے لئے کپڑے کا کاروبار شروع کیا گیا۔

۱۹۱۶ء میں تحریک کی ناکامی کے بعد مسٹر شوکت علی دوسرے دو ہندو ممبران کے ساتھ ہندوستان آگئے اور مولانا مقبول صاحب رنگون چلے گئے جہاں مطب کرتے رہے اور ۱۹۲۳ء میں حج کر کے وطن واپس آئے۔" (۵۲)

مندرجہ بالا تلخیص مولانا مقبول الرحمٰن صاحب کے بیان کی ہے۔ اسمیں ۱۹۱۶ء میں تحریک کی ناکامی کا ذکر کیا گیا ہے، جس سے اس خیال کو مزید تقویت ہوتی ہے کہ یہ وفود شیخ الہند کی تحریک سے متعلق تھے اور اسی کی طرف سے بھیجے گئے تھے۔

جاپانی مشن

پانچ ممبروں کا ایک مشن پروفیسر برکت اللہ صاحب کی قیادت میں جاپان بھیجا گیا۔

۵۲۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب۔ تحریک ریشمی رومال۔ ص۔ ۱۴۱-۱۳۹

پروفیسر صاحب موصوف انگریزی میں ایم ۔ اے تھے ۔ ترکی ، جرمنی ، جاپانی زبانوں پر بھی عبور حاصل تھا، عربی کی بھی شد بد رکھتے تھے، بھوپال کے کسی افسر کے لڑکے تھے، وہیں تھے کہ کسی طرح تحریک سے واقفیت ہوگئی ۔ سب چھوڑ چھاڑ تحریک میں شامل ہو گئے ۔ اسی عرصہ میں کرشنا ورما سے آپ کی دوستی ہوگئی جس کا تذکرہ رولٹ رپورٹ میں بھی ہے ۔ چار ممبروں کا قائد بنا کر آپ کو جاپان بھیجا گیا ۔ ٹوکیو کے ایک کالج میں پروفیسری اختیار کرلی تھی، وہاں ایک انجمن " اسلامک فریٹیرنٹی " بنائی، اور اسی نام کا ایک روز نامہ جاپانی اور انگریزی زبان میں جاری کیا ۔ ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۰ء تک وہاں کام کیا، اسی دوران میں فرانس بھی ایک وفد گیا ہوا تھا، وہاں اس کو کسی لائق آدمی کی ضرورت تھی، چنانچہ مرکزی حکم کے تحت آپ ممبران وفد میں سے ایک کو ہمراہ لے کر، اور دوسرے تین ممبران کے سپرد وہاں کا کام کر کے فرانس چلے گئے ۔ جاتے وقت پروفیسر شپ سے استعفار دے دیا، نیز اخبار بھی بند کر دیا ۔ (۵۴)

رولٹ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ برطانیہ کے خلاف اخبار کے تلخ لب ولہجہ کی بنا پر جاپانی حکومت نے اخبار ضبط کر لیا، اور ملازمت سے بھی علیحدہ کر دیا ۔ (۵۵)

یہ رولٹ کمیٹی کی غلط بیانی ہے، واقعہ وہی صحیح ہے جو حضرت مدنی کی تحریر میں ہے ۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب نے چودھری رحمت علی پنجابی قائد فرانسیسی مشن کے حوالہ سے بھی حضرت مدنی کی تائید کی ہے ۔ (۵۶) حکومت جاپان خود برطانیہ حکومت کے خلاف تھی اس لئے برطانیہ کی بالواسطہ مدد نا قابل فہم ہے ۔

فرانسیسی مشن

چودھری رحمت علی پنجابی کی زیر قیادت ایک مشن فرانس بھیجا گیا ۔ رام چندر نامی ایک تعلیم یافتہ نوجوان بھی ان کے ساتھ معاون کے طور پر تھا ۔ چودھری صاحب

---

۵۴ ۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب ۔ تحریک ریشمی رومال ۔ ص ۔ ۴۲ ۔ ۱۴۱

۵۵ ۔ رولٹ رپورٹ ۔ ص ۔ ۱۲۶

۵۶ ۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب ۔ تحریک ریشمی رومال ۔ ص ۔ ۱۴۳

خود بھی انگریزی جانتے تھے پھر بھی چار سال بعد ضرورت پڑی تو مرکز نے جاپان سے مولانا برکت اللہ بھوپالی کو پیرس جانے کا حکم دیا۔ وفد میں تین آدمی پہلے سے تھے۔ برکت اللہ صاحب اور ان کے رفیق کے آنے کے بعد پانچ ہو گئے۔ انھوں نے مزید دو سال تک کام کیا، اور انجمن "غدر پارٹی" کی طرف سے برکت اللہ صاحب نے ایک اخبار "الانقلاب" نامی جاری کیا۔ (۵۷)

امریکی مشن

ہر دیال دہلی کے باشندے اور پنجاب یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔ آکسفورڈ میں تعلیم کی تکمیل کے لئے ۱۹۰۵ء میں سرکاری وظیفہ لیکر گئے۔ وظیفہ کی آخری قسط یہ کہہ کر لوٹا دی کہ میں ہندوستان کے تعلیمی نظام سے مطمئن نہیں۔ ۱۹۰۶ء میں ہندوستان واپس آ گئے اور ۱۹۰۸ء میں لاہور میں برطانوی چیزوں کے بائیکاٹ کی مہم چلائی۔ (۵۸) انھیں کی قیادت میں چھ آدمیوں کا ایک وفد امریکہ بھیجا گیا۔ ان لوگوں نے وہاں کافی کام کیا بعد میں فرانس سے برکت اللہ صاحب اور چودھری رحمت علی صاحب بھی امریکہ پہونچ گئے۔ چودھری رحمت علی پہلے بھی فرانس سے کئی بار واشنگٹن گئے تھے امریکی مشن نے یہاں بھی "غدر پارٹی" کے نام سے ایک انجمن بنائی تھی۔ برکت اللہ صاحب کے پہونچنے کے بعد اپنے نصب العین کی اشاعت کے لئے "غدر" نامی ایک روزانہ اخبار جاری کیا۔ (۵۹)

امریکہ اور فرانس دونوں جگہ "غدر پارٹی" نامی انجمن بنی تھی، اور دونوں نے اخبار نکالا تھا رولٹ رپورٹ میں دونوں اخباروں کا نام "غدر" بتایا گیا ہے۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب نے چودھری رحمت علی سے اپنی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انھوں نے رولٹ رپورٹ کی اس بات کی تردید کی، اور فرمایا کہ امریکہ سے اخبار "غدر" نکالا تھا، اور فرانس سے "الانقلاب"۔ دونوں کے مدیر برکت اللہ صاحب تھے۔ ممکن ہے اسی بنا پر رولٹ کمیٹی کو اشتباہ ہوا ہو اور دونوں اخباروں کا نام "غدر" لکھ دیا ہو۔ (۶۰)

۵۷۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب۔ تحریک ریشمی رومال۔ ص۔ ۱۴۳

۵۸۔ مولانا عبیداللہ سندھی۔ کابل میں سات سال۔ ص۔ ۴۲

۵۹۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب۔ تحریک ریشمی رومال۔ ص۔ ۱۴۴

مولانا عبدالرحمٰن صاحب سے چودھری رحمت علی صاحب نے ایک ملاقات میں بتایا کہ ۔
"ہم نے اپنے اخراجات کی خاطر رنگوں کی تجارت شروع کی تھی ہندوستان کے بہت سے تحریک کے ممبر ہم سے رنگ منگواتے تھے اور یہاں تاجروں کو سپلائی کرتے تھے چنانچہ پشاور کے دو مسلمان اور ایک ہندو ۔ لاہور کے دو مسلمان اور پانچ ہندو ۔ دہلی کے چار مسلمان اور تین ہندو ۔ بمبئی کا ایک مسلمان اور چار ہندو ۔ کلکتہ کے چار ہندو اور دو مسلمان۔ کراچی کا ایک ہندو ۔ ڈھاکہ کے دو ہندو اور ایک مسلمان ہمارے خریدار تھے ۔ درحقیقت یہی لوگ تھے جن کے ذریعہ سے ہم مرکز (دہلی) سے ہدایات حاصل کرتے رہتے تھے، اور انہیں کے واسطے سے اپنی کارگذاری کی رپورٹ ہم مرکز کو باقاعدہ بھیجتے رہتے تھے، ورنہ ڈاک سے تو یہ کام نا ممکن تھا۔
چودھری صاحب نے مزید بتایا کہ : امریکہ میں میں نے جو رقم زمین بیچ کر ساتھ لے لی تھی اس سے ایک مکان کرایہ پر لیکر ہوٹل چلایا تھا جس کے ایک کمرہ میں پارٹی کا دفتر تھا اور ایک میں اخبار کا دفتر تھا اور یہی ہوٹل ہماری باغیانہ تحریک کا مرکز بھی تھا اور اسی سے ہم اپنے اخراجات بھی چلاتے تھے۔ میرے آنے سے پہلے یہ ہر دیال صاحب کی نگرانی میں چلتا رہا اور جب میں پیرس سے آگیا تو میری نگرانی میں چلتا رہا۔ جنگ عمومی کے دور میں جب امریکہ بھی شریک جنگ ہوگیا تو ہمیں خطرہ محسوس ہوا چنانچہ ہم نے ہوٹل بیچ دیا اور اخبار بھی بند کر دیا، اور اس رقم سے سفر خرچ بنا کر پہلے پیرس، پھر جینوا ہوتے ہوئے برلن پہونچے، پھر وہاں سے افغانستان آکر اپنے ساتھیوں سے مل گئے " (۶۱)

شیخ الہندؒ کی بصیرت

متذکرہ وفود بھیجنے کا مقصود ان ممالک کو اپنا ہمنوا اور ترکی کا مؤید بنانا تھا، چنانچہ کسی نہ کسی حد تک یہ مقصد پورا بھی ہوا ۔ ان وفود کے شیخ الہند سے تعلق پر چند باتیں پہلے بھی ہم لکھ چکے ہیں، یہاں مولانا محمد علی مرحوم کی بات نقل کر رہے ہیں جس سے شیخ الہند سے تعلق پر مزید روشنی پڑتی ہے، مولانا محمد علی نے کراچی کے مقدمہ کے دوران فرمایا تھا کہ ان وفود کے

---

۶۰ ۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب ۔ تحریک ریشمی رومال ۔ ص ۔ ۴۲ ۔ ۱۴۵
۶۱ ۔ " " " ص ۔ ۴۷ ۔ ۱۴۶

سلسلہ میں میری رائے یہ تھی کہ امریکہ ہمارا ہمنوا اور ترکی کا مؤید ہوگا لیکن حضرت شیخ الہند کی رائے تھی کہ ہمنوا تو کیا وہ غیر جانبدار بھی نہ رہیگا، چنانچہ یہی ہوا۔ جنگ عمومی میں امریکہ انگریزوں کا حمایتی بن کر سامنے آیا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اس وقت مجھے حضرت شیخ الہند کی معاملہ فہمی اور بصیرت کی قدر معلوم ہوئی۔ (۶۲)

مولانا محمد علی کے اس بیان سے شیخ الہند کی بصیرت اور دوررسی کے علاوہ ان کی کوششوں میں آپ کی شمولیت اور تعلق ظاہر ہوتا ہے، نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمد علی اور مولانا آزاد وغیرہ بھی ان مشوروں میں شریک تھے۔

امریکہ اور فرانس جو وفد گئے ان کا نتیجہ گو حکومتی سطح پر نہ نکل سکا لیکن کوششیں یکسر رائیگاں نہ گئیں، چنانچہ عوامی پیمانہ پر خاصی کامیابی ہوئی۔ جنگ عمومی کے دوران ان ملکوں کے عوام نے بار بار صدائے انصاف بلند کی۔

جنگی تیاریاں

تفصیلات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شیخ الہند نے سارا منصوبہ بہت ہی منظم طور پر بنایا تھا، اور حتی الوسع کوشش کی تھی کہ کوئی خامی نہ رہنے پائے۔ جب ترکی کو حملہ کی دعوت دی تو اس کے لئے ضروری ناکہ بندی بھی کر لی تھی۔ جنگ کے سلسلہ کی ضروری کارروائیاں، نقشۂ جنگ کی تیاری، دشمن کے رازوں سے واقفیت، خود دشمن کی فوج میں اپنے آدمی بھیج کر ان کو کمزور کرنا، یہ واضح خطوط ہیں جن پر حضرت شیخ الہند نے اپنے رفقاء کے تعاون سے کافی کام کیا تھا۔ (۶۳)

ایک اہم کام نقشۂ جنگ کی تیاری کا تھا، چنانچہ اس کے لئے آپ نے مولانا سندھی کا انتخاب کیا، اور شیخ محمد ابراہیم کو آپ کا معاون بنایا۔ یہ بمبئی کے رہنے والے ایک صالح تعلیم یافتہ جوان تھے، اقتصادیات میں ایم۔ اے تھے، فنون جنگ سے ناواقف تھے، اور نہ جنگی ذہن کے مالک تھے، اس لئے انھیں کچھ کامیابی نہ ہوئی، البتہ مولانا سندھی نے سات سال کے عرصہ میں

۶۲۔ مولانا عبدالرحمن صاحب۔ تحریک ریشمی رومال۔ ۱۷۰

۶۳۔ 〃 〃 〃

اس کام کو مکمل کر کے ایک عمدہ جنگی نقشہ تیار کیا۔ جرمنی۔ ترکی۔ ہندوستانی ممبران کا جو وفد کابل آیا تھا اس کے ہندوستانی ارکان جرمن و ترک ارکان کے سامنے اطمینان بخش نقشۂ جنگ نہ پیش کر سکے تھے، مولانا سندھی سے جب ملاقات ہوئی تو انھوں نے ان کے سامنے نقشہ پیش کیا اور چند ہی ملاقاتوں میں ان کو مطمئن کر دیا۔' (۶۴)

مولانا سندھی نے اس کام کے لئے بار بار سفر کئے تھے اس لئے انھیں پوری واقفیت تھی۔ خود تحریر فرماتے ہیں۔

"ہماری ساری عمر شمال مغربی ہند میں گذری، اور اسی ادھیڑبن میں ہر کہہ ومہہ سے ملتے رہے، ہمارے پاس بعض ایسی معلومات بھی تھیں جو کابل میں فوجی نقطۂ نظر سے بہت قیمتی سمجھی جاتی تھیں۔" (۶۵)

جنگ کے سلسلہ کی پیش بندیوں میں ایک کام سراغ رسانی کا تھا تاکہ دشمن کے ارادوں سے غافل نہ رہیں، اس کیلئے ایسے ہوشیار اور دیانت دار حریت پسندوں کی ضرورت تھی، جو بظاہر دشمن کے وفادار بن کر رہیں، لیکن ساری باتوں کی اطلاع مرکز کو دیتے رہیں، چنانچہ بہت سے ہندو اور مسلم نوجوان قائدین کے مشورے کے بعد اس محکمہ میں ملازم ہو گئے، اور سراغ رسانی کا کام انجام دیتے رہے، افسوس ہے کہ حضرت مدنی نے اس سلسلہ میں کوئی نام نہیں بتایا، نہ ہی مولانا سندھی نے کوئی نام بتایا۔ مرتب کتاب اس قدر لکھتے ہیں کہ۔

"اتنا پتہ چلتا ہے کہ اس کام کے سربراہ ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم تھے، اور انھیں کی سرپرستی میں یہ کام ہوتا رہا۔" (۶۶)

ہمیں نہیں معلوم کہ مولانا عبدالرحمٰن صاحب کے ذرائع معلومات کیا ہیں، البتہ اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر انصاری کے معتمد لوگ سی آئی ڈی میں تھے۔ حضرت شیخ الہند کے سفر حجاز کے سلسلہ میں ہم تحریر کر چکے ہیں کہ جہاز پر یہ حکم بھیجا گیا تھا کہ شیخ الہند کو گرفتار کر لیا جائے، لیکن ڈاکٹر صاحب موصوف کی کوششوں سے تار پہونچنے میں اتنی تاخیر ہوئی کہ حضرت شیخ الہند جہاز سے اتر کر روانہ ہو چکے

۶۴۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب۔ تحریک ریشمی رومال۔ ۱۴۹

۶۵۔ مولانا عبیداللہ سندھی۔ کابل میں سات سال۔ ۴۴

۶۶۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب۔ تحریک ریشمی رومال۔ ۱۵۳

تھے(۶۷) مولانا عبدالرحمٰن صاحب کے ذرائع معلومات کچھ بھی ہوں اس واقعہ سے ان کی بات کی تائید ہوجاتی ہے۔ اس لئے یہ بات قرین قیاس ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف کی نگرانی میں یہ کام ہوتا تھا۔ اس میں شریک دیگر افراد کے نام پھر بھی صیغۂ رازہی میں رہتے ہیں۔

اس سلسلہ میں تیسرا کام یہ تھا کہ دشمن کی فوج میں ایسے انقلابی افراد شامل کر دیئے جائیں جو ان کے فوجی رازوں سے انقلابی لیڈران کو باخبر رکھیں۔ نیز دشمن کی فوج میں شامل ملکی عوام کو برگشتہ کرتے رہیں۔ اس مقصد سے کچھ نوجوانوں کو منتخب کر کے فوج میں داخل کیا گیا۔ ان میں بعض لوگ بعد میں پکڑے بھی گئے۔ اور کچھ لوگوں نے اختتام جنگ کے بعد کسی نہ کسی طرح علیحدگی اختیار کرلی۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے کہ مستقل مزاجی کے ساتھ کام میں لگے رہے یہانتک کہ جنگ عظیم ثانی میں کچھ دوسرے افراد کو بھی اپنا ہمنوا بنالیا، اور آزاد فوج کی شکل میں ظاہر ہوئے۔ (۶۸)

حضرت مدنی نے اس سلسلہ میں کوئی تفصیل نہیں بیان فرمائی کہ وہ کون لوگ تھے جنھوں نے سر ہتھیلی پر لیکر یہ خدمت انجام دی۔ مرتب کتاب کے اضافہ سے یہاں ہلکی سی روشنی پڑتی ہے۔ انھوں نے اس کام میں شریک کسی بزرگ سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے، اور ان سے سنی ہوئی باتیں نقل فرمائی ہیں۔ مرتب کتاب کو ان بزرگ سے شکوہ ہے کہ وہ پرانی باتیں بتانے میں اب بھی بخل سے کام لیتے ہیں، لیکن خود ان کے بخل کو کیا کہیئے کہ ان صاحب کا نام تک نہیں بتایا، جن صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں کہ۔

" وہ حضرت سندھی سے بیعت ہیں، اور چھ سال تک انگریزی فوج میں ایک جتھے کی قیادت ان کے ہاتھ میں رہی۔ انھوں نے بتایا کہ پنجاب کے انیس نوجوانوں کا ایک جتھہ میری قیادت میں حضرت سندھی کے حکم سے انگریزی فوج میں بھرتی ہوا۔ ہم فوج میں نہایت احتیاط سے اپنی تبلیغ کرتے تھے، پہلے تین ماہ کام کے خفیہ رکھنے اور بتدریج اپنے مشن کو چلانے اور دوسری اہم باتوں کی مشق کرائی گئی۔ کل تربیت پانے والے اسّی آدمی تھے لیکن تین ماہ کا تربیتی کورس

۶۷۔ مولانا سید حسین احمد صاحب۔ نقش حیات دوم۔ ص۔ ۲۱۳

۶۸۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب۔ تحریک ریشمی رومال۔ ص۔ ۱۵۳

پورا کرنے کے بعد جب امتحان ہوا تو صرف انیس آدمی پاس ہوئے، فیل ہونے والوں کو دوسرے آسان کاموں پر لگا دیا گیا۔ کورس پاس کرنے کے بعد ہم دیوبند گئے تھے وہاں حضرت شیخ الہند سے ملاقات ہوئی۔ ہم میں صرف چھ مسلمان تھے باقی تین سکھ اور سب ہندو۔ ہم سب ایک ساتھ کھانا کھاتے۔ مسلمان ممبر سور اور جھٹکہ نہیں کھاتے تھے، مگر ہندو ممبر بڑا گوشت کھا لیتے تھے۔ دیوبند میں ہمارا کھانا دو مسلمان ملازم تیار کرتے تھے، وہاں ہم حضرت شیخ الہند کے مکان سے متصل ایک مکان میں ٹھہرے تھے، جس پر "مہمان خانہ دار العلوم" کا بورڈ آویزاں تھا ہم جب کھانا کھاتے حضرت شیخ الہند ہمارے درمیان گھومتے رہتے یہ غلط ہے کہ مولانا محمد علی اور مولانا سندھی نے دیوبند میں ہمارا امتحان لیا۔ ہمارا امتحان مولانا سندھی، پنڈت بولی اور متھرا سنگھ نے پنجاب میں لیا تھا، اس کے بعد ہم دیوبند گئے تھے۔ یہ بھی غلط ہے کہ حضرت شیخ الہند نے ہمارے لئے صرف دعا فرمائی تھی، ہمارے سربراہ وہ تینوں حضرات تھے جنھوں نے ہمارا امتحان لیا تھا۔ دیوبند سے ہم دہلی گئے جہاں گاندھی جی۔ پنڈت موتی لال نہرو۔ ابو الکلام آزاد۔ مولانا محمد علی جوہر اور ڈاکٹر انصاری سے ملاقات ہوئی۔ وہیں بنگال کے ایک نوجوان رام کشن سے بھی ملاقات ہوئی، گفتگو سے معلوم ہوا کہ وہ بھی ہماری طرح تربیتی کورس پاس کر کے چاٹگام سے آیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ہم صرف اس قدر کامیاب ہوئے کہ بعض سنجیدہ فوجیوں کو جذبۂ حب الوطنی سے متاثر کر سکے، اور سرحد میں جب حاجی ترنگ زئی صاحب نے جنگ شروع کی تو بعض اہم معاملات کی خفیہ اطلاع ان تک پہونچاتے رہے، جس سے ان کو زبردست فائدہ پہونچا، جب ہم صوبہ سرحد سے چلے آئے تو انھیں نقصان اٹھانا پڑا۔" (۶۹)

مذکورہ بیان میں چاٹگام سے کسی ہندو نوجوان کے آنے کا ذکر ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صرف پنجاب میں یہ کام نہ ہوا بلکہ ملک کے دوسرے حصوں میں بھی تربیتی سینٹر قائم کئے گئے تھے۔

* * *

۶۹۔ مولانا عبد الرحمٰن صاحب۔ تحریک ریشمی رومال۔ ۵۵۔ ۱۵۴

حملہ کرنے کے راستوں کا تعین

حملہ اگرچہ ترکی حکومت کو کرنا تھا لیکن راستے میں ایران وافغانستان پڑتے تھے۔ ایران خود برطانیہ کے زیر نگیں تھا، اس سے راستہ دینے کی توقع نہ تھی۔ افغانستان بھی اگرچہ انگریزوں کے زیر اثر تھا، لیکن غیور افغانی عوام وخواص سب کے دل میں بغاوت کے حوصلے اور ولولے تھے، اس لئے وہاں کامیابی کی پوری توقع تھی چنانچہ وہاں بہت کامیابی ہوئی۔ امیر حبیب اللہ خاں اگرچہ خود انگریزوں کے ہم نوا اور کمزور طبیعت کے آدمی تھے۔ اپنے ملک کو جنگ کا مرکز بنا دینے کے روادار نہ تھے لیکن جب انھوں نے جرگہ بلایا، تو تمام سردار اور افسر یہاں تک کہ نصر اللہ خاں اور امان اللہ خاں نے بھی جنگ پر آمادگی اور طوق غلامی اتار پھینکنے کے عزم کا اظہار کیا۔ صرف امیر صاحب اور سردار عنایت اللہ کی مصلحت بینی جنگ سے مانع تھی جنگ کیلئے عمومی آمادگی دیکھ کر امیر صاحب نے درمیانی راہ یہ تجویز کی کہ بعض متعین پہاڑی علاقوں سے گذر کر ترکی فوج حملہ کر دے، ہم انگریزوں سے یہ کہدیں گے کہ یہ قبائل باغی ہو گئے ہیں، مگر سرکاری فوج کوئی حصہ نہ لے گی البتہ عوام کو اختیار ہے کہ رضا کارانہ طور پر جانی ومالی خدمت انجام دیں۔ حملہ کے لئے ان چار راستوں کا تعین کیا گیا۔

۱۔ قلات ومکران کے قبائل ترکی فوج کی قیادت میں کراچی پر حملہ کریں۔
۲۔ کوئٹہ کے محاذ پر غزنی وقندہار کے قبائل ترکی فوج کی قیادت میں حملہ کریں۔
۳۔ پشاور کے محاذ پر درۂ خیبر سے مہمند ومسعودی قبائل کو لیکر ترکی فوج حملہ کرے۔
۴۔ اوگی کے محاذ پر کوہستانی قبائل ترکی فوج کی معیت میں حملہ کریں۔

ان چاروں محاذوں پر ایک ایک آدمی کام کے لئے متعین تھا۔ چنانچہ قلات کے محاذ ۔ مولانا محمد صادق صاحب کراچوی۔ کوئٹہ کے محاذ پر حافظ تاج محمود صاحب سندھی۔ درۂ خیبر کے محاذ پر حاجی صاحب ترنگ زئی۔ اوگی کے محاذ پر مولانا محمد اسحاق صاحب کام کر رہے تھے۔ ان کے علاوہ پنڈت لوئی صاحب نیپال میں کام کر رہے تھے، کہ روس اگر ساتھ دے تو نیپالی قبائل کو لیکر نیپال کے محاذ سے بھی حملہ کیا جائے۔ (۷۰)

۷۰۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب۔ تحریک ریشمی رومال۔ ص۔ ۷۵۔ ۱۷۳

اندرون ملک مراکز بغاوت

ترکی کے بیرونی حملہ کے علاوہ چونکہ اندرون ملک بغاوت کا منصوبہ تھا اس لئے متعدد مراکز بغاوت قائم کئے گئے جن کا مقصد یہ تھا کہ عوامی ذہن بغاوت کے لئے تیار کرتے رہیں، اور رضاکاروں کی جماعت تیار کرلیں کہ وقت مقررہ پر بغاوت کرادی جائے۔ حضرت مدنی علیہ الرحمۃ نے اس کام کے لئے حسب ذیل تفصیل کے ساتھ ایک ہیڈ کوارٹر اور آٹھ ذیلی مراکز کا تذکرہ کیا ہے۔

ہیڈ کوارٹر :- دہلی میں تھا جس میں حضرت شیخ الہند۔ مولانا محمد علی۔ مولانا شوکت علی۔ مولانا آزاد۔ مولانا سندھی۔ گاندھی جی۔ ڈاکٹر انصاری۔ پنڈت موتی لال۔ لالہ لاجپت رائے اور راجندر پرشاد کام کرتے۔ انھیں کی ہدایات پر ذیلی مراکز میں کام ہوتا تھا۔

ذیلی مراکز کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ **راندیر :-** یہ سورت، گجرات، بمبئی کا مرکز تھا۔ یہاں مولانا ابراہیم کاوی۔ احمد بزرگ۔ یونس پٹیل وغیرہ کام کرتے تھے ان میں مولانا ابراہیم صاحب امیر تھے۔

۲۔ **پانی پت :-** یہ اضلاع یوپی کا مرکز تھا جہاں مولانا احمد اللہ پانی پتی کی سرپرستی میں کام ہوتا تھا۔

۳۔ **لاہور :-** یہ پنجاب کا مرکز تھا یہاں مولانا محمد احمد صاحب چکوالی امیر تھے۔

۴۔ **دین پور :-** یہ ریاست بھاول پور کا مرکز تھا۔ مولانا ابوالسراج غلام محمد صاحب سجادہ نشین اس مرکز کے امیر تھے۔ تین سال تک قید رہے لیکن کوئی راز نہ ظاہر کیا۔

۵۔ **امروٹ :-** یہ صوبہ سندھ و بلوچستان کا مرکز تھا۔ مولانا تاج محمود صاحب سجادہ نشین یہاں کے امیر تھے۔ چار سال تک قید رہے لیکن مضبوطی سے جمے رہے۔

۶۔ **کراچی :-** شہر کراچی اور قلات و لس بیلا وغیرہ کا مرکز تھا۔ یہاں مولانا محمد صادق صاحب امیر تھے۔ انھوں نے لس بیلا میں زبردست بغاوت کرائی اور انگریزوں کو بہت نقصان پہونچایا۔ آخرکار گرفتار ہو گئے، ایک سال قید اور تین سال ملک بدر رہے، لیکن کمزوری نہ دکھائی۔

۷۔ **اتمان زئی**:۔ صوبہ سرحد شمالی کا مرکز تھا۔خان عبدالغفار خاں اس کے امیر تھے۔انھوں نے بھی بہت کام کیا اور گرفتار ہوئے،مگر ادنیٰ کمزوری نہ دکھائی۔

۸۔ **ترنگ زئی**:۔ آزاد قبائل کا مرکز تھا،مولانا فضل واحد صاحب یہاں کے امیر تھے۔چار سال تک انگریزوں سے لڑے۔ (۷۱)

حضرت مدنی نے انھیں آٹھ مراکز کا ذکر کیا ہے،البتہ مولانا عبدالرحمٰن صاحب نے دو اور مرکز بتائے ہیں،اس طرح کل دس مرکز ہو جاتے ہیں،لیکن یہ تعداد بھی آخری نہیں کہی جا سکتی۔مولانا عبدالرحمٰن صاحب لکھتے ہیں۔

"حضرت مدنی نے صرف آٹھ مراکز کا ذکر کیا ہے۔تعجب ہے کہ بنگال اور آسام کا ذکر تک نہیں کیا،حالانکہ یہاں حضرت شیخ الہند کے لاکھوں مرید تھے،اور یہاں کے لوگوں نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا،خود بنگال کے کئی قائد بیرونی مراکز میں کام کرتے رہے تھے،اور یہاں سے مالی امداد بھی کارکنوں کو زیادہ ملتی تھی۔غالباً حضرت کو یہاں کے مراکز کی تفصیل کا علم نہ ہو۔پھر شمال مغربی سرحد کے قبائل نے بڑھ کر حصہ لیا،لیکن ان کا بھی ذکر نہیں۔" (۷۲)

مولانا عبدالرحمٰن صاحب نے اپنے ایک بنگالی شاگرد کا تذکرہ کیا ہے،جس سے بنگال کے مرکز ہونے پر ہلکی سی روشنی پڑتی ہے۔مولانا موصوف کے شاگرد نے اپنے والد مولانا ریاض احمد صاحب کا تذکرہ کیا اور مولانا کی فرمائش پر اپنے والد کے نام حضرت شیخ الہند کے لکھے ہوئے چھ خطوط منگا کر مولانا کو دیئے،جس سے معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہند نے ان کے ذمہ کئی اہم امور کئے تھے،اور ان کے متعلق سخت تاکید فرمائی تھی۔ (۷۳)

طالب علم مذکور نے اپنے والد مولانا ریاض احمد صاحب کے زیر مطالعہ "حجۃ اللہ البالغہ" کا ایک نسخہ بھی منگا کر دیا تھا،جس پر ان کے کچھ نوٹس تھے۔انھیں نوٹس سے معلوم ہوا کہ آپ گرفتار ہو کر چھ سال تک جیل میں رہے،اس مدت میں کتاب آپ کے مطالعہ میں

۷۱۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب۔تحریک ریشمی رومال۔ص۔ ۶۱۔ ۱۶۰

۷۲۔ " " " ۔ص۔ ۶۲۔ ۱۶۱

۷۳۔ " " " ۔ص۔ ۱۶۲

رہی۔ اس پر گرفتاری اور رہائی کی تاریخیں بھی درج تھیں، اسی میں ایک جگہ ایک تحریر بطور وصیت لکھی تھی کہ۔

"۱۹ رفروری ۱۹۱۷ء کے دن کو یاد رکھو، اس تاریخ کو اگر میں لاپتہ ہو جاؤں یا کوئی حادثہ پیش آجائے تو میری زندگی کی امید نہ رکھنا اور میری بیوی کو نکاح کی اجازت ہوگی۔ اس کے بعد کئی سطریں میراث کی تقسیم کے سلسلہ میں لکھنے کے بعد ہے کہ۔ عوام کو اطلاع دیجاتی ہے کہ جب یہ تاریخ آجائے تو حکم امیر کا انتظار کریں، بغیر حکم کے کوئی توڑ پھوڑ دنگا فساد نہ کریں کیوں کہ اللہ تعالیٰ فساد پسند نہیں کرتا، اور اگر حکم امیر کسی قربانی کے لئے مل جائے تو اس میں دریغ نہ کریں۔" (۷۴)

مولانا عبدالرحمٰن صاحب اس تحریر کو نقل کر کے لکھتے ہیں۔

"اس تحریر سے پوری بات جو معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ یقیناً ڈھاکہ مرکز کے امیر تھے، اور یہ نوٹ وصیت تھی اور مذکورہ تاریخ انقلاب ریشمی رومال کی تاریخ تھی۔ اور آپ کو ۱۹۱۴ء کے اوائل میں اس کا علم ہو چکا تھا۔ ریشمی رومال میں بغاوت اور بیرونی حملہ کی تاریخ ۱۹ رفروری ۱۹۱۵ء مقرر کی گئی تھی، اس تاریخ کا تعین دہلی مرکز نے حضرت شیخ الہند کی روانگی حج سے پہلے آپ کی موجودگی میں کر دیا تھا اور ہر برانچ کو اطلاع دیدی تھی لیکن حکم ثانی کا انتظار بھی لازمی قرار دیا تھا۔" (۷۵)

مندرجہ بالا تحریر میں سن کے تعین میں یا تو مولانا سے غلطی ہوئی ہے یا پھر کتابت کی غلطی ہو۔ کیوں کہ حضرت شیخ الہند ۱۸ ستمبر ۱۹۱۵ء کو حجاز کے لئے روانہ ہوئے پھر ۱۹ ر فروری ۱۹۱۵ء کو مقررہ تاریخ انقلاب کیوں کر تسلیم کیا جا سکتا ہے، اس لئے صحیح یہ ہے کہ یہ ۱۹ رفروری ۱۹۱۷ء ہے۔

بنگال کے علاوہ مولانا عبدالرحمٰن صاحب نے ایک مرکز اوگی ضلع ہزارہ بتایا ہے۔ شمالی کوہستانی قبائل نے اسمیں بڑا حصہ لیا، جب تحریک ناکام ہوگئی تو ان لوگوں نے از خود جہاد شروع کر دیا، اور انگریزوں کو کافی پریشان کیا۔ مولانا موصوف نے اپنے

۷۴۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب۔ تحریک ریشمی رومال۔ ص۔ ۱۶۳

۷۵۔ " " " ص۔ ۱۶۴

ایک عالم دوست (جو خود اس مرکز سے وابستہ تھے) سے ملاقات کے بعد ان سے سنی ہوئی کچھ باتیں لکھی ہیں۔ ذیل میں ہم اختصار کے ساتھ ان کی باتیں تحریر کر رہے ہیں۔

"اس مرکز (ادگی) کے تحت سیاہ کوہ۔ نندہاڑ۔ الائی۔ کوہستان صغیر۔ کوہستان کبیر۔ دلیشیان کے قبائل میں باقاعدہ جہاد کی تبلیغ ہوتی تھی یہ غلط ہے کہ مرکز کے امیر مولانا محمد اسحاق صاحب مانسہری تھے۔ وہ صرف مرکز (دہلی) سے ہدایات لینے کا ذریعہ تھے۔ مقامی مرکزی امارت تین علماء کی کونسل کے پاس تھی، اور یہی حضرات مقامی مرکزی طاقت اور مرکز کی امیر تھے، ان میں ایک مولانا محمد اسحاق صاحب بھی تھے۔ جب مرکزی لیڈر گرفتار کر لئے گئے تو مقامی کونسل نے جہاد کا حکم دیدیا اور فیصلہ یہ ہوا کہ مولانا اسحاق صاحب بظاہر غیر متعلق رہ کر انگریزی علاقہ سے رضاکاروں اور مالی امداد کی فراہمی کا کام کریں۔ چنانچہ انگریزی علاقہ سے جانی اور مالی دونوں امداد بہم پہونچتی رہی، اسلحہ کی امداد محمود شاہ صاحب ڈوگے والے نے بہت کی۔ موقع پاکر انگریزی فوجوں پر حملہ کر کے ان سے ہتھیار چھین کر محاذ جہاد پر پہونچا دیتے۔ اس کی پاداش میں انگریزوں نے ۱۹۲۲ء میں گورا فوج کے محاصرہ سے محمود شاہ کو ان کے مکان میں شہید کر دیا۔ ہم اکثر شبخون مارا کرتے تھے، اور اس میں ہمیں کامیابی ہوتی تھی۔ ہمارے رضاکار اپنے گھروں سے تین تین چار چار دن کا کھانا۔ کچی رسد اور بعض دفعہ پکی ہوئی روٹیاں ساتھ لیکر محاذ پر آتے، رسد ختم ہو جاتی تو پھر اپنے گھروں کو لوٹ جاتے اور اس دور میں دوسرا قبیلہ آجاتا۔ اس طرح دو سال تک ٹکر لی گئی"۔ (۷۶)

مولانا عبدالرحمٰن صاحب کے اضافہ سے دس معلوم مرکزوں کی نشاندہی ہو جاتی ہے۔ بنگال کے متعلق رولٹ رپورٹ میں مذکور ہے کہ جنوری ۱۹۱۷ء میں مسلمانوں کی ایک جماعت مجاہدین میں شامل ہو گئی تھی اور مارچ ۱۹۱۷ء میں دو بنگالی مسلمان آٹھ ہزار روپئے کے ساتھ پکڑے گئے تھے، جیسے وہ مجاہدین تک پہونچانا چاہتے تھے۔ (۷۷)

اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بنگال میں کام ہو رہا تھا اور وہاں مرکز قائم تھا، البتہ متعین طور پر یہ بتانا مشکل ہے کہ مرکز کس جگہ قائم تھا اور اس کے کام میں کون لوگ شریک

۷۶۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب۔ تحریک ریشمی رومال۔ ص۔ ۶۴۔ ۱۶۵

۷۷۔ رولٹ رپورٹ ص۔ ۱۴۲

سکتے ہیں جن مراکز کی تعداد وغیرہ معلوم ہے ان کے علاوہ معلوم نہیں کتنے ہوں گے جن سے واقفیت کا بظاہر کوئی ذریعہ نہیں ۔

بیرون ملک امدادی مراکز

اندرون ملک بغاوت کے مراکز کے علاوہ ان کی امداد اور تائید وحمایت کی غرض سے بیرون ملک بھی مختلف مرکز بنائے گئے تھے ۔ رولٹ رپورٹ میں مدینہ منورہ کو ہیڈ کوارٹر بتایا گیا ہے ۔ (۷۸) لیکن حضرت مدنی نے اس کی تردید کرتے ہوئے کابل (افغانستان) کو ہیڈ کوارٹر بتایا ہے جہاں راجہ مہندر پرتاب اور مولانا سندھی نے کام کیا ۔ حضرت مدنی کی متذکرہ تفصیل کے مطابق اس کی پانچ برانچیں تھیں ، مدینہ منورہ ۔ استنبول ۔ قسطنطنیہ ۔ انقرہ ۔ برلن ۔

حضرت مدنی تحریر فرماتے ہیں ۔

" ان مقامات میں مختلف حضرات کام کرتے رہے ، خصوصاً برلن میں ہردیال صاحب نے نمایاں کارنامے انجام دیئے ، ان کی کوششوں سے جرمنی ترکی اتحاد عمل میں آیا اور جرمنی حکومت ہندوستانیوں کی مدد کیلئے آمادہ ہوئی ۔ کابل کے ہیڈ کوارٹر کو تو ایسی غیر معمولی کامیابی ہوئی کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے ۔ حبیب اللہ خاں جب رؤسائے افغانستان کا جرگہ بلاتے ہیں کہ انگریزوں سے لڑا جائے یا نہیں تو حبیب اللہ خاں اور ان کے لڑکے عنایت اللہ خاں کے علاوہ سب نے یک زبان ہو کر جنگ کی رائے دی ۔ خود افغانستان کی آزادی میں کابل ہیڈ کوارٹر کا بہت بڑا ہاتھ ہے ۔ " (۷۹)

برلن میں حریت پسندوں کا اجتماع

مولانا سندھی اپنے سفرنامہ میں تحریر کرتے ہیں ۔ " حرب عمومی کے شروع ہونے پر جس قدر آزادی خواہ ہندوستانی یورپ میں موجود تھے وہ سب برلن میں جمع ہو گئے

---

۷۸ ۔ . . . . رولٹ رپورٹ ۔ ص ۔ ۱۲۷

۷۹ ۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب ۔ تحریک ریشمی رومال ۔ ص ۔ ۷۹ ۔ ۱۶۷

تھے اور انھوں نے جرمن دفتر خارجہ کے ماتحت ایک انڈین نیشنل پارٹی قائم کی تھی، ہردیال اور مولوی برکت اللہ صاحب وغیرہ اس میں شامل تھے"۔ (۸۰)

انھیں حریت پسندوں میں راجہ مہندر پرتاب بھی تھے جن کے متعلق رولٹ رپورٹ میں مذکور ہے کہ ۔

"یہ شخص ایک معزز خاندان کا جوشیلا ہندو ہے ۱۹۱۴ء کے آخر میں اسے اٹلی، سوئٹزرلینڈ اور فرانس جانے کا پاسپورٹ دیا گیا، یہ سیدھا جنیوا چلا گیا اور وہاں بدنام زمانہ ہردیال سے ملا۔ ہردیال نے اسے جرمن قونصل سے ملایا وہاں سے یہ برلن آگیا جہاں اسے خاص مقصد کے لئے بھیجا گیا تھا"۔ (۸۱)

ان لوگوں نے برلن کے زمانہ قیام میں کافی کام کیا، اور عوامی سطح سے گذر کر حکومتی پیمانہ پر بھی انھیں وہاں کامیابی ہوئی۔ اس اعتبار سے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ سب سے زیادہ کامیابی اسی مشن کو ہوئی۔ حضرت مدنی تحریر فرماتے ہیں ۔

"برلن میں مہندر پرتاب نے مسلسل تین سال رہ کر اس کام کو سرانجام دیا، ہردیال اور مولانا برکت اللہ صاحب بھی ان کی امداد کرتے رہے اور آخر جرمنی ترکی اتحاد عمل میں آیا"۔ (۸۲)

جرمنی، ترکی اور ہندوستانی وفد افغانستان میں

انڈین نیشنل پارٹی کے تحت ان لوگوں نے برلن میں اتنا کام کر لیا کہ جرمنی ترکی کی تائید وحمایت کے لئے تیار ہو گیا۔ چنانچہ راجہ مہندر پرتاب، مولوی برکت اللہ اور دوسرے جرمن افسران برلن سے ترکی آئے اور انور پاشا و سلطان ترکی سے طویل ملاقاتیں کیں۔ ان ملاقاتوں کے بعد ایک وفد افغانستان کے لئے روانہ ہوا جس میں راجہ مہندر پرتاب و مولانا برکت اللہ۔ ڈاکٹر فان ہنٹنگ، کیپٹن ہینڈ و نیز کیپٹن قاسم بے شامل تھے۔ (۸۳)

۸۰۔ مولانا عبید اللہ سندھی۔ کابل میں سات سال۔ ص۔ ۴۲

۸۱۔ رولٹ رپورٹ۔ ص۔ ۱۲۶

۸۲۔ مولانا عبدالرحمن صاحب۔ تحریک ریشمی رومال۔ ص۔ ۱۷۱

تذکرہ شیخ الہند کے مصنف نے بھی نام بتائے ہیں لیکن حضرت مدنی نے ایک اور نام بتایا ہے، لکھتے ہیں ۔

"کیپٹن ہنٹش جو جرمنی حکومت میں اثر در سوخ کے مالک تھے انھوں نے اس اتحاد میں ہندوستانی مشن کی بڑی مدد کی اور آخر خود بہ نفس نفیس ہندوستان پر حملہ کی تیاری کے سلسلہ میں کابل تشریف لائے اور یہاں بڑے خلوص سے کام کیا" (۸۴)

یہ وفد سلطان ترکی ۔ قیصر جرمنی اور جرمن چانسلر کے خاص خطوط لے کر افغانستان کے لئے روانہ ہوا، ہرات پہونچنے پر افغان گورنر نے وفد کا شاندار استقبال کیا، ہرات میں ایک دو روز قیام کے بعد وفد فوجی افسروں کی رہنمائی میں کابل آگیا جہاں بابر باغ کے شاہی مہمان خانے میں اسے ٹھہرایا گیا ۔ (۸۵) یہ وفد مولانا سندھی کے کابل پہونچنے سے پہلے پہونچ گیا تھا ۔ وفد ۲؍اکتوبر ۱۹۱۵ء کو پہونچا اور مولانا سندھی ۱۵؍اکتوبر کو پہونچے (۸۶)

وفد کی امیر سے ملاقات

وفد کے ٹھہرنے کے لئے گو بہت اچھا انتظام کیا گیا تھا اور ہر طرح کی سہولیتں بہم پہونچائی جاتی تھیں، مگر عجیب بات ہے کہ بابر باغ سے باہر جانے کی اجازت نہ تھی ۔ وفد اپنے پروگرام کے تحت آیا تھا ضیافت شاہی سے لطف اندوز ہونے کے لئے نہیں چنانچہ دو ماہ اسی طرح گذر جانے کے بعد راجہ مہندر پرتاب کے احتجاج پر شاہ افغانستان امیر حبیب اللہ خاں سے ارکان وفد کی ملاقات کا انتظام کیا گیا ۔ انقلابی وفد کی قیادت راجہ صاحب نے کی ۔ انھوں نے قیصر ولیم اور سلطان ترکی کے خطوط امیر کی خدمت میں پیش کئے ۔ پھر ڈاکٹر فان ہنٹنگ نے جرمن چانسلر کا خط پیش کیا ۔ امیر نے اپنے اطمینان کی خاطر وفد سے بعض باتیں پوچھیں

---

۸۳ ۔ مفتی عزیز الرحمٰن صاحب بجنوری ۔ تذکرہ شیخ الہند ۔ ص ۔ ۲۱۴
۸۴ ۔ مولانا عبد الرحمٰن صاحب تحریک ریشمی رومال ۔ ص ۔ ۱۷۱
۸۵ ۔ مفتی عزیز الرحمٰن صاحب بجنوری ۔ تذکرہ شیخ الہند ۔ ص ۔ ۲۱۵
۸۶ ۔ مولانا عبید اللہ سندھی صاحب ۔ کابل میں سات سال ۔ ص ۔ ۴۳

اور جرمن و ترکی حکومتوں کے متعلق دریافت کیا کہ اور مجوزہ منصوبہ کی شکل میں جرمنی اور ترکی حکومتیں افغانستان کی کیا مدد کریں گی؟ کیپٹن ہینڈ ونیز اور قاسم بے فارسی جانتے تھے اس لئے وہ لوگ بھی گفتگو میں حصہ لیتے رہے۔ دوپہر تک گفتگو کا یہ سلسلہ جاری رہا شاہ نے دوپہر کا کھانا ساتھ کھایا راجہ صاحب کے لئے ہندوانہ کھانے کا علیحدہ نظم کیا گیا تھا لیکن راجہ صاحب نے اسے چھوڑ کر دوسرے ساتھیوں کے ساتھ شاہی دسترخوان پر کھایا۔ (۸۷)

پہلی اجتماعی ملاقات کے بعد امیر نے ارکان وفد کو الگ الگ ملاقات کیلئے بلایا۔ چنانچہ پہلے دن راجہ مہندر پرتاب اور مولانا برکت اللہ بلائے گئے۔ تین ساڑھے تین گھنٹے تک ان لوگوں سے شاہ نے گفتگو کی جس میں دیگر مسائل کے علاوہ حکومت مؤقتہ کے قیام پر بھی بات ہوئی۔ دوسرے دن جرمن ارکان فان ہنٹنگ اور فان ہینڈ و نیز نے شاہ سے ملاقات کی اور ان کو یقین دلایا کہ افغانستان میں بننے والی متوازن انڈین گورنمنٹ کو جرمنی حکومت تسلیم کرے گی نیز اسلحہ و سرمایہ سے اس کی مدد کرے گی اور اگر اس صورت میں ہندوستان کی برطانوی حکومت نے افغانستان پر حملہ کیا تو جرمنی اور ترکی دونوں افغانستان کا ساتھ دیں گے۔ تیسرے دن ترک نمائندے قاسم بے نے شاہ سے ملاقات کی اور ہر طرح کے تعاون کا یقین دلایا۔ اس کے بعد حکومت افغانستان کی طرف سے قاضی عبدالرزاق خاں کو وفد کا مشیر اعلیٰ بنا دیا گیا۔ اس کے بعد سے انقلابی وفد کے تمام اجلاس قاضی صاحب موصوف کے دولت کدہ پر ہوتے تھے۔ (۸۸)

لاہور سے بھاگے ہوئے طلبہ

اوائل ۱۹۱۵ء میں کچھ طلبا فرار ہو کر افغانستان پہونچے تھے ان کا تذکرہ مختلف کتابوں میں ملتا ہے مولانا سندھی نے ضمناً ان کا تذکرہ کیا ہے، دوسری کتابوں میں بھی ان کے کچھ واقعات مل جاتے ہیں۔ مؤلف تذکرہ شیخ الہند کی تحریر سے اس سلسلہ میں بعض غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ یہاں تذکرہ کر کے ان کا ازالہ کر دیا جائے وہ

۸۷۔ مفتی عزیزالرحمٰن صاحب بجنوری۔ تذکرہ شیخ الہند۔ ص۔ ۱۶ - ۲۱۵

۸۸۔ 〃 〃 ۔ص۔ ۱۸ - ۲۱۷

لکھتے ہیں۔

"بہت سے آزادی پسند ہندو، سکھ، اور مسلمان طالب علم اور قومی کارکن ہندوستان سے بھاگ کر افغانستان پہونچ چکے تھے ان میں اجیت سنگھ، عبیداللہ سندھی، محمد علی وغیرہ شامل تھے، افغان حکومت نے ان سب کو قید کر رکھا تھا انقلابی وفد کو جب اس کی اطلاع ملی تو مولانا برکت اللہ اور راجہ مہندر پرتاپ نے افغان حکومت سے ان نوجوانوں کی رہائی کا مطالبہ کیا راجہ مہندر پرتاپ اور مولانا برکت اللہ کے شہزادہ امان اللہ خاں اور شہزادہ عنایت اللہ خاں ولی عہد سلطنت سے نہایت گہرے تعلقات تھے چنانچہ ان کی کوششوں سے مولانا عبیداللہ سندھی اور دوسرے تمام ہندوستانیوں کو رہا کر دیا گیا، یہ سب لوگ انقلابی وفد کی قیام گاہ پر ہی آگئے اور اب بڑی سنجیدگی سے ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے سرگرمیوں کا آغاز کرنے پر غور ہونے لگا" (۸۹)

معلوم نہیں مفتی صاحب نے کن ذرائع معلومات کی بنیاد پر ایسی بے سروپا باتیں لکھیں ہیں، یہ صحیح ہے کہ لاہور سے کچھ طلبار بھاگ کر افغانستان پہونچے تھے لیکن مفتی صاحب کے متذکرہ افراد میں سے کوئی ان میں نہ تھا "ہندو۔ سکھ۔ مسلمان" معلوم نہیں کس طرح انھوں نے لکھا ہے۔ شعری وزن کی رعایت کبھی نہیں معلوم ہوئی یوں ممکن ہے اسی رعایت کے خیال سے لکھ گئے ہوں، مولانا سندھی کا طلبار کے وفد سے اس وقت تک کوئی تعلق نہ تھا ان کے افغانستان جانے کی بنیاد اور مصالح کچھ اور تھیں اور ان طلبا کے ہندوستان چھوڑنے کا سبب کچھ اور، پھر مولانا سندھی، ان کی روانگی کے آٹھ ماہ بعد کابل پہونچے۔ مولانا سندھی کی اس وقت گرفتاری کی بات بھی صحیح نہیں۔ راجہ مہندر پرتاپ اور مولانا برکت اللہ صاحب کے شہزادگان افغانستان کے ساتھ جن "گہرے تعلقات" کو دکھایا گیا ہے وہ بھی محض بے بنیاد ہے۔ پھر شہزادہ عنایت اللہ تو بنیادی طور پر ان کے مشن ہی کے خلاف تھا۔ راجہ صاحب مولانا سندھی کیلئے سہولت کا ذریعہ کیا بنتے یہاں مولانا سندھی ضرور ان کیلئے کچھ سہولتیں پیدا کر سکے ہندوستانی طلبار کو بھی مولانا سندھی کیوجہ سے کچھ مراعات حاصل ہوئیں۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ صحیح رہنمائی ظفر حسن ایبک صاحب کی "آپ

---

۸۹ مفتی عزیز الرحمٰن صاحب بجنوری۔ تذکرہ شیخ الہند ص۔ ۲۱۷

بیتی" کرتی ہے کیوں کہ ظفر صاحب خود طلبار کی اس جماعت میں شریک تھے جو افغانستان پہونچی تھی۔ افغانستان میں مولانا سندھی کے کام میں یہ طلبار ان کے معاون تھے جس کا تذکرہ مولانا سندھی نے جابجا کیا ہے اس لئے ہم ان کے ہندوستان چھوڑ کر کابل پہونچنے پر کسی قدر تفصیل سے روشنی ڈالیں گے۔ رولٹ رپورٹ میں ان کا تذکرہ اس طرح ہے۔

" فروری ۱۹۱۵ء میں پندرہ لاہور کے طلبار اپنے کالجوں کو چھوڑ کر مجاہدین میں شامل ہو گئے تھے جہاں شروع میں ان کو سخت قید میں رکھا گیا اور بعد میں ان کو کچھ آزادی حراست میں دیدی گئی۔ دو ان میں سے ہندوستان واپس آ گئے تھے جن کو روسیوں نے پکڑ کر انگریزی افسران کو دیدیا تھا انھوں نے معافی مانگ لی اور ان کو مشروط معافی دے دی گئی ان پندرہ طلبار کو خراج تحسین ادا کرنے کیلئے "مہاجرین" کا خطاب دیا گیا۔ (۹۰)

ظفر حسن ایبک کی آپ بیتی کے مطالعہ کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۱۲ء میں بلسقان کی جنگ کے زمانہ سے طلبار میں قومی جذبات اور اسلامی احساسات تیزی سے نشونما پا رہے تھے۔ چنانچہ اس کا اولین مظہر گورنمنٹ کالج میں آگ لگانے کی صورت میں سامنے آیا۔ ظفر صاحب نے گو یہاں سن نہیں تحریر کیا ہے لیکن بین السطور سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ غالباً ۱۹۱۳ء کا واقعہ ہے۔ انگریزوں سے انتقام کی خاطر خوشی محمد۔ شجاع اللہ اور ان کے چند دوستوں نے مل کر کالج کے آفس میں آگ لگادی۔ یہ ناتجربہ کاروں کی پہلی مہم تھی، آگ اچھی طرح لگانے میں تو کامیاب نہ ہو سکے، ہاں اپنے آپ کو بچانے میں ضرور کامیاب ہو گئے۔ (۹۰)

۱۹۱۴ء کے ذکر میں ظفر صاحب نے لکھا ہے کہ انگریز ان دلوں فوجی بھرتی پر بہت زور دے رہے تھے۔ خصوصاً مسلمانوں پر نظر عنایت زیادہ تھی۔ کالج کے ایک پروفیسر نے جب ظفر صاحب سے کہا کہ "تمہیں اپنے ملک اور اپنی حکومت کے لئے لڑائی پر جانا چاہئے" تو انھوں نے جواب دیا کہ "یہ ملک میرا ملک نہیں ہے کیوں کہ اس کی حکومت ہماری حکومت نہیں ہے"۔ یہ جواب تنہا ظفر صاحب کا نہیں بلکہ اس عام قومی احساس کا تھا

۹۰۔ رولٹ رپورٹ۔ ص۔ ۱۲۴

۹۔ ظفر حسن ایبک۔ آپ بیتی حصہ اول۔ ص۔ ۱۵

جوان دنوں پرورش پا رہا تھا ۔ (۹۲)

سلطان ترکی کے جہاد کے اعلان نے طلبار کے ان احساسات و جذبات کا رخ موڑ دیا۔ انھوں نے جماعت مجاہدین کے بعض ذمہ داروں سے رابطہ قائم کیا۔ان لوگوں نے اپنے اطمینان کیلئے طلبار کے واقعی احساسات کا اندازہ کرنے کے بعد خلیفۃ المسلمین کے فتویٰ جہاد کی ایک نقل ان کے پاس بھیجدی اور ان کے احساسات کو قوی تر کرنے کے لئے آیت ۔ "قل إن کان آباؤکم و ابنائکم وازواجکم وعشیرتکم و اموال اقترفتموہا وتجارۃ تخشون کسادہا ومساکن ترضونہا أحب الیکم من اللہ ورسولہ وجہاد فی سبیلہ فتربصوا حتی یاتی اللہ بأمرہ واللہ لایہدی القوم الفاسقین" ۔ کو پڑھنے اور سمجھنے کی تاکید کی ۔ نیز جہاد کے لئے دارالکفر سے نکل کر دارالاسلام (ترکی) جاکر فوج میں داخل ہونے کی تلقین کی جسے ان طلبار نے پسند کیا ۔ اس ارادہ کو صیغۂ راز میں رکھنے اور جہاد کیلئے مختلف کالجوں کے درج ذیل طلبار نے ۴ر جنوری ۱۹۱۵ء کو کشتی پر بیٹھ کر دریا کے منجدھار میں پہونچکر قسم کھائی ۔ ان میں یہ طلبار تھے ۔

گورنمنٹ کالج ۔ سے ایم اے کے طالب علم ۔عبدالباری اور شیخ عبدالقادر ۔ بی اے کے طالب علم ۔عبدالمجید خاں ۔ اللہ نواز خاں ۔ شیخ عبداللہ ۔عبدالرشید ۔غلام حسن ظفر حسن ایبک ۔چیف کالج ۔ سے بی ۔ اے کا طالب علم ۔عبدالخالق ۔ اسلامیہ کالج سے بی ۔اے کا طالب علم ۔ محمد حسن ۔میڈیکل کالج سے سیکنڈ ایر کے طالب علم ۔خوشی محمد ۔عبدالمجید ۔ رحمت علی ، اور شجاع اللہ ۔ (۹۳)

بعد میں طلبار کی اس جماعت میں اللہ نواز خاں کا بھائی شاہ نواز خاں اور اسی خاندان کا ایک پروردہ نومسلم عبدالحق بھی شریک ہوگئے ۔جماعت مجاہدین کے ذمہ داروں سے مل کر وطن چھوڑنے کے لئے ۵ر فروری ۱۹۱۵ء کی تاریخ کا تعین ہوا ۔ (۹۴) رولٹ رپورٹ میں ان طلبار کے ہندوستان چھوڑنے کا سبب بیان کرتے ہوئے بتایا

۹۲۔ ظفر حسن ایبک ۔ آپ بیتی حصہ اول ۔ص ۔ ۱۹

۹۳۔ 〃 〃 〃 〃 ۔ص ۔ ۲۳

۹۴۔ 〃 〃 〃 〃 ۔ص ۔ ۲۱ ۔ ۲۳

گیا ہے کہ ۔

"ہم نے دو ایسے طلبار کا بیان پڑھا جو واپس آگئے تھے ان میں سے ایک چھپے ہوئے ایک ایسے کتابچہ سے متاثر ہوا تھا جس میں یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ ترکی کے سلطان نے اس بات کا اعلان کیا ہے کہ اس بات کا خطرہ ہے کہ انگریز حملہ کر کے مکہ اور مدینہ منورہ کی بے حرمتی کریں لہٰذا ہندوستانی مسلمانوں کو "دارالاسلام" چلنے کے لئے تیار ہو جانا چاہئے۔ ان کو غیر مسلموں کے خلاف جہاد کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ دوسرا لڑکا بھی سلطان کے بیان سے بھڑک گیا تھا اور ایک انگریزی اخبار میں ایک ایسی تصویر دیکھ کر ناراض ہو گیا تھا جو اس کے خیال میں اسلامی خیالات کے اعتبار سے شر پذیر تھی، دونوں کے دماغ میں یہ غلط خیال تھا کہ مسلمانوں کے مذہب کی ہندوستان میں توہین کی گئی اور اس کو دبایا گیا۔" (۹۵)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ طلبار کے اس سفر سے انگریزوں پر کافی اثر پڑا اور انھوں نے اس کو فال بد خیال کیا، رپورٹ میں مذکور ہے کہ ۔

"پندرہ لاہور کے طلبار کا بھاگ جانا اس بات کی کھلی دلیل تھی کہ ملک میں پچاس سال قبل کی طرح چند مسلمان ایسے ہیں جو اس بات کا پرچار کرتے ہیں کہ نجات کی صرف ایک راہ یہ ہے کہ کافر حکومت ہند کے خلاف جنگ کیجائے، یا تو خود بھرتی ہو کر یا مجاہدین کی مالی امداد کر کے۔" (۹۶)

مذکورہ طالب علموں میں سے عبدالخالق وقت پر نہ پہونچ سکنے کیوجہ سے اور شیخ حسین خرابیٔ صحت کی بنا پر روانہ نہ ہو سکے، بقیہ سب ساتھی مقررہ تاریخ پر روانہ ہو گئے، راستہ میں شیخ عبداللہ کا بھائی عبدالرحمٰن بھی آملا۔ یہ سب بچتے بچاتے ۸ر فروری ۱۹۱۵ء کو مجاہدین کے مرکز (اسمس) پہونچ گئے۔ مجاہدین کے خلوص و جاں نثاری اور جذبۂ جہاد نے انھیں خاص طور پر متاثر کیا، لیکن لوازمات حرب سے ان کی ناواقفیت اور بدنظمی و بے انتظامی نے کافی مایوس کر دیا۔ مجاہدین کے خلوص و جاں نثاری سے انکار نہیں، لیکن انگریزوں کی دور مار بندوقوں، ان کی توپ و تفنگ، اور گولہ بارود کے مقابلہ کے لئے جن ہتھیاروں کی ضرورت تھی بد قسمتی سے مجاہدین ان سے تہی دست تھے، یہی وجہ ہے کہ اس

۹۵۔ رولٹ رپورٹ ۔ص۔ ۱۲۴

۹۶۔ " ۔ص۔ ۱۲۴

کمزوری کا احساس رکھنے والے طلبار وہاں زیادہ نہ ٹھہر سکے اور جلد ہی افغانستان کے لئے روانہ ہوگئے۔ ظفر صاحب لکھتے ہیں۔

"ہم اس نتیجے پر پہونچے کہ یہاں رہ کر ہم ہندوستان کی آزادی کے لئے کچھ کام نہیں کر سکتے، اس لئے ہمیں کابل جانا چاہئے تاکہ افغانی حکومت کو جنگ میں شامل ہونے پر راضی کر لیں۔ اگر کہیں کامیابی نہ ہو تو ترکی چلے جائیں اور وہاں ترکی فوج میں بھرتی ہو کر انگریزوں کے خلاف لڑیں" (۹۷)

جلال آباد پہونچکر ایک سرائے میں قیام کے لئے یہ لوگ اترے جہاں دوسرے ہی دن سے ان کی نظربندی کا سلسلہ شروع ہوگیا، حالانکہ یہ سب خود انگریزی حکومت کے مجرم تھے اور سرمائیکل اوڈ وائر نے یہ اعلان کیا تھا کہ" ان میں سے کوئی پکڑا گیا تو اسکو ہندوستان کی سرحد پر سب سے پہلے درخت سے لٹکا کر پھانسی دیدی جائے گی" اس کے باوجود افغانی حکام نے ان کو جاسوس سمجھا، یا ممکن ہے انگریز دوستی میں ایسا کیا ہو۔ ان طلبار کی اس نظربندی کا سلسلہ اگرچہ چار سال یعنی امیر حبیب اللہ خاں کے قتل تک چلا مگر مولانا سندھی کی آمد کے کچھ عرصہ بعد پابندیوں میں خاصی تخفیف ہوگئی تھی بلکہ کچھ مدت تو بالکل برائے نام پابندیاں رہیں، اور مولانا سندھی کی معیت میں کام کرنے پر کوئی پابندی نہ رہی۔

کابل پہونچنے کے تھوڑے ہی دن بعد ان میں ایک نوجوان عبدالمجید خاں کا ۱۹ اپریل ۱۹۱۵ء کو انتقال ہوگیا۔ (۹۸)

آئندہ صفحات میں، چونکہ ان طلبار میں سے اکثر کا ذکر بار بار آئیگا اس لئے ہم نے یہاں ان کا تذکرہ کسی قدر تفصیل کے ساتھ کر دیا ہے۔

افغانستان میں مولانا سندھی کی سرگرمیاں

مولانا سندھی کے کابل پہونچنے کا مختصر تذکرہ اور اس کا سبب گذشتہ صفحات میں ہم تحریر کر چکے ہیں، یہاں مولانا کی افغانستان میں سرگرمیوں کا ذکر پیش ہے۔

۹۷۔ ظفر حسن ایبک۔ آپ بیتی۔ ص ۳۳

۹۸۔ " " ص۔ ۶۳۔ ۶۴

مولانا سندھی ۱۵ر اکتوبر ۱۹۱۵ء کو کابل پہونچے تھے۔ حبیبیہ اسکول کابل کے ہیڈ ماسٹر حافظ احمد الدین بی۔ اے کے ساتھ مولانا سندھی نے اپنے رفیق کار شیخ محمد ابراہیم کو معلمی کے لئے اور ان کے ساتھ اپنے بھتیجے عزیز احمد کو اسی اسکول میں پڑھنے کے لئے اپنے آنے سے پہلے ہی بھیجدیا تھا۔ حافظ صاحب ان دونوں کے علاوہ مولوی محمد علی قصوری ایم اے کو بھی اپنے ہمراہ کابل لے گئے تھے۔ (۹۹) شیخ ابراہیم نے پہونچ کر مولانا سندھی کے لئے فضا ہموار کر لی تھی، اور خود بھی بعض سرداروں کے یہاں رسوخ پیدا کر لیا تھا (۱۰۰)

مولانا سندھی جب کابل پہونچے تو شیخ ابراہیم کی قیام گاہ کے قریب ہی ایک مکان میں رہنے لگے اور انھیں کے توسط سے سپہ سالار محمد نادر خاں اور سردار محمود خاں طرزی سے ملاقات کی، جن کے نام بعض خطوط لائے تھے۔ افغانستان کے محکمۂ قضاء شرعی جسے "میزان التحقیقات الشرعیۃ" کہتے ہیں اس کے رئیس قاضی عبدالرزاق سے ملے۔ قاضی صاحب موصوف دیوبند کے فاضل اور حدیث میں حضرت گنگوہی کے شاگرد تھے، مولانا سندھی نے اس امر پر تعجب کا اظہار کیا ہے کہ قاضی صاحب کو مولانا کے سفر کے متعلق پوری معلومات تھیں، انھیں جب اطمینان ہو گیا کہ یہی مولانا عبیداللہ سندھی ہیں تو بہت خوش ہوئے۔ (۱۰۱) عجب نہیں کہ ان کا بھی تعلق حضرت شیخ الہند سے رہا ہو اور آپ نے انھیں مولانا کے سفر سے باخبر کر دیا ہو۔

مولانا سندھی نے سپہ سالار محمد نادر خاں، سردار محمود طرزی اور قاضی عبدالرزاق کی ملاقاتوں سے فائدہ کافی اٹھایا اور انھیں لوگوں کے ذریعہ امیر افغانستان حبیب اللہ خاں تک رسائی حاصل کر لی۔ اپنے مقاصد سفر اور تجاویز کو اختصار کے ساتھ مولانا نے سات آٹھ صفحہ میں تحریر کیا تھا، یہ تحریر امیر صاحب کی خدمت میں پیش کی گئی، تو امیر صاحب اس سے کافی متاثر ہوئے۔ غرض یہ کہ اس طرح مولانا سندھی نے تھوڑی ہی

۹۹۔ مولانا عبیداللہ سندھی۔ کابل میں سات سال۔ ص۔ ۳۰۔ ۳۱

۱۰۰۔ ظفر حسن ایبک۔ آپ بیتی۔ ص۔ ۹۳

۱۰۱۔ مولانا عبیداللہ سندھی۔ کابل میں سات سال۔ ص۔ ۳۸

مدت میں افغانستان میں خاصا اثر و رسوخ حاصل کر لیا۔

انھیں دنوں برلن سے جرمنی، ترکی اور ہندوستانی ممبروں پر مشتمل ایک وفد کابل آیا تھا۔ امیر صاحب سے ملاقات کے بعد مولانا سندھی کو ان لوگوں سے ملنے کی اجازت ہو گئی مولانا نے ان سے مل کر تبادلۂ خیال کیا۔ اس وقت مولانا کو اندازہ ہو گیا کہ وفد کے ہندوستانی ممبر کس ذہن کے ہیں۔ مولانا سندھی ان سے بار بار ملتے رہے یہاں تک کہ ان کے ذہن کو کسی حد تک صاف کر دیا۔ مولانا لکھتے ہیں۔

"میرے ساتھ تبادلۂ خیال نے راجہ صاحب کو مجبور کیا کہ ہندوستانی معاملات میں وہ صحیح طور پر مسلمانوں کو شریک کریں۔ میں ان کے لئے ایسا نزم اور میٹھا ثابت نہیں ہوا جیسے مولوی برکت اللہ مرحوم۔" (۱۰۲)

مسلمانوں کے متعلق راجہ صاحب کا ذہن صاف نہ تھا اور انھوں نے بقول مولانا سندھی "مہا سبھائی نظریہ قبول کر رکھا تھا"۔ چنانچہ مشن میں بھی اسی ذہنیت کا ثبوت انھوں نے دیا۔ مولانا لکھتے ہیں۔

"مشن کا مقصد جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں فقط اس قدر تھا کہ جرمنی و ترکی اتحاد میں اگر افغانستان شمولیت کا قصد کرے تو مالوی جی کا ایک نمائندہ اس سے واقف رہے اور ان معاملات میں جو پوزیشن شاہ افغانستان کو حاصل ہو اس میں مہاراجہ نیپال کو شریک کرنے کی کوشش کرے۔" (۱۰۳)

انڈین سوسائٹی برلن نے راجہ صاحب کی یہ ذہنیت محسوس کر کے اس ہندو تحریک کو ہندوستانیت کا رنگ دینے کے لئے برکت اللہ صاحب کو بھی شریک کر دیا تھا۔ اور بات ہے کہ اگر مولانا سندھی نہ ملے ہوتے تو وہ راجہ صاحب کی مخالفت کا کام نہیں کر سکتے تھے۔ برکت اللہ صاحب کا ذکر کرتے ہوئے مولانا سندھی نے جو بات لکھی ہے وہ آج بھی خوش فہمیوں کی جنت میں بسنے والوں کے لئے محل غور ہے۔ مولانا لکھتے ہیں۔

۱۰۲۔ مولانا عبیداللہ سندھی۔ کابل میں سات سال۔ ص۔ ۵۲

۱۰۳۔ " " " ص۔ ۵۴

"مولانا برکت اللہ صاحب کی شخصیت کو جس قدر ہم بے معنی دکھلا رہے ہیں اس کا مولانا کی شخصیت سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ مسلمانوں کی غفلت کی سزا ہے جو اپنے آپ کو اقلیت میں فرض کر کے اکثریت کے رحم پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ مولانا محمد علی اور مولانا ابوالکلام جب اپنا اختیار مہاتما گاندھی کے سپرد کرتے ہیں تو کیا وہ اپنی قربانیوں سے مستفید ہو سکتے ہیں یا ڈاکٹر انصاری کو اگر سوامی شردھانند کے ساتھ وابستہ کر دیا جائے تو ان کی محنت سے کوئی نتیجہ نکل سکتا ہے؟ اسی طرح اگر مولانا برکت اللہ مرحوم راجہ صاحب سے اختلاف کر کے اپنا کام جاری نہیں رکھ سکتے تو ان کی ہاں میں ہاں ملانے کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔" (۱۰۴)

حکومت موقتہ کا قیام

راجہ مہندر پرتاب اور مولانا برکت اللہ نے کابل میں ہندوستان کے لئے ایک حکومت موقتہ کا نقشہ بنایا تھا۔ راجہ صاحب نے مولانا سندھی کی اہمیت کا اندازہ کر کے انھیں بھی اس میں شریک کر لیا تھا۔ تذکرہ شیخ الہند کے مصنف لکھتے ہیں۔

"انقلابی کونسل کا ہنگامی اجلاس ۲۹۔ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو آقائے عبدالرزاق خان کے دولت کدہ پر منعقد ہوا جس میں ہندوستان کی متوازی حکومت قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ حکومت افغانستان کی طرف سے بعض سرکاری عمارات کو اس متوازی حکومت کے دفاتر کیلئے مخصوص کر دیا گیا۔ یکم دسمبر ۱۹۱۵ء کو متوازی حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا گیا، جس پر راجہ مہندر پرتاب کے دستخط بحیثیت صدر ثبت تھے۔" (۱۰۵)

ترک۔ جرمن۔ ہندوستانی ممبران کا انقلابی وفد ۲۔ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو کابل پہونچا۔ مفتی صاحب چند سطور قبل لکھ چکے ہیں کہ دو ماہ تک وفد کو نظر بند رکھا گیا، اور کسی سے ملاقات کی نوبت نہ آئی۔

دو ماہ کے بعد امیر حبیب اللہ خاں تک رسائی ہوئی، اس کے بعد ان سے اس مسئلہ

۱۰۴۔ مولانا عبیداللہ سندھی۔ کابل میں سات سال۔ ص۔ ۵۴-۵۵

۱۰۵۔ مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری۔ تذکرہ شیخ الہند۔ ص۔ ۲۱۸

میں کوئی بات ہوسکی ابیز امیر صاحب نے چند ملاقاتوں کے بعد عبدالرزاق خاں کو وفد کا مشیر اعلیٰ بنادیا اس کے بعد سے تمام اجلاس ان کے دولت کدہ پر ہونے لگے۔ (۱۰۶)
اس کے بعد مفتی صاحب مندرجہ بالا تحریر میں بتارہے ہیں کہ ۲۹، اکتوبر ۱۹۱۵ء کو عبدالرزاق خاں کے در دولت پر انقلابی کونسل کا اجلاس ہوا اور یکم دسمبر ۱۹۱۵ء کو متوازی حکومت کا اعلان کر دیا گیا یہ تضاد حیرت انگیز ہے۔ مفتی صاحب نے چوں کہ اپنے ذریعۂ معلومات کی نشان دہی نہیں کی ہے اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں پہلی بات صحیح ہے یا دوسری۔

ظفر حسن ایبک صاحب اور مولانا سندھی کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ راجہ صاحب اور برکت اللہ صاحب نے مل کر حکومت موقتہ ہند کی تشکیل کی تھی جس میں بعض جرمن اور ترک ممبران بھی شامل تھے۔ (۱۰۷) لیکن راجہ صاحب چوں کہ اپنے ہی بنائے ہوئے قانون کے مطابق حکومت کے تاحیات تھے، اس لئے عملاً سب کچھ انھیں کے ہاتھ میں تھا (۱۰۸)

راجہ صاحب اس حکومت کے صدر اور برکت اللہ صاحب وزیر اعظم تھے۔ راجہ صاحب کو جب مولانا سندھی کے بغیر گاڑی چلتی نظر نہ آئی تو انھوں نے مولانا کو حکومت میں شمولیت کی دعوت دی۔ مولانا سندھی نے حلف نامہ (جس میں پہلے راجہ صاحب سے وفاداری کا حلف لینا ضروری تھا) میں تھوڑی ترمیم کرائی اور حکومت میں شامل ہو گئے۔ مولانا کو وزیر مملکت کا عہدہ تفویض ہوا۔ ابتدا میں حکومت کے تین ممبر رہے۔ امیر امان اللہ کے زمانے میں جنگ افغانستان کے خاتمہ اور ممبر بڑھائے گئے ان میں جماعت مجاہدین کے نمائندے مولانا بشیر صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ (۱۰۹)
راجہ صاحب کے متعلق مولانا سندھی لکھتے ہیں۔

۱۰۶۔ مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری۔ تذکرہ شیخ الہند۔ ص۔ ۲۱۸-۲۱۷
۱۰۷۔ مولانا عبید اللہ سندھی۔ کابل میں سات سال۔ ص۔ ۶۱
۱۰۸۔ ظفر حسن ایبک۔ آپ بیتی۔ ص۔ ۱۰۰
۱۰۹۔ مولانا عبید اللہ سندھی۔ کابل میں سات سال۔ ص۔ ۶۶-۶۷

"راجہ صاحب بے شمار خوبیوں کے مالک ہیں مگر اپنی شخصی ڈکٹیٹر شپ کا خیال ان کے دماغ پر غالب تھا، یورپین لوگوں سے ان کی زبان میں باتیں کر لیتے اور ڈیموکریسی کے لیکچر دے ڈالتے لیکن ہندوستانی معاملات میں ان کی موروثی خصلت نمایاں رہتی۔ ہم نے بڑے داؤ پیچ سے انھیں راضی کیا کہ حکومت موقتہ اپنا چارج اس جماعت کو دے دے گی جسے انڈین نیشنل کانگریس نے اس کام کیلئے معین کیا ہو۔ وہ اس کے سوا کوئی بات نہیں جانتے تھے کہ کام پریزیڈنٹ کے اختیار میں چھوڑ دینا چاہئے، اور وہ لائف پریزیڈنٹ اپنے ہی تجویز کردہ قانون سے مقرر ہو چکے تھے۔" (۱۱۰)

رولٹ رپورٹ میں حکومت موقتہ کا تذکرہ ان الفاظ میں ہے۔

"عبیداللہ اور اس کے باغی دوستوں نے ایک عارضی منصوبہ حکومت ہند چلانے اور انگریزوں کو مٹانے کے لئے بنایا تھا، مہندر پرتاب صدر چنے گئے تھے، عبیداللہ خود ہندوستان کا منسٹر ہونا، اور اس کا دوست برکت اللہ وزیر اعظم ہوتا۔" (۱۱۱)

ان وزرار کے علاوہ لاہوری طلبار میں سے بعض اس حکومت کے مختلف شعبوں میں سکریٹری اور دوسری حیثیتوں سے کام کرنے کے لئے منتخب کئے گئے تھے۔

اس حکومت موقتہ نے مختلف ممالک کی تائید و حمایت حاصل کرنے کے لئے ان میں اپنے وفود بھیجنے کا فیصلہ کیا، جرمنی پہلے سے موئید تھا اور اس کے نمائندے ساتھ ہی آئے تھے، اس لئے وہاں ضرورت نہ تھی، البتہ روس، جاپان اور ترکی کو وفود بھیجنے کے لئے فیصلہ ہوا۔ نائب السلطنت سردار نصراللہ خاں نے بھی اس کی تائید کی اور وفد بھیجنے کے لئے اپنی طرف سے منظوری دے دی۔

روسی مشن

وفد میں بھیجنے کے لئے راجہ صاحب کے پاس کوئی ہندوستانی آدمی نہ تھا، لاہور کے طلبار جو کابل میں نظربندی کی حالت میں مقیم تھے، جب مولانا سندھی کے گرویدہ اور آپ ہی

---

۱۱۰ - مولانا عبیداللہ سندھی - کابل میں سات سال - ص - ۶۷

۱۱۱ - رولٹ رپورٹ - ص - ۱۲۶

سے وابستہ تھے۔ لاہوری طلبار کے علاوہ کچھ اور ہندوستانی نوجوان تھے جو بعد میں بھاگ کر کابل پہونچے تھے۔ یہ سب کے سب مولانا سندھی سے زیادہ قریب تھے۔ راجہ صاحب نے روس بھیجنے کے لئے ڈاکٹر متھرا سنگھ کا انتخاب کیا۔ برکت اللہ صاحب نے بھی انھیں کی تائید کی۔ لیکن مولانا سندھی متھرا سنگھ سے واقفیت کی بنار پر اس بات کے لئے رضامند نہ ہوئے اور اپنی طرف سے یہ تجویز رکھی کہ ایک مسلمان نوجوان بھی ان کے ساتھ ہو۔ راجہ صاحب کو یہ تجویز پسند نہ آئی بحث نے اس قدر طول اختیار کیا کہ معاملہ نائب السلطنت تک پہونچا۔ انھوں نے فریقین کی باتیں سننے کے بعد مولانا سندھی کی تائید کی۔ چنانچہ لاہوری طلبار میں سے ڈاکٹر خوشی محمد کو "مرزا محمد علی" نام دے کر سفر روس کیلئے تیار کیا۔ راجہ صاحب نے صرف متھرا سنگھ کا خرچ دیا۔ مولانا سندھی خود تہی دست تھے، مرزا محمد علی کے سفر خرچ کیلئے فکر ہوئی آخر کار مولوی محمد علی قصوری جو حبیبیہ اسکول کابل میں ملازم تھے انھوں نے اپنے دو ماہ کی پیشگی تنخواہ وصول کر کے دی جس سے مرزا محمد علی کے سفر خرچ کا انتظام ہوا (۱۱۲) ان دونوں کے ساتھ ایک ایک خادم بھی روانہ کیا گیا۔ متھرا سنگھ کا خادم ایک کابلی سکھ اور مرزا محمد علی کا خادم ایک افغان تھا۔

مشن نے تاشقند پہونچ کر گورنر سے ملاقات کی اور زار روس کے نام حکومت موقتہ کا خط گورنر کے حوالہ کیا جو سونے کی پٹری پر کندہ تھا۔ مولانا سندھی نے اسے پمفلٹ بتایا ہے، غالباً زار روس کے نام خط جس میں حکومت موقتہ کے موقف کی وضاحت اور روس سے تائید وحمایت طلب کی گئی تھی اسی کو مولانا نے پمفلٹ سے تعبیر کیا ہے زار روس کے علاوہ ایک خط گورنر تاشقند کے نام بھی تھا۔ (۱۱۳)

زار روس نے حکومت موقتہ کے خط سے اپنا فائدہ کرنا چاہا اور اس کو بہانہ بناکر برطانیہ سے بہت سے مطالبات شروع کر دئے۔ برطانیہ نے مشن کو جعلی قرار دیا اور ہندوستان سے ممبروں کی تشخیص کرائی، لیکن کچھ پتہ نہ چل سکا۔ آخر کار زار روس نے مشن کی

۱۱۲۔ مولانا عبیداللہ سندھی۔ کابل میں سات سال۔ ص۔ ۶۱۔ ۶۵

۱۱۳۔ 〃 〃 〃 〃 ص۔ ۷۰

گرفتاری کا حکم دیدیا، لیکن گورنر تاشقند کی مداخلت کے باعث یہ لوگ گرفتار نہ کئے جا سکے ۔ مولانا سندھی لکھتے ہیں ۔

"یہ مشن بیکار ثابت نہیں ہوا بلکہ روسی اور انگریزی اتحاد میں کسی قدر مشکلات پیدا کر سکا ۔" (۱۱۴)

اس مشن کا تذکرہ رولٹ رپورٹ میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے ۔

"حکومت موقتہ ہند نے روسی ترکستان کے گورنر اور اس زمانہ کے زار روس کو خط لکھ کر اس کو برطانیہ عظمیٰ کا ساتھ چھوڑ نے کی دعوت دی، اور ہندوستان سے انگریزی راج ختم کرنے کے لئے اس سے مدد مانگی ۔ ان خطوط پر راجہ مہندر پرتاب کے دستخط تھے، بعد میں یہ خط انگریزوں کے ہاتھ آگیا، زار روس کے نام جو خط تھا وہ ایک سونے کی پٹری پر لکھا ہوا تھا، اس کا فوٹو ہمیں دکھایا گیا ہے ۔" (۱۱۵)

یہ وفد جب روس سے کابل واپس آیا تو راجہ صاحب متھرا سنگھ کو نائب السلطنت کی خدمت میں لے گئے، انھوں نے سفر کی تفصیلات پوچھیں تو متھرا سنگھ نے ہر سوال کا جواب "بخیر رفتیم و بخیر باز آمدیم" سے دیا ۔ جس سے نائب السلطنت کو بہت مایوسی ہوئی ۔ قاضی عبدالرزاق خاں بھی اس مجلس میں موجود تھے، انھوں نے مولانا سندھی کو اطلاع کر کے مرزا محمد (خوشی محمد) کو طلب کیا ۔ انھوں نے سفر کی مکمل روداد یادداشت کے طور پر لکھ رکھی تھی، اسے پیش کر دیا ۔ سردار نائب السلطنت بہت خوش ہوئے اور انھوں نے کہا کہ اگر مولانا سندھی کی رائے ہم نے نہ مانی ہوتی تو راجہ صاحب کا آدمی ہمیں کچھ نہ بتاتا ۔ (۱۱۶) اس واقعہ نے مولانا سندھی کی اہمیت افغانی حکام کی نظروں میں دوچند کر دی، اور خوشی محمد کیلئے بھی باعث عزت بنا ۔

* * *

---

۱۱۴ ۔ مولانا عبیداللہ سندھی ۔ کابل میں سات سال ۔ ص ۔ ۲۹

۱۱۵ ۔ رولٹ رپورٹ ۔ ص ۔ ۱۲۶

۱۱۶ ۔ ظفر حسن ایبک ۔ آپ بیتی ۔ ص ۔ ۱۰۴

جاپانی اور ترکی مشن

روسی مشن کی نیم کامیابی کے بعد راجہ صاحب نے دو مشن اور بھیجنے کا ارادہ کیا۔ ایک مولانا سندھی کی تجویز پر ایران ہوکر استنبول جانے کیلئے، جس میں لاہوری طلبار میں سے عبدالباری اور ڈاکٹر شجاع اللہ کو نمائندہ بنایا گیا اور دوسرا وفد برکت اللہ صاحب کی تجویز پر روس ہوکر جاپان جانے کے لئے تیار کیا گیا۔ اس میں جانے کیلئے لاہوری طلبار میں سے ایک شیخ عبدالقادر اور دوسرا ممبر متھرا سنگھ کو بنایا گیا۔

جرمن کیپٹن ہنٹس مولانا سندھی کیلئے تین سو پونڈ چھوڑ گیا تھا، جس میں سے ایک سو پونڈ راجہ صاحب اور برکت اللہ صاحب نے اپنی ضروریات کیلئے لے لیا تھا، دو سو پونڈ رکھے تھے، لیکن رات میں قیام گاہ پر ڈاکہ پڑا اور دوسری چیزوں کے علاوہ دو سو پونڈ بھی چلے گئے۔ راجہ صاحب کے مزاج سے واقفیت کی بناء پر مولانا سندھی کو یہ خوف ہوا کہ کہیں وہ یہ نہ سمجھیں کہ روپیہ ہضم کرنے کے لئے یہ بہانہ کھڑا کیا گیا ہے اس لئے مولانا سندھی نے جماعت مجاہدین کے رئیس مولانا محمد بشیر صاحب سے سو پونڈ قرض لئے اور ترکی جانے والے مشن کو دیدیئے۔ اس کے بعد جاپانی مشن کیلئے سردار نائب السلطنت سے مل کر روپیہ ضائع ہونے کا ذکر کیا، دوسرے دن سردار صاحب نے خود لاکر سو پونڈ دیئے جس سے دوسرا وفد بھی روانہ ہوگیا۔ (۱۱۷)

یہ دونوں مشن ناکام ثابت ہوئے اور منزل مقصود تک پہونچنے سے پہلے گرفتار کر لئے گئے۔ روسیوں نے متھرا سنگھ اور شیخ عبدالقادر کو گرفتار کرکے انگریزوں کے حوالہ کر دیا۔ متھرا سنگھ ایک بم کیس میں مفرور تھا، جس میں اس کے لئے پھانسی کی سزا تجویز ہوئی تھی۔ اس گرفتاری کے بعد اسے پھانسی دیدی گئی، اور شیخ عبدالقادر جنگ کے خاتمہ تک نظر بند رہے۔

(۱۱۸) ترکی مشن کو ایران میں خود انگریزوں نے گرفتار کر لیا اور دونوں نظر بند کر دیے گئے۔ مولانا سندھی لکھتے ہیں کہ۔

۱۱۷۔ مولانا عبیداللہ سندھی۔ کابل میں سات سال۔ ۱۷۔ ۲۰۔

۱۱۸۔ ظفر حسن ایبک۔ آپ بیتی۔ ص۔ ۱۰۳

"ان میں سے عبدالباری، سر محمد شفیع کا رشتہ دار نکلا، اسے معافی مانگنے پر راضی کرلیا گیا، اس نے تمام واقعات حکومت موقتہ اور جنود اللہ اور جماعت مجاہدین کے مفصل لکھ دیئے، اور شجاع اللہ، اور جاپانی وفد کے ممبر شیخ عبدالقادر نے اس پر دستخط کر دیئے۔ کچھ عرصہ نظر بند رکھنے کے بعد ان کو چھوڑ دیا گیا۔ ہندوستانی حکومت روسی مشن کے زمانہ سے واقعات کی تحقیق کے لئے پریشان تھی، اب اسے باطمینان مفصل حالات کی اطلاع مل گئی۔" (۱۱۹)

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں نے افغان حکومت پر زور ڈال کر شیخ محمد ابراہیم اور مولوی محمد علی قصوری کو حبیبیہ اسکول سے معزول کرا دیا، اور مولانا سندھی کا بھتیجہ عزیز احمد اسکول سے نکال دیا گیا۔ اس کے بعد شیخ ابراہیم اور مولوی محمد علی قصوری نے کابل چھوڑ دیا۔ کچھ عرصہ دونوں جماعت مجاہدین میں رہے اس کے بعد شیخ ابراہیم نے افغانستان ہو کر روس جانا چاہا، لیکن افغانستان کے کسی گاؤں میں شہید کر دیئے گئے، شبہ کیا جاتا ہے کہ ڈاکوؤں نے شہید کیا، لیکن ان کے ایک خط سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ڈاکو نہ ہوں، بلکہ انگریزوں کے آدمی ہوں، جو ان کے ساتھ لگ گئے تھے۔ مولوی محمد علی قصوری بھی کچھ دنوں بعد سر عبدالقیوم کی معرفت معافی مانگ کر ہندوستان پہونچ گئے۔ (۱۲۰)

جنود اللہ کی تشکیل

جماعت مجاہدین کے امیر مولانا محمد بشیر صاحب کے مشورہ سے قیام کابل کے زمانہ میں مولانا سندھی نے "جنود اللہ" نامی ایک تنظیم کی تشکیل کی تھی، جس میں لاہوری طلبار آپ کے شریک تھے۔ (۱۲۱)

مولانا سندھی نے اس کا تذکرہ بہت ہی مجمل طور پر کیا ہے، نیز عہدوں کی بھی کچھ تفصیل نہیں بتائی ہے۔ رولٹ رپورٹ میں بھی اس کا تذکرہ ملتا ہے۔ "تحریک ریشمی

۱۱۹۔ مولانا عبیداللہ سندھی۔ کابل میں سات سال۔ ص۔ ۴۳
۱۲۰۔ " " ص۔ ۴۴
۱۲۱۔ " " ص۔ ۵۷ - ۶۰۔

رومال" میں حضرت مدنی نے بھی اس تنظیم کا ذکر کیا ہے لیکن انھوں نے حکومت موقتہ اور جنود اللہ دونوں کو ایک کر دیا ہے البتہ ظفر حسن ایبک کی آپ بیتی سے بعض امور کی وضاحت ہوتی ہے رولٹ رپورٹ میں مذکور ہے کہ۔

" اس فوج کی بھرتی ہندوستان سے ہوتی اس کا کام حکمران سے رابطہ قائم کرنا تھا۔ محمود حسن یہ تمام باتیں عثمانی ترکی حکومت سے کرتے۔ عبید اللہ کے خط میں جنود اللہ کا خانہ وار گوشوارہ بھی درج تھا۔ اس کا بڑا دفتر مدینہ منورہ ہوتا۔ محمود حسن خود اس کے جنرل انچیف ہوتے۔ ثانوی دفاتر جو مقامی جنرل کے چارج میں ہوتے۔ قسطنطنیہ، تہران، اور کابل میں ہوتے۔ کابل کا جنرل عبید اللہ خود ہوتا۔ نقشہ میں تین سر پرستوں کے نام، بارہ فیلڈ مارشلوں کے نام اور بہت سے دیگر ملیٹری افسران کے نام تھے۔ لاہور کے طلبا میں سے ایک میجر جنرل ہوتا ایک کرنل اور چھ لیفٹیننٹ کرنل ہوتے۔" (۱۲۲)

ابراہیم فکری صاحب نے اپنے مضمون مطبوعہ رسالہ "آجکل" دہلی جون ۱۹۶۹ء میں مولانا سندھی کے خط کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس خط میں ـــ

" جنود الربانیہ" (جنود اللہ) کی پوری تفصیل درج ہے مثلاً یہ کہ اس فوج کے سربراہ یا سرپرست شیخ الہند، نادر شاہ اور غالب پاشا ہوں گے۔ گیارہ فیلڈ مارشل ہوں گے۔ یہاں ان گیارہ اشخاص کے نام دیے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ان کی تنخواہوں کے اسکیل بھی تحریر ہیں۔ میجر جنرلوں میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے اسماء گرامی بھی موجود ہیں۔" (۱۲۳)

اس مضمون میں فکری صاحب نے شیخ الہند کے علاوہ نادر شاہ اور غالب پاشا کا بھی نام لیا ہے معلوم نہیں فکری صاحب کے ذرائع معلومات کیا ہیں ہماری نظر سے کوئی ایسی تحریر نہیں گذری جس میں نادر شاہ اور غالب پاشا کا ذکر ہو۔ حضرت مدنی علیہ الرحمۃ نے حکومت موقتہ اور جنود اللہ دونوں کو باہم گڈ مڈ کر دیا ہے جو واقعاتی اعتبار سے صحیح نہیں۔ حکومت موقتہ راجہ مہندر پرتاب اور مولانا برکت اللہ نے قائم کی تھی، مولانا سندھی کو

۱۲۲۔ رولٹ رپورٹ . ص۔ ۱۲۷

۱۲۳۔ شہباز حسین اڈیٹر۔ رسالہ آجکل دہلی جون ۱۹۶۹ء۔ ص۔ ۴۶

بعد میں ان لوگوں نے انہیں شامل کر لیا اس لئے حضرت شیخ الہند اور گاندھی جی کے نام کی شمولیت خارج از امکان ہے۔ حضرت مدنی کی تحریر کے علاوہ کسی اور تحریر سے اس کا پتہ کبھی نہیں چلتا۔ البتہ "جنود اللہ" مولانا سندھی نے قائم کی تھی اس میں حضرت شیخ الہند اور گاندھی جی کی شمولیت بعید از قیاس نہیں۔ رولٹ رپورٹ میں شیخ الہند کا تذکرہ بھی ہے۔ اسی لئے حضرت مدنی کی تحریر جس میں دونوں کا یکجا تذکرہ ہے، ہم اسے جنود اللہ سے متعلق محمول کرتے ہیں۔ تحریر فرماتے ہیں۔

"اس میں ایک مسلمان اور دو ہندو رکن ہوں گے۔ مسلمان رکن تو حضرت شیخ الہند تھے۔ افسوس ہے کہ ہندو ارکان کے نام معلوم نہیں ہو سکے صرف سی۔ آئی۔ ڈی کے کاغذات سے گاندھی جی کے نام کا پتہ چلتا ہے۔" (۱۲۴)

مولانا سندھی کی تحریر اس سلسلہ میں کسی رہنمائی سے قاصر ہے، البتہ ظفر حسن ایبک کی آپ بیتی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نیم فوجی نیم اقتصادی قسم کی تنظیم تھی۔ نیز ظفر صاحب نے یہ بھی صراحت کی ہے کہ "اعزازی طور پر بلا تنخواہ کام کرنے والے رضاکاروں کی حیثیت سے کام لیا جائیگا۔" اس سے فکری صاحب کی اس بات کی تردید ہو جاتی ہے کہ "مولانا سندھی کے خط میں تنخواہوں کے اسکیل درج تھے۔" ظفر صاحب نے حضرت شیخ الہند کے علاوہ متعین طور پر کسی کا نام نہیں بتایا ہے۔ تنظیم کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ہمارے ساتھیوں میں سے کالج کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو بھی اس میں مختلف عہدے دیئے گئے تھے، قبلہ مولانا صاحب (مولانا سندھی) ہم میں سے ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ ہدایات دیتے اور نصیحت کیا کرتے تھے، اور ہر ایک کو آئندہ اسلامی ممالک کی اقتصادیات اور مالی حالت درست کرنے کے لئے کس طرح اور کہاں کہاں کام کرنا چاہئے، اس کے بارے میں راستہ بتایا کرتے تھے، ان منصوبوں کا تعلق ایران، ترکی اور عرب سے تھا۔ مثلاً مجھے اور محمد حسن یعقوب کو اس کام کو اپنے ذمہ لینے پر تیار کر رہے تھے کہ ہم حجاز جا کر آہستہ آہستہ ایک ایسی انجمن بنائیں، جو حج کے موقعہ پر ذبح شدہ بھیڑ، بکریوں اور اونٹوں کی کھالوں کو جمع کر کے ان سے دباغت خانہ میں مختلف قسم کے چمڑے بنائے اور ان کو اسلامی ممالک کو

۱۲۴۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب۔ تحریک ریشمی رومال۔ ص۔ ۱۵۸

برآمد کرے۔ اس کے لئے حجاز میں بین الاسلامی کمپنی قائم کی جائے جو کھالوں کو صاف کرکے ان سے چمڑا بنائے، اس کام کے لئے مالی ذرائع بہم پہونچانے والے ایک بین الاسلامی بینک کی بنیاد ڈالی جائے جو ان کاموں کے لئے سرمایہ بہم پہونچائے۔ آہستہ آہستہ یہ کمپنی اتنی بڑھ جائے کہ چمڑے کی مصنوعات بنانا شروع کردے اور ان کو برآمد کرنے کے لئے رفتہ رفتہ خود اپنے تجارتی جہازوں سے کام لینے لگے۔" (۱۲۵)

ظفر صاحب کے اس متذکرہ منصوبہ پر عمل کی نوبت نہ آئی کیوں کہ افغانی حکومت نے اس کی اجازت نہ دی۔ انھوں نے مزید لکھا ہے کہ دوسرے ساتھیوں کو بھی اسی قسم کے مختلف کاموں پر لگایا تھا لیکن ایک کو دوسرے کے کام سے اس قدر بے خبر رکھا جاتا تھا کہ ہم اس سلسلہ میں کچھ بتا نہیں سکتے۔ (۱۲۶)

حجاز میں شیخ الہندؒ کی سرگرمیاں

"ممالک غیر کے دوسرے سفر" کے ذیل میں ہم حضرت شیخ الہند کے حجاز پہونچنے کا مفصل تذکرہ کر چکے ہیں۔ قیام ہندوستان میں تحریک سے متعلق کوششوں کے ذکر کے بعد سرزمین حجاز پہونچنے پر خود حضرت شیخ الہند کی سرگرمیوں کی تفصیل یہاں پیش کیجارہی ہے۔

حضرت شیخ الہند نے مولانا سندھی کو چند ماہ پیشتر افغانستان کیلئے روانہ کر دیا تھا جہاں وہ ۱۵؍ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو پہونچ گئے، ادھر خود سرحدی مجاہدین سے حضرت نے رابطہ قائم رکھا، وہاں سے برابر اطلاعات پہونچتی رہتی تھیں، انھوں نے کسی حکومت کی تائید حاصل کرنے کے لئے لکھا۔ ادھر حضرت خود ہی ترکی کی تائید حاصل کرنے کے لئے کوشاں تھے۔ ہندوستان میں حالات مخدوش تھے، خطرہ تھا کہ خود حضرت شیخ الہند بھی گرفتار کرلئے جائیں، چنانچہ ڈاکٹر انصاری مرحوم نے زور دیا کہ آپ فوراً ہندوستان چھوڑ دیں۔ (۱۲۷) ہر چند کہ

۱۲۵۔ ظفر حسن ایبک۔ آپ بیتی۔ ص۔ ۱۱۔ ۱۱۰

۱۲۶۔ " " " ۱۱۲۔

۱۲۷۔ مولانا سید حسین احمد مدنی۔ نقش حیات دوم۔ ص۔ ۲۱۲

مولانا ابوالکلام آزاد، اور بعض دوسرے مخلصین کی رائے تھی کہ ہندوستان نہ چھوڑیں لیکن آپ نے ڈاکٹر صاحب کی بات کو ترجیح دی اور ہندوستان چھوڑ کر حجاز پہونچ گئے۔ سفر حجاز کا مفصل تذکرہ گذر چکا ہے، اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں البتہ یہاں ان امور کا ذکر ضروری ہے جو حجاز میں پیش آئے۔

مکہ معظمہ میں بہت سے ہندوستانی تاجر مختلف تجارتوں میں لگے ہوئے تھے انھیں میں دہلی کے ایک تاجر حاجی علی جان مرحوم کا خاندان تھا جسے وہاں خاصی اہمیت اور امتیاز حاصل تھا، تجارت بھی خاصے بڑے پیمانہ پر تھی، اسی خاندان کے ایک فرد حافظ عبدالجبار صاحب دہلوی تھے۔ اس خاندان کا تعلق حضرت سید احمد شہید اور مجاہدین استھانہ سے بہت قریبی تھا۔ حضرت شیخ الہند حافظ صاحب سے ملے اور ان سے اپنا مدعا بیان کیا، اور خواہش کی کہ کسی طرح گورنر حجاز غالب پاشا سے ملاقات کا نظم کر دیں۔ حافظ صاحب موصوف نے ایک نوجوان ہندوستانی کو جو کہ وہاں تسبیحوں کی تجارت کرتے تھے، حضرت شیخ الہند کے ساتھ کر دیا کہ غالب پاشا سے ملادیں۔

غالب پاشا سے ملاقات

اس نوجوان کو ترکی اور عربی سے پوری واقفیت تھی، وہ حضرت شیخ الہند کو ساتھ لے کر غالب پاشا کے پاس گئے۔ حضرت نے جو باتیں کیں یہ ان کا ترجمہ کرکے غالب پاشا کو سمجھاتے رہے۔ غالب پاشا نے تمام باتیں ہمدردی کے ساتھ اور غور سے سنیں۔ اس کے بعد دوسرے دن پھر ملنے کے لئے کہہ کر حضرت شیخ الہند کو رخصت کر دیا۔ اس کے بعد واقف کار لوگوں سے حضرت کے متعلق پوری تحقیق کی کہ آپ کون ہیں اور ہندوستانی مسلمانوں کے نزدیک آپ کی کیا منزلت ہے؟ دوسرے دن کی ملاقات سے قبل غالب پاشا نے آپ کے متعلق پوری معلومات حاصل کر لی تھیں اور مطمئن تھے۔ دوسرے دن وقت مقررہ پر جب حضرت شیخ الہند پہونچے تو غالب پاشا آپ سے بڑے تپاک سے ملے، اور تحریک آزادی سے متعلق کافی دیر تک گفتگو کرتے رہے، حضرت شیخ نے انور پاشا سے ملنے کی خواہش ظاہر کی، تو انھوں نے کہا کہ انور پاشا سے ملنے کی کوئی ضرورت نہیں میں جو کچھ کہہ رہا ہوں آپ اسے انور پاشا ہی کا کہا سمجھیں، لیکن جب حضرت شیخ نے انور پاشا

سے ملاقات پر اصرار کیا تو انھوں نے از خود تین تحریریں لکھ کر آپ کو دیں ۔

۱۔ پہلی تحریر مسلمانان ہند کے نام

۲۔ دوسری تحریر گورنر مدینہ منورہ بصری پاشا کے نام کہ یہ معتمد شخص ہیں ان کا پورا احترام کرو اور انور پاشا کے پاس استنبول پہونچا دو

۳۔ تیسری تحریر انور پاشا کے نام تھی جس میں حضرت کے تعارف کے بعد آپ کے مطالبات پورے کرنے کی سفارش تھی ۔

غالب پاشا نے خود بھی تحریک کے متعلق حضرت شیخ الہند کو ہدایات دیں اور اس بات کی تاکید کی کہ آپ پورے ہندوستان کو آزادی کامل کے مطالبہ کے لئے تیار کریں جزوی آزادی پر قناعت گوارا نہ کریں ۔اس کے علاوہ اپنی طرف سے مکمل تائید وحمایت کا وعدہ کیا ۔ اس ملاقات کے بعد بھی جب تک حضرت مکہ میں رہے خفیہ ملاقاتیں ہوتی رہیں ۔ کچھ دنوں بعد غالب پاشا طائف اور حضرت مدینہ منورہ کے لئے روانہ ہو گئے ۔ (۱۲۸)

غالب نامہ

غالب پاشا کی مذکورۃ الصدر تین تحریروں میں سے پہلی تحریر جو مسلمانان ہند کے نام ہے وہ غالب نامہ کے نام سے مشہور ہوئی ۔ بعد میں کسی طرح اس کی نقل انگریزوں کے ہاتھ لگ گئی ۔ رولٹ رپورٹ میں اس تحریر کا حسب ذیل اقتباس درج ہے ۔

" ایشیاء یورپ اور افریقہ کے مسلمان اپنے آپ کو ہر قسم کے ہتھیار سے مسلح کر کے خدا کے راستہ میں جہاد کرنے کے لئے کود پڑے ہیں خدا کا شکر ہے کہ ترکی فوج اور مجاہدین اسلام دشمنوں پر غالب آ گئے ہیں ۔ اس لئے مسلمانو! جس ظالم عیسائی حکومت کے قبضہ میں تم ہو اس پر حملہ کرو دشمن کو مرنے پر مجبور کرنے کے لئے پختہ عزم کے ساتھ اپنی ساری جد وجہد عمل میں لانے کی جلدی کرو اور ان پر اپنی نفرت و دشمنی کا اظہار کرو ۔ یہ بھی تمھیں معلوم ہونا چاہئے کہ مولوی محمود حسن آفندی (مدرسہ دیوبند ہندوستان سے سابقہ تعلق رکھنے والے) ہمارے پاس آئے اور ہمارا مشورہ طلب کیا ۔ ہم نے اس بارے میں ان سے اتفاق کیا اور انھیں ضروری ہدایات دیں اگر وہ تمھارے پاس

---

۱۲۸ ۔ مولانا سید حسین احمد مدنی ۔ نقش حیات دوم ۔ ص ۔ ۲۱۴ ۔ ۱۵

آئیں تو تمھیں ان پر اعتماد کرنا چاہئے اور آدمیوں اور روپیوں اور ہر اس چیز سے ان کی امداد کیجیے جس کی ضرورت انھیں پیش آسکتی ہے۔ (۱۲۹)

حضرت مدنی نے "نقش حیات" میں صرف مذکورہ تین تحریروں ہی کے متعلق لکھا ہے اور مشہور بھی یہی ہے لیکن "تحریک ریشمی رومال" کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے علاوہ ایک تحریر افغان حکومت کے نام بھی تھی۔ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

افغان حکومت کو لکھا تھا کہ محمود حسن آفندی یعنی شیخ الہند تمہارے پاس بہت جلد آرہے ہیں یہ جو بات کریں ہماری حکومت کی جانب سے اس کی تائید سمجھیں اور اس معاہدہ کو ترک حکومت کا معاہدہ سمجھیں۔ افسوس ہے کہ اس معاہدہ کی تفصیل نہیں معلوم ہوسکی۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہی پرانا معاہدہ لوٹا گیا تھا کہ ہم افغان حکومت کے مقبوضات میں کوئی دخل نہ دیں گے اور اگر ہماری وجہ سے کوئی طاقت افغان حکومت کے خلاف ہوئی تو ہم اس کے خلاف افغانستان حکومت کی ہر طرح مدد کریں گے۔ (۱۳۰)

اگر یہ صحیح ہے تو اس کو لیکر غالب پاشا کی کل چار تحریریں ہوئیں۔ انگریزوں کے ہاتھان میں سے صرف پہلی تحریر لگ سکی چنانچہ غالب پاشا سے گرفتاری کے بعد اسی کے متعلق پوچھا گیا اور انھوں نے اس کا اعتراف کیا کسی دوسری تحریر کے متعلق نہ ان سے پوچھا گیا اور نہ انھوں نے خود کچھ بتایا۔ سرکاری کاغذات میں "غالب نامہ" اسی پہلی تحریر کا نام ہے جو مسلمانان ہند کے نام تھی۔

غالب نامہ کا ارسال

غالب پاشا کا خیال تھا کہ حضرت شیخ الہند خود ان تحریروں کو لے کر ہندوستان اور افغانستان جائیں اور ان کی اشاعت کریں لیکن حضرت شیخ انگریزوں کی نظر میں کافی مشکوک ہو چکے تھے چنانچہ روانگی حجاز کے وقت آپ کی گرفتاری کے احکام بھی جاری ہوئے تھے اس لئے حضرت نے خود ہندوستان جانا مناسب نہ سمجھا۔ مولانا محمد میاں عرف منصور انصاری صاحب کو غالب پاشا کی وہ تحریر جو مسلمانوں کے نام تھی، دے کر آپ نے ہندوستان روانہ کیا۔ مولانا منصور انصاری صاحب خود بھی حکومت کی نظر میں مشکوک آدمی تھے اس لئے ہندوستان نہ گئے

۱۲۹۔ رولٹ رپورٹ۔ ص۔ ۱۲۷

۱۳۰۔ مولانا عبدالرحمٰن۔ تحریک ریشمی رومال۔ ص۔ ۱۸۵

بلکہ راستہ میں غالب نامہ کی کاپیاں تقسیم کرتے ہوئے بچتے بچاتے آزاد قبائل پہونچ گئے، اور غالب نامہ کی وہاں بھی خوب اشاعت کی، اس کے بعد مولانا سندھی کے پاس کابل چلے گئے اور وہاں بھی اسکی اشاعت کی۔ رولٹ رپورٹ میں اس کا تذکرہ اس طرح ہے۔

"اگست ۱۹۱۵ء مطابق ۱۳۳۳ھ میں مولانا محمود حسن کے ایک شاگرد مولوی عبیداللہ کابل چلے گئے اور وہاں پہونچ کر انھوں نے جرمنی اور ترکی مشن سے جو افغانستان آیا ہوا تھا مل کر امیر کابل پر برطانیہ کے خلاف زور ڈالا۔ اسی سال مولوی محمود حسن مکہ مکرمہ چلے گئے، اور وہاں سے انھوں نے غالب پاشا کا دستخطی اعلان مولوی محمد میاں کے ہاتھ مولوی عبیداللہ کے پاس کابل بھیجا، جس میں برطانیہ کے خلاف جہاد کی ترغیب دی گئی تھی۔ ان لوگوں نے یہ طے کیا تھا کہ برطانیہ کو شکست دینے کے بعد ہندوستان میں عارضی حکومت قائم کی جائے، جس کے پریذیڈنٹ راجہ مہندر پرتاب سنگھ ہوں گے، جو ضلع متھرا کے ایک رئیس تھے، اور ۱۹۱۴ء میں یورپ چلے گئے تھے اور برطانیہ کی مخالف سلطنتوں سے تعلق رکھتے تھے۔" (۱۳۱)

اس طرح غالب پاشا کی تحریر بنام مسلمانان ہند کی اشاعت ہوگئی، لیکن وہ تحریر جو ترک افغان معاہدہ کی حیثیت رکھتی تھی، اس کا پتہ نہیں چلتا۔ حضرت مدنی نے اس کے متعلق ذیل کی معلومات سپرد قلم فرمائی ہیں۔

"سی آئی ڈی کے کاغذات سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ یہ عہد نامہ افغان حکومت کو بعد از وقت ملا، جب کہ ریشمی خط کا راز فاش ہو چکا تھا، اس عہد نامہ نے افغانستان کے انقلاب پسند عنصر کی ہمتوں کو مضبوط کیا، اور امان اللہ خاں جو اس پارٹی کے سرخیل سمجھے جاتے تھے انقلاب لانے میں کامیاب ہو گئے۔ حبیب اللہ خاں کو قتل کروادیا اور خود حکومت پر قابض ہو گئے، اور افغانستان کو انگریزی تسلط سے لڑکر آزاد کرایا۔ عہد نامہ میں کچھ ایسی تدبیریں بھی تھیں جن سے ان لوگوں نے فائدہ اٹھایا اور کامیاب ہوئے۔" (۱۳۲)

٭ ٭ ٭

۱۳۱۔ رولٹ رپورٹ۔ ص۔ ۲۵۳-۲۵۴

۱۳۲۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب۔ تحریک ریشمی رومال۔ ص۔ ۱۸۸

گورنر مدینہ کی بدگمانی

غالب پاشا سے ملاقات اور تحریریں حاصل کر کے حضرت شیخ الہند مدینہ منورہ آ گئے تھے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری بھی ساتھ تھے۔ سفر حج میں دو لاہوری نوجوان ، مولانا خلیل احمد صاحب سے ساتھ ہو گیا تھا۔ عام حجاج روانہ ہو گئے تھے لیکن یہ دونوں مدینہ منورہ ہی میں رہے اور مولانا خلیل احمد صاحب بھی موجود تھے۔ پولیس کی نظر میں یہ دونوں نوجوان مشتبہ ثابت ہوئے اور ان کو گرفتار کر لیا۔ مولانا خلیل احمد صاحب سیدھی سادی طبیعت کے آدمی تھے حسن ظن کی بنا پر گورنر مدینہ سے ان کی براءت کے لئے سفارش کر دی۔ مگر یہ بات پولیس کمشنر کو ناگوار گذری اس نے گورنر مدینہ بصری پاشا کو ان دونوں نوجوانوں کے علاوہ مولانا خلیل احمد صاحب سے بھی بدظن کر دیا۔ مولانا کا چونکہ حضرت شیخ الہند کا ساتھ تھا اس لئے اس کا اثر حضرت شیخ کی ثقاہت پر بھی پڑا۔

ادھر مولانا مرتضیٰ حسن صاحب جو ہندوستان آنے کے لئے جدہ پہونچکر جہاز کا انتظار کر رہے تھے انھوں نے جدہ سے حضرت شیخ الہند کے نام طول طویل خط لکھنا شروع کر دیا۔ ان دنوں ڈاک میں عربی یا ترکی کے علاوہ کوئی خط نہ لیا جاتا تھا اس لئے ڈاک لیجانے والے بدوی کے ذریعہ دستی خط بھیجا کرتے تھے۔ یہ بدوی کچھ اجرت لیکر خطوط پہونچا دیا کرتا تھا۔ پولیس کمشنر کو کسی طرح ان خطوط کا پتہ چل گیا اس نے اسے بھی مشکوک سمجھا اور اس کی وجہ سے گورنر مدینہ کو حضرت شیخ الہند کیجانب سے بھی بدظن کر دیا۔ اسکے بعد جب حضرت شیخ الہند ملے تو آپ نے اس کے بدلے ہوئے رویہ کو محسوس فرمایا۔ اس کے بعد ایک مرتبہ مولانا خلیل احمد صاحب اور حضرت شیخ الہند سے اس سلسلہ میں کچھ پوچھ گچھ بھی ہوئی۔ موقع کی نزاکت دیکھ کر حضرت شیخ الہند نے اپنے ترکی ترجمان کے ذریعہ غالب پاشا کو اطلاع دی۔ غالب پاشا نے دوسرا خط بصری پاشا کو حضرت شیخ سے حسن معاملہ کے لئے لکھ دیا۔ اس کے بعد بصری پاشا کا رویہ بدل گیا۔ آپ نے پہلے ہی استنبول جانیکا ارادہ اس سے ظاہر کیا تھا۔ اس ملاقات کے بعد اس نے آپ کو تیاری کر لینے کے لئے کہا لیکن دو ہی ایک دن میں انور پاشا اور جمال پاشا کے خود مدینہ منورہ پہونچنے کی اطلاع ملی اس لئے استنبول کا سفر نہ ہو سکا۔ ( )

انور پاشا اور جمال پاشا سے ملاقات

مختلف محاذوں کا دورہ کرتے ہوئے انور پاشا اور جمال پاشا اسپیشل ٹرین سے مدینہ منورہ پہونچے۔ استقبال کے لئے عظیم الشان مجمع اسٹیشن پہونچ گیا۔ تھوڑی دیر اسٹیشن پر قیام کے بعد روضۂ اطہر کی زیارت کے لئے روانہ ہوئے۔ سواری پیش کی گئی لیکن پسند نہ کیا اور پیدل ہی مجمع کے ساتھ چلے۔ جلوس پہلے ہی سے ترتیب دیا ہوا تھا۔ علماء اور معززین شہر کے علاوہ کافی پولیس جلوس کے ساتھ چل رہی تھی (مولانا حسین احمد صاحب نے مدینہ منورہ کے مذہبی اور دینی طبقات کے رسمی سردار مفتی مامون بری اور نقیب الاشراف شامی سے پہلے ہی بات کر لی تھی۔ چنانچہ جلوس میں گھس کر انور پاشا کے پاس پہونچ گئے اور انکو حضرت شیخ الہند کی طرف سے ایک خط دیا جس میں تنہائی میں ملاقات کی درخواست کی گئی تھی انھوں نے خط رکھ لیا اور بعد میں اطلاع دی گئی کہ مغرب کے بعد کا وقت ملاقات کے لئے دیا گیا ہے حضرت شیخ الہند اور مولانا خلیل احمد صاحب وقت مقررہ پر پہونچ گئے۔ انور پاشا نے بند کمرے میں ان سے ملاقات کی۔ حضرت نے انھیں غالب پاشا کا خط دیا۔ اس کے بعد گفتگو کی۔ انور پاشا نے اطمینان سے ساری باتیں سنیں اور آزادی کامل کے مطالبہ کی تلقین کی حضرت نے ان سے تحریر دینے کے لئے کہا لیکن ان کے پاس قیام کا وقت کم اور مصروفیات زیادہ تھیں، اس لئے معذرت کی اور یہ کہا کہ ہم دمشق پہونچ کر تحریریں بھیجدیں گے۔ حضرت نے ان سے یہ بھی کہا کہ کسی طرح حدود افغانستان تک پہونچا دیں لیکن راستہ مخدوش ہونیکی وجہ سے ان لوگوں نے معذرت کی" اور ہندوستان یا حجاز میں رہ کر کام جاری رکھنے کی تلقین کی۔ (۱۴۴)

دوسرے دن دونوں مدینہ منورہ سے روانہ ہو گئے اور چند دنوں کے بعد گورنر مدینہ کے معرفت ترکی۔ عربی۔ فارسی تینوں زبانوں میں تحریریں لکھ کر بھیجدیں "نقش حیات" میں ان تحریروں کے متعلق مذکور ہے کہ ۔۔

" ان میں ہندوستانیوں کے مطالبۂ آزادی کے استحسان اور مطالبہ پر ہمدردی ظاہر

۱۴۳۔ مولانا سید حسین احمد صاحب۔ نقش حیات دوم۔ ص۔ ۲۱۶۔ ۲۱۷

۱۴۴۔ " " " " ص۔ ۲۱۸۔ ۲۲۰

کرتے ہوئے امداد و اعانت کا وعدہ تھا اور ہر شخص کو جو ترکی رعیت یا ملازم ہو حکم تھا کہ مولانا محمود حسن صاحب پر اعتماد کرے اور آپ کی اعانت میں حصّہ لے۔" (۱۳۵)

انور نامہ

انور پاشا کی دی ہوئی ان تحریروں کو ہم "انور نامہ" سے تعبیر کرتے ہیں۔ "نقش حیات" کے صفحات ان کے متعلق مزید تفصیل سے خالی ہیں۔ البتہ "تحریک ریشمی رومال" سے معلوم ہوتا ہے کہ تینوں زبانوں میں دو عہد نامے تھے۔ ایک انقلابی کونسل اور ترکی حکومت کے مابین، اور دوسرا افغان و ترک حکومت کے درمیان۔ اس دوسرے معاہدہ میں ۱۹ر فروری ۱۹۱۷ء کی تاریخ انقلاب کیلئے مقرر ہوئی تھی۔ حضرت مدنی کے بیان کے مطابق اس کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ **معاہدۂ اول** ۔ جو ترکی اور انقلابی کونسل کے مابین تھا اس کا تعلق حضرت شیخ الہند کی ذات سے تھا اس لئے اسے آپ نے اپنے ہی پاس محفوظ رکھا، جسے گرفتاری کے وقت بیکار سمجھ کر ضائع کر دیا۔ یا ممکن ہے کسی کے پاس حجاز میں رکھ دیا ہو۔ اس نے گرفتاری کے بعد بیکار سمجھ کر ضائع کر دیا ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ رہائی کے بعد آپ تک پہونچا دیا ہو۔ حضرت مدنی فرماتے ہیں کہ یہ سب امکانات ہیں لیکن حضرت نے خود اس کے متعلق نہ کچھ بتایا، نہ ہم نے کبھی کچھ پوچھنے کی جرأت کی۔

۲۔ دوسرا معاہدہ ۔ جو ترکی اور افغان حکومت کے مابین تھا سے حضرت شیخ الہند نے مولانا ہادی حسن صاحب کو دیگر ہندوستان بھیجا۔ اس میں ترکی حکومت نے اپنی طرف سے معاہدہ کو آخری شکل دیدی تھی، نیز اسی خط میں انقلاب کے لئے ۱۹ر فروری ۱۹۱۷ء کی تاریخ کی منظوری بھی تھی، اور اب صرف افغان حکومت کی منظوری کی اطلاع حضرت شیخ الہند کے ذریعہ ترکی حکومت کو پہونچنی تھی، اس کے بعد ترکی حکومت حملہ کرتی۔ (۱۳۶)
حضرت مدنی اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ ۔

---

۱۳۵ - مولانا سید حسین احمد مدنی۔ نقش حیات دوم ص - ۲۲۱

۱۳۶ - " عبدالرحمٰن ندوی ... تحریک ریشمی رومال ۔ ص ۔ ۱۹۰

"حضرت شیخ الہند نے افغانستان اور ہندوستان کے قائدین تحریک کو یہ ہدایات دی تھیں کہ کام میں کہیں تیزی اور پیش قدمی نہ ہو جائے، اس لئے تمھیں اپنی تمام ماتحت برانچوں کو ہدایت دینی ہے کہ جب افغان حکومت کی منظوری کی اطلاع ترکی حکومت کو پہونچ جائے اور میں اس کی اطلاع کابل اور دہلی کے مرکزوں کو دوں، پھر یہ مرکز اپنی برانچوں کو مطلع کریں کہ کام پورا ہو گیا اس وقت کوئی قدم اٹھاؤ، اگر میری اطلاع تمہارے مرکزوں کو نہ ملے تو سمجھو کہ کوئی حادثہ پیش آگیا، پھر کوئی قدم نہ اٹھانا۔" (۱۳۷)

حضرت مدنی نے انور پاشا کی تحریروں کی دو قسم بتائی ہے۔ ایک انقلابی کونسل اور ترکی حکومت کے درمیان معاہدہ۔ اور دوسرا افغان و ترک حکومت کے درمیان معاہدہ۔ بعد کی سطریں جو اوپر نقل کیجا چکی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ انور پاشا کی تحریروں کے علاوہ حضرت شیخ الہند نے خود بھی کوئی خط ان کے ساتھ بھیجا تھا جس میں مندرجہ بالا ہدایات درج تھیں۔ اسی کتاب میں چند صفحات کے بعد حضرت مدنی "انور نامہ" کے متعلق فرماتے ہیں کہ۔

"ایک خط میں قوم سے اپیل کی گئی تھی کہ حضرت شیخ الہند کا ساتھ دیں، اس خط کا فوٹو اتروا کر تحریک کے مرکزوں میں پہونچا دیا گیا۔" (۱۳۸)

اس تفصیل سے خیال ہوتا ہے کہ انور پاشا نے تین تحریریں دیں، جن میں سے ایک جو انقلابی کونسل سے عہد نامہ تھا، اسے حضرت نے اپنے پاس رکھ لیا، اور دو تحریریں ایک عوام کے نام، اور ایک افغان حکومت کے نام، شیخ الہند نے یہ دونوں تحریریں ذمہ داران مراکز کے پاس اپنے ایک خط کے ساتھ مولانا ہادی حسن صاحب کے ذریعہ ہندوستان بھیجدیں۔

انور نامہ کا ارسال

حضرت شیخ الہند کا خود باغستان پہونچنا آسان نہ تھا اس لئے آپ نے ان تمام تحریروں کو ہندوستان بھیجنے کا ارادہ کیا۔ لکڑی کا ایک صندوق اس طرح بنوایا گیا کہ دو

۱۳۷۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب، تحریک ریشمی رومال۔ ص۔ ۹۱-۱۹۰

۱۳۸۔ " " " ص۔ ۱۹۴

تختوں کے درمیان تحریریں رکھ کر ان دونوں کو اس طرح ایک کر دیا گیا کہ کسی کو وہم و گمان بھی نہ ہو سکے کہ دو تختے ملے ہوئے ہیں۔ تحریریں تو تختے کے درمیان رکھ دی گئیں تھیں صندوق کے اندر کچھ نئے ریشمیں اور غیر ریشمیں کپڑے عورتوں، بچوں کے لئے رکھ کر مولانا سید ہادی حسن صاحب رئیس خان جہانپور ضلع مظفر نگر کے حوالہ کر دیا ان خطوط کو حاجی سید نور الحسن صاحب موضع رتھڑی ضلع مظفر نگر کے پاس پہنچانا تھا۔

حضرت شیخ الہند اور آپ کے رفقاء اور مولانا خلیل احمد صاحب وغیرہ ۱۲ رجادی الثانیہ ۱۳۳۴ھ مطابق ۱۹۱۶ء کو مدینہ منورہ سے روانہ ہو کر آخر ماہ میں مکہ معظمہ پہونچ گئے تھے۔ چند دن قیام کے بعد حضرت شیخ الہند ۲۰ رجب ۱۳۳۴ھ مطابق ۱۹۱۶ء کو طائف روانہ ہو گئے مولانا خلیل احمد صاحب اور ہندوستان آنے والے دوسرے حضرات وہیں رہے شیخ الہند کو شریف حسین کی بغاوت کی وجہ سے طائف میں محصور ہونا پڑا۔ جب ۱۰ شوال ۱۳۳۴ھ مطابق ۱۹۱۶ء کو مکہ معظمہ واپس پہونچے تو معلوم ہوا کہ جہاز آجانے کی وجہ سے ہندوستان جانے والا قافلہ جدّہ پہونچ چکا ہے۔ انہیں رخصت کرنے کے لئے حضرت شیخ الہند بھی جدہ آگئے۔ (۱۳۹)

خفیہ پولیس کی تفتیش

بندرگاہ پر سی آئی ڈی والوں نے حضرت شیخ الہند کو دیکھ کر یہ خیال کیا کہ آپ بھی ہندوستان جارہے ہیں۔ چنانچہ اس کی اطلاع انہوں نے بمبئی پولیس کو کر دی۔ حضرت شیخ الہند نے بمبئی کے کسی رکن تحریک کو پہلے سے کسی ذریعہ مطلع کر دیا تھا کہ "مولانا ہادی حسن صاحب صندوق لے کر پہونچ رہے ہیں ان سے لے کر فلاں جگہ پہونچا دینا"۔ بمبئی پہونچنے پر وہ صاحب بندرگاہ پر موجود تھے انہوں نے مسافروں کے ہجوم میں گھس کر صندوق لے لیا اور باہر آکر فوراً مولانا محمد نبی صاحب

۱۳۹۔ مولانا سید حسین احمد مدنی صاحب نقش حیات دوم ص ۲۲۳-۲۲۴

کے نام پر مظفر نگر روانہ کر دیا۔ ادھر سی۔ آئی ڈی کی اطلاع کے مطابق پولیس نے حضرت شیخ الہند کو تلاش کرنا شروع کیا۔ حضرت شیخ الہند تو جدہ میں تھے۔ ملتے کہاں، آخر آپ کے رفقار کو پکڑا، مولانا خلیل احمد صاحب سے پوچھ گچھ ہوئی ہفتہ عشرہ تک آپ کو بند بھی رکھا گیا لیکن آپ نے کوئی بات نہ بتائی۔ مولانا ہادی حسن صاحب کو گرفتار کر کے نینی تال میں قید کر دیا گیا۔ وہاں آپ پر کافی سختیاں کی گئیں لیکن ثابت قدم رہے۔ آخر کار ڈیڑھ ماہ بعد رہا ہوئے۔ حضرت شیخ الہند نے مولانا محمد نبی صاحب کو کسی ذریعہ سے پہلے ہی اطلاع کر دی تھی۔ انہیں صندوق ملا تو انہوں نے فوراً توڑ تاڑ کر کاغذات نکال لئے۔ (۱۴۰)

مولانا محمد نبی صاحب کی تلاشی

خفیہ پولیس کو یہ اطلاع مل گئی تھی کہ اس طرح صندوق میں کاغذات رکھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ تفتیش شروع ہو گئی۔ پولیس مولانا محمد نبی صاحب کے یہاں پہونچی تو وہ اسی وقت ان تحریروں کو نکال رہے تھے فوراً انہوں نے کاغذات کو موڑ کر صدری کی جیب میں رکھ کر کھونٹی پر لٹکا دیا۔ پولیس نے مکان کا ایک ایک کونہ چھان مارا۔ کپڑوں کے دوسرے صندوق ریزہ ریزہ کر ڈالے۔ دس بجے سے لے کر چھ بجے تک تلاشی ہوتی رہی لیکن کچھ ہاتھ نہ آیا۔ صدری سامنے ٹنگی ہوئی تھی معلوم نہیں اس پر نظر نہیں پڑی یا ناقابل اعتنار سمجھ کر اسے چھوڑ دیا۔ (۱۴۱)

حاجی نورالحسن صاحب کی تلاشی

اس کے بعد پولیس موضع رہتڑی میں حاجی نورالحسن صاحب کے گھر پہونچی اور

۱۴۰۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب — تحریک ریشمی رومال — ص ۱۹۳
۱۴۱۔ مولانا حسین احمد صاحب — نقش حیات دوم — ص ۲۲۵

وہاں بھی اسی طرح تلاشی لی کتابوں کا ایک ایک ورق تک دیکھ ڈالا کہ کہیں اس میں رکھے ہوں۔ حضرت شیخ الہند کے کچھ پرانے خطوط رکھے ہوئے تھے ان سب کو پولیس نے اپنے قبضہ میں کر لیا مگر جس چیز کی انہیں تلاش تھی وہی نہ ہاتھ آئی۔(۱۴۲)

حاجی نورالحسن صاحب کے صاحبزادے حکیم محمود الحسن صاحب لکھتے ہیں کہ "جس وقت رہنٹری میں پولیس تلاشی لے رہی تھی، باہر بیٹھک میں یہ تحریریں ایک صندوقچی کے اندر رکھی ہوئی تھیں لیکن پولیس نے اس پر کچھ توجہ نہ دی"(۱۴۳)

حاجی احمد مرزا کی تلاشی

مولانا محمد نبی صاحب نے تحریریں حاجی نورالحسن صاحب کے پاس پہونچا دیں اور وہ لے کر حاجی احمد مرزا فوٹو گرافر کے پاس دہلی پہونچے۔ حاجی صاحب نے دور ہی سے دیکھا کہ مرزا صاحب کی دوکان میں تلاشی ہو رہی تھی اور دوکان کے گرد پولیس کا محاصرہ تھا۔ نورالحسن صاحب یہ دیکھ کر واپس آ گئے اور دوسرے وقت لے کر پہونچے۔ آفریں ہے مرزا صاحب کی ہمت پر کہ پولیس کی اس سختی کے باوجود تحریریں لے کر فوٹو لیا۔ دوسری مرتبہ پولیس نے پھر مرزا صاحب کی دوکان کی تلاشی لی۔ ان کی فوٹو کا پیاں اس وقت ایک طشت میں میز کے نیچے پڑی ہوئی تھیں لیکن ان پر پولیس کی نظر نہ گئی۔ ساری دوکان کی دوبارہ تلاشی لے کر پولیس ناکام واپس گئی(۱۴۴)

تحریروں کی تقسیم

اس قدر تلاشی اور اتنی سختیوں کے باوجود حاجی احمد مرزا صاحب نے تحریروں کی

۱۴۲۔ پروفیسر سعید احمد اکبر آبادی رسالہ برہان دہلی دسمبر ۱۹۴۸ء جلد ۲۱ شمارہ ۶ ص ۳۸۲

۱۴۳۔ پروفیسر سعید احمد اکبر آبادی صاحب رسالہ برہان دہلی دسمبر ۱۹۴۸ء جلد ۲۱ شمارہ ۶ ص ۳۵۳

۱۴۴۔ مولانا سید حسین احمد مدنی صاحب نقش حیات دوم ص ۲۲۷

فوٹو کاپیاں تیار کیں اور حاجی نورالحسن صاحب نے انہیں حسب ہدایت متعلقہ افراد اور متعینہ مراکز تک پہونچا دیا۔ انور پاشا کی وہ تحریر جو افغان و ترک حکومت کے درمیان معاہدہ کے طور پر تھی۔ مولانا محمد نبی صاحب ہی کے پاس رہی۔ مولانا سید ہادی حسن صاحب رہائی کے بعد جب وطن پہونچے تو مولانا محمد نبی صاحب سے وہ تحریر لے کر خود افغانستان گئے۔ اور تحریر پہونچائی۔ راستہ میں اپنا حلیہ بدل کر ظفر احمد نام رکھ لیا تھا۔ اس تحریر کے پہونچنے کے بعد امیر حبیب اللہ خاں والئ افغانستان نے ارکان حکومت اور سرداروں کو طلب کیا کہ جنگ کے متعلق مشورہ کریں۔ چنانچہ خود حبیب اللہ خاں اور عنایت اللہ خاں کے علاوہ سب نے جنگ کے لئے زور دیا۔ آخر کار امیر صاحب نے اپنے خصوصی اختیارات سے کام لیتے ہوئے درمیانی راہ نکالی کہ ترکی حکومت چند مقررہ راستوں سے حملہ کردے۔ ہم اپنی برأت کے لئے انگریزوں سے یہ کہہ لیں گے کہ وہ قبائل بغاوت پر اتر آئے ہیں۔ حکومت خود حملہ میں شریک نہ ہوگی۔ ہاں عوام کو شرکت سے منع بھی نہ کرے گی۔ مولانا سندھی اور لطف اللہ خاں وغیرہ نے شاہ کی اتنی اجازت بھی کافی سمجھی اور اس کی مفصل اطلاع حضرت کو دینے کے لئے وہ ریشمی خط لکھا جس کے نام سے یہ پوری تحریک مشہور ہوئی۔ (۱۴۵)

شیخ الہند رح کی غالب پاشا سے آخری ملاقات

حضرت شیخ الہند مکہ معظمہ سے ۲۰ رجب ۱۳۳۴ھ مطابق ۱۹۱۶ء کو چل کر طائف آئے کیونکہ غالب پاشا ان دنوں طائف ہی میں مقیم تھے ان سے مل کر کچھ ضروری باتیں طے کرنا تھیں۔ ارادہ یہ تھا کہ جلد واپس ہوجائیں گے۔ وہاں پہونچنے کے چند دن بعد غالب پاشا سے ملاقات کرکے کچھ باتیں طے کیں اور کچھ کے لئے دوسری ملاقات کا وعدہ ہوا۔ اس دوسری ملاقات کا وقت نہ آیا تھا کہ شریف حسین نے انگریزوں کے اشارہ پر بغاوت کردی جس کی وجہ سے طائف ہی میں محصور ہوجانا پڑا۔ اس دوران حضرت نے ایک بار پھر غالب پاشا

۱۴۵۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب تحریک ریشمی رومال ص ۱۹۶-۱۹۴۔

سے ملاقات کی۔ انہوں نے کچھ باتیں کیں۔ اور پریشان کن حالات کی بنا پر کچھ مجبوریاں ظاہر کیں نیز حضرت کو تاکید کی کہ آپ مکہ معظمہ جاکر جلد ہندوستان چلے جائیں، اور اہل ہند کو آزادی کامل کے مطالبہ کے لئے تیار کریں کیونکہ انگریزوں کی یہ کوشش ہوگی کہ اہل ہند کی آزادی کا آفتاب برطانیہ ہی کے زیر سایہ طلوع ہو۔ آپ کوشش کریں کہ اہل ہند انگریزوں کی اس پیشکش کو قبول نہ کریں۔ اس کے بعد حضرت شیخ الہند مکہ معظمہ آگئے۔ جہاں سے مولانا ہادی حسن صاحب وغیرہ کو الوداع کہنے کے لئے جدہ پہونچے جس کا ذکر گذر چکا ہے۔

جدہ سے پھر مکہ معظمہ واپس آگئے اور منتظر رہے کہ ہندوستان سے کوئی ایسا آدمی آئے جس سے وہاں کے مفصل حالات معلوم ہوں۔ اگر کچھ نرم رویہ کا پتہ چلے تو حج کے بعد ہندوستان جائیں۔ ورنہ کچھ دوسری تدبیر سوچی جائے۔ (۱۴۶)

قاضی مسعود صاحب حجاز میں

حضرت شیخ الہند کے رفقاء کار میں ڈاکٹر انصاری نے جس طرح قدم قدم پر حضرت کا خیال رکھا وہ ان کے انتہائی تعلق اخلاص کا مظہر ہے۔ ادھر ہندوستان میں حضرت کے گھر والوں کی پوری خبرگیری رکھتے تھے، ادھر خیال ہوا کہ حضرت کو گئے ہوئے ایک سال سے زائد کا عرصہ ہوگیا اس لئے ایک ہزار روپیہ حضرت کے لئے مکہ معظمہ بھیجا۔ حج کا زمانہ تھا کسی بھی معتمد حاجی کے ذریعہ بھیج سکتے تھے لیکن یہ سوچ کر کہ گھر کے کسی آدمی کو بھیجا جائے تاکہ اس کے ذریعہ گھر کے بھی مفصل حالات آپ کو معلوم ہوجائیں اس لئے آپ کے داماد قاضی مسعود صاحب کو یہ رقم لے کر حجاز کے لئے روانہ کیا۔ قاضی صاحب کی روانگی بہت خفیہ طریقہ سے ہوئی تھی عین وقت پر دیوبند سے روانہ ہوئے اس لئے کسی کو کچھ شبہ نہ ہوسکا۔ جہاز کی روانگی کے بعد حکومت کو شبہ ہوا تو عدن تار دیا گیا کہ وہاں ان کی تلاشی لی جائے جیسے ہی جہاز عدن پہونچا پولیس نے پہونچ کر

۱۴۶۔ مولانا سید حسین احمد مدنی صاحب نقش حیات دوم ص ۲۸-۲۲۷

تلاشی لی لیکن کوئی قابل اعتراض تحریر برآمد نہ ہوسکی اس لئے کچھ تعرض نہ کیا گیا۔

قاضی صاحب جب جدہ پہونچے تو حضرت کو بڑی مسرت ہوئی ملک کے عمومی حالات کے علاوہ اہل وعیال کے مکمل حالات بھی معلوم ہوگئے۔ انہوں نے بتایا کہ حضرت کے بارے میں گورنمنٹ کا رویہ بہت سخت ہے جہاز کے بمبئی پہونچنے پر خفیہ پولیس اور باوردی پولیس کی ایک جمعیت موجود رہتی ہے جب تک یہ اطمینان نہیں ہوجاتا کہ اس میں حضرت شیخ الہند نہیں ہیں اس وقت تک کسی مسافر کو اترنے کی اجازت نہیں ہوتی۔

ڈاکٹر انصاری صاحب کے مرسلہ روپیہ کے علاوہ انہیں دنوں راندیر ضلع سورت سے مولانا محمد ابراہیم صاحب راندیری نے بھی ایک ہزار روپئے ارسال کئے۔ یہ دونوں رقمیں مکہ معظمہ میں حافظ عبدالجبار صاحب دہلوی کے پاس بطور امانت رکھ دی گئیں جو اسارت مالٹا کے زمانہ میں بہت کام آئیں۔(۱۴۷)

افشائے راز

حضرت شیخ الہند سے مکہ معظمہ میں ملاقات ہوہی چکی تھی۔ قاضی صاحب مدینہ منورہ نہ جاسکے کیونکہ "شریفانہ شورش" کی بنا پر راہیں مسدود ہوچکی تھیں۔ اس لئے حج سے فراغت کے بعد پہلے جہاز سے ہندوستان روانگی کے لئے تیار ہوگئے۔ ان کے پہونچنے سے پہلے چونکہ مولانا ہادی حسن صاحب کو ہندوستان بھیجا جاچکا تھا۔ حضرت کو فکر تھی کہ معلوم نہیں ان تحریروں کا کیا بنا؟ اس لئے قاضی صاحب کی روانگی سے بیشتر حضرت نے ان کو تمام باتوں سے آگاہ کردیا اور صندوق کا راز بھی بتادیا کہ اگر تحریریں ابھی تک نہ بھیجی گئی ہوں تو اب بھیجدی جائیں۔

قاضی صاحب حجاز سے روانہ ہوئے تو سی آئی ڈی انسپکٹر نے وہیں جہاز پر انتہائی سختی سے تلاشی لی اور ایک ایک چیز دیکھ ڈالی لیکن کچھ اس کے ہاتھ نہ لگ سکا اور تھا

۱۴۷۔ مولانا سید حسین احمد صاحب نقش حیات دوم ص ۳۰۔ ۲۲۹

بھی کیا جو اسے ملتا ؟ — جہاز بمبئی پہونچا تو ایک بار پھر تلاشی لی گئی اور انہیں کے بعد زیر حراست الہ آباد پہونچا دیا گیا۔ کمزور دل اور ناتجربہ کار قاضی صاحب کا سابقہ شاطر اہل فن پولیس افسران سے پڑا۔ انہوں نے اپنے سارے حربے آزما کر قاضی صاحب سے ایک ایک راز اگلوا لیا۔ قاضی صاحب کو جو کچھ معلوم تھا انہوں نے بتا دیا۔ صندوق کا راز بھی انہیں کے ذریعہ معلوم ہوا۔ اس کے بعد مظفر نگر تار دیا گیا اور پولیس نے خانجہاں پور اور رتھیڑی میں تلاشی لی۔ (۱۴۸)

ہندوستان کی خفیہ پولیس کی حضرت شیخ الہند کی کارروائیوں پر نظر تو بہت پہلے سے تھی لیکن قاضی صاحب کے اس افشاء راز کے بعد جرم کی حیثیت اور بڑھ گئی، اور اب گورنمنٹ کو یہ فکر ہوئی کہ حضرت کو کسی طرح جلد از جلد گرفتار کرے۔

"ریشمی خط" انگریزوں کے قبضہ میں

انور پاشا کی وہ تحریر جو ترک افغان معاہدہ کے طور پر تھی، اس کے افغانستان پہونچنے پر ارکان حکومت اور مولانا سندھی وغیرہ سے گفتگو کے بعد امیر حبیب اللہ خان نے جب محدود و متعین راستوں سے مقررہ تاریخ پر ترکی کو حملہ کرنے کی اجازت دیدی تو حضرت شیخ الہند کو اس منظوری کی اطلاع دینے کے لئے مولانا سندھی نے ایک ریشمی رومال پر خط لکھا یہی خط انگریزوں کے ہاتھ لگا اور اسی کی مناسبت سے پوری تحریک کا نام "تحریک ریشمی رومال" پڑ گیا۔ حضرت مدنی اس خط کی یہ تفصیل بتاتے ہیں۔

"حضرت سندھی اور نصر اللہ خاں نے مل کر ایک ماہر کاریگر سے ایک ریشمی رومال اس طرح بنوایا کہ اس کی بناوٹ میں معاہدہ کی پوری عبارت اور تاریخ حملہ کی منظوری کی عبارت بھی بن دی گئی۔ یہ عبارت عربی زبان میں تھی اور دستخط حبیب اللہ اور اس کے تینوں بیٹوں امان اللہ خاں۔ نصر اللہ خاں: عنایت اللہ خاں کے ایک دفعہ قبضہ میں آگئے پھر اس

۱۴۸۔ مولانا سید حسین احمد صاحب نقش حیات دوم ص ۲۳۱ — ۲۳۰

رومال کے اوپر ان چاروں کے دستخط زرد رنگ کی سیاہی سے کروائے گئے۔
یہ رومال بھی زرد رنگ کا تھا۔ جس کی لمبائی ایک گز تھی اور عرض
بھی اتنا ہی تھا۔" (۱۴۹)

عبدالحق کا تذکرہ لاہوری طلباء کے ساتھ ہم کر چکے ہیں، یہ رومال اسی نومسلم عبدالحق کو دیا گیا۔ عبدالحق سے یہ کہا گیا تھا کہ اسے وہ شیخ عبدالرحیم سندھی کو دے جاکر دیدے۔ پروگرام کے مطابق عبدالرحیم صاحب حج کو جاتے اور حضرت شیخ الہند کے حوالہ کر دیتے ــــ اس خط کا راز ظاہر کرنے کی نوعیت مختلف حضرات نے اپنی اپنی معلومات اور اندازہ کے مطابق متعین کی ہے۔ یہاں ہم ان میں سے اہم معلومات درج کرتے ہیں۔ مولانا سندھی لکھتے ہیں کہ

"عبدالحق نے خط اللہ نواز خاں کے والد حق نواز خاں کو دیدیا اور
خاں صاحب نے سر مائیکل اوڈوائر تک پہونچا دیئے۔" (۱۵۰)

ہم عبدالحق یا حق نواز خاں کی برات کے متعلق کچھ نہیں کہتے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ خاں صاحب کو عبدالحق نے بتایا اور خاں صاحب نے اس کی اطلاع اوڈوائر کو دیدی ہو۔ لیکن خط کا شیخ عبدالرحیم تک پہونچنا امر مسلم ہے کیونکہ بغیر اس کے شیخ صاحب کی روپوشی سمجھ میں نہیں آتی۔ ظفر حسین ایبک صاحب کی تحریر سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ انہوں نے اللہ نواز خاں کے والد کا نام رب نواز خاں بتایا ہے۔ ظفر صاحب کا کہنا ہے کہ گورنمنٹ پرستی کے اظہار کے لئے انہوں نے ایسا کیا جس کے صلہ میں خاں صاحب کو مربعے دیئے گئے اور عبدالحق کو پولیس کی ملازمت ملی۔ (۱۵۱)

لیکن حضرت مدنی کا اس سلسلہ میں بیان یہ ہے کہ "(عبدالحق) تحریک کے رکن تھے اور پیغام رسانی کا کام کیا کرتے تھے۔ افغانستان و ہندوستان میں کپڑے کی تجارت کرتے تھے ہندوستان کا کپڑا افغانستان اور افغانستان کا کپڑا ہندوستان لے

۱۴۹۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب　　تحریک ریشمی رومال　　ص ۱۹۷
۱۵۰۔ مولانا عبیداللہ سندھی　　کابل میں سات سال　　ص ۷۶
۱۵۱۔ ظفر حسن ایبک　　آپ بیتی　　ص ۱۱۳

جاتے۔ اس طرح ان کا کاروبار بھی اچھا چل رہا تھا اور پیغام رسانی کا کام بھی دیتے تھے۔ حضرت شیخ الہند سے بیعت اور تحریک کے معتمد علیہ رکن تھے۔ یہ رومال ان کے حوالہ کر دیا گیا یہ حسب ہدایت اسے لے کر پشاور پہونچے انہوں نے اسی قسم کے پانچ درجن رومال اور رکھ لئے تھے اور انہیں کے درمیان خط والا رومال بھی تھا۔ ان کو ہدایت کی گئی تھی کہ خود شیخ عبدالرحیم کو دیں اور شیخ صاحب کو حسب ہدایت رومال لے کر حج کے لئے جانا تھا اور اگر عبدالحق کو کوئی خطرہ ہو تو رومال کو پشاور میں تحریک کے رکن خان بہادر حق نواز خاں کو دیدیں اور ان کو سب باتیں سمجھا دیں۔ عبدالحق کا پہلے یہ ارادہ تھا کہ خود لے جا کر دیں لیکن کئی بار کی پوچھ گچھ اور تلاشی کی وجہ سے ڈرے ہوئے تھے اس لئے رومال حق نواز خاں کے حوالہ کر کے ان کو مکمل ہدایت دیدی۔ حق نواز خاں کو یہ امانت رات کے نو بجے ملنی ہے اور آپ اسے چار بجے صبح روانہ کر دیتے ہیں آپ کے آدمی نے ریاست بہاولپور کے دین پور میں سجادہ نشین خواجہ غلام محمد صاحب کے پاس پہونچا دیا ادھر پشاور میں نماز صبح سے پہلے ہی حق نواز خاں کے گھر پر فوج کا چھاپہ پڑا لیکن خط وہاں سے نکل چکا تھا۔ خاں صاحب کو گرفتار کر لیا گیا اور پوچھ گچھ ہوئی لیکن آپ مضبوط رہے۔ دین پور میں خط دن کے دس بجے پہونچا خواجہ صاحب نے اپنے ایک معتمد آدمی کے ہاتھ اسے بارہ بجے سندھ کے لئے روانہ کر دیا۔ چند ہی گھنٹوں بعد خواجہ صاحب کے یہاں چار بجے فوج پہونچ گئی مکان کا محاصرہ کر کے رات کے دس بجے تک تلاشی لیتی رہی اس کے بعد خواجہ صاحب کو گرفتار کر لیا گیا اور چار ماہ تک بند رکھا لیکن آپ نے کچھ نہ بتایا۔ دوسرے دن ظہر کے وقت شیخ عبدالرحیم کو خط مل گیا۔ شیخ صاحب عشاء کے وقت حلیہ بدل کر نکلنے کے لئے تیار ہو رہے تھے۔ رومال ہاتھ میں تھا سوئی تاگہ لے کر اس کو "گودڑی میں لعل" کی حیثیت سے لگانے کی فکر میں تھے کہ دیواریں پھاند کر فوج مکان کے اندر آگئی اس نے فوراً رومال اپنے قبضہ میں کر لیا۔ لیکن شیخ صاحب فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے اور ایسے فرار ہوئے کہ پھر پتہ نہ چل سکا کہ کہاں گئے یہ اچاریہ کرپلانی کے حقیقی بھائی تھے مولانا سندھی

کے ہاتھ پر انہوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ مشہور ہے کہ روپوشی کی حالت میں سرہند میں انتقال ہو گیا۔" (۱۵۲)

بہر حال رومال انگریزوں کے ہاتھ لگ گیا اور وہ سارا منصوبہ جو ایک عرصہ سے بنایا جا رہا تھا جب اس کی تکمیل کا وقت آیا۔ اور خدا خدا کر کے دونوں حکومتیں حملہ کے لئے تیار ہوئیں اور یہ توقع قائم ہوئی کہ غلامی کا طوق کوئی دن میں اب اترنے والا ہے تو سارا راز فاش ہو گیا۔ ؎

قسمت کی خوبی دیکھئے ٹوٹی کہاں کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

انگریزوں کو اطلاع کس نے دی؟

یہ مسئلہ الجھ کر رہ گیا ہے کہ ان خطوط کی اطلاع انگریزوں کو کس نے دی؟ عبدالحق نے؟ خان بہادر حق نواز خاں نے؟ یا کسی اور نے؟ —— مولانا سندھی کا خیال ہے کہ عبدالحق نے خطوط حق نواز خاں کو دیئے اور حق نواز خاں نے اوڈوائر کو پہونچا دئے لیکن ظفر صاحب کی نظر میں خود عبدالحق بھی مشکوک ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ شروع سے لاہوری طلباء کے قافلہ میں ایک جاسوس کی حیثیت سے آیا تھا یا حق نواز خاں نے اس حرکت پر آمادہ کیا، ظفر صاحب نے شبہ ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"کابل آنے کے بعد اللہ نواز خاں کا بھائی شاہنواز کبھی کبھی سیر ہو جاتے ہوئے افغانی پہرہ دار کو رشوت دے کر اس کو اپنے پاس سے دور کر کے انگریزی قونصل خانے کے عملہ سے ملا کرتا تھا۔" (۱۵۳)

اس طرح ان کی نظر میں عبدالحق، اور خان بہادر حق نواز خاں کے علاوہ اللہ نواز کا بھائی شاہنواز (جو عبدالحق کے ساتھ آکر اس جماعت میں شریک ہوا تھا) بھی مشکوک شخص ہے۔ حضرت

---

۱۵۲ ۔ مولانا حسین احمد صاحب مولانا عبدالرحمٰن صاحب ۔ تحریک ریشمی رومال ص ۲۰۰۔۱۹۷

۱۵۳ ۔ ظفر حسن ایبک ۔ آپ بیتی ص ۱۱۶

مدنی علیہ الرحمۃ عبدالحق اور حق نواز خاں دونوں کو بری قرار دیتے ہیں۔ البتہ ان کے خیال میں یہ سب امیر حبیب اللہ خاں کی حرکت تھی۔ تحریر فرماتے ہیں۔

"یہ سب خبریں اور ان مقامات کے پتے اور ریشمی رومال کی پوری تفصیل امیر حبیب اللہ خاں نے حکومت برطانیہ کو بتادی تھیں۔ امیر حبیب اللہ خاں کے یہی کارنامے تھے جو اس کے لئے جان لیوا ثابت ہوئے اور عنایت اللہ خاں کے بھی ولی عہدی کے سب خواب پریشاں ہو گئے" (۱۵۴)

ابراہیم فکری صاحب کے مضمون مطبوعہ "آجکل" سے عبدالحق اور خان بہادر حق نواز خاں دونوں کی شخصیتیں مشکوک معلوم ہوتی ہیں۔ فکری صاحب لکھتے ہیں کہ

"حق نواز خاں نے خطوط عبدالحق سے لیکر ۱۴ اگست ۱۹۱۶ء کو ملتان کے کمشنر کے حوالے کر دئے وہاں سے یہ خطوط پنجاب سیکریٹریٹ بھیجدئے گئے۔ پنجاب سی آئی ڈی کے سربراہ ٹوم کنس نے ان خطوط کی جانچ کی۔ عبدالحق سے پوچھ تاچھ ہوئی تو جو کچھ معلوم تھا انہوں نے بتادیا۔ عبدالحق کا بیان پینتیس ۳۵ صفحات میں قلم بند کیا گیا۔ آگے چل کر عبدالحق پولیس اور خان بہادر کے دباؤ میں آکر سرکاری گواہ بن گئے" (۱۵۵)

ظفر حسن صاحب نے اپنی کتاب میں "ہندوستان میں تحریک ہجرت" کے ذیل میں کسی عبدالحق کا ذکر کیا ہے البتہ کچھ صراحت نہیں کی کہ یہ وہی عبدالحق ہیں جو "ریشمی پیامبر" تھے یا کوئی اور ہے۔ اگر وہی ہیں تو ان کی حیثیت مشکوک ہونے میں شبہ نہیں۔ ظفر صاحب لکھتے ہیں۔

"۔۔۔۔ ان جاسوسوں میں ایک شخص عبدالحق نامی تھا یہ اپنے کو بڑا متقی اور پرہیز گار دکھلاتا تھا یہاں تک کہ سردار سپہ سالار صاحب مرحوم کو بھی اس کے زہد و تقوی سے دھوکہ لگا تھا اس نے قندھار کے راستہ ہندوستان جانے کا فیصلہ کیا مگر کابل سے چلنے سے پہلے کوئٹہ کے انگریز افسر کو ایک خط لکھا جس میں اس کو اپنی واپسی کی اطلاع دی یہ خط افغانوں کے ہاتھ میں پڑا ہمیں نے بھی یہ خط سردار سپہ سالار صاحب مرحوم کے دفتر میں دیکھا۔ اس سے مجھے بہت شرمندگی اٹھانی پڑی۔ تحقیقات کے بعد اس شخص کو جیل میں ڈال دیا گیا اور بعد میں اس کو موت کی سزا دی گئی" (۱۵۶)

---

۱۵۴ - مولانا عبدالرحمٰن صاحب — تحریک ریشمی رومال — ص ۲۰۱
۱۵۵ - شہباز حسین (ایڈیٹر) — رسالہ آجکل دہلی جون ۱۹۶۹ء — ص ۴۶
۱۵۶ - ظفر حسن ایبک — آپ بیتی — ص ۱۷-۲۱۶

مندرجہ بالا تحریر سے اس بات کا شبہ ضرور ہوتا ہے کہ یہ وہی شخص ہے کیونکہ یہ ظفر صاحب کے ساتھ آنے والے طلبہ کے قافلہ میں شریک ہو گیا تھا۔ اس معیت و صحبت کی بنا پر ظفر صاحب کو اس کی حرکت سے شرمندگی اٹھانی پڑی۔

جہاں تک حضرت مدنی کی تحریر کا تعلق ہے اس میں دو رائے نہیں ہو سکتی حبیب اللہ خاں یقیناً انگریزوں کے دباؤ میں تھے کوئی بعید نہیں کہ انہوں نے یہ ساری خبریں انگریزوں کو دی ہوں جس طرح حکومت سوفتہ اور انقلابی وفد کی گفتگو پہونچاتے رہتے تھے۔

ریشمی رومال — کچھ وضاحتیں

یہ خطوط جو انگریزوں کے ہاتھ لگے یہ تو مولانا سندھی اور مولانا منصور انصاری صاحب کے تھے۔ یہ مسئلہ وضاحت طلب ہے کہ یہ مولانا سندھی کی ایجاد تھی یا کسی اور کی؟ حضرت شیخ الہند کے نواسے مولوی ہارون صاحب مدرس دارالعلوم دیوبند کی روایت ہے کہ اس سے پہلے سے یہ طریقہ حضرت شیخ الہند نے اختیار فرمایا تھا۔ اور "ریشمی رومال" کسی شخص کے معتمد علیہ ہونے کا مظہر ہوا کرتا تھا اس کی نوعیت یہ ہوتی تھی کہ رومال ہی سے کچھ تار اس طرح نکال دیئے جاتے کہ رومال پر آپ کے دستخط ابھر آتے تھے۔

مولانا سندھی اور منصور انصاری صاحب کے جو خطوط پکڑے گئے، تحریک کے سرگرم رکن خان عبدالغفار خاں نے ان کی نوعیت بتاتے ہوئے کہا ہے کہ۔

"رومال پر بیل بوٹوں کی شکل میں عبارت بن دی گئی تھی۔" (۱۵۷)

انگریزوں کے ہاتھ میں تین خطوط پڑے تھے ان میں ایک مولانا سندھی کا وہ خط تھا جو انہوں نے شیخ عبدالرحیم صاحب کو لکھا تھا۔ دو خط شیخ الہند کے نام تھے۔ ایک مولانا سندھی کا جس میں منظوری وغیرہ کی مفصل اطلاع تھی، دوسرا خط مولانا منصور انصاری کا۔ انہوں نے اپنے خط میں غالب نامہ کی تقسیم وغیرہ امور کی رپورٹ دی تھی۔ ذیل میں ان خطوط کے متعلق کچھ مزید تفصیلات رسالہ آج کل سے نقل کی جارہی ہیں۔

"شیخ عبدالرحیم کے نام خط کی لمبائی چوڑائی — ۵″×۶″ ہے۔

شیخ الہند کے نام مولانا سندھی کے خط کی لمبائی چوڑائی — ۱۰″×۱۵″ ہے

〃 〃 〃 مولانا منصور انصاری 〃 〃 — ۸″×۱۰″ ہے۔

۱۵۷۔ مولانا محمد عثمان فارقلیط (ایڈیٹر) الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر ص ۱۰۹

— یہ تینوں خط انڈیا آفس لائبریری لندن کے پولیٹکل اور سیکریٹ شعبہ میں من وعن محفوظ ہیں۔" (۱۵۸)

رولٹ رپورٹ میں صرف اتنا بتایا گیا ہے کہ۔

"یہ خطوط صاف سفید پیلے ریشم پر لکھے گئے تھے۔" (۱۵۹)

گرفتاریاں اور احتیاطی تدابیر

ان خطوط کے پکڑے جانے سے حکومت کو سارا راز معلوم ہو گیا اگرچہ حضرت شیخ الہند نے انقلاب کی تاریخ کے آخری اعلان سے قبل بہت احتیاط فرمائی تھی اور تمام مراکز کو یہ ہدایت دے دی تھی کہ تاریخ اگرچہ معین ہو چکی ہے لیکن آخری حکم سے پہلے کوئی اقدام نہ کیا جائے۔ خطوط پکڑے جانے کے بعد آخری حکم کا قصہ ہی تمام ہو گیا۔ مراکز کے علم میں اگرچہ تاریخ تھی لیکن انہیں حکم نہ ملا اس لئے پورے ہندوستان میں کہیں کوئی ہنگامہ نہ ہوا۔

انگریزوں نے خط میں انقلاب کی تاریخ کا تعین دیکھ کر تمام احتیاطی تدابیر کر ڈالیں۔ ان ہی احتیاطی تدابیر کا تذکرہ رولٹ رپورٹ میں بھی کیا گیا ہے (۱۶۰)

۱۹ر فروری کی تاریخ سے پہلے پہلے ہندوستان کے انقلابی لیڈروں کو گرفتار کر لیا گیا اور ہر جگہ زبردست انتظام کیا گیا تاکہ کوئی ہنگامہ نہ ہونے پائے۔ (۱۶۱)

اس کے علاوہ انگریزوں نے امیر حبیب اللہ خاں پر زور ڈالا کہ وہ مولانا سندھی اور ان کے رفقاء کو گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالہ کر دیں لیکن نصر اللہ خاں اور امان اللہ خاں کی مداخلت سے حبیب اللہ خاں ان لوگوں کو گرفتار نہ کر سکے۔ مولانا منصور انصاری یہ حالت دیکھ کر کابل چھوڑ دیا غستان جا بسے اور مولانا سندھی کو یکم رمضان ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۹۱۷ء کو ایک تنگ مکان میں لا کر قید کر دیا گیا۔ اس میں بیس پچیس آدمیوں کو رکھا گیا جبکہ دس آدمیوں سے زیادہ کے لئے وہ موزوں نہ تھا۔ سردار سپہ سالار کے سپرد نگرانی تھی اس لئے کسی قدر سہولتیں بھی حاصل ہو گئیں۔ مولانا سندھی وغیرہ وہاں امیر حبیب اللہ خاں کے قتل تک مقید رہے۔ (۱۶۲)

۱۵۸۔ شہباز حسین۔ (ایڈیٹر) رسالہ "آجکل" دہلی جون ۱۹۶۹ء ص ۴۶-۴۵
۱۵۹۔ رولٹ رپورٹ ص ۱۲۶
۱۶۰۔ ص ۱۲۷
۱۶۱۔ مولانا عبدالرحمن صاحب تحریک ریشمی رومال ص ۱۷۷
۱۶۲۔ مولانا عبید اللہ سندھی کابل میں سات سال ص ۷۸

شیخ الہند کا ترکوں کی تکفیر سے انکار

انگریزوں نے ادھر ہندوستان اور کابل میں مقیم انقلابیوں کو اذیت میں مبتلا کیا اور ان پرطرح طرح کی پابندیاں لگائیں۔ ادھر حجاز سے حضرت شیخ الہند کی بھی گرفتاری کی کوشش کی ترکی جسے پروگرام کے مطابق ہندوستان پر حملہ کرنا تھا انگریزوں نے سب سے بڑا حملہ اسی پہ کیا اور یہ چاہا کہ ترکی اس قابل ہی نہ رہ جائے کہ وہ آئندہ ایسی بات سوچ بھی سکے۔ چنانچہ شریف حسین کو آلۂ کار بناکر حجاز میں بغاوت کرادی۔ عامۃ المسلمین کو ترکوں سے متنفر کرنے کے لئے کچھ ضمیر فروش مولویوں کو خرید کر ترکوں کی تکفیر کا فتویٰ دلایا۔

شریف حسین کی بغاوت اور ترکوں کے خلاف شورش سے ہندوستان میں بھی کافی اضطراب تھا۔ یہ بات عام طور پر سمجھی جا رہی تھی کہ یہ سب کچھ انگریزوں کی شہ پر ہو رہا ہے۔ انگریز ہندوستان کے ہیجان کو دبانا چاہتے تھے اس کے لئے اورنگ آباد کے ایک "وفادار حکومت" خان بہادر مبارک علی خاں کو برآمد کیا گیا۔ اور انہیں حجاز بھیج دیا گیا۔ انہوں نے وہاں پہونچ کر ترکوں کی برائی اور شریف کی مدح و ستائش میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے اور شریف سے کہا کہ ہندوستان میں کافی ہیجانی پھیلی ہوئی ہے اسے فرو کرنا ہے اس لئے آپ ترکوں کے خلاف فتویٰ لکھوا کر دیدیں۔ شریف حسین نے اپنے کچھ ہوا خواہ علماء سے فتویٰ لکھوا کر دے دیا لیکن خان بہادر نے کہا کہ ان علماء کو ہندوستان میں کوئی نہیں جانتا اس لئے مناسب ہے کہ حضرت مولانا محمود حسن صاحب جو علماء ہند میں اہمیت اور شہرت کے حامل ہیں ان کے دستخط بھی اس پر کرائے جائیں۔ (۱۶۳)

یہاں ایک بات ہم نظر انداز نہیں کرسکتے کہ خان بہادر خود اپنے بیان کے مطابق انگریزوں کے فرستادہ بن کر حجاز گئے تھے۔ انگریز شیخ الہند کی گرفتاری کے لئے درپے تھے۔ انہیں کوئی بہانہ درکار تھا۔ عجب نہیں کہ فتویٰ پر خان بہادر نے اسی پروگرام کے تحت حضرت شیخ الہند کے دستخط کی اہمیت جتلائی ہو یہ تو جانتے ہی تھے کہ فتویٰ کی تائید آپ کرنے سے رہے، اس لئے خواہ مخواہ شریف پیچھے پڑجائے گا اور انگریزوں کی مشکل آسان ہوجائے گی پھر وہ کسی اور بہانے سے گرفتار کرالیں گے۔

خان بہادر کی اس تجویز کے بعد شریف حسین نے آخر محرم ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۹۱۶ء میں وہ فتویٰ حضرت شیخ الہند کے پاس بھیجا کہ آپ بھی اس کی تائید فرما دیں۔ حضرت نے دیکھا کہ اوپر جلی حرفوں میں ـــ

---

۱۶۳ ـ مولانا سید حسین احمد مدنی اسیر مالٹا ص ۵۸

«من علماء مكة المكرمة المدرسين بالحرم الشريف» (حرم شریف میں پڑھانے والے مکی علماء کی طرف سے) لکھا ہوا ہے اس صراحت کو دیکھ کر حضرت نے فرمایا کہ نہ میں مکی علماء میں سے ہوں اور نہ کبھی حرم شریف میں درس دیا، اس لئے مجھے اس پر کچھ لکھنے کا حق نہیں اس کے علاوہ اس فتویٰ میں چونکہ ترک قوم کی مطلقاً تکفیر کی گئی ہے اور وجہ تکفیر سلطان عبدالحمید خاں کا تخت سلطنت سے اتار دینا دکھایا گیا ہے، سلاطین آل عثمان کی خلافت کا انکار کیا گیا ہے نیز انقلاب اور شورش کو مستحسن بتایا گیا ہے ـــــ از روئے شرع یہ چیزیں میرے نزدیک صحیح نہیں اس لئے تائید سے معذور ہوں۔ (۱۶۴)

شریف حسین کی جانب سے جو صاحب یہ فتویٰ لیکر حضرت شیخ الہند کے پاس آئے تھے حضرت مدنی کی ان سے کسی قدر پہلے سے ملاقات اور شناسائی تھی آپ نے ان سے کہا کہ انکار کی وجہ صرف یہ بتائیں کہ اس پر "مکی علماء کی طرف سے" لکھا ہوا ہے۔ دوسرے اسباب ابھی نہ ظاہر کریں وہ لیکر واپس چلے گئے پھر کوئی جواب نہ لائے۔ البتہ شہر میں حضرت شیخ الہند کے انکار کا چرچا ہوگیا۔ کچھ مقامی علماء جو اس فتوی کے مؤید نہ تھے، حضرت کے انکار سے ان کی ہمتیں بھی بندھ گئیں۔ ادھر شریف نے فتویٰ کی سابقہ عبارت بدلوا کر اس میں سے تکفیر کا جزء خارج کر دیا لیکن دوبارہ حضرت کے پاس نہ بھیجا۔ پہلے جن علماء نے دستخط کئے تھے دوبارہ انہیں کے دستخط سے اس فتویٰ کو اخبار "القبلة" میں شائع کرا دیا اور اسی کی نقل خان بہادر مبارک علی خاں لے کر ہندوستان آگئے۔ (۱۶۵)

دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں کی قطاریں نظر پڑیں

فتویٰ کی تائید سے انکار کے بعد ہی سے یہ خطرہ لگا ہوا تھا کہ کس وقت نہ گرفتاری کا حکم آجائے۔ اس لئے دوسرے لوگوں کے علاوہ خود حضرت شیخ الہند کی بھی خواہش تھی کہ یہاں سے جلد نکل جانا چاہیئے۔ چنانچہ کسی قدر انتظام نکلنے کا ہو بھی گیا تھا کہ اسی دوران شریف حسین برطانوی نمائندہ کرنل ولسن سے ملنے کیلئے جدہ گئے، اس نے کچھ ایسی پٹی پڑھائی کہ شریف نے شیخ الاسلام مفتی عبداللہ سراج کے نام یہ حکم بھیجا کہ مولانا

---

۱۶۴ - مولانا سید حسین احمد مدنی صاحب اسیر مالٹا ص ۵۹
۱۶۵ - " " " ص ۶۰

محمود حسن صاحب اور ان کے رفقاء کو گرفتار کر کے جدہ بھیجدو۔ صبح کو شیخ الاسلام کا نمائندہ حضرت شیخ الہند کے پاس آیا اور اس نے یہ حکم سنا کر تیاری کے لئے کہا۔ حضرت مدنی وغیرہ نے دوڑ دھوپ شروع کی۔ آپ معطوف سید امین عاصم کے پاس پہونچے، گفتگو کے بعد شیخ الاسلام سے بات کرنے کی رائے ہوئی تو امین عاصم صاحب کی معیت میں شیخ الاسلام سے ملنے کے لئے حمیدیہ پہونچے۔ امین عاصم صاحب نے تنہائی میں ان سے بات کی تو انہوں نے فتویٰ سے انکار والی بات دہرادی۔ امین عاصم صاحب نے کہا کہ مولانا حسین احمد صاحب موجود ہیں ان سے انکار کا سبب معلوم کر لیجئے۔ مولانا سے پوچھا گیا تو آپ نے انکار کا سبب "علماء مکہ کی طرف سے" لکھا ہوا بتایا۔ آخر کار دوسرے دن شریف کی آمد تک کیلئے گرفتاری کا مسئلہ ملتوی ہو گیا۔ (۱۶۶)

خیال ہوا کہ رات کے وقت کسی طرف نکل جائیں لیکن حافظ عبدالجبار صاحب دہلوی کی رائے ہوئی کہ شیخ الاسلام سے مولانا کی صفائی ہو جائے تو بہتر ہے۔ انہوں نے اپنے ذرائع سے گفتگو کے بعد مولانا حسین احمد صاحب کو بلا کر کہا کہ اگر آپ شیخ الاسلام کا ہاتھ چوم کر معافی مانگ لیں تو معاملہ رفع دفع ہو جائیگا۔ مولانا نے کہا کہ حضرت کے سر سے یہ بلا ٹالنے کیلئے ہاتھ کیا ہیں پیر چومنے کے لئے تیار ہوں۔ شام کے وقت حافظ صاحب موصوف کے ساتھ گئے اور شیخ الاسلام کے ہاتھ چوم کر معافی مانگ کر مجلس میں ایک طرف بیٹھ رہے۔ کچھ دیر وہاں بیٹھ کر خوش خوش واپس آگئے کہ معاملہ ختم ہو گیا۔ دوسرے دن شریف حسین جدہ سے واپس آگئے تو شیخ الاسلام نے ان سے کہا کہ ان لوگوں نے آکر معافی مانگ لی اس لئے انہیں چھوڑ دیا گیا۔ (۱۶۷)

مولانا حسین احمد صاحب کی گرفتاری

مولانا حسین احمد صاحب پر شیخ الہند کی معیت وصحبت کی وجہ سے ایک جرم یہ عائد ہو گیا کہ وہ حکام کو "انگریزیت زدہ" بتاتے ہیں۔ واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ مولانا حسین احمد صاحب ایک دکان پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص کسی کتاب کی جلد باندھ کر لایا آپ نے اس سے پوچھا کہ کیسی جلد باندھ کر لائے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ انگریزی! اس پر آپ نے فرمایا کہ افسوس ہے کہ اب تو سب چیزیں انگریزی پسند کی جارہی ہیں پہونچانے والے نے اس واقعہ کو حکام تک اس طرح پہونچا دیا کہ مولانا حکام کو انگریزیت پسند کہتے ہیں۔ اس واقعہ کا غبار حکام کے دل میں تھا کہ شریف نے جدہ سے آنیکے بعد سب کی گرفتاری کے متعلق دریافت کیا جب اسے یہ معلوم ہوا کہ ابھی تک گرفتاری عمل میں نہیں آئی تو اس نے سخت غصہ کا اظہار کرتے ہوئے فوراً گرفتاری کا حکم دیا۔ یہ خبر مولانا حسین احمد صاحب وغیرہ کو ملی تو انہوں نے حضرت شیخ الہند اور مولوی وحید احمد صاحب کو فوراً کہیں روپوش کر دیا۔ کچھ ہی دیر کے بعد پولیس کمشنر کا بھیجا ہوا ایک آدمی آیا کہ مولانا حسین احمد صاحب اور مولوی وحید احمد صاحب کو کمشنر صاحب نے طلب کیا ہے وحید صاحب تو موجود نہ تھے، مولانا حسین احمد صاحب کو پولیس کمشنر کے پاس لے گیا اس نے کہا کہ تم انگریزی حکومت کی برائی کرتے ہو۔ اب اس کا مزہ چکھو۔ یہ کہہ کر اس نے مولانا کو قید خانے بھیجدیا۔ (۱۶۸)

---

۱۶۶ - مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی — اسیر مالٹا — ص ۶۶ - ۶۵

۱۶۷ - " " " — ص ۶۷

مولوی عزیز گل اور حکیم نصرت حسین صاحبان کی نظر بندی

مولانا حسین احمد صاحب کی گرفتاری کے بعد پولیس کو پھر شیخ الہند کی تلاش ہوئی۔ قیام گاہ پر پولیس پہونچی تو وہاں صرف مولوی عزیز گل صاحب اور حکیم نصرت حسین صاحب تھے ان پر سختی کی کہ جہاں کہیں بھی حضرت شیخ الہند ہوں ڈھونڈھ لاؤ۔ ان لوگوں نے ناواقفیت کا اظہار کیا، تو انھیں مار ڈالنے تک کی دھمکی دی، پھر بھی کچھ نہ بتایا تو اسی مکان میں حضرت کے ملنے تک کیلئے نظر بند کر دئیے گئے۔ (۱۶۹)

صفائی کی ایک اور کوشش

دہلی کے جو تاجر مکہ معظمہ میں موجود تھے انھوں نے ایک بار پھر کوشش کی کہ معاملہ رفع دفع ہو جائے۔ شریف سے یہاں تک کہا کہ اگر یہ لوگ مجرم ہیں تو ان کو اپنی مملکت میں آپ سزا دے لیں لیکن انگریزوں کے حوالہ نہ کریں شریف نے جواب دیا کہ۔

"انگریزوں سے ہماری دوستی نئی ہے اور ہمیں یہ دوستی قائم رکھنی ہے، ہم نہیں چاہتے کہ اس میں کچھ رخنہ پڑے" یہ کہہ کر اس نے کسی قسم کی رعایت سے انکار کر دیا۔ بیچارے حافظ صاحب وغیرہ ناکام واپس آئے۔ ادھر پولیس حضرت شیخ الہند کی تلاش میں سرگرداں رہی، شام تک نہ ملے تو پھر شریف کو اطلاع دی گئی کہ نہیں مل رہے ہیں، اس نے حکم دیا کہ عشاء کے وقت تک اگر نہ مل جائیں تو دونوں ساتھیوں (مولوی عزیز گل اور حکیم نصرت حسین) کو گولی مار دو اور مطوف سید امین عاصم صاحب کو سو کوڑے لگاؤ اور ان کی مطوفیت چھین لو۔ حضرت شیخ الہند کو ان باتوں کی اطلاع مل گئی، تو آپ نے فرمایا کہ میں پسند نہیں کرتا کہ میری وجہ سے کوئی مصیبت میں مبتلا ہو، جو کچھ افتاد پڑے گی میں خود برداشت کروں گا۔ یہ فرما کر نکلنے کے لئے تیار ہو گئے، تو مخلصین نے کہا کہ احرام باندھ کر نکلیں تاکہ یہ معلوم ہو کہ یہاں موجود نہ تھے۔ آپ نے اسے قبول فرمایا اور احرام باندھ کر قیام گاہ پر آ گئے۔ (۱۷۰)

۱۶۸۔ مولانا سید حسین احمد مدنی۔ اسیر مالٹا۔ ص۔ ۶۸

۱۶۹۔ " " " ص۔ ۶۹

عشق اپنے مجرموں کو پابجولاں لے چلا

مکان پر آنا تھا کہ فوراً ۱۱ اونٹ لائے گئے اور ان پر بٹھا کر روانہ کر دیا گیا۔ احباب و مخلصین سے گلے مل مل کر جدا ہوئے اور فرمایا کہ

" الحمد للہ بمصیبتے گرفتارم نہ بمعصیتے "

یکشنبہ ۲۳ صفر ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۹۱۷ء کی شب میں مسلح سپاہیوں کی حفاظت ونگرانی میں "مقدس مجرمین" کا یہ قافلہ مکہ معظمہ روانہ ہو کر ۲۴ صفر کی صبح کو جدہ پہونچ گیا۔ کیسا مقدس تھا وہ جرم جو حسبۃً للہ کیا گیا تھا اور جس کی پاداش میں انھیں سزائیں جھیلنی پڑیں۔

مولانا حسین احمد صاحب جو پہلے ہی گرفتار کر لئے گئے تھے قید خانے میں انھیں یہ اطلاع ملی کہ حضرت شیخ الہند وغیرہ گرفتار کر کے جدہ بھیج دیے گئے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ خود مولانا موصوف چند دن میں رہا کر دیے جائیں گے۔ یہ سن کر بہت پریشان ہوئے اور ابن عاصم صاحب کے عزیز سید احمد جعفری صاحب جو یہ خبر لائے تھے ان سے کہا کہ میں اپنی رہائی کا خواہاں نہیں، حضرت کی معیت مطلوب ہے، اس لئے آپ کوشش کر کے مجھے بھی حضرت کے ساتھ کرا دیں، انھوں نے آکر کوشش کی اور کامیاب ہو گئے۔ مولانا حسین احمد صاحب پولیس کے ساتھ اپنی قیام گاہ پر پہونچے، اور جس قدر سامان ساتھ لے جانا تھا لے لیا اور بقیہ کو حافظ عبدالجبار صاحب کے سپرد کر دیا۔ اس طرح حضرت شیخ الہند کی روانگی کے دوسرے ہی دن سپاہیوں کی نگرانی میں جدہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ خچر کی رفتار تیز ہوتی ہے اس لئے حضرت کے پہونچنے کے چند گھنٹے بعد مولانا حسین احمد صاحب بھی جدہ پہونچ گئے۔ (۱۷۱)

جدہ پہونچنے پر حضرت شیخ الہند نے مولانا مدنی کو اپنا ایک خواب سنایا کہ "سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا جنازہ رکھا ہوا ہے اور ہم سب لئے جا رہے ہیں، میں یہ سمجھ رہا ہوں کہ آپ کی تجہیز و تکفین وغیرہ امور کا متکفل میں ہوں اور میں یہ سوچ رہا ہوں کہ کیا ہم لوگ آپ کی تجہیز و تکفین سے اچھی طرح عہدہ برآ ہو سکیں گے؟ پھر دیکھا کہ جنازہ ایک جگہ رکھ دیا گیا ہے اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب اس کے سامنے دو زانوں مراقب بیٹھے

۱۷۰۔ مولانا سید حسین احمد مدنی۔ اسیر مالٹا۔ ص۔ ۶۹ - ۷۵

۱۷۱۔ " " " ص۔ ۷۱ - ۷۲

ہوئے ہیں اور میں چاروں طرف تجہیز و تکفین وغیرہ کے انتظام میں پھر رہا ہوں ۔"

اسی دن شام کو سی آئی ڈی انسپکٹر بہاؤالدین نے آکر کہا کہ کل جہاز جا رہا ہے اگر آپ لوگ تیار ہوں تو اس سے روانگی کا انتظام کیا جائے لیکن مکہ معظمہ سے سامان پہونچانے کا انتظار تھا اس لئے اس سے روانگی نہ ہو سکی ۔ بہاؤالدین سے یہ بھی کہا گیا کہ کوشش کریں کہ سرزمین حجاز ہی میں کہیں مقید رکھا جائے ۔ معتمد برطانیہ کرنل ولسن اس وقت موجود نہ تھا آنے کے بعد اس نے یہ ماننے سے انکار کر دیا اور مصر لیجانے کا حکم دیا ۔ پہلا جہاز روانہ ہو چکا تھا مکہ معظمہ سے سامان کے انتظار میں اس سے روانگی نہ ہوئی اس لئے دوسرے جہاز کی آمد تک جدہ میں مقید رہنا پڑا ۔ (۱۷۲)

جدہ سے مصر

تقریباً ایک ماہ تک جدہ میں قیام کرنے کے بعد جمعہ ۱۲ر جنوری ۱۹۱۷ء مطابق ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ کو بذریعہ جہاز جدہ سے روانہ ہوئے اور چار دن کے بعد سہ شنبہ ۱۶ر جنوری ۱۹۱۷ء مطابق ۲۲ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ کی صبح سوئیز پہونچے ۔ اٹھارہ بیس مسلح گوروں نے استقبال کیا اور قریب کے ایک کیمپ میں لیجا کر ٹھہرا دیا اور یہ کہا گیا کہ دوسرے دن مصر روانہ کر دیئے جاؤ گے پہرے کے لئے چند ہندوستانی سپاہیوں کو مقرر کیا گیا اور ہندوستانیوں ہی سے کھانا پکوایا گیا ۔

دوسرے دن علی الصباح مصر جانے کیلئے ریل پر سوار کر دیا گیا ایک ڈبہ میں پانچ قیدیوں پر پندرہ گورے حفاظت کے لئے متعین ہوئے ۔ اسی دن ۱۷ر جنوری کی سہ پہر کو دو بجے ریل گاڑی قاہرہ پہونچ گئی ظہر کی نماز کا وقت تھا سنگینوں کے سایہ میں نماز ادا کی گئی اس کے بعد وہیں ٹھہرے رہے عصر کی نماز بھی اسی طرح ادا کر چکے تو موٹر کے ذریعہ جیزہ کے سیاسی قیدخانہ میں پہونچا دیا گیا ۔ (۱۷۳)

✣

---

۱۷۲ ۔ مولانا سید حسین احمد مدنی ۔ اسیر مالٹا ۔ ص ۔ ۷۳

۱۷۳ ۔ " " " ص ۔ ۷۴ ۔ ۷۶

جیزہ کے قید خانے میں

دریائے نیل کے داہنی جانب قاہرہ اور بائیں جانب جیزہ واقع ہے۔ قاہرہ میں جیل خانہ بن گیا تھا لیکن جنگ کے زمانہ میں جیزہ کے پرانے غیر آباد جیل خانہ کو بسانے کی ضرورت پڑی، چنانچہ "المعتقل السیاسی" (سیاسی قید خانہ) کا نام دے کر جنگی قیدیوں کو اس میں رکھا جانے لگا۔

جیزہ کے قید خانے پہونچنے پر حضرت شیخ الہند اور آپ کے چاروں رفقاء مولینا اسید حسین احمد صاحب، مولانا حکیم نصرت حسین صاحب، مولوی وحید احمد صاحب اور مولوی عزیز گل صاحب کی تلاشی لی گئی۔ چاقو چھری وغیرہ قسم کی جملہ چیزیں رکھوالی گئیں۔ اس کے علاوہ اکیاسی پونڈ اور کچھ نقد روپے تھے انھیں بھی رکھ لیا گیا اور کہا کہ جب ضرورت پڑے منگا لیا کرو۔ رات کو کوٹھریوں میں نہیں رکھا گیا بلکہ چہار دیواری کے اندر ایک خیمہ نصب کرا کر اس میں چار پائیاں ڈال دی گئیں۔ صبح کو چار پائیاں ایک بڑے کمرے میں پہونچا دی گئیں جس میں لوہے کی مضبوط سلاخوں کا دروازہ لگا ہوا تھا۔

کچھ دیر بعد حضرت شیخ الہند کو جیل خانے کے دفتر لے گئے، اس کے بعد وہاں سے شہر کے جنگی دفتر دو سپاہیوں کی حفاظت میں لیجایا گیا۔ وہاں دفتر میں تین انگریز افسران تھے جن میں دو اردو بخوبی سمجھتے اور بولتے تھے۔ ان کے پاس چھپے ہوئے کاغذات کا ایک ڈھیر تھا جس میں حضرت اور آپ کے رفقاء کے متعلق رپورٹیں درج تھیں۔ ان کے سامنے حضرت کو ایک کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ اس کے بعد انگریز افسر نے آپ سے سوالات شروع کئے، آپ نے انتہائی بے التفاتی و بے توجہی مگر ہوشیاری سے ان کے جوابات دیئے۔ مختلف سوالات کے جواب اس خوبصورتی سے ادا کئے کہ اس کے سوال کا جواب بھی دیدیا اور بات کا رخ ابھی بدل دیا۔ ذیل میں یہ سوالات و جوابات نقل کئے جا رہے ہیں۔

افسر۔ آپ کو شریف نے کیوں گرفتار کیا؟

مولانا۔ اس کے محضر پر دستخط نہ کرنے کی بنا پر۔

افسر۔ آپ نے اس پر دستخط کیوں نہ کئے؟

مولانا۔ مخالف شریعت تھا۔

افسر۔ آپ کے سامنے مولوی عبدالحق حقانی کا فتویٰ ہندوستان میں پیش کیا گیا تھا؟

مولانا۔ ہاں

افسر۔ پھر آپ نے کیا کیا؟

مولانا۔ رد کر دیا۔

افسر۔ کیوں؟

مولانا۔ مخالف شریعت تھا۔

افسر۔ آپ مولوی عبیداللہ کو جانتے ہیں؟

مولانا۔ ہاں

افسر۔ کہاں سے؟

مولانا۔ انھوں نے دیوبند میں مجھ سے عرصہ دراز تک پڑھا ہے۔

افسر۔ وہ اب کہاں ہیں؟

مولانا۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں ڈیڑھ سال سے زیادہ ہوا کہ حجاز میں ہوں۔

افسر۔ ریشمی خط کی کیا حقیقت ہے؟

مولانا۔ مجھ کو کچھ علم نہیں، نہ میں نے دیکھا ہے۔

افسر۔ وہ لکھتا ہے کہ آپ اس کی سیاسی سازش میں خلاف برطانیہ شریک ہیں اور فوجی کمانڈر ہیں۔

مولانا۔ وہ اگر لکھتا ہے تو اپنے لکھنے کا خود ذمہ دار ہوگا۔ بھلا میں اور فوجی کمانڈری؟ میری جسمانی حالت ملاحظہ فرمایئے اور پھر عمر کا اندازہ کیجئے۔ میں نے تمام عمر مدرسہ کی مدرسی میں گذاری۔ مجھ کو فنون حربیہ اور فوج کی کمان سے کیا مناسبت؟

افسر۔ اس نے دیوبند میں جمعیۃ الانصار کیوں قائم کی تھی؟

مولانا۔ محض مدرسہ کے مفاد کے لئے۔

افسر۔ پھر کیوں علیحدہ کیا گیا؟

مولانا۔ آپس کے اختلاف کی وجہ سے۔

افسر۔ کیا اس کا مقصد اس جمعیۃ سے کوئی سیاسی امر نہ تھا؟

مولانا۔ نہیں۔

افسر۔ غالب نامہ کی کیا حقیقت ہے؟
مولانا۔ غالب نامہ کیسا؟
افسر۔ غالب پاشا گورنر حجاز کا خط جس کو محمد میاں لے کر حجاز سے گئے اور آپ نے غالب پاشا سے اس کو حاصل کیا!
مولانا۔ مولوی محمد میاں کو میں جانتا ہوں وہ میرے رفیق سفر تھے مدینہ منورہ میں مجھ سے جدا ہوئے وہاں سے لوٹنے کے بعد ان کو جدہ اور مکہ میں تقریباً ایک ماہ ٹھہرنا پڑا تھا۔ غالب پاشا کا خط کہاں ہے، جس کو آپ میری طرف منسوب کر رہے ہیں۔
افسر۔ محمد میاں کے پاس۔
مولانا۔ مولوی محمد میاں کہاں ہیں؟
افسر۔ وہ بھاگ کر حدود افغانستان میں چلے گئے۔
مولانا۔ پھر آپ کو خط کا پتہ کیوں کر چلا؟
افسر۔ لوگوں نے دیکھا۔
مولانا۔ آپ ہی فرمائیں کہ غالب پاشا گورنر حجاز اور میں ایک معمولی آدمی۔ میرا وہاں تک کہاں گذر ہو سکتا ہے۔ پھر میں ناواقف شخص نہ زبان ترکی جانوں، نہ پہلے سے ترکی حکام سے کوئی ربط ضبط۔ حج سے چند دن پہلے مکہ معظمہ پہونچا اپنے امور دینیہ میں مشغول ہو گیا۔ غالب پاشا اگرچہ حجاز کا گورنر تھا مگر وہ طائف میں رہتا تھا، میری وہاں تک رسائی نہ حج سے پہلے ہو سکتی تھی نہ حج کے بعد۔ یہ بالکل غیر معقول بات ہے کسی نے یونہی اڑائی ہے۔
افسر۔ آپ نے انور پاشا اور جمال پاشا سے ملاقات کی؟
مولانا۔ بے شک۔
افسر۔ کیوں کر؟
مولانا۔ جب وہ مدینہ آئے تو صبح کے وقت انھوں نے مسجد نبوی میں علماء کا جلسہ کیا، مجھ کو بھی حسین احمد اور وہاں کے مفتی اس مجمع عام میں لے گئے، اور اختتام جلسہ پر انھوں نے وزیروں سے مصافحہ کرا دیا۔
افسر۔ آپ نے اس مجمع میں کوئی تقریر کی؟

مولانا۔ نہیں۔
افسر۔ کیوں؟
مولانا۔ مصلحت نہ سمجھا۔
افسر۔ مولانا خلیل احمد صاحب نے تقریر کی؟
مولانا۔ نہیں۔
افسر۔ (مولانا) حسین احمد نے کی؟
مولانا۔ ہاں۔
افسر۔ پھر کچھ انور پاشا نے آپ کو دیا؟
مولانا۔ ہاں اتنا معلوم ہوا کہ حسین احمد کے مکان پر ایک شخص پانچ پانچ پونڈ لے کر انور پاشا کی طرف سے آئے تھے۔
افسر۔ پھر آپ نے کیا کیا؟
مولانا۔ حسین احمد کو دیدیا۔
افسر۔ ان کاغذات میں لکھا ہے کہ آپ سلطان ٹرکی اور ایران و افغانستان میں اتحاد کرانا چاہتے ہیں، اور پھر ایک اجتماعی حملہ ہندوستان پر کرا کے ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم کرانا چاہتے ہیں، اور انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنا چاہتے ہیں؟
مولانا۔ میں تعجب کرتا ہوں کہ آپ کو بھی حکومت کرتے ہوئے اتنے دن گذر گئے، کیا آپ گمان کر سکتے ہیں کہ میرے جیسے گمنام شخص کی آواز بادشاہوں تک پہونچ سکتی ہے؟ اور پھر کیا سالہا سال کی ان کی عداوتیں میرا جیسا شخص زائل کرا سکتا ہے؟ اور پھر اگر زائل ہو بھی جائے تو کیا ان میں اتنی قوت ہے کہ وہ اپنے ملک کی ضرورتوں سے زائد سمجھ کر ہندوستان کی حدود پر فوجیں پہونچا دیں؟ اور اگر پہونچا بھی دیں تو کیا ان میں آپ سے جنگ کی طاقت ہوگی؟
افسر۔ فرماتے تو آپ سچ ہیں، مگر ان کاغذات میں ایسا ہی لکھا ہے۔
مولانا۔ اس سے آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ اس میں کی باتیں کس قدر اعتماد کے قابل ہیں۔
افسر۔ شریف کی نسبت آپ کا کیا خیال ہے؟
مولانا۔ وہ باغی ہے۔
افسر۔ حافظ احمد صاحب کو آپ جانتے ہیں؟

مولانا۔ خوبا وہ میرے استاد زادے ہیں، اور بہت سچے اور مخلص دوست ہیں میری تمام عمر ان کے ساتھ گذری۔

انگریز افسر اسی طرح سوالات کرتا رہا اور موصوف ایسے ہی جوابات دیتے رہے ان سوالات و جوابات کے بعد مولانا جب جیل خانہ واپس ہوئے تو ان کو علحدہ کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔ کوٹھری میں سے صبح شام ایک گھنٹہ کے لئے سپاہی ہوا خوری کیلئے نکالتا تھا۔ جب ٹہلنے کیلئے نکالا جاتا تو عام میدان میں جانے کی اجازت نہ ہوتی بلکہ کوٹھریوں کے پیچھے ایک محفوظ جگہ تھی وہیں ٹہلنے کا حکم تھا۔ محافظ ایک شخص کو بند کر کے جاتا ایک گھنٹہ پورا ہونے پر اس کو کھول کر نکال دیتا اور دوسرے کو بند کر دیتا۔ ایک دوسرے سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔

حضرت شیخ الہند کو جب علحدہ کوٹھری میں بند کر دیا گیا تو دوسرے رفقار پریشان ہوئے کیونکہ مشہور تھا کہ جس کو پھانسی دی جاتی ہے اسی کو اس طرح کوٹھری میں بند کیا جاتا ہے۔ ادھر رفقار کو حضرت کی فکر تھی اور خود آپ کو رفقار کی۔ فرماتے تھے کہ بار بار خیال آتا کہ میری وجہ سے تم لوگ تکلیف اٹھا رہے ہو۔ ایک ہفتہ تک ایک دوسرے سے ملنے کا اتفاق نہ ہوا۔ ساتویں دن ہوا خوری کی جگہ پر سب یکجا کئے گئے تو ایک دوسرے کے حالات کا پتہ چلا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ان سات دنوں میں کھانا نہ کھایا تھا صرف چارپی لیا کرتے تھے اور پان کھاتے رہتے۔

شیخ الہند کا بیان لینے کے بعد یکے بعد دیگرے ایک ایک دو دو دن میں دوسرے رفقار کا بھی بیان لیا گیا۔ سب سے آخر میں حکیم نصرت حسین صاحب کا بیان لیا گیا۔ کوٹھریاں چونکہ چار ہی خالی تھیں اس لئے حکیم صاحب کو حضرت کی کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔ انھوں نے پہونچ کر سب کی خیریت سے مطلع کیا اور بتایا کہ سب برابر کی کوٹھریوں میں ہیں۔ تب جاکر حضرت کو قدرے اطمینان ہوا۔ حکیم صاحب کے پہونچنے کے بعد چارپائی پر آرام فرمایا۔ اس سے پہلے پورے عرصہ میں زمین پر کمبل بچھا کر بیٹھ رہے تھے۔ دہیں اوراد و وظائف میں مشغول رہتے۔ کبھی بیٹھے بیٹھے آنکھ لگ جاتی تو لگ جاتی ورنہ چارپائی پر آرام نہ فرماتے۔

انگریز افسر نے مولانا حسین احمد سے سوالات کے دوران کہا کہ تم لوگوں کے

متعلق ہمارے کاغذات میں رپورٹ تو پھانسی کی ہے لیکن تم لوگ اقرار ہی نہیں کرتے۔ عجیب بات تھی باوجودیکہ پہلے سے کوئی پروگرام طے نہ ہوا تھا، نہ سوالات کی نوعیت کا علم تھا، لیکن جوابات سب کے تقریباً یکساں رہے۔ اس قید خانہ میں ایک ماہ رہنے کے بعد مالٹا منتقل کر دیا گیا۔(۱۷۴)

جیزہ سے مالٹا

۱۵، فروری ۱۹۱۷ء مطابق ۲۳، ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ کو جیل کے انگریز کمانڈر نے مولانا کو بلاکر تیاری کا حکم دیا اور بتایا کہ کل تم لوگ مالٹا بھیج دیئے جاؤ گے۔ دوسرے دن ۱۶ فروری کی صبح کو گورہ سپاہیوں کی نگرانی میں موٹر پر بٹھاکر قاہرہ ریلوے اسٹیشن پہونچا دیا گیا۔ اسی وقت ٹرین ملی اور سپاہیوں کی معیت میں ایک تھرڈ کلاس میں بٹھا دیا گیا۔ دن کے ایک بجے ٹرین اسکندریہ پہونچی، اسٹیشن پر ایک بند موٹر لائی گئی اس میں سوار کر کے بندرگاہ پر پہونچا دیا گیا۔ وہاں جہاز لگا ہوا تھا، جہاز کے بالائی حصہ میں ایک بڑے کمرے کے اندران سب حضرات کو پہونچا دیا گیا۔ جہاز میں بھی کمرہ کے دروازہ پر تین گورہ سپاہی پہرے کے لئے متعین تھے۔ کمرے کی کھڑکی اور روشن دان نہ صرف بند تھا بلکہ ان پر لکڑی کے تختے مضبوط کیلوں کے ساتھ جڑ دیئے گئے تھے۔

جہاز کی روانگی سے پہلے کچھ ترکی افسران اور سپاہی لائے گئے، افسران کو نیچے کے اچھے کمروں میں رکھا گیا لیکن سپاہیوں کے لئے شیخ الہند والا کمرہ تجویز ہوا۔ یہ سپاہی حضرت وغیرہ سے بڑے اخلاق سے پیش آتے۔ آپس میں یہ کھیل کود اور گانے بجانے میں مصروف رہتے، انگریز جب ان کے قریب آتے تو یہ اور ترنگ میں آجاتے۔ ان میں سے دو تین سپاہی حضرت کے پاس آئے اور کہا کہ ہم آپ کے سامنے بے ادبی کرتے ہیں، لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم ان دشمنوں کے اسیر ہیں، اگر خاموش رہیں تو یہ ہمیں غمگین سمجھ کر خوش ہونگے، اس لئے ان کو جلانے کے لئے ہم ایسا کرتے ہیں۔ یہ سن کر حضرت نے فرمایا کہ کوئی بات نہیں، ہماری طرف سے اجازت ہے۔ (۱۷۵)

۱۷۴۔ مولانا سید حسین احمد مدنی۔ اسیر مالٹا، ص۔ ۷۶۔ ۹۴

۱۷۵۔ 〃 〃 〃 ص۔ ۱۰۶۔ ۱۰۸

۱۶ ر فروری ۱۹۱۷ء مطابق ۲۴ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ کی شام کو جہاز اسکندریہ سے روانہ ہوا۔ (۱۷۶) اور دوشنبہ ۲۱ ر فروری مطابق ۲۹ ر ربیع الثانی کو مالٹا میں لنگر انداز ہوا۔ جہاز دن کے دس بجے پہونچ گیا تھا لیکن شام تک اتر نے نہ دیا گیا۔ چار بجے کے بعد اتار کر اسارت خانہ لے چلے راستہ میں انگریز عورتیں اور بچے دو رویہ کھڑے تماشہ دیکھتے اور اظہار مسرت کر رہے تھے، شاید اسی لئے چار بجے کے بعد قیدیوں کو جہاز سے اتارا گیا تھا۔ (۱۷۷)

مالٹا کے کچھ حالات

تمام قیدیوں کو جہاں رکھا گیا وہ ایک بہت بڑا قلعہ تھا جو پہاڑ کھود کر بنایا گیا تھا۔ اس کی دیواریں انتہائی مضبوط و مستحکم تھیں۔ اس کے علاوہ گرداگرد خندقیں بھی کھدی ہوئی تھیں۔ اس کے اندر متعدد اچھی عمارتیں بھی بنی تھیں جن میں فوجی اور افسران کے رہنے کا انتظام تھا۔ جنگ کے زمانہ میں خطرناک ترین جنگی مجرموں کو رکھنا ہوا تو خاردار تاروں سے گھیر کر اس کے مختلف حصے کر دئے گئے اور الگ الگ کیمپ بنا دئے گئے، جن میں حسب تجویز قیدیوں کو رکھا جاتا۔ قلعہ کے اندر بہت سے کیمپ تھے اور ہر ہر کیمپ میں بڑی تعداد کے رہنے کا نظم تھا۔ کیمپوں میں مختلف ضروریات کیلئے دکانیں موجود تھیں، شفاخانے اور ڈاک وغیرہ کا بھی نظم تھا۔ (۱۷۸)

تمام کیمپوں میں مقیم قیدیوں کی تعداد تقریباً تین ہزار تھی، جن میں تقریباً نصف جرمنی اور بقیہ ترکی۔ مصری۔ شامی۔ آسٹرین وغیرہ شامل تھے۔ کیمپ میں باقاعدہ داخلہ کے بعد ہر قیدی کو اس کا نمبر بتا دیا جاتا تاکہ وقت ضرورت پر نمبر کیا جا سکے اور کوئی غلطی نہ ہو چنانچہ مولانا وغیرہ کے نمبر حسب ترتیب یہ تھے۔ مولوی عزیز گل صاحب ۲۲۱۵۔ حکیم نصرت حسین صاحب ۲۲۱۶۔ مولانا حسین احمد صاحب ۲۲۱۷۔ مولوی وحید احمد صاحب

۱۷۶۔ مولانا سید حسین احمد مدنی۔ اسیر مالٹا۔ ص۔ ۱۰۹

۱۷۷۔ 〃 〃 〃 ص۔ ۱۱۴

۱۷۸۔ 〃 〃 〃 ص۔ ۱۲۴-۱۱۵

۲۲۱۸ حضرت شیخ الہند ۲۲۱۹ - (۱۷۹)

قیدیوں کے لئے اخبارات کا بھی انتظام تھا۔ لندن ٹائمز۔ ماتان پیرس۔ اور اٹلی کے ایک اخبار کے آنے کی اجازت تھی، مصری اخباروں میں سے الاہرام اور المقطم بھی آ سکتے تھے، ان کے علاوہ کوئی اخبار نہ آسکتا تھا۔ جو لوگ اخبار منگانا چاہتے وہ کیمپ کے آفس میں درخواست دیتے، وہاں سے انتظام کرا دیا جاتا تھا۔ (۱۸۰)

شیخ الہند وغیرہ کو ردگیٹ کیمپ میں رکھا گیا۔ دوسرے دن صبح آفس میں سب کو بلایا گیا اور نام پتہ وغیرہ پوچھنے کے علاوہ ہر شخص کا وزن کر کے کیمپ واپس کر دیا گیا، اور حسب قاعدہ رسد کی چیزیں سب کے لئے جاری کر دی گئیں۔ ذبیحہ کا اعتبار نہ تھا اس لئے گوشت نہ لیتے تھے، بقیہ تمام جنس لے لیتے۔ کچھ دنوں کے بعد اس کی اجازت مل گئی کہ مرغ۔ کبوتر یا خرگوش وغیرہ منگا کر خود ذبح کر لیا کریں۔ لیکن اس میں بھی یہ تاکید تھی کہ سپاہی کے سامنے ذبح کریں۔ (۱۸۱)

ردگیٹ کیمپ میں مولانا وغیرہ ایک ماہ تک رہے۔ یہ کیمپ خندق میں واقع تھا، رہنے کے لئے خیموں کا انتظام تھا اس لئے سخت تکلیف ہوتی تھی، وہاں سردی یوں بھی زیادہ پڑتی تھی، کھلی فضا میں خیموں کے اندر رہنے سے اور تکلیف ہوتی۔ حضرت شیخ الہند کو باوجودیکہ سردی بالکل برداشت نہ ہوتی تھی، مگر اس کے باوجود رات ڈیڑھ دو بجے تک اٹھ جاتے اور ضروریات سے فارغ ہو کر تہجد اور دیگر اوراد و وظائف میں مشغول ہو جاتے۔ (۱۸۲)

ردگیٹ کیمپ سے ایک ماہ بعد عرب کیمپ میں منتقل ہونے کا حکم آیا۔ اس کیمپ میں مولانا وغیرہ سے پہلے ڈاکٹر غلام محمد پنجابی اور ایک بنگالی برہمن سیدار نامی رکھے گئے تھے۔ ان سے مولانا وغیرہ کافی مانوس ہو گئے تھے، اس لئے اولاً تو کوشش کی کہ منتقل نہ ہوں کیونکہ یہ بھی ڈر تھا کہ وہاں شاید نسبتاً زیادہ تکلیف ہو۔ لیکن جب یہ درخواست منظور نہ ہوئی تو

---

۱۷۹ - مولانا سید حسین احمد مدنی اسیر مالٹا۔ ص - ۱۲۶
۱۸۰ - " " " " ص - ۱۲۸
۱۸۱ - " " " " ص - ۱۳۲-۱۳۷
۱۸۲ - " " " " ص - ۱۴۸-۱۴۷

مولانا عُزیر نے ڈاکٹر غلام محمد صاحب اور سیدار صاحب کو بھی ساتھ منتقل کرنے کیلئے درخواست کی جو منظور ہوگئی۔ عرب کیمپ میں پہونچے تو خلاف توقع وہاں کا انتظام بہت اچھا تھا۔ ایک صاف ستھرا بڑا کمرہ رہنے کے لئے دیا گیا اس کے علاوہ دوسری سہولتیں بھی نسبتاً زیادہ حاصل ہوئیں۔ یہ کمرہ کافی کشادہ تھا اس لئے اس کا ایک حصہ نماز کے لئے مخصوص کر لیا گیا۔ (۱۸۳)

ان کیمپوں میں مختلف کام خود کرنے پڑتے تھے۔ قیدیوں میں ہر قسم کے لوگ تھے کچھ لوگوں نے مختلف کاموں کا مشغلہ اختیار کر رکھا تھا چنانچہ وہ دوسروں کے کام کر دیا کرتے اور ان سے اجرت لے لیتے تھے۔ عرب کیمپ میں حضرت وغیرہ نے بھی ایک قیدی کو نصف پونڈ ماہوار پر اپنے کام کے لئے لگا رکھا تھا۔ (۱۸۴)

عرب کیمپ میں حضرتؒ کے معمولات

کیمپ کے تمام قیدی حضرت شیخ الہندؒ کا بہت خیال کرتے تھے ان کے علاوہ دوسرے کیمپوں کے قیدی بھی ملاقات کے لئے آیا کرتے اور انتہائی عزت و اکرام کا معاملہ کرتے تھے۔ شیخ الہند یوں تو ذاتی طور پہ اوراد و وظائف میں مشغول ہی رہتے تھے لیکن قسمت سے سنت یوسفی کے احیاء کا بھی موقع نصیب ہوگیا تھا۔ اسے ضائع نہ فرمانا چاہتے تھے، یوسف کنعانی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو صدیاں بیت گئیں تھیں، اس یوسف زندانی نے بھی امکان بھر سنت یوسفی کا التزام رکھا، ورٌ" ارباب متفرقون خیر ام اللہ الواحد القہار" کے دعوئ استفسار کے ساتھ۔ " یا ایہا الذین آمنوا آمنوا"۔ کے پیغام خداوندی کی بھی دعوت سے لمحہ بھر کیلئے نہ چوکا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ قید خانہ کے بہت سے قیدی نماز باجماعت کے پابند ہوئے اور دوسرے شعائر دینیہ کا اہتمام کرنے لگے۔ ان میں سے کچھ نے حضرتؒ کے دست مبارک پر بیعت بھی کی۔

شیخ الہند کے ذاتی معمولات کا یہ نظام تھا کہ عشاء کی نماز کے بعد تھوڑی دیر جاگتے اور کچھ وظائف پورے کرنے کے بعد ضروریات سے فارغ ہو کر وضو فرماتے اس کے

۱۸۳۔ مولانا سید حسین احمد مدنی۔ اسیر مالٹا۔ ص۔ ۱۴۹

۱۸۴۔ " " " ص۔ ۱۵۴

بعد کبھی کچھ دیر باتیں کر لیتے ورنہ سو جاتے کیونکہ دس بجے کے بعد تمام روشنیاں گل کر دینے کا لازمی حکم تھا اس لئے دس بجے کے بعد سبھی لوگ سو جاتے تھے۔ حضرتؒ کا معمول یہ تھا کہ ایک یا ڈیڑھ بجے شب میں اٹھ بیٹھتے اور دبے پاؤں ضروریات کے لئے کمرہ سے باہر نکل جاتے۔ ضروریات سے فارغ ہو کر وضو فرماتے۔ گرمیوں میں تو خیر گرم پانی کی ضرورت نہ ہوتی لیکن سردیوں میں چونکہ حضرت کو سردی سے تکلیف بہت رہتی تھی اس لئے ٹین کا ٹونٹی دار لوٹا جو چائے بنانے کے لئے ملا تھا اس میں دس بارہ لوٹے پانی آجایا کرتا تھا، اسی میں رات کو گرم کر کے کمبلوں سے لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا جاتا تھا یہ پانی صبح تک گرم رہتا۔ اسی سے جب جب ضرورت ہوتی وضو فرما لیا کرتے۔ نوافل سے فراغت کے بعد صبح تک مراقبہ اور ذکر خفی میں مشغول رہتے۔ نماز صبح سے پہلے اکثر پیشاب کی ضرورت ہوتی، تجدید وضو فرما کر نماز باجماعت ادا کرتے نماز کے بعد وہیں بیٹھے رہتے اشراق کی نماز پڑھ کر کمرے میں تشریف لاتے اس وقت تک آپ کے لئے چائے اور ابلے ہوئے انڈے تیار ہو جاتے تھے۔ ناشتہ سے فارغ ہو کر دلائل الخیرات اور قرآن شریف کی تلاوت فرماتے یا اس پر نظر ثانی کرتے۔ اگر خط لکھنے کا دن ہوتا تو خط لکھتے یا مولوی وحید صاحب کو سبق پڑھاتے رہتے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد پھر چائے پیتے اس کے بعد اگر کسی سے ملنے کے لئے دوسرے کیمپ جانا ہوتا تو تیاری فرماتے یا کوئی خود ملنے کے لئے آجاتا تو اس سے باتیں کرتے۔ گرمی ہوتی تو کمرے میں اور اگر تھوڑی بھی سردی ہوتی تو پھر دھوپ میں قیلولہ فرماتے۔ آرام فرما کر اٹھتے تو پھر ضروریات سے فارغ ہو کر تلاوت قرآن شریف وغیرہ میں مشغول ہو جاتے۔ قرآن شریف بہت زیادہ پڑھتے تھے ظہر کی اذان تک مشغول رہتے اس کے بعد نماز سے فارغ ہو کر اگر صبح کو پڑھانا لیا ہوتا، تو مولوی وحید صاحب کو سبق پڑھاتے۔ مشکوٰۃ شریف، اور ترمذی شریف ساتھ تھی، یہ دونوں کتابیں ختم کرائیں جلالین بھی پڑھاتے تھے۔ اس سے فارغ ہو کر پھر ترجمۂ قرآن پر نظر ثانی فرمایا کرتے تھے۔ ہفتہ میں تین دن ظہر کے بعد دوسرے کیمپوں میں جانے کی اجازت تھی چنانچہ ایک دن روگیٹ کیمپ۔ ایک دن سینٹ کلیمنٹ کیمپ اور ایک دن بلغار کیمپ تشریف لیجایا کرتے۔ اس وقت عموماً رفقاء بھی ساتھ ہوتے۔ عصر کی نماز کے بعد پھر ذکر خفی میں مشغول ہو جاتے اور ہزار دانہ تسبیح چادر یا رومال کے نیچے چھپا کر بیٹھ جاتے۔ اسی دوران کھانا تیار ہو جاتا اور مغرب سے پہلے کھانا کھا کر پھر وظائف میں مشغول ہو جاتے، وہیں چائے پیش کر دی جاتی۔ مغرب کی

نماز کے بعد پھر نوافل سے فارغ ہوکر تسبیح لے کر بیٹھ جاتے۔ اس وقت رفقاء میں سے اگر کوئی پاس جا بیٹھتا تو گفتگو فرما لیتے ورنہ وظائف میں مشغول رہتے۔ کبھی دن میں دس سے بارہ اور کبھی دو سے چار بجے کے دوران کچھ ترکی قیدی ملاقات کے لئے آجاتے اس وقت اپنا کام چھوڑ کر آپ ان کے پاس آبیٹھتے۔ ع

پھر دیکھئے انداز گلفشانی گفتار

انہیں معمولات میں اسارت کا پورا عرصہ گذرا۔ (۱۸۵)

کچھ مراعات

ستمبر یا اکتوبر ۱۹۱۷ء میں حضرت شیخ الہند کو آفس میں بلاکر کہا گیا کہ آپ کے متعلق ہمارے پاس کچھ خصوصی احکام آئے ہیں کہ آپ کے ساتھ بہتر معاملہ کریں۔ اور آپ کے حقوق ایک فوجی کیپٹن کے حقوق کے مانند سمجھیں۔ اس لئے آپ اپنی ضروریات یا کسی قسم کی شکایت ہو تو ہمیں لکھ کر دیں۔ اگر کیمپ بدلنا چاہیں تو وہ بھی بدل دیا جائے گا۔ کیمپ کی تبدیلی کے لئے تو شیخ الہند نے اسی وقت انکار کر دیا البتہ دوسری شکایات کیلئے فرمایا کہ میں کمرہ جاکر وہاں سے لکھ کر کل تک بھیج دوں گا۔ وہاں سے واپس آکر رفقاء سے آپ نے کہا کہ اپنی ضرورتوں کو لکھ کر بھیجو۔ چنانچہ ایک مفصل درخواست بھیجی گئی جس میں مالٹا کی سخت سردی کی وجہ سے وہاں رہنا انتہائی تکلیف دہ اور ناقابل برداشت بتایا گیا۔ نیز بیگناہی کے باعث رہائی کی درخواست کی گئی، اور لکھا گیا کہ اگر رہائی نہ ہو تو کم از کم ہندوستان منتقل کر دیا جائے، یا مصر کے کسی ایسے قید خانے میں رکھا جائے جہاں سردی زیادہ نہ ہو۔ اسکے علاوہ کھانے کے متعلق اور اخراجات کی کمی کی کچھ شکایت کی گئی۔ اس کا نتیجہ اتنا ہوا کہ حضرتؒ کے لئے ایک لوہے کا پلنگ اور اچھے قسم کے گدے کا انتظام ہوگیا۔ نیز پیشاب وغیرہ کے لئے ایک طرف علحدہ چوکی رکھوا دی گئی اس سے پہلے باہر جانا پڑتا تھا جو سخت تکلیف دہ ہوتا تھا۔ (۱۸۶)

۱۸۵۔ مولانا سید حسین احمد مدنی۔ اسیر مالٹا۔ ص۔ ۱۶۰۔ ۱۵۶

۱۸۶۔ 〃 〃 〃 ص۔ ۱۶۷۔ ۱۶۱

مسٹر برن مالٹا میں

اواخر جنوری یا اوائل فروری ۱۹۱۸ء کی ایک صبح سب کو آفس بلایا گیا، وہاں ایک بوڑھا انگریز سب سے ملا۔ یہ گورنر یوپی جیمز مسٹن کا سکریٹری بی برن تھا۔ وہ ہندوستان سے انگلستان جاتے ہوئے وہاں رکا تھا۔ اس نے اردو میں حالات پوچھے اور مولوی عزیز گل صاحب سے کچھ باتیں کیں۔ ان سے کہا کہ آپ ہی مولوی عزیز گل ہیں؟ اس کے بعد کچھ ان کے شہر وغیرہ کی باتیں کیں۔ مولوی صاحب موصوف اور دیگر حضرات کو بھی اس کی واقفیت پر قدرے حیرت ہوئی، اس کے بعد اور سب کو رخصت کر کے حکیم نصرت حسین صاحب کو روک لیا۔ دیر تک ان سے باتیں کرتا رہا اور کچھ سوالات کئے جن کے جوابات اس نے قلم بند کر لئے۔

ہندوستان دار الحرب ہے یا دار الاسلام؟

اسی دن دو بجے حضرت شیخ الہند کو بلایا اور اسی قسم کے سوالات کئے جو مصر میں کئے گئے تھے۔ ایک نیا سوال یہ تھا کہ ہندوستان دار الحرب ہے یا دار الاسلام؟ حضرت نے فرمایا کہ اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ اس نے پوچھا کہ آپ کی کیا رائے ہے؟ آپ نے فرمایا کہ میرے نزدیک دونوں صحیح کہتے ہیں، اس نے حیرت سے کہا کہ یہ کیوں کر ممکن ہے؟ آپ نے فرمایا کہ دار الحرب دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور حقیقت میں یہ دونوں اس کے درجات ہیں جن کے احکام جدا جدا ہیں۔ ایک معنی کی حیثیت سے اس کو دار الحرب کہہ سکتے ہیں دوسرے کے اعتبار سے نہیں، برن نے اس کی وضاحت چاہی تو فرمایا کہ دار الحرب اس ملک کو کہتے ہیں جس میں کافروں کی حکومت ہو اور وہ اس قدر با اقتدار ہوں کہ جو حکم چاہیں جاری کریں۔ برن نے کہا کہ یہ بات تو ہندوستان میں موجود ہے، مولانا نے فرمایا کہ ہاں اس اعتبار سے ہندوستان یقیناً دار الحرب ہے، اس نے دوسری حیثیت پوچھی تو فرمایا کہ جس ملک میں اعلانیہ طور پر شعائر اسلام اور احکام اسلامی کے ادا کرنے کی ممانعت کی جاتی ہو، یہ وہ دار الحرب ہے جہاں سے ہجرت واجب ہو جاتی ہے بشرطیکہ اصلاح کی استطاعت نہ ہو۔ یہ سن کر برن نے کہا کہ یہ بات تو ہندوستان میں نہیں، مولانا نے فرمایا کہ ہاں، دار الحرب جو لوگ نہیں مانتے وہ اسی آخری شکل کو مدنظر رکھتے ہیں۔ (۱۸۷)

دوسرے رفقاء کے بیانات

دارالحرب اور دارالاسلام کے متعلق سوال کے بعد اس نے مختصر طور پر خیریت دریافت کرکے رخصت کر دیا۔ اس کے بعد صبح و شام میں دوسرے رفقاء کو بھی بلاکر بیانات لئے۔ مولانا حسین احمد صاحب نے گرانی اور اخراجات کی قلت کا شکوہ کیا، نیز دوسری ضروریات بیان کیں۔ (۱۸۵) برن نے اپنی گفتگو میں شیخ الہند کو اطمینان دلاتے ہوئے کہا تھا کہ آپ اپنے اہل وعیال کی فکر نہ کریں۔ حکیم عبدالرزاق صاحب ان کو پچاس روپے ماہوار دیتے ہیں (۱۸۹)

حکیم نصرت صاحب کو آزادی کی پیشکش

برن نے حکیم صاحب سے کہا کہ تمہارے اوپر کوئی الزام نہیں ہے میں تم کو چھوڑ سکتا ہوں۔ تم ہندوستان جا سکتے ہو۔ حکیم صاحب نے کہا کہ تنہا رہائی منظور نہیں! برن نے کہا کہ سب کو رہا کرنے کا اختیار مجھے نہیں لیکن تمھیں رہا کر سکتا ہوں مگر حکیم صاحب نے منظور نہ کیا۔ واپسی پر انھوں نے جب شیخ الہند وغیرہ سے بیان کیا تو سب نے ان کو زور دیا کہ چلے جاؤ، لیکن وہ نہ مانے یہاں تک کہ حضرتؒ نے یہ بھی کہا کہ وہاں جاکر ہماری رہائی کی بہتر کوشش کر سکتے ہو، پھر بھی حکیم صاحب تیار نہ ہوئے۔

مزید مراعات

برن نے ان ملاقاتوں کے بعد ان حضرات کے لئے کچھ اور سہولتیں بہم پہونچانے کا انتظام کیا۔ چنانچہ رفقاء کو ڈیڑھ شلنگ یومیہ اور حضرت شیخ کو تین شلنگ یومیہ دئے جانے کی سفارش کی۔ اس کے بعد سے رسد کے بجائے نقد ملنے لگا۔ شمع، صابن، وغیرہ بھی حسب ضرورت مل جاتے۔ سردیوں کے خیال سے کوئلہ پہلے سے زیادہ ملنے لگا۔ کپڑوں کیلئے بھی اس نے کوشش کی۔ چند دن بعد کپڑوں کے کچھ نمونے دکھا کر پسند کرائے گئے۔ اس کے بعد حسب پسند کپڑا بھی مل گیا۔ برن خود کمرہ دیکھنے آیا اور قیام گاہ کا جائزہ لیا۔

۱۸۷۔ مولانا سید حسین احمد مدنی۔ اسیر مالٹا۔ ص۔ ۱۷۹-۱۷۸

۱۸۸۔ " " ص۔ ۱۸۰

۱۸۹۔ مولانا سید حسین احمد مدنی۔ اسیر مالٹا۔ ص ۱۸۵

وہاں رکھی ہوئیں کتابیں الٹ پھیر کر دیکھیں، اور کچھ باتیں کر کے ضروریات کی طرف سے اطمینان دلا کر چلا گیا۔ (۱۹۰)

حکیم نصرت حسین کا انتقال

حکیم نصرت حسین صاحب دیوبند کے فاضل تھے اور حضرت شیخ الہند سے غایت درجہ تعلق و محبت رکھتے تھے۔ سفر حجاز میں گو ساتھ نہ گئے تھے لیکن بعد میں حج کے ارادے سے گئے تو حضرت کے پاس ہی رہ گئے۔ سرکاری رپورٹ میں ان کے خلاف کوئی جرم نہ تھا۔ اس لئے ایک مرتبہ جدہ سے روانگی کے وقت سی آئی ڈی انسپکٹر بہاؤالدین نے، دوسری مرتبہ مالٹا میں مسٹر برن نے رہا کر دینے کی پیش کش کی لیکن انھوں نے حضرت کی معیت پر رہائی کو ترجیح نہ دی، قیام مالٹا کے دوران حضرتؒ کی بہت خدمت کی۔ حضرتؒ بھی آپ کا بہت خیال فرماتے تھے۔ رجب ۱۳۳۶ھ مطابق ۱۹۱۸ء میں تپ ولرزہ شروع ہوا۔ پورے شعبان یہی حال رہا، علاج سے کچھ افاقہ نہ ہوا اسی حالت میں رمضان آگیا، رمضان میں حالت زیادہ خراب ہوئی تو ڈاکٹر کو دکھایا گیا، روزوں کی وجہ سے دوا دن میں استعمال نہ کرتے جو دوائیں ہوتیں انھیں رات میں استعمال کرتے، مگر افاقہ نہ ہوا، تو عید کے بعد ڈاکٹر نے اسپتال لیجانے کے لئے کہا، تو شیخ الہند وغیرہ نے کہا کہ یہیں رکھ کر علاج کیا جائے، مگر ڈاکٹر نے کمرہ میں اچھی طرح علاج نہ ہونے کا عذر کیا۔ آخر یہ کہا گیا کہ دوسرے رفقا میں سے کسی کو ساتھ رہنے کی اجازت دی جائے، اس کے لئے بھی تیار نہ ہوا۔ روزانہ ملاقات تک کے لئے روادار نہ تھا۔ بڑی مشکل سے تیسرے دن دو بجے کے بعد جاکر مل لینے کی اجازت دی گئی۔ اسپتال میں اگرچہ اچھی طرح علاج ہوتا رہا لیکن حالت دن بدن ابتر ہوتی گئی۔ اس دوران ہر تیسرے دن رفقا دیکھنے کیلئے جاتے رہے۔ آخر شوال میں حالت بہت ہی خراب ہوگئی، تو ایک بار پھر کوشش کی گئی کہ دیکھ بھال کیلئے ایک آدمی کو وہاں رہنے کی اجازت دی جائے، ۲ ذی الحجہ کو اجازت مل گئی، لیکن اس میں بعض قواعد کی پخ لگا کر مزید دو دن کی

۱۹۰۔ مولانا سید حسین احمد مدنیؒ : اسیر مالٹا۔ ص۔ ۱۸۸-۱۸۹

تاخیر کردی گئی ۔ ۹ر ذی الحجہ ۱۳۳۶ھ مطابق ۱۹۱۸ء کی صبح اجازت لیکر اسپتال جانے کیلئے گئے تو معلوم ہوا کہ رات انتقال ہوگیا ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔

کمانڈر نے حضرت اور دیگر رفقار کو بلاکر کہا کہ چونکہ ان کا مرض (نمونیہ) متعدی مرض ہے ۔ اس لئے تمہیں نعش نہ ملے گی ۔ قبرستان میں رکھی رہنے گی تم لوگ دور سے نماز پڑھ لینا ۔ تجہیز و تکفین کے لئے ہرچند اصرار کیا گیا لیکن نہ مانا، کافی رد و قدح کے بعد اس پر تیار ہوا کہ کفن پہنا دیا جائے ۔ اجازت ملنے کے بعد پچاس ساٹھ آدمیوں نے شیخ الہند کی امامت میں نماز جنازہ ادا کی، اس کے بعد مالٹا کے اسلامی قبرستان میں دفن کر دیا گیا ـــــ حضرت شیخ الہند پر حکیم صاحب کے انتقال کا بہت اثر تھا ۔ (۱۹۱)

ہندوستان میں رہائی کی کوشش

حضرت شیخ الہند اور آپ کے رفقار کی گرفتاری آخر صفر ۱۳۳۵ھ مطابق ۱۹۱۷ء میں ہوئی تھی، حج کا زمانہ ختم ہوچکا تھا اس لئے حاجیوں کے قافلے واپس آچکے تھے ۔ ہندوستان میں گرفتاری کی کوئی اطلاع نہ ملی یہاں تک کہ جب قاہرہ سے بعض رفقار کے خطوط ہندوستان پہونچے تب یہ اطلاع اہل ہند کو ملی ۔ (۱۹۲)

ہندوستان میں یہ خبر پہونچتے ہی سخت اضطراب پیدا ہوا اور رہائی کیلئے دوڑ دھوپ کی جانے لگی ۔ ملک کے ہر حلقہ کی طرف سے رہائی کے مطالبے ہوئے، جلسے کئے گئے اور عرضداشتیں بھیجی گئیں ۔ ان کوششوں میں سب سے زیادہ منظم اور قابل قدر کوششیں ڈاکٹر انصاری مرحوم نے کیں، ڈاکٹر صاحب موصوف نے ایک مستقل انجمن "انجمن اعانت نظر بندان اسلام" کے نام سے قائم کی جس کی مختلف شاخیں حسب تفصیل ذیل ملک میں قائم کی گئیں ۔

---

۱۹۱ ۔ مولانا سید حسین احمد مدنی ۔ اسیر مالٹا ۔ ص ۔ ۱۹۸، ۱۹۳!

۱۹۲ ۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری ۔ شیخ الہند ۔ ص ۔ ۲۶ ۔ شائع کردہ انجمن اعانت نظر بندان اسلام ۔

صدر دفتر انجمن اعانت نظربندانِ اسلام - دہلی

صدر	راجہ سردار محمد علی خاں آف محمود آباد
جنرل سیکرٹریان	ڈاکٹر مختار احمد انصاری - ڈاکٹر عبد الرحمان
ممبران	حکیم اجمل خاں - حکیم عبد الرحمٰن

- صوبہ پنجاب میں -

آنریبل میاں فضل حسین بیرسٹرایٹ لا - محمد محسن شاہ -
آغا محمد صفدر -

صوبہ	ضلع	
صوبہ یو - پی - مغربی -	علیگڈھ -	خواجہ عبد المجید صاحب - تصدق احمد
"	" - اٹاوہ -	غلام پنجتن
" مشرقی	الہ آباد -	سید رضا علی وکیل - ظہور احمد بیرسٹرایٹ لا
" "	بنارس -	عبد الواحد خاں وکیل - محمد وسیع وکیل
" "	گورکھپور -	شاکر علی بیرسٹرایٹ لا
" "	غازی پور	قمر احمد
روہیلکھنڈ	مراد آباد	مولوی محمد یعقوب وکیل - مسعود الحسن بیرسٹرایٹ لا
	"	معظم علی خاں - عبد السلام رئیس
"	بریلی	عزیز احمد خاں وکیل
اودھ	لکھنؤ	آنریبل سید وزیر علی - نواب ذوالقدر جنگ بہادر
"	بارہ بنکی	شیخ ولایت علی وکیل
"	فیض آباد	محمد فائق وکیل
صوبہ بہار	پٹنہ	آنریبل مولوی فضل الحق - آنریبل مولوی ابوالقاسم
"	"	قاضی عبد الغفار ایڈیٹر جمہور - مولوی محمد اکرام ایڈیٹر محمدی
صوبہ مدراس		آنریبل سیٹھ یعقوب حسن وکیل -
بمبئی		محمد علی جناح - عمر سبحانی
سندھ		آنریبل غلام محمد بھورگری - انور محمد وکیل

غلام علی چاغلا ۔ (۱۹۳)

انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر انصاری نے انجمن مذکور کے درج ذیل اغراض و مقاصد کا اعلان کیا تھا ۔

۱۔ نظربندان اسلام کی رہائی کے لئے ہر قسم کی آئینی جد وجہد جاری کرنا ۔
۲۔ ایسی تدابیر عمل میں لانا جن سے جلد نظربندان اسلام کی رہائی ہوسکے ۔
۳۔ انجمن کی شاخیں صدر دفتر کے ماتحت ہر حصۂ ملک میں قائم کرنا جو باضابطہ اور مؤثر تحریک جاری رکھیں ۔
۴۔ ہر حصۂ ملک میں خواہ وہ قصبہ ہو یا قریہ جہاں بھی مسلمان آباد ہوں نظربندان اسلام کی رہائی کیلئے جلسے کرنا اور مطالبے کے تار وائسرائے اور وزیر ہند کو بھیجنا ۔
۵۔ جلسوں کی پوری کارروائی اخباروں اور صدر دفتر انجمن دہلی کو بھیجنا ۔
۶۔ جلسوں میں نظربندان اسلام کی اعانت کے لئے چندہ جمع کرنا ۔
۷۔ کافی رقوم وصول ہو جانے کے بعد صدر دفتر سے نظربندان اسلام کی امداد کرنا، اور آئینی جد وجہد جاری رکھنے کے لئے اخراجات ادا کرنا ۔
۸۔ وائسرائے کے پاس وفود لے جانا ۔
۹۔ اخباروں میں نظربندان اسلام کے صحیح حالات شائع کرنا ۔
۱۰۔ نظربندان کے متعلق میموریل تیار کرنا، اور کونسلوں اور دیگر اکابر ملک کو مطلع کرنا ۔ (۱۹۴)

انجمن مذکور نے حسب ذیل اپیل شائع کی ۔

قوم کو اپنے مقاصد اور مطالبے کی پامالی اور توہین کا پورا احساس ہوگیا ہے، اور اب ہماری حالت ہمیں مجبور کر رہی ہے کہ ہم پوری ہمت اور کامل استقلال کے ساتھ اپنے اہم قومی فرض کو انجام دیتے رہیں ۔ ہم اپیل کرتے ہیں کہ جن برگزیدہ بندوں نے قوم کی بہبود اور فلاح کے لئے گرفتار مصیبت ہو جانا اور نظربندی کی زندگی بسر کرنا گوارا کیا،

۱۹۳۔ مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری ۔ تذکرہ شیخ الہند ۔ ص ۲۰۶ ۔ ۲۰۵
۱۹۴۔ " " " " ۔ ص ۲۰۷

اور جنھوں نے قوم اور محض قوم کی خاطر اپنا مال و متاع اور عیش و آرام نثار کر دیا آخر ان کی ضروریات زندگی اور کچھ علائق بھی تو ہیں ؟ کیا اس طرف سے غافل رہنا اور اسیران بلا و گرفتاران آلام کو ان کی حالت پر چھوڑ دینا اور خود عیش و راحت کی زندگی بسر کرنا ہمارے لئے شرمناک نہیں ہے ؟ کیا ان مبتلایان رنج و محن کا اتنا بھی ہم پر فرض نہیں ہے کہ ہم ان کی ذاتی ضروریات کا خیال و لحاظ کریں ؟ اگر ہے تو افراد قوم کو اس میں بھی حصہ لینا ایک اخلاقی فرض سمجھنا چاہئے۔ امید ہے کہ باحمیت افراد قوم اور دردمند مسلمان اس طرف توجہ دیں گے۔ وما علینا الا البلاغ۔

خادمان قوم۔ مختار احمد۔ محمد عبد الرحمٰن۔

جنرل سکریٹریان۔ دفتر انجمن اعانت نظر بندان اسلام۔

دہلی۔ (۱۹۵)

انجمن مذکور نے ایک چوالیس صفحہ کا کتابچہ حضرت شیخ الہند کے حالات اور گرفتاری و اسارت مالٹا وغیرہ کے واقعات پر مشتمل شائع کیا تھا اس کے علاوہ اپنے مذکورہ مقاصد کے تحت ملک میں رہائی کے لئے کوششیں کی تھیں۔ انجمن کے شائع کردہ کتابچہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ذمہ داران انجمن، ارباب اہتمام دار العلوم دیوبند سے (شاید کسی غلط فہمی کی بنا پر) کچھ غیر مطمئن سے تھے۔

مولانا عبد الباری صاحب فرنگی محلی اور راجہ صاحب محمود آباد نے وائسرائے کو مولانا کی رہائی کیلئے تار دیئے انجمن کی درخواست پر سید وزیر حسن صاحب۔ سید رضا علی صاحب اور سید آل نبی صاحب نے کونسل میں گرفتاری کے متعلق تفصیلات بتانے اور رہا کرنے کے مطالبے کیے۔ (۱۹۶) کونسل کے سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا گیا کہ:

"مولانا محمود حسن صاحب اس وقت مالٹا میں ایک جنگی قیدی کی حیثیت سے اسیران جنگ کے کیمپ میں جس کا نام افضل خاں کیمپ ہے، رکھے گئے ہیں۔ صوبہ متحدہ کی گورنمنٹ کو خبر ملی ہے کہ مولانا کی گرفتاری ہندوستان کے حدود کے باہر عمل میں لائی گئی ہے، کیوں کہ تحریری اور دیگر اقسام کی شہادتوں سے صاف پایا جاتا ہے کہ انھوں نے ہز مجسٹی ملک معظم

۱۹۵۔ مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری۔ تذکرہ شیخ الہند۔ ص۔ ۲۰۸

کے دشمنوں کو ان کی فوجی تجاویز میں مدد دی۔" (۱۹۷)

۱۷ر نومبر ۱۹۱۷ء کو علماء دیوبند کا ایک وفد سر جیمز مسٹن سے ملا۔ یہ وفد مولانا حافظ احمد صاحب کی سربراہی میں گیا تھا اور اس میں دارالعلوم کے پندرہ اساتذہ شریک ہوئے تھے۔ وفد نے حضرت شیخ الہند کی رہائی کے سلسلہ میں درخواست پیش کی اور زبانی بھی گفتگو کی۔ (۱۹۸) اس ملاقات میں وفد نے جو درخواست پیش کی تھی اسے ذیل میں ہم رسالہ القاسم دیوبند سے نقل کر رہے ہیں۔ درخواست سے قبل مختصر نوٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ علماء دیوبند کے وفد کے متعلق کچھ لوگوں کو غلط فہمی یا بدگمانی تھی۔ اس کے ازالہ کیلئے یہ پوری درخواست شائع کر دی گئی ..... درخواست یہ ہے۔

"حضور والا۔ ہم چند خدام دارالعلوم دیوبند بحیثیت ایک خالص مذہبی جماعت کی مرکزی نمائندگی کے آج ایک ایسے اہم مسئلہ کی طرف ہز آنر کی توجہ گرامی منعطف کرانا چاہتے ہیں جو اپنی بعض سیاسی حیثیات سے اگرچہ دائرۂ بحث کے اندر داخل نہ ہو لیکن اس کا وہ مذہبی پہلو جس کا تعلق دارالعلوم سے اور دارالعلوم کی کارکن جماعت سے اور دارالعلوم کی مدد کرنے والے عام مسلمانوں سے ہے کسی وقت بھی نظر انداز نہیں ہوسکتا۔

حضور والا — ہم اپنی اسی فطری سادگی اور صفائی کی راہ سے (جس نے ایک دراز تکلف مذہب کے سایہ میں تربیت پائی ہے اور جس کو ہز آنر کی مہربانی سے گورنمنٹ کے عمل نے بھی آجتک مرہون ضوابط نہیں بنایا) اس وقت جو کچھ نہایت مؤدبانہ گذارش کریں گے ممکن ہے کہ وہ حالات حاضرہ پر نظر کرتے ہوئے تھوڑی دیر کیلئے ہز آنر کے یا گورنمنٹ کے بعض دوسرے اعلیٰ حکام کے مزاج کو منغض بنا دے۔ لیکن سچ یہ ہے (اور سچ ہی ہم کو ہمیشہ کہنا چاہئے) کہ حالات حاضرہ ہی وہ چیز ہیں جنھوں نے ہم کو ایک ایسے معاملہ میں دخل دینے کی ہدایت کی ہے جس میں اگر ہم کامیاب ہو جائیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ یہ مسلمانان ہند کے واحد مذہبی مرکز کا سب سے بڑا اعزاز اور ہندوستان کی عام پبلک کے حق میں نہایت ہی تسکین و اطمینان کا باعث اور خود حکام گورنمنٹ کے لئے بھی بجائے اس وقتی تکدر کے بڑی حد

---

۱۹۶ ۔ اخبار مدینہ بجنور ۱۷ ستمبر ۱۹۱۷ء

۱۹۷ ۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری۔ شیخ الہند۔ ص۔ ۲۹۔ ۳۰ (شائع کردہ انجمن اعانت نظر بندان اسلام)

تک حقیقی راحت وسہولت حاصل ہونے کی ضمانت اور اس کی مدبرانہ حکمت عملی کا جس سے کہ عام اہل اسلام کے قلوب مسخر ہو جائیں ایک گہرا ثبوت ہوگا۔

ہماری جماعت کے محسن شفیق ہز آنر سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ حضرت مولینا محمود حسن صاحب صدر مدرس کی غیر متوقع نظر بندی سے (خواہ وہ گورنمنٹ کے نزدیک کیسی ہی قوی دلائل پر مبنی ہو) دارالعلوم کی اجتماعی حالت کو ایک صدمۂ عظیم برداشت کرنا پڑا ہے اور اب بار بار ان کی رہائی کی امیدیں قائم کرتے رہنے کے بعد دارالعلوم کے دوست اور اس کے کثیر التعداد مستفیدین ان کی طویل مفارقت سے نہایت ہی بیچین اور شکستہ خاطر ہوکر دارالعلوم کی مرکزی حیثیت اور اس وفد کے سالار قافلہ شمس العلماء مولانا مولوی حافظ محمد احمد صاحب کے رسوخ و وجاہت خداداد سے اپنی آخری امید وابستہ کئے ہوئے ہیں جس میں اولاً خدا کی رحمت اور ثانیاً ہز آنر کی عنایات خاصہ سے توقع ہے کہ وہ مایوس نہ کئے جائیں گے۔

اس بات کے اظہار کی ہم چنداں ضرورت نہیں سمجھتے کہ ہماری جماعت ایک قدامت پسند جماعت ہے جس کو قدرتی طور پر طلب حقوق یا عرض مدعا کے نئے نئے طور وطریق سے جو آج کل مروج ہیں قطعاً مناسبت نہیں۔

پھر نہ تو ہمارے ہم مشرب آنریبل موجود ہیں جو کونسلوں میں ہماری خواہش کے متعلق مسلسل جدوجہد جاری رکھیں اور نہ انگریزی تعلیم نے ہمارے دماغوں کو ایسا منور بنایا ہے کہ اپنی معروضات کو منوانے کے لئے ہم آئرلینڈ یا کم از کم نیشنل کانگرس کی کورانہ تقلید میں آئینی یا غیر آئینی ایجی ٹیشن برپا کر نے لگیں جس کو ہم اپنی کمزوری کی وجہ سے ادب حکومت کے متعلق سخت ناعاقبت اندیشی سے تعبیر کرتے ہیں۔

ہم کو بلاشبہ خیر خواہانہ مشورہ دیا گیا تھا کہ قانون کی حدود میں رہ کر ہی شور وغل مچاؤ تو تمھارے نظر بند بھی مسز اینی بسنٹ کی طرح آزاد کر دیے جائیں گے لیکن خواہ ہم کو کوئی خوشامدی اور ڈرپوک کہے یا دور اندیش اور سمجھدار۔ ہم نے یہی کہا کہ اول تو عام نظر بندوں کے معاملہ میں مسز اینی بسنٹ کی نظیر ہماری پوری رہنمائی نہیں کرتی۔ دوسرے اگر ہم چند تیز ریزولیوشن پاس کر کے اور دو چار تار حضور وائسرائے بہادر اور سیکریٹری آف اسٹیٹ کی خدمت میں بھیج کر غوغائے عام میں

۱۹۸۔ اخبار مدینہ بجنور ۲۵ نومبر ۱۹۱۷ء

شریک بھی ہو جائیں تو اس کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہوتا ہے کہ ہم اپنے خاموش مسلک پر ثابت قدم رہنے سے جو کچھ فائدہ حاصل کر سکتے تھے اس کو بھی ہاتھ سے کھو بیٹھیں۔

حضور والا۔ یہ نکتہ خاص طور پر ہزآنر جیسے بیدار مغز حاکم کی توجہ کے قابل ہے کہ مسز اینی بسنٹ کے واقعہ سے جو یوروپین الیسوسی ایشن کے ذہین ارکان کو یہ خیال پھیل جانے کا اندیشہ پیدا ہوا ہے کہ گورنمنٹ کے دربار میں بے ادب شور وغل مچانے اور ایجی ٹیشن برپا کرنے والے بہ نسبت مہذب اعتدال پسندوں کے زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔ اگر یہ اندیشہ کسی درجہ میں وزن رکھتا ہے تو اس کی تلافی کا طریقہ بھی غالباً اس سے بہتر اس وقت کوئی نہ ہوگا کہ گورنمنٹ ایک بالکل خاموش اور سیاسیات سے محض بیگانہ جماعت کی استدعا پر حضرت مولینا محمود حسن صاحب کو فوری آزادی مرحمت فرما کر ہماری کل جماعت بلکہ کل اسلامی پبلک کے قلوب سے خراج منت پذیری واحسان شناسی وصول کرے اور اپنے اس طریق عمل سے عام طور پر ثابت کر دے کہ خاموش امن پسند بھی ایجیٹیٹروں سے زیادہ کامیاب ہو سکتے ہیں۔

حضور والا۔ بتیس چالیس برس کے کامل تجربہ کے بعد ہم کو یہ کہنے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کہ حضرت مولانا محمود حسن صاحب ساری عمر تمام جماعت دیوبندہی کی طرح سیاسی الجھنوں سے الگ تھلگ رہے نہ تو وہ کوئی وطن پرست آدمی ہیں نہ قوم پرست بلکہ ایک سچے خدا پرست انسان ہیں اور انسان جب تک انسان ہے سہو ونسیان اور غلط فہمی کا شکار ہو سکتا ہے۔ لیکن ایک پاکباز انسان بدنیت نہیں ہو سکتا ہے۔ اسی لئے ہمارے واسطے اپنے سابق چہل سالہ تجربہ اور حضرت مولینا کے قلم کی لکھی ہوئی بعض تحریروں پر نظر کرتے ہوئے گورنمنٹ صوبہ جات

متحدہ کا یہ اعلان کہ تحریری اور دوسری قسم کی شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ مولانا محمود حسن صاحب نے ہز مجسٹی ملک معظم کے دشمنوں کو ان کی فوجی تجاویز میں مدد دی"۔ اگرچہ نہایت ہی حیرت انگیز اور رنج دہ ہے لیکن جب کہ ان تحریری اور دوسری قسم کی شہادتوں سے واقف ہونے اور ان کے پرکھنے کا ہمارے لئے کوئی موقع نہیں ہے تو ہم راستہ کو مختصر کرنے کیلئے صرف اسی قدر گذارش کرنا چاہتے ہیں کہ اگر حضرت مولانا ممدوح کی آواز گورنمنٹ کے کانوں میں چند سیاسی لوگوں کی آواز کے ساتھ ملتبس ہو کر پہونچی ہے تب بھی وہ از راہ کرم گستری ورعایا نوازی ایک ایسی شخصیت کے آزاد کرنے میں دریغ نہ کرے جس کی آزادی سے ایک عظیم الشان جماعت اسلام کے جذبات

اسیر احسان ہو جائیں گے، اور دار العلوم کے در و دیوار میں سے عمیق شکر گذاری کا ایک ایسا ابلتا ہوا جوش نظر آئیگا جو شاید اس سے پہلے کبھی نظر نہ آیا ہو۔

ہم کو یور آنر کے ان وسیع اخلاق و الطاف سے جو آج تک ہماری جماعت کی نسبت کام فرمائے گئے ہیں کامل یقین ہے کہ ہماری یہ عرضداشت بے اثر نہیں جائیگی، اور یور آنر کوئی ممکن مہربانی اس معاملہ میں اٹھا کر نہیں رکھیں گے۔ اخیر میں ہم سمع خراشی کی معافی چاہتے ہوئے دعائے کامیابی و فلاح پر اس ناچیز تحریر کو ختم کرتے ہیں۔

ہم ہیں آپ کے صادق خیر اندیش اور وفا کیش

علماء دیوبند۔

۱۸ محرم ۱۳۳۶ھ مطابق ۶ نومبر ۱۹۱۷ء۔ (۱۹۹)

جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں ڈاکٹر انصاری وغیرہ نے اس وفد کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہ دیکھا۔ نتائج کے اعتبار سے یہ وفد بے اثر ثابت ہوا۔ اور رہائی کی کوئی سبیل نہ نکل سکی جیمز مسٹن نے اس درخواست کا جواب دیا کہ۔

"میں اس مجلس میں جو کچھ کہونگا صاف اور صحیح کہوں گا مجھ سے میرے خاص دوستوں نے اس باب میں کہا لیکن میں نے ان سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ مولانا کی نظر بندی ہمارے یہاں اور ہمارے حکم سے نہیں ہوئی۔ شریف نے گرفتار کر کے ہمارے حوالہ کیا ہے وہاں کوئی بات ہوئی ہو گی۔" (۲۰۰)

یہاں یہ تضاد محل نظر ہے کہ کونسل میں سوالات کا جواب دیتے ہوئے کہا گیا تھا کہ مولانا محمود حسن صاحب نے مخالف برطانیہ مملکتوں سے تعاون کیا یہی ان کی گرفتاری کا سبب تھا لیکن علماء دیوبند کے وفد کی درخواست کا جواب یہ دیا گیا کہ گرفتاری کا تعلق ہم سے نہیں، شریف حسین نے گرفتار کیا ہے گویا مجرم شریف حسین کے ہوئے اور سزا حکومت ہند دے رہی تھی۔

انجمن اعانت نظر بندان اسلام اور علماء دیوبند کی کوششوں کے علاوہ ملک کی مختلف

۱۹۹۔ مولانا حبیب الرحمٰن۔ مدیر رسالہ "القاسم"۔ ص۔ ۶ - ۸ دیوبند شعبان ۱۳۳۶ھ ج۔ ۱۔ شمارہ ۹

۲۰۰۔ الخلیل بجنور۔ ۲۴/ فروری ۱۹۱۸ء

برسرآوردہ شخصیتوں نے احتجاج کئے اور رہائی کے مطالبے کرتے رہے لیکن حکومت نے ان کا اثر قبول نہ کیا۔

حضرت شیخ الہندؒ کی گرفتاری کے بعد تحریک

ہندوستان میں ریشمی خط کا راز فاش ہونے اور کچھ دنوں بعد حجاز میں حضرت شیخ الہند کی گرفتاری کے بعد انقلاب ہند کا وہ منصوبہ جو شیخ الہند اور دوسرے حضرات نے مل کر بنایا تھا، ناکام ہو گیا۔ اور بظاہر آزادی کا خواب جلد شرمندۂ تعبیر ہونے کی کوئی صورت باقی نہ رہی۔ ادھر ترکی جو اس منصوبہ میں سب سے اہم حیثیت کا حامل تھا وہ انگریزوں کی زد میں آگیا۔ لے دے کر افغانستان سے کسی قدر امید کی جا سکتی تھی، وہ بھی محدود پیمانہ پر مگر واقعات بتاتے ہیں کہ اس نے بھی کچھ ساتھ نہ دیا۔ ظفر حسن ایبک کی آپ بیتی کے مطالعہ سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ افغانستان کی ہندوستان کے ساتھ ہمدردی زبانی جمع خرچ سے زیادہ نہ تھی۔ اس نے جس حد تک ساتھ دیا وہ صرف اپنا مقصد نکالنے کے لئے۔

حضرت شیخ الہند حجاز میں گرفتار کر لئے گئے اور مولانا سندھی کو انگریزوں نے کابل سے گرفتار کرنا چاہا۔ امیر حبیب اللہ خاں کی چلی ہوتی تو یقیناً مولانا سندھی بھی انگریزوں کے ہاتھ لگ جاتے۔ پھر بھی انھیں افغانستان ہی میں نظر بند کر دیا گیا جہاں وہ حبیب اللہ خاں کے قتل کے بعد تک رہے۔ امیر امان اللہ خاں نے تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہونے کے بعد ایوان شاہی میں باریابی دی۔ اور پرانی ملاقاتوں کی یاددہانی کیلئے مولانا سندھی سے مخاطب ہو کر کہا "مَن ہمو ہستم" (میں وہی ہوں)۔ (۲۰۱)

اس کے باوجود امیر امان اللہ خاں نے ہندوستان کے ساتھ تو عملاً کچھ ہمدردی نہ کی، البتہ کابل میں مقیم ہندوستانیوں سے افغانستان کی جنگ آزادی میں ضرور کام لیا۔ مولانا سندھی اور ظفر حسن ایبک جو جنگ افغانستان کے دوران کابل ہی میں تھے۔ افغانستان کی آزادی میں ان کا بڑا ہاتھ ہے یہاں تک کہ ظفر حسن تو خود دست بدست سردار سپہ سالار نادر خاں مرحوم کے ساتھ جنگ میں شریک رہے اور متعدد مواقع پر جب خود افغانی سپاہیوں نے نہ صرف بے ہمتی

۲۰۱۔ مولانا عبید اللہ سندھی۔ کابل میں سات سال۔ ص۔ ۸۴۔

بلکہ انتہائی بزدلی دکھائی اس وقت اپنی جان پر کھیل کر ظفر حسن نے حفاظتی تدبیریں کیں۔ (۲۰۲)
امیر امان اللہ خاں نے جب انگریزوں سے جنگ کی تیاری کی تو حکومت موقتہ ہند کے ذمہ داران مقیم کابل سے تعاون طلب کیا اور معاہدہ کی خواہش کی۔ جسے مولانا سندھی نے منظور کرتے ہوئے اپنی جانب سے ہر ممکن تعاون کا وعدہ کیا نیز حکومت موقتہ کی مہر سے اہالیان ہند اور وابستگان تحریک کو افغانستان کی حملہ آور فوج کے ساتھ تعاون کرنے کا پیغام دیا۔ اس پیغام کی نقل یہ ہے۔

عارضی حکومت ہند کی خبر رولٹ سڈیشن کمیٹی کی رپورٹ میں پڑھ چکے ہو یہ حکومت اس لئے بنائی گئی کہ ہند میں موجودہ غاصب غدار ظالم حکومت کے عوض بہترین حکومت قائم ہو۔ تمھاری عارضی حکومت چار سال سے مسلسل جدوجہد کر رہی ہے، اس وقت جب تم نے ظالمانہ قانون کے نہ ماننے کا پکا ارادہ کر لیا عین اسی زمانہ میں حکومت موقتہ بھی امداد حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔

حملہ آور فوج سے حکومت موقتہ ہند نے معاہدہ کر لیا ہے اس لئے اس سے مقابلہ کر کے اپنے حقیقی فوائد ضائع نہ کریں بلکہ انگریزوں کو ہر ممکن طریقہ سے قتل کریں، انھیں آدمی اور روپیہ کی مدد نہ دیں۔ ریل اور تار خراب کرتے رہیں۔ حملہ آور فوج سے امن حاصل کر لیں، ان کو رسد اور سامان سے مدد دیکر اعزازی سندیں حاصل کریں۔

حملہ آور فوج ہر ہندوستانی کو بلا تفریق نسل و مذہب امن دیتی ہے، ہر ایک ہندوستانی کی جان۔ مال۔ عزت محفوظ ہے۔ فقط وہی مارا جائیگا یا بے عزت ہوگا جو مقابلہ میں کھڑا ہوگا۔ خدا ہمارے بھائیوں کو سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق دے!

عبید اللہ	ظفر حسن
وزیر حکومت موقتہ ہند	سکریٹری حکومت موقتہ ہند (۲۰۳)

مولانا سندھی کی یہ اپیل جو حکومت موقتہ کیطرف سے انھوں نے جاری کی ظاہر کرتی ہے کہ مولانا مجوزہ منصوبہ کے یکبار ناکام ہو جانے کے بعد مایوسی و بے ہمتی کا شکار نہیں ہوئے

۲۰۲۔ ظفر حسن ایبک۔ آپ بیتی۔ ص۔ ۱۲۸۔ ۱۲۷

۲۰۳۔ ” ” ص۔ ۱۴۰۔ ۱۳۹

بلکہ اپنے طور پر انھوں نے کوششیں جاری رکھیں ۔ یہ اور بات ہے کہ نتیجہ خیز وہ بھی نہ ثابت ہو سکیں ۔

حکومت موقتہ کے مندرجہ بالا اعلان کے علاوہ اس کے ذمہ داران کے تعاون سے افغانستان حکومت نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور اپنی آزادی کے بعد ہندوستان کے مسئلہ سے آنکھ پھیر لی ۔ یہی نہیں بلکہ اپنی آزادی کی خاطر انھوں نے بعض ایسی حرکتیں بھی کیں جو ہندوستانیوں کے لئے مزید دشواریوں کا باعث بن گئیں ۔ (۲۰۴)

ظفر حسن صاحب نے محسوسات کی ان تلخیوں کو الفاظ کے دامن میں سمیٹتے ہوئے لکھا ہے کہ —

"..... ان واقعات سے ہم کو یہ سبق ضرور حاصل ہوا کہ ہمیں اپنے ملک کی جنگ آزادی میں اپنے مسلمان ہمسایوں کے بجائے خود اپنی کوششوں پر ہی بھروسہ کرنا چاہئے ۔ کوئی مسلمان قوم ہماری خاطر اپنے مفاد کو قربان نہ کرے گی جب تک کہ ہم غلامی سے نہ چھوٹ جائیں اور آزاد و مضبوط ہو کر اپنا لوہا جہان میں نہ منوالیں ۔ ہماری باہر عزت جبھی ہو سکتی ہے جب ہم ملک کے اندر باعزت مستقل اور طاقت ور ہوں "۔ (۲۰۵)

حضرت شیخ الہند کی گرفتاری سے انقلاب کا منصوبہ اگرچہ ناکام ہو گیا تھا تاہم وابستگان تحریک نے ہمت نہ ہاری اور تقدیر کے سہارے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ رہنا اپنا شیوہ نہ بنایا، بلکہ جو جہاں تھا اس نے وہیں از سر نو کوششیں ترتیب دینے کا پروگرام بنایا۔ مولانا سندھی نے حکومت موقتہ کے نام پر افغانستان حکومت سے معاہدہ کیا جس کا ذکر گذر چکا ہے ۔ ادھر ہندوستان میں مولانا محمد علی، مولانا آزاد، ڈاکٹر انصاری وغیرہ نے زبردست محاذ آرائی شروع کی اور پورے ملک میں انگریزوں کی مخالفت کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ تحریک خلافت قائم کی، ترکوں کی امداد کیلئے چندے کئے، ان کی حمایت میں ہندوستان سے وفود بھیجے، ان کارروائیوں نے اگرچہ ہندوستان کی آزادی کی صورت اس وقت نہ پیدا کی، البتہ ترکوں کو ان سے ضرور کسی قدر مدد ملی ۔ ہندوستانیوں کے حق میں ان کی یہی کیا کم افادیت ہے کہ احساس ناکامی نے ان کے قوائے عمل کو مضمحل و معطل نہ ہونے دیا، بلکہ جوش عمل کا نیا جذبہ ابھر آیا۔

---

۲۰۴ - ظفر حسن ایبک - آپ بیتی - ص - ۲۰۲ - ۲۰۴

تحریک ہجرت

اسی دوران ہندوستان کو دارالحرب قرار دے کر ہجرت کا فتویٰ دیا گیا جس سے وہ افرا تفری مچی کہ الامان والحفیظ ۔ پنجاب اور صوبہ سرحد کے مسلمانوں نے ہجرت کے نام پر رخت سفر باندھنا شروع کیا اسی زمانہ میں امیر امان اللہ خاں نے یہ تقریر کی کہ ۔۔۔

"افغانستان بہ ہمہ وسعت خود آمادہ است کہ مہاجرین ہندی راپناہ بدہد"۔

اس کے بعد تحریک ہجرت نے اور زور پکڑا ۔ مسلمانوں کے قافلے لدے پھندے اپنا مال ومتاع کوڑیوں کے مول بیچ بیچ کر افغانستان جانے لگے ۔ لیکن امان اللہ خاں کے مندرجہ بالا وعدہ کے باوجود وہاں مہاجرین کی آبادکاری کا کوئی بندوبست نہ کیا گیا ۔ یہی نہیں بلکہ جب مہاجرین سرزمین افغانستان میں بے سہارا ہوگئے تو انھوں نے اپنے ضروری اسباب جو بچا کر ساتھ لے گئے تھے اسے بھی سستے داموں فروخت کرنا شروع کیا اور ان کے یہ افغانی بھائی اس ارزانی سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہے تھے ۔ چار وناچار کچھ لوگوں نے دوسرے ملکوں کا بھی رخ کیا ۔ لیکن ایسے لوگ کم تھے ۔ کتنے ہی مسلمانوں نے افغانستان میں حصول اطمینان کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوتے دیکھ کر الٹے پاؤں ہندوستان کا رخ کیا ۔ لیکن اپنا اثاثہ اور جائداد جو لٹا چکے تھے اس کو کہاں سے لاتے؟ (۲۰۶)

بجائے خود تحریک ہجرت پر کچھ تعریض مقصود نہیں، اتنا ضرور کہنا ہے کہ یہ منصوبہ غیر منظم اور بے سوچے سمجھے بنایا گیا تھا جس کا نتیجہ انتہائی افسوس ناک نکلا ۔ ہجرت کرنے والے کچھ پا نہ سکے بلکہ جو کچھ ان کے پاس تھا اسے بھی کھو دیا ۔ اس کی تفصیلات بجائے خود ایک مستقل موضوع کی حیثیت رکھتی ہیں ۔ اس کے جو افسوس ناک نتائج برآمد ہوئے وہ ہمارے لئے مستقل درس عبرت ہیں ۔

حضرت شیخ الہند ادھر مالٹا میں نظر بند تھے، اور ادھر ہندوستان میں تحریک آزادی کی جدوجہد کسی نہ کسی درجہ میں جاری رہی، جس کے نتائج تحریک خلافت وغیرہ کی شکل میں

---

۲۰۵ ۔ ظفر حسن ایبک ۔ آپ بیتی ۔ ص ۵۰۔ ۲۰۱

۲۰۶ ۔ " " ۔ ص ۔ ۲۱۰۔ ۱۰۰

برآمد ہوئے۔ مولانا سندھی پر ہندوستان کے دروازے بند ہو گئے اس لئے وہ افغانستان ہی میں رہے یہاں تک کہ امان اللہ خاں کے دربار میں انگریزوں کا اثر دیکھا اور خود امان اللہ خاں میں عافیت کوشی کے مظاہر آپ کو نظر آئے تو چند لاہوری طلبار کے ساتھ افغانستان چھوڑ روس کا رخ کیا جہاں سے ترکی اور حجاز ہوتے ہوئے ۱۹۳۷ء میں تیس بتیس برس جلاوطنی کی زندگی گذار کر ہندوستان واپس آئے۔

نامہ بران تحریک

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک کا یہ مسئلہ حل طلب ہے کہ نامہ بری کے کیا طریقے رائج تھے اور کون کون لوگ نامہ بری کے فرائض انجام دیتے تھے اس سلسلہ میں کوئی واضح تحریر اور متعین ثبوت نہیں ملتا۔ البتہ مختلف تحریروں میں ضمناً تذکرہ مل جاتا ہے۔ مفتی عزیز الرحمٰن صاحب بجنوری نے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب دامت برکاتہم کا ارشاد نقل کیا ہے کہ۔

"اس وقت میری عمر نو سال کی تھی بعد میں مجھے لوگوں سے اس تحریک کے بارے میں معلوم ہوا جو شخص پیغام رسانی کا کام کرتے تھے وہ سہارنپوری کے رہنے والے تھے ان سے بات چیت کی ہے ہوتا یہ تھا کہ وہ صاحب کاغذ کے پھول بنایا کرتے تھے اور ان پھولوں کو بیچتے ہوئے سرحد پر پہونچ جاتے تھے۔ ان میں سے جن پھولوں کے ذریعہ پیغام بھیجا جاتا تھا ان کو دوسرے پھولوں کے ساتھ رکھتے تھے اگر کوئی خریدار امی پیغام والے پھولوں کو پسند کرتا تو وہ کہتے کہ اس میں یہ نقص ہے اس کو نہ لو بلکہ اس سے بہتر پھول دکھلاتے اس طرح حضرت شیخ الہند کی ہدایات مجاہدین کے پاس جایا کرتی تھیں۔" (۲۰۷)

مندرجہ بالا بیان سے نامہ بری کے ایک طریقہ پر روشنی پڑتی ہے مختلف تحریروں میں جن نامہ بروں کا ذکر آیا ہے ذیل میں ہم مختصر طور پر ان کا ذکر کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ منظم پیغام رسانی کے نامہ بروں کا یہ ذکر بہت ہی محدود ہے لیکن اس سے زیادہ تک جب ہماری رسائی ممکن نہیں تو جس قدر معلومات حاصل ہو جائیں انھیں کو قابل قدر سمجھتے ہوئے تاریخ کے صفحات میں مناسب جگہ دینی چاہئے جن چند ناموں تک رسائی ہو سکی ان کا ذکر یہ ہے۔

۲۰۷۔ مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری۔ تذکرۂ شیخ الہند۔ ص۔ ۲۱۲-۲۱۴

صوفی غلام محمد ترک

یہ تحریک ہجرت کے دوران افغانستان گئے تھے ان کے متعلق مذکور ہے کہ ان کے ذریعہ ہندوستانی انقلاب پسندوں کو مالی امداد پہونچتی تھی۔ یہ بھیس بدل کر امرتسر، انبالہ اور دہلی تک پہونچتے تھے اور انقلاب پسندوں کے پیغامات لے کر کابل جاتے۔ (۲۰۸)

خان عبدالغفار خاں

خان صاحب ابھی بقید حیات ہیں یہ تحریک کے سرگرم رکن تھے انھوں نے پیغام رسانی کے بھی فرائض انجام دیئے۔ اپنی ایک تقریر میں انھوں نے بتایا تھا کہ وہ حاجی صاحب ترنگ زئی اور شیخ الہند کے درمیان پیغام رسانی کیا کرتے تھے۔ انگریزوں کی سخت نگرانی کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ حضرت دیوبند سے باہر کسی غیر معروف اسٹیشن پر مجھ سے مل لیتے تھے جس سے سی آئی ڈی کو پتہ نہ چل پاتا تھا اور حضرت ضروری ہدایات دیکر رخصت کر دیتے۔ کبھی کبھی اپنے گھر میں کئی کئی دن تک خفیہ طور پر رکھتے تھے اور باہر نہ نکلنے دیتے۔ (۲۰۹)

مولانا منصور انصاری

مولانا محمد میاں عرف مولینا منصور انصاری صاحب نے بھی پیغام رسانی کے فرائض انجام دیئے حضرت شیخ الہندان کو سرحد وغیرہ مقامات پر بھیجا کرتے تھے۔ غالب پاشا گورنر حجاز کا مشہور خط "غالب نامہ" لے کر انھیں کو شیخ الہند نے ہندوستان بھیجا تھا جس کا ذکر رولٹ رپورٹ وغیرہ میں بھی ملتا ہے۔ (۲۱۰)

٭ ٭ ٭

۲۰۸۔ شورش کشمیری۔ ایڈیٹر ہفتہ وار چٹان لاہور ۲۱ ستمبر ۱۹۶۴ء۔
۲۰۹۔ مولانا محمد عثمان فارقلیط۔ الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر۔ ص۔ ۱۰۹
۲۱۰۔ رولٹ رپورٹ۔ ص۔ ۱۲۶

مولوی عزیز گل

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ یہ نہایت مہتم بالشان اور خطرناک کاموں کو انجام دیتے تھے۔ صوبہ سرحد اور آزاد قبائل میں سفارت کی خدمات عظیمہ انھوں نے انجام دیں۔ حضرت شیخ الہند ان کو پہاڑی علاقوں میں اپنے ہمنوا لوگوں کے پاس بھیجتے تھے یہ انتہائی خطرناک اور دشوار گذار راستوں سے بار بار ہوکر جاتے اور خطوط وپیغامات پہونچایا کرتے تھے۔ (۲۱۱)

مولانا محمد اسحاق صاحب مانسہری

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے انھیں اوگی کے محاذ کا امیر بتایا ہے۔ (۲۱۲) لیکن مولانا عبدالرحمٰن صاحب نے تحریک میں شریک کسی دوسرے صاحب کے حوالہ سے اس کی تردید کی ہے، ان کا کہنا ہے کہ مولانا اسحاق صاحب مرکز (دہلی) سے ہدایات لانے کا ذریعہ تھے۔ اس کے علاوہ مقامی مجلس عمل کے تین ارکان میں سے ایک رکن وہ بھی تھے۔ یہ دہلی سے ہدایات لاکر مقامی مجلس عمل کو مطلع کرتے اور دیگر ارکین مل کر طریقہ کار متعین کرتے۔ (۲۱۳)

عبدالحق

یہی صاحب مولانا سندھی کا وہ خط لیکر گئے تھے جو ریشمی رومال پر لکھا گیا تھا اور بعد میں وہ انگریزوں کے ہاتھ لگ گیا حضرت مدنی نے ان کے متعلق بتایا ہے کہ یہ افغانستان وہندوستان کے مابین کپڑے کی تجارت کرتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ تحریک کی پیغام رسانی کا بھی کام کرتے تھے۔ حضرت مدنی نے انھیں تحریک کا معتمد علیہ رکن اور حضرت شیخ الہند سے بیعت بتایا ہے اس کے علاوہ آپ نے انھیں انگریزی میں ایم اے بھی بتایا ہے۔ (۲۱۴)

۲۱۱۔ مولانا سید حسین احمد۔ نقش حیات دوم۔ ص۔ ۱۹۱

۲۱۲۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب۔ تحریک ریشمی رومال۔ ص۔ ۱۷۵

۲۱۳۔ " " " ص۔ ۱۷۵

۲۱۴۔ " " " ص۔ ۱۹۸-۱۹۷

حضرت مدنیؒ کو شاید یہاں مغالطہ ہو گیا یہ ممکن ہے کہ عبدالحق نامی کوئی صاحب ان صفات کے حامل رہے ہوں اور تحریک کی پیغام رسانی کا کام بھی کرتے ہوں لیکن وہ عبدالحق جو ریشمی خط لیکر گئے ان کو ان صفات سے متصف ماننا مشکل ہے کیونکہ ظفر حسن صاحب جو کہ خود اس موقعہ پر موجود تھے، ان کا کہنا ہے کہ یہ عبدالحق ان پڑھ سے تھے، اور لاہوری طلبار کے فرار میں یہ بھی ان کے ساتھ ہوئے تھے۔ مزید یہ کہ انھوں نے عبدالحق کو اپنے لاہوری رفیق اللہ نواز خاندان کا پروردہ اور ان سے متعلق بتایا ہے۔ (۲۱۵) ظفر صاحب کی ان صراحتوں کی روشنی میں اندازہ یہی ہوتا ہے کہ حضرت مدنی کو اس سلسلہ میں غلط فہمی ہو گئی۔

حضرت شیخ الہندؒ نے انور پاشا سے جو عہد نامہ حاصل کر کے بھیجا تھا اس کے ذکر میں مولانا سید ہادی حسن خانجہاں پوری، مولانا محمد نبی صاحب مظفر نگری اور حاجی نور الحسن صاحب وغیرہ کا نام آتا ہے اس ایک خط کے علاوہ ہو سکتا ہے کہ یہ حضرات اس سے پہلے بھی مختلف اوقات میں پیغام رسانی کا کام کرتے ہوں۔ اتنی بات بہر حال مسلم ہے کہ یہ لوگ تحریک سے اور حضرت شیخ الہند سے محبت اور تعلق اخلاص رکھتے تھے۔

مولینا عبدالرحمٰن صاحب نے چودھری رحمت علی پنجابی قائد وفد فرانس کے حوالے سے کچھ اور پیغام رسالوں کا ذکر کیا ہے لیکن ان کے نام نہیں بتائے ان کے بیان سے پیغام رسانی کی نوعیت اور طریق کار پر بھی روشنی پڑتی ہے چودھری صاحب اپنے حالات بتاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ۔

"ہم نے اپنے اخراجات کی خاطر رنگوں کا کاروبار شروع کیا تھا اور ہندوستان کے بہت سے تحریک کے ممبر ہم سے رنگ منگواتے تھے اور یہاں تاجروں کو سپلائی کرتے تھے چنانچہ پشاور کے دو مسلمان ایک ہندو۔ لاہور کے دو مسلمان اور پانچ ہندو، دہلی کے چار مسلمان اور تین ہندو، بمبئی کا ایک مسلمان اور چار ہندو، کلکتہ کے چار ہندو اور دو مسلمان، کراچی کا ایک ہندو، ڈھاکہ کے دو ہندو اور ایک مسلمان، ہمارے خریدار تھے یہی لوگ تھے جن کے ذریعہ ہم مرکز (دہلی) سے ہدایات حاصل کرتے رہتے تھے، اور انھیں کے واسطے سے اپنی کارگذاری کی رپورٹ ہم مرکز کو باقاعدہ بھیجتے رہتے تھے۔" (۲۱۶)

اسی طرح متعدد مواقع پر ہم یہ پڑھتے ہیں کہ شیخ الہندؒ نے فلاں جگہ پیغام بھیجدیا لیکن نہیں

۲۱۵۔ ظفر حسن ایبک۔ آپ بیتی۔ ص۔ ۲۳

۲۱۶۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب۔ تحریک ریشمی رومال۔ ص۔ ۱۴۶

جانتے کہ پیغام کس طرح بھیجا، پیغام لے جانیوالا کون تھا؟ اور اس نے کیا طریقہ استعمال کیا؟ مثال کے طور پر "النور نامہ" کے ذکر میں ہم پڑھتے ہیں کہ شیخ الہند نے مولانا ہادی حسن صاحب کو صندوق لے کر بھیجا اور بمبئی کے کسی رکن کو یہ اطلاع کر دی کہ بندرگاہ پر پہونچ کر صندوق ان سے حاصل کر لیں۔ لیکن اس بات سے ہم قطعًا ناواقف ہیں کہ بمبئی کے یہ رکن تحریک کون تھے؟ اور خود شیخ الہند نے ان کو پیغام کس طرح بھیجا؟

متعلقہ کتابوں سے یکجا کر کے یہ چند نام ہم نے ذکر کر دیے ہیں، اس یقین کیساتھ کہ یہ نام بہت کم ہیں، ان کے مقابلہ میں جن کا ذکر ہم نہیں کر سکے۔ لیکن اس سلسلہ میں ہم مجبور ہیں کیونکہ ان سے واقفیت کے ذرائع تقریبًا ختم ہو چکے ہیں، جو لوگ شریک یا واقف کار تھے، انھوں نے تمام امور کو صیغۂ راز میں رکھا، یہاں تک کہ انتقال کر گئے۔ جن لوگوں نے ان امور کے متعلق کچھ لکھا وہ اس سلسلہ میں ناکافی ہے۔ جو چیزیں منظرِ عام پر نہ آسکیں، ان میں لکھنے والوں کی کوتاہی کا دخل نہیں بلکہ عدم واقفیت یا کم واقفیت اس راہ میں حائل رہی ہے۔

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم

حضرت شیخ الہند کے بھیجے ہوئے خطوط اور صندوق کا راز فاش ہو گیا۔ مولانا سندھی اور مولانا منصور انصاری کے مرسلہ ریشمی خطوط انگریزوں کے ہاتھ لگ گئے، اور دیکھتے دیکھتے تحریک ناکام ہو گئی۔ کامیابیوں اور کامرانیوں کے سنہرے خواب دیکھے جا رہے تھے کہ اچانک دم کے دم میں سارا شیرازہ ہی درہم برہم ہو گیا۔ لیکن کیوں؟ ذمہ داران تحریک نے ہزار خطرے مول لیکر اور سر ہتھیلی میں لئے ہوئے جو تجاویز تیار کیں اور منصوبہ تقریبًا مکمل کر لیا، اس وقت سارا راز کھل گیا۔ تحریک اس وقت اگر ناکام نہ ہوئی ہوتی اور ان کوششوں سے آزادی حاصل ہو جاتی، تو یقینًا ہندوستان کا نقشہ اس سے مختلف ہوتا جیسا آج ہے۔

اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ تحریک کی ناکامی میں کیا کچھ مضمر تھا۔ خیر یا شر؟ تحریک کی تنظیم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ سے زیادہ منظم تحریک تھی، اور اس وقت کی غلطیوں سے بچنے کی بھی کوشش کی گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آخری وقت تک مراکز بغاوت نے مرکزی احکام کا انتظار کیا اور جب انھیں بغاوت کا کوئی حکم نہ ملا تو کسی قسم کی شورش نہ برپا کی۔ ناکامی کے تقدیری اسباب ہم نہ بیان کریں گے اور نہ یہ ہمارے بس کی بات ہے، البتہ ظاہر حال دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا

ہے کہ یہ تحریک "اپنوں" ہی کی بیوفائی کے باعث ناکام ہوئی ۔حقیقت یہ ہے کہ ملت اسلامیہ کو جب جب کوئی سخت آزار پہونچا ہے اس کی تہہ میں اپنوں ہی کا ہاتھ تھا ۔پھر شکایت کوئی کس سے کرے ۔ نقصان غیروں نے کم پہونچایا اپنوں نے زیادہ ۔کبھی غیر مخلص ہونے کی بنا پر کبھی بے تدبیری کے باعث ۔
اندازہ ہوتا ہے کہ کچھ لوگ دانستہ یا نادانستہ طور پر انگریزوں کے آلہ کار بن گئے تھے اور کچھ کو انگریزوں نے خاص طور پر اس کام کیلئے متعین کیا تھا کہ وہ تحریک کے اندر گھس کر حالات کا پستہ چلائیں ۔ دانستہ یا نادانستہ طور پر جن لوگوں نے انگریزوں کے لئے کام کیا ذیل میں ہم بالاجمال ان کا تذکرہ کر رہے ہیں مختلف کتابوں کو سامنے رکھ کر یہ تذکرہ ہم نے مرتب کیا ہے ۔نہیں کہہ سکتے کہ اس میں واقعیت کا عنصر کتنا ہے ؟ اور غلط فہمی کا کس قدر ؟

امیر حبیب اللہ خاں

والئ افغانستان امیر حبیب اللہ خاں انگریزوں سے ملے ہوئے تھے یہاں تک کہ جرمن ، ترک ، اور ہندوستانی ممبران کا جو وفد افغانستان آیا تھا اس سے جو گفتگو ہوتی وہ انگریزوں کو حرف بہ حرف پہونچا دی جاتی ۔ اور اس کے صلہ میں انگریزوں سے انھیں کافی روپیہ ملتا تھا ۔ (۲۱۷)
امیر حبیب اللہ خاں کے علاوہ ان کا لڑکا معین السلطنت سردار عنایت اللہ خاں بھی انھیں کا ہمنوا اور انگریزوں کا مؤید تھا ۔ اسی تائید کے سہارے وہ ولیعہدی کے خواب دیکھ رہا تھا ۔
حضرت مدنی نے ان دونوں باپ بیٹوں کے متعلق یہاں تک لکھا ہے کہ انھیں نے ریشمی خط کی اطلاع حکومت برطانیہ کو دی تھی اور امیر صاحب موصوف کی بے وفائیاں اور سماسانیاں تھیں جو ان کے لئے جان لیوا ثابت ہوئیں ۔ (۲۱۸)

مولانا حافظ محمد احمد صاحب

حضرت شیخ الہند استاد زادے ہونے کی بنا پر ان کا بہت خیال فرماتے تھے ۔موصوف کو نہ صرف یہ کہ تحریک سے واسطہ نہ تھا بلکہ اس کے مخالف بھی تھے ۔ڈاکٹر انصاری وغیرہ متعلقین

---

۲۱۷ ۔ مولانا عبید اللہ سندھی ۔کابل میں سات سال ۔ص ۔ ۶۱
۲۱۸ ۔ مولانا عبد الرحمٰن صاحب ۔تحریک ریشمی رومال ۔ص ۔ ۲۰۱

تحریک ان سے مطمئن نہ تھے ۔ حضرت شیخ الہند کی صاحبزادی صاحبہ کی روایت ہے کہ انگریزوں سے معاہدہ کئے ہوئے تھے ۔ انھیں کا کہنا ہے کہ ایک موقع پر کسی خبر کے پہونچانے کے صلہ میں ان کو انگریزوں نے سترہ کمبل دیئے تھے ۔ مدینہ بجنور نے روزنامہ "الصباح" کے حوالہ سے لکھا تھا کہ ۔

"مولانا محمود حسن صاحب کے خلاف شمس العلمار حافظ احمد صاحب مہتمم مدرسہ عربیہ دیوبند اور ان کے رفقار طرح طرح کی رپورٹیں کیا کرتے تھے" ۔ (۲۱۹)

مولوی عزیز گل صاحب

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ حیرت انہیں کے نام پر ہوتی ہے کیونکہ شروع سے حضرت شیخ الہند کے ساتھ رہے بظاہر تحریک کا کام بھی کرتے رہے ۔ شیخ الہند جب مالٹا میں اسیر تھے تو بھی یہ ساتھ رہے ۔ اس سب کے باوجود "تحریک ریشمی رومال" کے مرتب مولانا عبدالرحمٰن صاحب نے ان کے جاسوس ہونے پر تفصیل سے لکھا ہے، اور متعدد قرائن پیش کئے ہیں، جنھیں یکسر نظرانداز کر دینا ممکن نہیں ۔ وہ لکھتے ہیں ۔

۱ ۔ حضرت شیخ الہند کی خصوصی مجلسوں کے ایک رکن تھے، ان کی بابت لوگوں نے بارہا حضرت کو آگاہ کیا لیکن حضرت کی خوش اعتمادی کا یہ عالم تھا کہ آخر زندگی تک ان کو ساتھ رکھا ۔ بلکہ اپنی ایک عزیزہ سے انکا عقد بھی کرا دیا ۔ حضرت مدنی نے بھی ان کی صفائی بیان کی ہے ۔ لیکن ان کی زندگی اور حالات بتاتے ہیں کہ وہ یقیناً جاسوس تھے ۔ ان کا وطن پشاور ہے اور کاکا صاحب کی درگاہ کے متولیوں کے خاندان سے ہیں، مالٹا میں بھی حضرت کے ساتھ رہے، ان کے جاسوس ہونے کے کئی ثبوت ہیں ۔

۲ ۔ مصر کی عدالتی کاروائی سے پتہ چلتا ہے کہ دیوبند و دہلی کی ان خصوصی مجلسوں کے حالات انگریزوں کو معلوم ہوتے تھے جن میں یہی لوگ تھے، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا آزاد، گاندھی جی، موتی لال نہرو، مہندر پرتاپ، برکت اللہ، ہر دیال، مولانا سندھی، مولانا ہادی حسن، مولانا محمد میاں (منصور انصاری) اور مولانا عزیز گل ۔ اب ان باقی حضرات میں سے کسی پر شبہ نہیں ہو سکتا سوائے ان کے ۔ کیونکہ باقی حضرات نے اپنی زندگیاں انگریز کی مخالفت میں ختم کر دیں،

---

۲۱۹ ۔ مدینہ بجنور ۔ ۱۷/ اکتوبر ۱۹۱۷ء

اور مصائب وآلام برداشت کئے لامحالہ خبریں پہونچانے والے یہی صاحب تھے۔

۳۔ حضرت شیخ الہند جب مالٹا سے واپس بمبئی پہونچے تو جہاز پر ہی آپ کو ایک سی۔ آئی۔ ڈی کا مولوی ملتا ہے اور وہ باتیں بتاتا ہے جو مالٹا کے قیدخانہ میں ان تین حضرات میں ہوئیں۔
حضرت شیخ الہند۔ مولانا حسین احمد مدنی اور مولوی عزیز گل۔

۴۔ ان مولوی صاحب کی معاشرتی زندگی ایک بلند پایہ دولت مند کی سی رہی، خورد ونوش اور دوسرے لوازمات زندگی امیرانہ رہے اور بظاہر آمدنی کبھی بھی اتنی بلند نہیں رہی جس سے اس طرح کی زندگی بسر کیجا سکے۔

۵۔ امیر احمد خاں نامی ایک صاحب اٹک کے رہنے والے تھے۔ دیوبند میں تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ انگریزوں نے ان کو خرید لیا۔ تین سال ہندوستان میں جاسوسی کا کام کیا، پھر انگلینڈ میں سراغ رسانی کا امتحان دیا اور دوسرے ممالک میں انگریز کی جاسوسی کا کام کرتے رہے۔ جرمن، روس، جاپان میں بھی کام کیا۔ آخر ترکی میں متعین ہوئے تو خیالات میں جنبش آئی۔ انگریز سے باغی ہوکر مستعفی ہوگئے۔ ان سے میری ملاقات ہوئی تھی انھوں نے بتایا کہ جب ہندوستان میں کام کرتا تھا اس زمانہ میں دیوبند سے وابستہ بہت سے مولوی یہ کام کرتے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ میں خود ایک مولوی صاحب کے ذریعہ اس کام میں تھا۔ ان کا نام بھی انھوں نے بتایا تھا وہ عیدگاہ دیوبند کے خطیب تھے۔ یہ بھی بتایا کہ ایک صاحب جو پشتو بولتے تھے اور میرے ساتھ پشتو میں بات کرتے تھے، پہلے تو مجھے ان کا علم نہ تھا جب میں اس کام پر مقرر ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ بھی یہی کام کرتے ہیں اور ان کے ذمہ اہم کام ہوتے ہیں۔ ان کا نام بھی انھوں نے بتایا تھا یہ صاحب کاکاخیلی (عزیز گل) تھے۔

۶۔ حضرت شیخ الہند انگریز کی شکل دیکھنا بھی برداشت نہیں کرتے تھے۔ حتیٰ کہ مصر میں جب انگریز فوجی افسر کیساتھ بات چیت ہوئی، اور اس کو بیان دینا پڑا تو آپ نے منہ دوسری طرف پھیر لیا، اور بیان دیتے رہے، جس کی انگریز افسر نے حضرت مدنی سے شکایت کی۔ حضرت شیخ کا تو یہ حال تھا لیکن حضرت شیخ کے یہی فدائی وشیدائی فنافی الشیخ صاحب ایک میم سے شادی رچاتے ہیں۔ کیا حضرت شیخ کے مسلک کا فدائی انگریز سے رشتہ کر سکتا ہے؟ اور کیا ایک مولوی کی مولویانہ آمدنی سے ایک میم کا تمدن پورا ہو سکتا ہے؟" (۲۲۰)

۲۲۰۔ مولانا حسین احمد مدنی۔ تحریک ریشمی رومال۔ ص۔ ۲۴۹۔ ۵۲۔

مولانا عبدالرحمٰن صاحب نے مولوی عزیز گل صاحب کے جاسوس ہونے کے سلسلہ میں مذکورہ بالا قرائن پیش کئے ہیں ۔ جو محل غور ہیں ۔

مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری

مولانا عبدالرحمٰن صاحب نے مولانا سندھی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ:

"مولوی صاحب نے پہلے تو حجاز میں کچھ ایسی حرکتیں کیں جن سے مقصد یہ تھا کہ ترکی حکومت حضرت شیخ سے بدظن ہو کر گرفتار کرے ۔ کچھ ایسے مشکوک خطوط حضرت شیخ کی خدمت میں بھیجے کہ اگر غالب پاشا مداخلت نہ کرتا تو شاید مدینہ کی حکومت آپ کو گرفتار کر لیتی ۔ یہاں (ہندوستان) کا معاملہ پہلے بھی انگریزوں کو پہنچاتے رہتے تھے ۔ حجاز کے کام کی بھی پوری رپورٹ پیش کی اس لئے کہ ان کے ساتھ میں مولوی محمد میاں صاحب جب خط لکڑی کی چھڑی میں لے کر آتے ہیں تو بمبئی گورنمنٹ کو خبر نہ تھی بلکہ مولوی صاحب کے پہنچتے ہی دیوبند اور نانوتہ میں ان لوگوں کے گھروں پر چھاپے پڑے جن کا علم حضرت شیخ کے سوا صرف ان دونوں کو تھا۔" (۲۲۱)

مولوی صاحب مذکور کے متعلق حضرت مدنی نقش حیات میں رقمطراز ہیں ۔

"تصدق حسین افسر خفیہ پولیس مولانا مرتضیٰ حسن صاحب کو نہایت سچا اور حضرت رائپوری کو نہایت جھوٹا کہتا تھا کیونکہ ان کی رپورٹ اس کی دلی خواہش کے مطابق اور اس کے آقا انگریزوں کی طرفداری میں تھی ۔ بخلاف مولانا رائے پوری کے بیانات کے۔" (۲۲۲)

حضرت مدنی رحمتہ اللہ علیہ نے کسی اور کے متعلق اس طرح کی بات محض شبہ کی بنا پر نہیں کہی ۔ یقیناً آپ کے سامنے ایسے حالات رہے ہوں گے جن کی موجودگی میں یہ بات کہی جائے ۔

سیف الرحمٰن قندھاری

ان کو بھی انگریزوں سے ملا ہوا بتایا جاتا ہے مولانا عبدالرحمٰن صاحب لکھتے ہیں ۔

"آپ حضرت شیخ الہند کی تحریک کے رکن بن کر قبائل میں تبلیغ جہاد کا کام کرتے تھے لیکن تعجب

---

۲۲۱ ۔ مولانا حسین احمد مدنی تحریک ریشمی رومال ۔ ص ۔ ۲۵۰

۲۲۲ ۔ نقش حیات دوم ۔ ص ۔ ۲۰۶

ہے کہ جب ریشمی خط پکڑا جاتا ہے تو انگریز دباؤ ڈال کر حبیب اللہ خاں سے کابل کے سب انقلابیوں کو گرفتار کرواتا ہے تو قندھاری صاحب نہ صرف یہ کہ گرفتار نہیں ہوتے بلکہ ان کو مستوفی الممالک کیساتھ مشیر امور خارجہ مقرر کر دیا جاتا ہے حبیب اللہ خاں اس وقت انگریز کی مرضی و منشا کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا تھا پھر ان مولوی صاحب کو ایسا عہدہ دیا گیا جو انگریز اور افغان حکومت کے درمیان رابطہ کا درجہ رکھتا تھا۔ افغان حکومت کو انگریزوں سے کوئی بات منوانی ہوتی تو ان کی وساطت کے بغیر نہ ہوتی۔ انھیں کے واسطہ سے انگریز اس قسم کے مطالبات منظور کرتے تھے۔" (۲۲۳)

احمد چکوالی

یہ حضرت بھی تحریک کے رکن تھے اور مختلف اہم رازوں سے واقف۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب نے لکھا ہے کہ ۔

"حضرت سندھی کا بیان ہے کہ جاسوسی کے طور پر تحریک میں شریک تھے، ان کو حکومت لوگوں کو دکھانے کے لئے گرفتار کرتی پھر جلد ہی رہا کر دیئے جاتے، اگر یہ جاسوس نہ ہوتے تو تحریک کے ذمہ دار رکن تھے، نہ معلوم کتنے سال جیل میں رہتے۔" (۲۲۴)

مولانا احمد اللہ پانی پتی کو جب حکومت نے گرفتار کیا تو انھوں نے کوئی بات نہ بتائی اور برابر اپنی ناواقفیت کا اظہار کرتے رہے۔ آخر میں پولیس انھیں چکوالی صاحب کو لے آئی در پردہ پولیس افسران بیٹھے ہوئے تھے۔ چکوالی صاحب نے مولانا احمد اللہ صاحب سے رازدارانہ طور پر گفتگو شروع کی اور ایک ایک بات کا اقرار کرالیا۔ اس کے بعد پولیس افسران سامنے آ گئے۔ (۲۲۵)

اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ چکوالی صاحب نے از خود جو باتیں بتائیں وہ کسی اضطراری حالت کی بنا پر بتائیں اور اس کے بعد پولیس سے چھٹکارا حاصل کیا تو بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ مولانا پانی پتی کو گرفتار کرانے میں کون سی مصلحت کارفرما تھی؟

٭ ٭ ٭ ٭

۲۲۳۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب: تحریک ریشمی رومال ص۔ ۲۵۵۔ ۲۵۶

۲۲۴ " " ص۔ ۲۵۳۔ ۲۵۴

۲۲۵۔ مولانا سید حسین احمد مدنی۔ نقش حیات دوم۔ ص۔ ۱۹۳

عبدالحق

کالج کے لاہوری طلبا جب افغانستان جانے کے لئے تیار ہوئے تو انھیں میں ایک طالبعلم اللہ نواز خاں تھا۔ یہ سب روانگی کے لئے پابہ رکاب تھے کہ اس قافلہ میں عبدالحق بھی شامل ہوگیا۔ ظفر حسن صاحب نے اسے "ان پڑھ سا" بتایا ہے۔ مولانا سندھی کا ارسال کردہ ریشمی خط کابل سے یہی لیکر چلا تھا۔ ظفر صاحب نے اس سلسلہ میں شبہ ظاہر کیا ہے کہ یہ شخص شروع ہی سے جاسوسی کے لئے شریک ہوا تھا یا بعد میں مخبری کی۔ (۲۲۶) ظفر صاحب نے آپ بیتی کے صفحہ ۲۱۶-۲۱۷ پر بھی اس کا ذکر کیا ہے اور انگریزوں کے نام لکھے ہوئے اس کے ایک خط کا بھی تذکرہ کیا ہے (۲۲۷) اگر یہ دوسری بات بھی اسی عبدالحق کے متعلق ہے تو اس کی جاسوسی میں مجال شک نہیں۔

خان بہادر حق نواز خاں

حضرت مدنی نے نہ صرف انھیں جاسوس ماننے سے انکار کیا ہے بلکہ تحریک کا قدائی رکن بھی بتایا ہے(۲۲۸) لیکن مولانا سندھی ان کو انگریزوں سے ملا ہوا مانتے ہیں۔ (۲۲۹) ظفر صاحب بھی انھیں مشکوک قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ریشمی خط کی مخبری کے صلہ میں ان کو انگریزوں سے زمینیں ملی تھیں۔ (۲۳۰)

خطیب عیدگاہ

مولانا عبدالرحمٰن صاحب نے ان کو تحریک کے کئی شعبوں سے وابستہ بتایا ہے، البتہ مولانا نے

۲۲۶۔ ظفر حسن ایبک ۔ آپ بیتی ۔ص۔ ۱۱۳

۲۲۷۔ " " ۔ص۔ ۲۱۷

۲۲۸۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب ۔ تحریک ریشمی رومال ۔ص۔ ۲۰۰

۲۲۹۔ مولانا عبیداللہ سندھی ۔ کابل میں سات سال ۔ص۔ ۷۶

۲۳۰۔ ظفر حسن ایبک ۔ آپ بیتی ۔ص۔ ۱۱۳

ان کا نام نہیں بتایا۔ امیر احمد اللہ خاں نامی ایک جاسوس کی زبانی کہتے ہیں کہ ۔

"ویسے تو میں اپنی رپورٹ دہلی پہونچاتا تھا مگر گرما میں شملہ جانا پڑتا تھا تو راستہ میں انبالہ میں مولوی صاحب کے پاس ٹھہرا کرتا تھا۔ مولوی صاحب انبالہ میں چھاؤنی کی جامع مسجد میں خطیب تھے بعض دفعہ مولوی صاحب بھی میرے ساتھ جاتے تھے اور شملہ جاکر علیحدہ ہو جاتے کیوں کہ ہمیں ایک دوسرے کو بھی اپنی باتیں بتانا اور پہچان کرانا منع تھا وہ اپنی رپورٹ الگ پیش کرتے تھے، معلوم نہیں کہ کیا رپورٹ پیش کرتے تھے"۔ (۲۳۱)

ان معلوم اشخاص کے علاوہ معلوم نہیں ایسے کون کون لوگ ہوں جنھوں نے تحریک کے خلاف جاسوسی کی ہو۔ لاہوری طلبا میں سے میاں عبدالباری۔ یا حبیبیہ کالج کابل کے معلم مولوی محمد علی قصوری، مولانا احمد اللہ پانی پتی، قاضی مسعود صاحب وغیرہ کا نام بھی تحریک کے راز بتانے والوں میں آتا ہے لیکن جن حالات میں ان لوگوں نے کوئی بات بتائی ہے ان کو مدنظر رکھتے ہوئے ان پر حرف گیری نہیں کیجا سکتی ۔

رہائی اور ہندوستان واپسی

شیخ الہند کی رہائی کے لئے مسلمانان ہند کی پیہم کوششیں اور مسلسل عرضداشتیں رہائی کا ذریعہ نہ بن سکیں لیکن جب جنگ ختم ہوگئی اور ان تمام جنگی قیدیوں کی رہائی کا سلسلہ شروع ہوا جن پر الزام ثابت نہ ہو سکا تو چونکہ اسی قسم کے قیدیوں میں شیخ الہند وغیرہ کا بھی شمار تھا جن کے متعلق مکمل ثبوت فراہم کرنے سے حکومت قاصر رہی تھی۔ اس لئے آپ کی رہائی کا بھی فیصلہ ہوگیا۔ متعدد بار یہ مشہور ہوگیا کہ رہا ہوگئے بس آنے ہی والے ہیں لیکن دن بہ دن تاخیر ہوتی رہی۔ آخر کار ۲۲ جمادی الثانیہ ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۲ مارچ ۱۹۲۰ء کو مالٹا سے روانگی ہوئی۔ لیکن اس شان سے کہ اسیرانہ پابندیاں ساتھ چھوڑنے کیلئے تیار نہ تھیں ۔ (۲۳۲)

حضرت مدنی مالٹا سے واپسی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

"۲۵ جمادی الثانیہ ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۵ مارچ ۱۹۲۰ء کو آگبوٹ اسکندریہ پہونچا اور

۲۳۱۔ مولانا عبدالرحمن صاحب ۔ تحریک ریشمی رومال ص ۲۵۳

۲۳۲۔ مفتی عزیز الرحمن بجنوری ۔ تذکرہ شیخ الہند ص ۱۔ ۳۸۰

۲۶ جمادی الثانیہ کو سیدی البشر میں جو کہ قرار گاہ اسرار مصر میں تھا داخل کر دیئے گئے۔ تقریباً اٹھارہ روز وہاں قیام کرنے کے بعد ۱۲ رجب ۱۳۳۸ھ مطابق ۲ اپریل ۱۹۲۰ء کو وہاں سے سویز روانہ کیئے گئے۔ سویز میں بھی ہم سنگینوں کے سایہ میں اسیروں کے کیمپ میں مثل سیدی البشر داخل کیئے گئے۔ یہاں پونے دو مہینے کیمپ میں رہنا پڑا۔

۵ رمضان ۱۳۳۸ھ مطابق ۲۲ مئی ۱۹۲۰ء اتوار کے دن آگبوٹ پر پہونچایا گیا۔ ۱۲ رمضان کو جہاز عدن پہونچا چونکہ جہاز عدن میں ایک دن ٹھہرا تھا تو ہم کنارہ پر گئے اور تین تار ہندوستان کو ایک دیوبند میں حکیم محمد حسن صاحب کے نام دوسرا ڈاکٹر انصاری صاحب کو دہلی اور تیسرا حکیم اجمیری صاحب کو بمبئی کے پتہ پر ہم نے دیا جس سے تمام احباب کو اطلاع ہوگئی۔ تار کے الفاظ یہ تھے "ہم لوگ ۸ جون تک بمبئی پہونچیں گے"۔ مختصر یہ کہ ۲۰ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ مطابق ۸ جون ۱۹۲۰ء کو تین برس سات مہینے کے بعد بمبئی پہونچا کر ہم کو رہا کیا گیا۔" (۲۴۳)

جیسے ہی جہاز بمبئی پہونچا ایک انگریز سی آئی ڈی افسر دو تین ہندوستانی افسروں کے ساتھ آیا اور شیخ الہند سے کہا کہ آپ سے تنہائی میں کچھ باتیں کرنی ہیں حضرت مولانا شیخ الہند اس کے ساتھ کمرے میں چلے گئے تو اس نے بتایا کہ "مولوی رحیم بخش صاحب یہاں آئے ہوئے ہیں آپ بغیر ان سے ملے ہوئے ہرگز جہاز سے نہ اتریں"۔ یہ بزرگ انگریزوں کے فرستادہ تھے انھوں نے شیخ الہند کو تلقین کی کہ تحریک خلافت اور دوسری سیاسی سرگرمیوں سے علیحدہ رہیں۔ اسی لئے انھوں نے یہ چاہا کہ شیخ الہند بمبئی سے براہ راست دیوبند چلے جائیں اور ذمہ داران خلافت سے ملاقات نہ فرمائیں لیکن حضرت شیخ الہند نے ان کی باتوں پر کچھ کان نہ دھرا۔ جس وقت شیخ کنارہ پر پہونچے تو مولانا شوکت علی مرحوم اور تحریک خلافت کے دوسرے ذمہ داران کے علاوہ ہزاروں کے مجمع نے آپ کا عظیم الشان استقبال کیا اور پوری فضا نعرۂ تکبیر سے گونج اٹھی۔ ہجوم کیساتھ مولانا کار تک آئے۔ اور اس میں بیٹھ کر خلافت ہاوس آگئے جہاں قیام کا پہلے سے نظم تھا بیچارے مولوی عبدالرحیم اس ہجوم میں دوبارہ شیخ الہند تک پہونچ بھی نہ سکے (۲۴۴)

مولانا شوکت علی، خلافت کمیٹی کے اراکین اور مسلمانان بمبئی کی بڑی تعداد کے علاوہ دہلی،

۲۴۳۔ مولانا سید حسین احمد صاحب۔ نقش حیات دوم۔ ص۔ ۲۴۲ تا ۲۴۴

۲۴۴۔ " " " " ص۔ ۲۴۶ تا ۲۴۵

لکھنؤ اور دیوبند وغیرہ سے سفر کر کے بہت سے لوگ شیخ الہند کے استقبال کے لئے پہونچے تھے ان میں خاص افراد یہ تھے۔ مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند۔ مولانا مرتضیٰ حسن صاحب۔ چاندپوری۔ حکیم محمد حسن صاحب (برادر خورد شیخ الہند) مولانا محمد حنیف صاحب (داماد شیخ الہند)۔ حکیم عبدالرزاق صاحب۔ نواب محی الدین خاں صاحب قاضی بھوپال۔ مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری صاحب۔ حاجی احمد مرزا صاحب فوٹوگرافر دہلی۔

بمبئی کے دو روزہ قیام کے دوران مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی بھی ملاقات کے لئے تشریف لائے اور دیر تک سیاسیات حاضرہ پر گفتگو فرمائی۔ ان کے علاوہ مہاتما گاندھی بھی ملنے کے لئے آئے اور دیر تک بات کرتے رہے۔ (۲۳۵)

خلافت کمیٹی کیجانب سے کھتری مسجد میں مسلمانان بمبئی کا ایک جلسۂ عام منعقد ہوا جس میں خلافت کمیٹی اور اہل شہر کیجانب سے شیخ الہند کیخدمت میں سپاس نامہ پیش کیا گیا۔

بمبئی سے روانگی

بمبئی میں دو روز قیام فرما کر ۲۳ اور ۲۴ رمضان کی درمیانی شب میں دہلی کیلئے روانہ ہوئے۔ ۲۵ رمضان ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۳ جون ۱۹۲۰ء کی صبح دہلی پہونچے، ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی کوٹھی پر قیام فرمایا۔ شب کے آخر حصہ میں دہلی سے روانہ ہو کر ۲۶ رمضان المبارک کی صبح کو نو بجے دیوبند پہونچ گئے۔

حالات نے عام طور پر لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا کر دیا تھا کہ اب شیخ الہند کی واپسی مقدر نہیں۔ آپ اور آپ کے رفقا کو یقیناً پھانسی دیدی جائے گی یا کم از کم حبس دوام کی سزا ملے گی۔ اب چونکہ خلاف امید اس طرح رہائی ہوگئی اور حضرت ہندوستان واپس آگئے تو ہر طرف مسرت و شادمانی کی فضا چھاگئی۔ مصافحہ یا کم از کم ایک نظر دیکھ لینے کے لئے اسٹیشن پر خلقت ٹوٹی پڑ رہی تھی۔ دہلی، غازی آباد، میرٹھ شہر، میرٹھ چھاونی، مظفر نگر، دیوبند وغیرہ اسٹیشنوں پر یہ عالم ہو گیا کہ لوگوں کو زیارت کرنے کے لئے سروں پر اٹھانا پڑا۔ ہر جگہ مشتاقان زیارت کا بے پناہ سیل امنڈ پڑا تھا۔ (۲۳۶)

۲۳۵۔ مولانا سید حسین احمد مدنی صاحب۔ نقش حیات دوم۔ ص۔ ۲۳۶

مختلف شہروں کے سفر

حضرت شیخ الہند تقریباً پانچ سال ہندوستان کے باہر قید و بند کی صعوبتیں اور مشقتیں جھیل کر آئے تھے۔ مختلف شہروں کے لوگوں کی تمنا تھی کہ آپ ان کے شہر میں تشریف لائیں۔ لیکن کہاں تک جاتے، صرف چند شہروں کے سفر کئے۔

مالٹا کی اسارت کے دوران حکیم نصرت حسین صاحب کا انتقال ہو گیا تھا۔ واپسی کے بعد سب سے پہلے شیخ الہند حکیم صاحب کی غمزدہ ماں اور سوگوار بیوہ کی تعزیت کے لئے ان کے وطن الوڑہ جہان آباد تشریف لے گئے۔ اس کے بعد لکھنؤ۔ غازی پور۔ الہ آباد وغیرہ کے سفر کئے، ہر جگہ عجیب مسرت و انبساط کا عالم تھا۔

میرٹھ کے سفر میں مسلمانان میرٹھ نے سپاس نامہ پیش کیا تو اس کے جواب میں تقریر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا۔ "جو تکلیف گذر چکی اس کی یاد کرنے کی ضرورت نہیں"۔ اور یہ شعر پڑھا۔ ؎

سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالبؔ
خدا سے کیا ستم و جور ناخدا کہیئے۔ (۲۳۷)

اس طرح کان پور کے سفر میں مسلمانان کان پور نے بھی خدمت عالیہ میں سپاس نامہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کی تھی۔ (۲۳۸)

اس کے علاوہ جگہ جگہ آپ کی رہائی پر مسرت و سرخوشی کا اظہار کیا گیا تھا اور تہنیت و مبارکباد کے تار بھیجے گئے تھے۔

۞ ۞ ۞ ۞ ۞ ۞ ۞ ۞

۲۳۶۔ مولانا سید حسین احمد مدنی۔ نقش حیات دوم۔ ص۔ ۲۳۷

۲۳۷۔ ۔ ۔ ۔ مدینہ بجنور۔ ۹ر جولائی ۱۹۲۰ء

۲۳۸۔ ۔ ۔ ۔ " ۲۸ر جولائی ۱۹۲۰ء

ہندوستان میں سیاسی رہبری

حضرت شیخ الہند آخر شوال سنہ ۱۳۳۳ھ میں بیرون ملک کے سفر کے لئے نکلے تھے اور آخر رمضان سنہ ۱۳۳۸ھ مطابق جون سنہ ۱۹۲۰ء میں تقریباً پانچ سال باہر رہ کر واپس تشریف لائے۔ اس عرصہ میں آپ کے نحیف وزار جسم پر عرصۂ قید وبند میں بے پناہ مظالم بھی ٹوٹے مگر ہر قسم کی کلفتیں اور مصائب ہنسی خوشی برداشت کرتے رہے اور کبھی تکدر کا اظہار نہ فرمایا نہ کبھی احساس پشیمانی نے پاس پھٹکنے کی جرأت کی۔

جذبۂ حریت اور اشتیاق آزادی کا والہانہ جذبہ جلد پیدا نہیں ہوتا لیکن جب پیدا ہو جاتا ہے تو پھر اسے سرد کر دینا کسی کے بس کی بات نہیں رہتی۔ قید وبند یا دوسری تکالیف پہونچا کر اسے ختم کر دینے کی توقع محض خام خیالی ہے۔ ع۔ یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ چیزیں آتش شوق کو تیز تر کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ ع

بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد

حضرت شیخ الہند کے ساتھ بھی یہ مذکورہ صورت پیش آئی۔ مالٹا کے زمانہ قیام میں طرح طرح کی تکالیف برداشت کرنی پڑیں۔ حاکمان خود سر نے یہ سمجھا تھا کہ اس طرح نشۂ آزادی اتر جائیگا لیکن اترنا کیسا وہاں تو یہ نشہ چڑھتا ہی جا رہا تھا چنانچہ مالٹا سے واپسی پر جب بمبئی پہونچے اور مولانا شوکت علی اور دیگر خلافت کمیٹی کے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی اور گاندھی جی سے مسائل حاضرہ پر گفتگو ہوئی تو وہ نشۂ حریت جو پہلے ہی کیا کم تھا اور جس کو مالٹا کی اسارت نے دوبالا کر دیا تھا بمبئی پہونچکر ہم مشرب وہم نفس شرکار کار سے ملنے کے بعد سہ آتشہ بن گیا۔ چنانچہ سیاسی رہبری کی زمام کار ہاتھ میں لی ــــ اور بقیہ مدت حیات کو اسی میں صرف کر دینے کا عزم فرمایا۔ تحریک خلافت۔ ترک موالات۔ قیام جامعہ ملیہ وغیرہ امور میں نہ صرف شرکت کی بلکہ پیش پیش رہے۔

مولانا سید اصغر حسین صاحب ان لوگوں میں ہیں جنھوں نے بزعم خود شیخ الہند کے دامن

سے "سیاست کا داغ" دھونے کی اور تحریک ریشمی رومال وغیرہ سے مولانا کی برات ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے باوجود مولانا موصوف نظر بندی کے بعد کے حالات میں اتنا لکھنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ مالٹا سے واپسی کے بعد آزادی ہندوستان کے سلسلہ میں آپ نے کچھ کام کیا۔ تحریر فرماتے ہیں۔

"نظر بندی سے رہا ہو کر حضرت مولانا ہندوستان پہونچے تو خلاف امید ملک میں ایک زندگی کی حرکت اور قوم میں بیداری کے آثار اور مسلمانوں میں اپنے ہم خیال دیکھ کر نہایت مسرور ہوئے اور احکام شرع کے ماتحت سیاسی جدوجہد کرنے پر مجبور، کیونکہ چشم دید حالات، مسلمانوں کی نسبت اہل یورپ کے ارادے اور خیالات، معتبر لوگوں سے سنی ہوئی سرگذشتیں اور واقعات، حضرت کے ذہن میں موجود تھے، اور وہ یہ دیکھ کر لہو کے گھونٹ پی رہے تھے کہ بقائے احترام اماکن مقدسہ کے وعدے حرف غلط کی طرح محو کر دیئے گئے، سلطنت اسلامیہ کے اقتدار کو بحال برقرار رکھنے کے مواعید نقش بر آب ثابت ہوئے" (۱)

مزید لکھتے ہیں۔

"اب مولانا کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور سکوت و صموت کی گنجائش نہ رہی۔ احکام شرع کی اطاعت، مولانا کی اسلامی حمیت اور دینی غیرت نے بیٹھنے نہ دیا اور ارادہ کو مضبوط، جرأت کو قوی کر کے نہایت جرأت کے ساتھ اعلان حق کے لئے کھڑے ہو گئے اور مخالف طاقتوں سے نڈر ہو کر آپ نے تحریراً، تقریراً، بواسطہ اور بلا واسطہ تبلیغ حق شروع فرما دی۔ استفتاء، خطوط کے جوابات میں تو تشریف آوری کے دن ہی سے کلمۃ الحق کا اظہار ہو رہا تھا۔ اب آپ نے اخبارات اور اشتہارات کے ذریعہ سے بلا توریہ و تقیہ اپنا مشہور و معروف "ترک موالات" کا اعلان شائع فرما کر اونگھنے والوں کو بیدار کر دیا۔" (۲)

میدان سیاست میں اس طرح آپ کی علانیہ شرکت اور خلافت و ترک موالات کی تائید میں فتاویٰ اور تقریروں کا مسلم عوام پر بہت زیادہ اثر پڑا اور مولانا کی دینی شخصیت کی بنا پر لوگوں نے ان امور سے زیادہ سے زیادہ دلچسپی لینا شروع کر دیا۔ مولانا اصغر صاحب لکھتے ہیں۔

"ہزارہا ہزار دیندار مسلمان جو دنیاوی مشاہیر کے اقوال پر مضبوطی و اعتماد کیساتھ عمل نہیں کر سکتے تھے وہ آپ کے اعلان ہدایت کو ایک شرعی فتویٰ سمجھ کر بامید ثواب قومی تحریک میں شریک ہو گئے۔ حضرت مولانا کی ظاہری و باطنی توجہ نے اہل اسلام کے با اثر دیندار طبقے کو جوش کیساتھ آمادہ کر دیا۔

۱۔ مولانا سید اصغر حسین صاحب۔ حیات شیخ الہند۔ ص۔ ۱۷۵

۲۔ " " " ص۔ ۱۷۵

اور آپ کے اعلان سے ترک موالات کی مذہبی تحریک کو ایک حیات تازہ مل گئی۔ صدہا علماء جو اپنی دینداری سے تعلیم و تعلم ہی کو بہترین اشتغال سمجھے ہوئے تھے، وہ بھی ضرورت حاضرہ پر متنبہ ہو کر خلوص نیت سے مسئلہ خلافت میں تحریراً و تقریراً حصّہ لینے لگے۔ (۳)

"شیخ الہند" کا خطاب

تحریک خلافت سے وابستہ متعدد حضرات حضرت شیخ الہند کے ۱۹۱۵ء کے سفر سے پہلے ہی سے آپ کے ساتھ تعلق و محبت رکھتے تھے۔ پھر "ریشمی رومال" کے قضیہ اور اس کی پاداش میں اسارت نے اس تعلق و محبت کو قوی جذبۂ ارادت سے بدل دیا تھا، چنانچہ مالٹا سے واپسی پر مولانا شوکت علی وغیرہ ذمہ داران خلافت ہی پیش پیش تھے اور انھیں کے اثر سے علیحدہ رکھنے کیلئے مولوی رحیم بخش صاحب کو انگریزوں نے حضرت کے پاس بھیجا تھا جو ناکامیاب واپس ہوئے۔ تحریک خلافت کی پر زور تائید و حمایت نے ارباب خلافت کو مولانا سے اور زیادہ قریب کر دیا۔ چنانچہ خلافت کمیٹی کیجانب سے مولانا کیلئے "شیخ الہند" کا خطاب تجویز ہوا، جو اس قدر مشہور و مقبول ہوا کہ نام کا ایسا جزو بن گیا جس کے بغیر نام ادھورا معلوم ہوتا ہے۔ (۴)

تحریک خلافت و ترک موالات کی تائید و حمایت

مولانا جب ہندوستان واپس پہونچے تو تحریک خلافت کا زور تھا اس سے وابستہ افراد آپ سے ارادت اور تعلق قلبی رکھتے تھے چنانچہ آپ نے اس میں کافی دلچسپی لی، اور بذات خود تقریر و تحریر اور خطوط کے ذریعہ تحریک خلافت اور ترک موالات وغیرہ کی پر زور حمایت و وکالت کی، تحریک خلافت اور ترک موالات وغیرہ کی تائید میں مولانا کے فتاویٰ کا خاطر خواہ اثر اسلامیان ہند پر پڑا۔ آخر کار حکومت نے اپنے سابق فرستادہ مولوی رحیم بخش صاحب کو دوبارہ بھیجا کہ آپ ان فتاویٰ کو واپس لے لیں اور ان معاملات سے علیحدہ اور یکسو ہو کر رہیں جسے آپ نے منظور نہ فرمایا اور مولوی رحیم بخش صاحب ناکام و نامراد واپس ہوئے۔ (۵)

۳۔ مولانا اصغر حسین صاحب۔ حیات شیخ الہند۔ ص۔ ۱۷۶۔ ۱۷۵

۴۔ مولانا حسین احمد صاحب مدنی۔ نقش حیات دوم۔ ص۔ ۲۴۸

خلافت کمیٹی نے آپ سے جو فتویٰ حاصل کیا تھا وہ حسب ذیل ہے۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم۔ قال اللہ تعالیٰ: ولا تنازعوا فتفشلوا وتذہب ریحکم واصبروا ان اللہ مع الصابرین"۔ (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے آپس میں اختلاف نہ ہونے دو کہ بزدل ہو جاؤ اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے، صبر کرو اللہ صبر کرنیوالوں کے ساتھ ہے)۔

"وتعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" (نیکی اور تقویٰ میں باہم دگر تعاون سے کام لو اور برائی یا زیادتیوں میں تعاون نہ کرو)۔

"ومن یتولہم منکم فانہ منہم۔ ان اللہ لا یہدی القوم الظالمین"۔ (کفار کے ساتھ موالات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ جو ان سے دوستی اور معاونت رکھے وہ انھیں میں سے ہے، اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا)۔

گر پڑے ہے آگ میں پروانہ سا کرم ضعیف
آدمی سے کیا نہ ہو لیکن محبت ہو تو ہو

امابعد۔ آج جب کہ شرق وغرب کے مسلمانوں پر قیامت خیز مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے جبکہ اندیشہ ہے کہ خلافت اسلامیہ کا جہاز امنڈتے ہوئے طوفان میں موجوں سے ٹکرا کر خدا نخواستہ پاش پاش ہو جائے جبکہ ہر فرد مسلم کی روح موت کی دھمکیاں دینے والے حوادث سے لرز رہی ہے بلکہ اگر عاقبت بینی سے کام لیا جائے تو ہر ایک ایشیائی اور خصوصاً ہر ایک ہندوستانی اپنی اخلاقی جرأت اور آزادانہ مستقبل کو سخت خطرہ کی نگاہ سے دیکھ رہا ہے علماء ہند کی تعداد کثیر اور ہندو مسلم ماہرین سیاست کا بہت بڑا طبقہ اس جدوجہد میں ہے کہ اپنے جائز حقوق اور واجبی مطالبات کو پامال ہونے سے بچائے۔ کامیابی تو ہر وقت خدا کے ہاتھ میں ہے، لیکن جو فرض شرعی، قومی اور وطنی حیثیت سے کسی شخص پر عائد ہوتا ہے اس کے ادا کرنے میں ذرہ برابر تقصیر کرنا ایک خطرناک جرم ہے میں اصل فطرت سے کوئی سیاسی آدمی نہیں ہوں اور جیسا کہ میری طویل زندگی شاہد ہے میرا مطمع نظر مذہب رہا ہے اور یہی وہ مطمع نظر ہے جس نے مجھے ہندوستان سے مالٹا اور مالٹا سے ہندوستان واپس پہونچایا۔ پس میں ایک لمحہ کے لئے کسی ایسی مفید تحریک سے اپنے کو علحدہ نہیں پاتا جس کا تعلق تمام جماعت اسلام کے فوز وفلاح سے ہو یا وہ دشمنان اسلام کے حربوں کے جواب میں حفاظت خود

۵۔ مولانا سید احمد صاحب ندوی، نقش حیات دوم۔ ص۔ ۲۵۴

اختیاری کے طور پر استعمال کی گئی ہو۔

مالٹا سے واپس آکر مجھے معلوم ہوا کہ ہندوستان کے ارباب بست وکشاد نے آخری طریق کار اپنے فرائض کی ادائیگی اور اپنے جذبات وحقوق کے تحفظ کا یہ قرار دیا ہے کہ وہ قرآن کریم کی ایک صریح تعلیم اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک روشن اسوہ حسنہ کو مضبوط تھام لیں، اور نفع وضرر قومی کا موازنہ اور عواقب ملکیہ کی پوری جانچ کرکے اس کو بخوف وخطر انجام تک پہونچائیں، اور وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اعدائے اسلام کیساتھ تعاون وموالات کو اعتقاداً وعملاً ترک کردیں۔ اس مسئلہ کی شرعی حیثیت ناقابل انکار ہے، اور ایک صادق مسلمان کی غیرت کا ایسے حالات میں یہی تقاضا ہونا ہے کہ وہ۔

۱۔ سرکاری اعزازوں اور خطابات کو واپس کردے۔

۲۔ ملک کی جدید کونسلوں میں شریک ہونے سے انکار کردے۔

۳۔ صرف اپنی ملکی اشیاء اور مصنوعات کا استعمال کرے۔

۴۔ سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں اپنے بچوں کو داخل نہ کرے۔ اس کے علاوہ جو تجاویز وقتاً فوقتاً شائع کیجائیں ان پر عمل کرے بشرطیکہ اتباع احکام شریعت کیا جائے، اور عملدرآمد میں خلاف حکم شرع کا ارتکاب پیش نہ آوے۔ نیز اس امر کا پورا لحاظ رکھا جائے کہ جن امور میں فساد بالنقص امن کا اندیشہ ہو ان سے احتراز کیا جائے، اور ہر کام میں افراط وتفریط سے بچکر اعتدال مدنظر رہے ارشاد عثمانی

" اذا احسن الناس فاحسن معهم واذا اساءوا فاجتنب اسائتهم "۔ (جب لوگ اچھا کام کریں تو ان کے ساتھ اچھائی میں شریک رہو اور جب برائی کریں تو اس سے بچتے رہو) کا لحاظ ہر ایک امر میں مفید اور ضروری سمجھا جائے۔ واللہ الموفق والمعین "۔

العبد محمود حسن عفی عنہ دیوبندی۔ ۳/ ذلقعدہ ۱۳۳۸ھ۔ (۲)

شیخ الہند کی یہی تحریر بعد میں جمعیۃ العلماء ہند کے متفقہ فتویٰ کی حیثیت سے پانچ سو علماء کے دستخط سے شائع ہوئی۔

۲۔ مدینہ بجنور۔ ۵ راگست ۱۹۲۰ء۔

کلکتہ میں خلافت کانفرنس کے انعقاد کی تجویز ہوئی تو اس میں شرکت کیلئے آپ کو دعوت دی گئی۔
لیکن ضعف اور علالت کیوجہ سے آپ شرکت نہ فرما سکے البتہ مولانا مرتضی حسن صاحب چاند پوری کے
ذریعہ ایک پیغام بھیجا جو کانفرنس کے اجلاس میں پڑھ کر سنایا گیا یہ پیغام حسب ذیل ہے۔

"بندہ ناچیز وضعیف اپنے مکرمین و مخلصین حضرات کیخدمت میں تسلیمات مسنونہ کے بعد ملتمس
ہے۔ سب سے پہلے یہ عاجز آپ حضرات کی ان مساعی جمیلہ کا شکریہ واجب سمجھتا ہے جن کو آپ حضرات
اپنی لگاتار کوششوں سے اپنے ملک وقوم وملت کی بہبودی کے لئے بے دریغ مبذول فرما رہے ہیں،
اور سوتے ہوؤں کو خواب غفلت سے جگا جگا کر اور کمزوروں کو چونکا چونکا کر مفید باتیں دکھا اور سنا رہے
ہیں۔ فجزاکم اللہ احسن الجزاء و افضل الجزاء۔

اس وقت تمام ملک میں جو آثار بیداری کہیں زیادہ کہیں کم نظر آتے ہیں، وہ آپ ہی کی جدو
جہد کا نتیجہ اور آپ ہی کی جان توڑ مسلسل محنت اور ہمت کا ثمرہ ہے۔ اللّٰھم زد فزد۔

اس کے بعد یہ عرض ہے کہ آپ حضرات نے جو اس ناتواں اور ناکارہ کو یاد فرما کر عزت و احترام کے
ساتھ مکرر سہ کرر اپنی شرکت سراسر برکت کیلئے طلب فرمایا اس کا جواب بجز لبیک کے کچھ نہ تھا مگر کیا
عرض کروں ہجوم عوارض اور کمزوری طبیعت ایسی سد راہ ہے کہ باوجود عزم واشتیاق شرکت کسی طرح
حرکت نہ کر سکا اور افسوس کے ساتھ آپ حضرات کی تعمیل سے بالکل قاصر رہا۔ آپ کے اخلاق
کریمانہ سے بوجہ اپنی معذوری قوی معافی کا مستحق ہوں۔ اب بجز اس کے اور کیا کر سکتا ہوں کہ حق سبحانہٗ
تعالیٰ نیات ومساعی میں برکت عطا فرمائے اور اہل اسلام اور تمام ملک کو اس کی خیر و برکت سے مستفیض
کرے۔ یہ دور افتادہ باوجود ضعف و ناتجربہ کاری آپ کی ہمدردی و شرکت میں باذن اللہ ہرگز قاصر نہیں،
فالحمد للہ۔

یہ ضرور ہے کہ ترک موالات وغیرہ جملہ امور میں انجام بینی اور احتیاط سے کام لیا جائے کسی جوش
اور جذبہ کی اتباع بغیر تامل و مشورہ ہرگز نہ کیجائے۔ واللہ الموفق والمعین "

بندہ محمود عفی عنہ۔ ۱۸ ذی الحجہ ۱۳۳۸ھ (۷)

اس کے علاوہ صوبہ آگرہ کی خلافت کمیٹی کے استفتاء پر آپ نے ترک موالات کے متعلق فتویٰ
تحریر فرمایا تھا جو خلافت کمیٹی کیجانب سے دوسرے علماء کرام کے فتاویٰ کے ساتھ طبع ہو کر مشتہر ہوا۔ یہ

۷۔ مدینہ بجنور ۔ ۱۷ ستمبر ۱۹۲۰ء

فتوٰی حسب ذیل ہے۔

"ترک موالات عن النصاریٰ کے متعلق جو استفتار اس ضعیف اور درماندہ سے کیا گیا ہے ہرچند اپنے ضعف اور ناتوانی کے باعث مجبور ہوں، اور نہ اپنی تحریر سے کوئی خاص نفع خیال میں آتا ہے مگر اس حالت میں سکوت اور انکار کو بھی ناجائز سمجھتا ہوں، اس لئے بالاجمال اور بقدر ضرورت وکتابت عرض ہے کہ موالات کفار کی ممانعت اور حرمت قرآن وحدیث میں مصرح ہے اور متعدد مواقع میں موجود ہے، بالخصوص ان کے ساتھ جو تخریب اسلام میں ساعی ہوکر جگہ جگہ اسلام ومسلمین کی ہر قسم کی ایذار رسانی کا ثبوت بین دے رہے ہیں، اور استقبال میں اس سے زائد اندیشے ہیں۔

۱- ایسے وقت میں ترک موالات کی فرضیت میں تامل کرنا کسی طرح جائز نہیں معلوم ہوتا اور جو خطرات پیش نظر ہیں ہرچند وہ بھی قابل انکار نہیں، مگر ان کے اندیشہ سے سب موجودہ اور آئندہ بلاؤں پر صبر وسکوت کر لینا ہرگز جائز نہیں۔ مسلمانوں پر فرض ہے کہ اپنے حقوق ومنافع ضروریہ کو متفق ہوکر حکام سے حاصل کرنے میں ہرگز کوتاہی نہ کریں، مسلمانوں کی کوتاہیوں کا نتیجہ ہے جو کچھ نظر آرہا ہے۔ اب آخر تا بکے؟

۲- مصائب حاضرہ میں ہندوؤں کی ہمدردی سے فائدہ اٹھانا یا ان کے ساتھ مصالحت اور رواداری کا برتاؤ کرنا اور جو ہنود اس درد میں ہماری غم خواری کریں ان سے مبرۂ اقساط (حسن سلوک) سے پیش آنا شرعًا درست اور جائز ہے، ہاں یہ فرض ہے کہ اس امداد میں کسی حکم شرعی میں ادنیٰ خلل اور نقصان نہ آئے، نیز جو صاحب یہ کام کریں ایسے مصالح اور مقاصد پر پوری نظر اور احتیاط رکھیں، اس جواب اور (۱) کے جواب کا ثبوت اس آیت سے واضح ہے،

"لاینہاکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروہم وتقسطوا الیہم ان اللہ یحب المقسطین۔ انما ینہاکم اللہ عن الذین قاتلوکم فی الدین واخرجوکم من دیارکم وظاہروا علیٰ اخراجکم ان تولوہم ومن یتولہم فاولٓئک ہم الظلمون"۔

اس آیت کا شان نزول تفاسیر سلف میں دیکھ لیا جائے۔ نیز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا کفار مکہ کی سختیوں سے تنگ آکر ملک حبشہ کی (جو اس وقت کافر تھا) زیر حمایت رہنے کو اچھا سمجھنا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ابن الدغنہ کی امان کو قبول کرنا اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ابوطالب کی وفات پر تاسف انگیز کلمات فرما کر ان کی تائید اور اعانت کو یاد فرمانا نیز بنو خزاعہ اور بعض دوسرے قبائل کا فتح مکہ کے وقت آپ کے ساتھ ہونا۔ یہ اور اس قسم کی نظائر کثیرہ بھی موجودہ حالت

کو دیکھتے ہوئے نظر انداز کرنے کے قابل نہیں۔

۳۔ ترک موالات کے متعلق بہت سی جزئیات ہیں جو امر مسلمانوں کو نافع نظر آئے اس کا کرنا ضروری ہے۔ ہاں یہ امر ضروری اور مفید معلوم ہوتا ہے کہ اپنے مدارس اور اپنے لڑکوں کی تعلیم کو اپنے ہاتھ میں لے کر اپنی دینی حسیات اور قومی خصائل پر اس کا نظام قائم کیا جائے۔ علی گڑھ کالج کی ابتدائی حالت میں علماء متدینین نے علی العموم اس قسم کی تعلیم سے (جو از سرتاپا گورنمنٹ کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے) روکا مگر بدقسمتی کہ وہ رک نہ سکی۔ اب جب کہ اس کے ثمرات و نتائج آنکھوں سے دیکھ لئے تو قوم کو اس سے بچانا بالبداہۃ ایک ضروری امر ہے۔ طلباء کے والدین دیکھ بھال کر اور سمجھا نے پر بھی اسی تعلیم پر زور دیں اور مذہبی تعلیم سے مانع ہوں تو طلباء کو ضروری ہے کہ لوجہ اللہ تعلیم مذہبی اور اسلام کی خدمت گذاری کیلئے سعی کریں۔"

بندہ محمود حسن عفی عنہ۔ (۸)

ہجرت سے متعلق ایک سوال

ملک کے ان حالات میں جب کہ تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات زوروں پر تھی، اس وقت حضرت شیخ الہند نے بعض لوگوں کو ہجرت کے مشورے بھی دیئے۔ ایک صاحب نے ہجرت کے سلسلہ میں استفتار کیا تھا اُن کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اس میں شک نہیں ہے کہ حالات موجودہ میں ہجرت کی ضرورت اور اہمیت سے انکار نہیں، اور اب جب اس امر کی اہمیت اور نزاکت کو کما حقہ سمجھ چکے ہیں تو آپ پر اس بارے میں جد وجہد فرض ہے۔" (۹)

واضح رہے کہ یہ مسئلہ انفرادی ہجرت کے سلسلہ میں آپ نے بتایا ہے کہ عمومی ہجرت کا وہ طوفانی دور جس کا تذکرہ ہم کر چکے ہیں گذر چکا تھا۔

۸۔ شیخ الہند و دیگر علماء دیوبند و فرنگی محلی وغیرہ۔ فتویٰ ترک موالات۔ ص۔ ۳۔ ۴۔ ۵

۹۔ مدینہ بجنور۔ ۹ ستمبر ۱۹۲۰ء

علالت

حضرت شیخ الہند بہت ہی نحیف الجثہ تھے اور کسی قدر مریض بھی رہتے تھے، آخر عمر میں مرض کا سلسلہ اور دراز ہو گیا تھا، اور اکثر کچھ نہ کچھ شکایات لگی رہتی تھیں، مگر بایں ہمہ مشاغل درس و تدریس سے بے توجہی نہ فرماتے، آخری بار سفر حجاز سے پہلے گھٹنوں کے درد اور وجع المفاصل میں مبتلا رہتے تھے، سردیوں میں یہ مرض ترقی کر جاتا تھا، اس کے علاوہ بواسیر اور کثرت بول وغیرہ امراض کی بھی شکایت رہتی تھی، اس سفر میں جب مالٹا کی اسارت کا حادثہ پیش آیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ان مذکورہ شکایات میں بڑی حد تک تخفیف فرما دی تھی البتہ رہائی کے بعد جب ہندوستان واپس تشریف لائے تو پھر یہ شکایات عود کر آئیں۔ واپسی کے بعد ہی سے اگرچہ کسی قدر علالت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا، تاہم آپ نے جو مقصد متعین فرما لیا تھا اس میں حتی الامکان کوتاہی نہ ہونے دی۔ زندگی کے آخری چند مہینوں میں جب مرض کافی شدت اختیار کر گیا تھا، اس حالت میں بھی آپ نے متعدد سفر کیے، اور بعض جلسوں میں انتہائی کمزوری اور بیماری کے باوجود شرکت فرمائی۔ ایام مرض میں بار بار فرمایا کرتے تھے کہ "بیماری سے اچھے ہوتے ہی سارے ہندوستان کا دورہ کروں گا اور ہندوستان کے باشندوں بالخصوص مسلمانوں کو آزادی کی مکمل جد و جہد کیلئے آمادہ کروں گا"۔ لیکن عمر نے وفا نہ کی اور یہ مرض مرض الوفات ثابت ہوا۔ (۱۰)

طویل اسارت کا سلسلہ ختم کر کے شیخ الہند کی ہندوستان واپسی سے جہاں عام مسرت و شادمانی کا اظہار ہوا، تھوڑے ہی دنوں بعد سلسلۂ علالت شروع ہونے پر اس مسرت و شادمانی کی جگہ فکر و تردد اور کچھ چھن سا جانے کے ہمہ وقتی خطرے نے لے لی۔ ہر شہر کے لوگوں کی تمنا تھی کہ شیخ الہند ان کے شہر تشریف لے جائیں، لیکن صحت اس قابل نہ تھی، مجبوراً علالت کا عذر پیش فرما دیتے۔ جس سے عمومی طور پر اہل تعلق کو تشویش دامن گیر رہنے لگی۔

داد دیجئے اس ہمت اور عزم جواں کی جو بوڑھے نحیف و نزار جسم میں تھا کہ اس حالت میں شدید بیماری کے عالم میں بھی بعض سفر فرمائے۔ چنانچہ علی گڈھ جامعہ ملیہ کے جلسۂ تاسیس میں

۱۰۔ مولانا سید حسین احمد صاحب۔ نقش حیات دوم۔ ص۔ ۲۴۸۔ ۲۴۹

شرکت کیلئے تشریف لے گئے اور وفات سے چند یوم قبل جب کہ بسلسلۂ علاج دہلی میں مقیم تھے اسی دوران جمیعتہ علمار ہند کے اجلاس منعقدہ دہلی میں شرکت کا ارادہ فرمایا گو معالجین نے جانے نہ دیا لیکن آپ اپنے طور پر تیار تھے۔ آخر آپ کا خطبۂ صدارت مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب نے اجلاس میں پڑھ کر سنایا۔

قیام جامعہ ملیہ

ملک میں تحریک ترک موالات زوروں پر تھی۔ ترک موالات کی ایک شق یہ بھی تھی کہ وہ اسکول اور کالج جو حکومت کے زیر انتظام یا کم از کم اس کے تعاون سے چل رہے ہوں ان کا مقاطعہ (بائیکاٹ) کیا جائے۔ اور ان میں اپنے لڑکوں کو تعلیم کی غرض سے نہ بھیجا جائے۔ مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی اور گاندھی جی اس مقصد سے پورے ملک کا دورہ کر رہے تھے۔ علی گڑھ کے خاصے پرجوش نوجوان مولانا محمد علی کے ہمنوا تھے مگر کالج کے ذمہ داران کے سامنے ان کی ایک نہ چلتی تھی اور وہ مجبور ہو کر رہ جاتے۔ مولانا محمد علی سے ذمہ داران علی گڑھ خوش نہ تھے۔ علی گڑھ کے کچھ جوشیلے نوجوانوں نے مولانا محمد علی کو دعوت دی تھی کہ علی گڑھ آکر ترک موالات اور تعلیمی مقاطعہ کی دعوت دیں۔ خود مولانا محمد علی کی بھی یہی خواہش تھی، مولانا موصوف کو علی گڑھ سے جو تعلق تھا اس کا تقاضا بھی یہی تھا چنانچہ آپ نے گاندھی جی سے کہا کہ آپ یہ دعوت مجھ علی گڑھ سے شروع کرنے دیں، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور گاندھی جی علی گڑھ آئے اور اپنی دعوت پیش کی۔ ذمہ داران کالج کے اشاروں پر کچھ لوگوں نے جلسہ کو ناکام بنانے کی کوشش کی۔ ان کی کوشش نتیجہ خیز ثابت ہوئی اور پہلے مرحلہ میں مولانا مرحوم کو ناکامی ہوئی، وہ طلبار جنھوں نے مولانا وغیرہ کو علی گڑھ آنے کی دعوت دی تھی جلسہ کا یہ رخ دیکھ کر سخت متاسف ہوئے اور انھیں اس پر ندامت و شرمندگی کا بھی احساس ہوا۔ دوسرے دن ان کی تحریک پر پھر جلسہ ہوا، آج کے جلسہ کا رنگ کچھ اور تھا نسبتاً کامیابی کے امکانات بھی کچھ پائے جا رہے تھے جلسہ ہو ہی رہا تھا کہ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی بھی پہونچ گئے ان دونوں بھائیوں نے پھر چند منٹ تقریر کی، مگر اسی میں ہوا کا رخ بدل دیا۔ (۱۱)

۱۱۔ عبد الغفار مدہولی۔ جامعہ کی کہانی۔ ص۔ ۱۹۔ ۲۰

اس جلسہ کا تذکرہ کرتے ہوئے مصنف "جامعہ کی کہانی" یوں رقمطراز ہیں ۔

" دونوں بھائیوں نے بس دو دو چار چار منٹ تقریر کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ علی گڑھ ہمارا روحانی گھر تھا ہم یہاں بڑے ارمان لے کر آئے تھے بہت دل شکستہ جاتے ہیں ، خدا حافظ ! ہزاروں نوجوانوں کا مجمع چلا چلا کر رو رہا تھا بہتوں کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں ، ایک کہرام تھا ، دل پگھل پگھل کر آنکھوں سے نکلے پڑتے تھے اسی عالم میں علی برادران ہال سے چلے گئے ، مگر یہ چند منٹ بہتوں کے لئے زندگی کے فیصلہ کن منٹ بن گئے ۔" (۱۲)

متعدد موافق و مخالف تقریروں اور بے انتہا رد و قدح کے بعد یہ طے پایا کہ اگر ذمہ داران کالج سرکاری امداد و تعلق سے دست بردار نہیں ہوتے ہیں اور ان کا یہ تعلق ترک موالات کی راہ میں حائل ہے تو طلبا خود علیحدہ ہو جائیں اور قوم ان کی مستقل آزاد تعلیم کا علیحدہ بندوبست کرے جو حقیقتاً ــــ "تعلیم مادر دست ما باشد" کی مصداق ہو ــــ یہیں سے جامعہ ملیہ کے قیام کا خیال پیدا ہوا ۔ علی برادران ۔ مولانا آزاد ، حکیم اجمل خاں ۔ مولانا حسرت موہانی تک طلبا کے اس فیصلہ کن جذبہ کی رسائی ہوئی تو انھوں نے بھی اس کی پذیرائی کی ۔ اور غور و تامل کے بعد اس کو عملی قالب "جامعہ ملیہ اسلامیہ" کے نام سے دیا ۔ وقتی طور پر یہ علی گڑھ ہی میں قائم ہوا تھا مگر بعد میں دہلی منتقل ہو گیا ۔

۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو جمعہ کے دن باضابطہ طور پر قیام جامعہ ملیہ اسلامیہ کا اعلان ہوا ۔ حضرت شیخ الہند گو ان دنوں کافی بیمار تھے تاہم مولانا محمد علی وغیرہم کی دعوت اسی حالت میں بڑے شوق سے قبول فرمائی ، بعض مخلصین نے مرض کی طرف توجہ دلائی تو فرمایا کہ ــــ

" اگر میری صدارت سے انگریز کو تکلیف ہوگی تو اس جلسہ میں ضرور شریک ہوں گا ۔" (۱۳)

مجوزہ پروگرام کے مطابق حضرت شیخ الہند نے رسم تاسیس ادا فرمائی ، خطبہ بیماری کے باعث آپ خود نہ پڑھ سکے اس لئے رسم تاسیس کے بعد مولانا شبیر احمد عثمانی نے آپ کا مشہور خطبہ پڑھ کر سنایا ۔ (۱۴)

---

۱۲ ۔ عبدالغفار مدہولی ۔ جامعہ کی کہانی ۔ ص ۔ ۲۱

۱۳ ۔ مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی ۔ نقش حیات دوم ۔ ص ۔ ۲۵۶

۱۴ ۔ عبدالغفار مدہولی ۔ جامعہ کی کہانی ۔ ص ۔ ۲۶

خطبہ کے جستہ جستہ اقتباسات درج ذیل ہیں ۔

"اے حضرات! آپ خوب جانتے ہیں کہ جس وادیٔ پرخار کو آپ برہنہ پا ہوکر قطع کرنا چاہتے ہیں وہ مشکلات اور تکالیف کا جنگل ہے، قدم قدم پر وہاں صعوبتوں کا سامنا ہے طرح طرح کی بدنی اور مالی اور جاہی مکروہات آپ کے دامن استقلال کو الجھانا چاہتی ہیں لیکن "حفت الجنۃ بالمکارہ" کے قائل کو اگر آپ خدا کا سچا رسول مانتے ہیں (اور ضرور مانتے ہیں) تو یقین رکھئے کہ جس صحرائے پرخار میں آپ گامزن ہونیکا ارادہ رکھتے ہیں اس کے راستے سے جنت کا دروازہ بہت ہی قریب ہے ۔ کامیابی کا آفتاب ہمیشہ مصائب و آلام کی گھٹاؤں کو پھاڑ کر نکلا ہے"۔ (۱۵)

آگے چل کر ضعف و علالت کے باوجود اپنی شرکت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں ۔

"میں نے اس پیرانہ سالی اور علالت و نقاہت کی حالت میں (جس کو آپ خوب مشاہدہ فرما رہے ہیں) آپ کی دعوت پر اس لئے لبیک کہا کہ میں اپنی ایک گم شدہ متاع کو یہاں پانے کا امیدوار ہوں، بہت سے نیک بندے ہیں جن کے چہروں پر نمازوں کا نور اور ذکر اللہ کی روشنی جھلک رہی ہے لیکن جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا را جلد اٹھو اور اس امت مرحومہ کو کفار کے نرغہ سے بچاؤ تو ان کے دلوں پر خوف و ہراس مسلط ہو جاتا ہے، خدا کا نہیں بلکہ چند ناپاک ہستیوں کا اور ان کے سامان حرب و ضرب کا ۔ حالانکہ ان کو تو سب سے زیادہ جاننا چاہیئے تھا کہ خوف کھانے کے قابل اگر کوئی چیز ہے تو وہ خدا کا غضب ہے، اور اس کا قاہرانہ انتقام ہے، اور دنیا کی متاع قلیل خدا کی رحمتوں اور اس کے انعامات کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں رکھتی"۔ (۱۶)

وہ پرجوش طلبار جو علی گڑھ کے عیش و آرام کو قومی جذبات پر نچھاور کر کے جامعہ کے فرش خاکی کو ترجیح دے رہے تھے، انھیں خطاب کرتے ہوئے فرمایا ۔

"اے نونہالان وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے درد کے غمخوار (جس سے میری ہڈیاں پگھلی جارہی ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں (دیوبند اور علی گڑھ) کا رشتہ جوڑا ۔

۱۵۔ شیخ الہند ۔ خطبہ صدارت مع فتویٰ ۔ (عنی المطابع دہلی) ۔ ص ۔ ۳

۱۶۔ " " " " " ص ۔ ۴

کچھ بعید نہیں کہ بہت سے نیک نیت بزرگ میرے اس سفر پر نکتہ چینی کریں اور مجھ کو اپنے مرحوم بزرگوں کے مسلک سے منحرف بتلائیں لیکن اہل نظر سمجھتے ہیں کہ جس قدر میں بظاہر علی گڑھ کیطرف آیا ہوں اس سے کہیں زیادہ علی گڑھ میری طرف آیا ہے۔

آپ میں سے جو حضرات باخبر ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ میرے اکابر سلف نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان کے سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم وفنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا، ہاں یہ بے شک کہا گیا کہ اگر انگریزی تعلیم کا آخری اثر یہی ہے جو عموماً دیکھا گیا ہے کہ لوگ نصرانیت کے رنگ میں رنگے جائیں یا ملحدانہ گستاخیوں سے اپنے مذہب اور مذہب والوں کا مذاق اڑائیں یا حکومت وقتیہ کی پرستش کرنے لگیں تو ایسی تعلیم پانے سے ایک مسلمان کے لئے جاہل رہنا ہی اچھا ہے۔" (۱۷)

"ضرورت اس امر کی ہے کہ تعلیم مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہو اور اغیار کے اثر سے کلیتاً آزاد ہو۔ کیا باعتبار عقائد وخیالات کے اور کیا باعتبار اخلاق و اعمال کے اور کیا باعتبار اوضاع واطوار کے۔ ہم غیروں کے اثرات سے پاک ہوں۔

ہماری عظیم الشان قومیت کا اب یہ فیصلہ نہ ہونا چاہئے کہ ہم اپنے کالجوں سے بہت سستے داموں کے غلام پیدا کرتے رہیں، بلکہ ہمارے کالج نمونہ ہونے چاہئیں بغداد اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں کے اور ان عظیم الشان مدارس کے جنھوں نے یورپ کو اپنا شاگرد بنایا اس سے پیشتر کہ ہم اسکو اپنا استاد بناتے۔" (۱۸)

"سربرآوردہ مسلم زعماء کے قیام جامعہ کے فیصلہ کو نظر استحسان سے دیکھتے ہوئے فرماتے ہیں۔ ہماری قوم کے سربرآوردہ لیڈروں نے سچ تو یہ ہے کہ امت اسلامیہ کی ایک بڑی اہم ضرورت کا احساس کیا۔ بلاشبہ مسلمانوں کی درس گاہوں میں جہاں علوم عصریہ کی تعلیم دی جاتی ہو اگر طلبہ اپنے مذہب کے اصول وفروع سے بے خبر ہوں اور اپنے قومی محسوسات اور اسلامی فرائض فراموش کر دیں اور ان میں اپنی ملت اور اپنے ہم قوموں کی حمیت نہایت ادنیٰ درجہ پر رہ جائے تو یوں سمجھو کہ وہ درس گاہ مسلمانوں کی قوت کو ضعیف بنانے کا ایک آلہ ہے۔ اس لئے اعلان کیا گیا ہے کہ ایسی آزاد یونیورسٹی کا افتتاح کیا جائے گا جو گورنمنٹ کی اعانت اور اس کے اثر

۱۷- شیخ الہند خطبۂ صدارت مع فتویٰ (غنی المطابع دہلی) ص - ۴ - ۵

۱۸- " " " ص - ۶

سے بالکل علیحدہ اور جس کا تمام تر نظام عمل اسلامی خصائل اور قومی محسوسات پر مبنی ہو۔"

(اس کے متأ بعد ان طلبار کی جنھوں نے علی گڈھ کو خیر باد کہا تھا اور قیام جامعہ کا ذریعہ بنے تھے ہمت افزائی کرتے ہوئے فرماتے ہیں)

"مجھے لیڈروں سے زیادہ ان نونہالان وطن کی ہمت بلند پر آفریں اور شاباش کہنا چاہئے جنھوں نے اس نیک مقصد کی انجام دہی کے لئے اپنی ہزاروں امیدوں پر پانی پھیر دیا، اور باوجود ہر قسم کی طمع اور خوف کے وہ موالات نصاریٰ کے ترک پر نہایت مضبوطی اور استقلال کے ساتھ قائم رہے اور اپنی عزیز زندگیوں کو ملت اور قوم کے نام پر وقف کر دیا۔" (۱۹)

اس موقع پر طلبار نے حضرت شیخ الہند کے سامنے بعض شبہات پیش کئے تھے جو ان کے دلوں میں ذمہ داران کالج کی باتوں سے پیدا ہو گئے تھے چنانچہ انھوں نے ترک موالات کے سلسلہ میں حضرت شیخ الہند سے استفسار کیا اور اس کی تمام شقوں کے ایسے جوابات چاہے جن سے وہ مطمئن ہو سکیں۔ حضرت شیخ الہند نے ان کے تمام استفسارات کا تفصیل سے جواب دیا اور اسلامی تاریخ کے مختلف واقعات ان کے سامنے تمثیلاً بیان کرتے ہوئے اپنی بات کو پختہ و مضبوط فرمایا طلبار کو جواب دیتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ۔

"اے فرزندان اسلام اور اے محبان ملت و وطن! آپ کو مجھ سے زیادہ معلوم ہے کہ جس برق مسلم سوز نے ان بلاد اسلامیہ کے خرمن آزادی کو جلا دیا اور خلافت اسلامیہ کے قصر کو آگ لگائی اس کا اصلی ہیولیٰ عربوں اور ہندوستانیوں کے خون گرم سے تیار ہوا تھا اور جس دولت سے نصاریٰ ان ممالک مقدسہ میں کامیاب ہوئے اس کا بہت بڑا حصہ کبھی تمہارے ہی دست و بازو کا کمایا ہوا تھا کیا اب بھی کوئی ایسا بلید او غبی مسلمان پایا جاتا ہے جسکو نصاریٰ کے موالات و مناصرت کے نتائج قطعیہ معلوم نہ ہوئے ہوں۔ اور ایسی تشویش ناک حالت میں جب کہ ڈوبتا ہوا آدمی ایک تنکے کا سہارا ڈھونڈتا ہے وہ اس فکر میں ہو کہ کوئی صورت موالات کے جواز کی نکالے۔ اے میرے عزیزو! یہ وقت استحباب اور فرضیت کی بحث کا نہیں بلکہ غیرت اسلامی اور حمیت دینی سے کام لینے کا ہے کہیں علمار زمانہ کا چھوٹا بڑا اختلاف تمہاری ہمتوں کو پست اور تمہارے ولولوں کو پژمردہ نہ کر دے۔ میں اس وقت تم سے یہ نہیں کہتا کہ تم تاتاری لیس کر جہاد کرو یا عراق اور شام میں جاکر اپنے بھائیوں کا ساتھ دو بلکہ محض اسقدر

۱۹۔ شیخ الہند خطبہ صدارت مع فتویٰ، ص ۱۰

درخواست کرتا ہوں کہ تم اپنے دشمنوں کے بازوؤں کو قوی مت بناؤ ۔" (۲۰)

اس کے بعد ترک موالات کی تائید کے لئے متعدد آیات قرآنی اور ان کی تشریح پیش فرمائی ۔ ترک موالات میں چونکہ مسلمانوں کے علاوہ ہندو بھی شریک تھے اس لئے خطبہ کے آخر میں اس کا ذکر کرتے ہوئے اسے حسن اتفاق سے تعبیر فرمایا نیز ان سے مروت اور حسن سلوک کی تلقین کرتے ہوئے مسلمانوں کو متنبہ فرمایا کہ ۔

"ہندوؤں اور مسلمانوں کے ان تعلقات کا اثر یہ نہ ہونا چاہئے کہ مسلمان اپنے کسی مذہبی حکم کو بدلیں اور شعائر کفر و شرک کو اختیار کرنے لگیں اگر وہ ایسا کریں گے تو نیکی برباد گناہ لازم کی مثال اپنے اوپر منطبق کریں گے ۔" (۲۱)

اس پس منظر میں اور بڑی امیدوں اور تمناؤں کیساتھ جامعہ کا قیام عمل میں آیا تھا ۔ جامعہ کا وہ جذبۂ قومی و اسلامی تو اب باقی نہیں رہا تاہم ادارہ بہر حال قائم ہے اور اپنے نئے متعین کردہ فکری خطوط کے مطابق ترقی بھی کر رہا ہے ۔

اجلاس جمعیۃ علماء ہند کی صدارت

ہفتوں سے مرض شدت اختیار کئے ہوئے تھا اسی حالت میں جامعہ ملیہ کے جلسۂ تاسیس میں شرکت کے لئے علی گڈھ تشریف لے گئے تھے اور پھر وہاں سے دیوبند واپس ہو گئے ۔ مرض بڑھتا جا رہا تھا اس لئے ڈاکٹر انصاری صاحب وغیرہ کے شدید اصرار اور خواہش پر دہلی میں ڈاکٹر صاحب موصوف کی کوٹھی پر قیام فرما کر علاج کی تجویز منظور فرمائی ۔ دہلی میں بسلسلۂ علاج قیام پذیر تھے کہ اسی دوران جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس کی تاریخوں کا تعین ہوا ۔ ذمہ داران جمعیۃ کی خواہش پر شرکت اور صدارت بخوشی منظور فرمائی لیکن معالجین نے مرض کا خیال کر کے شرکت کی اجازت نہ دی ۔ آخر کار آپ کا تحریری خطبۂ صدارت اجلاس مذکورہ میں پڑھ کر سنایا گیا ۔ خطبہ کے بعض اقتباسات درج ذیل ہیں ۔

"چونکہ دور حاضرہ میں دشمنان اسلام نے مقامات مقدسہ کو غصب کر کے اقتدار خلافت کو پامال کر کے مسلمانوں کے واجب الاحترام جان و مال سے زیادہ عزیز مذہب کی توہین کی اور ان کے

---

۲۰ ۔ شیخ الہند ۔ خطبہ صدارت ۔ مع فتووں ۔ ص ۔ ۱۰ ۔ ۱۱

۲۱ ۔ " " " ص ۔ ۱۴

دینی بھائیوں کی جان و مال۔ عزت و آبرو کو برباد کیا اس لئے تمام روئے زمین کے مسلمانوں پر فرض ہو گیا ہے کہ وہ اپنے دینی بھائیوں کی نصرت و اعانت اور اپنے پاک اور مقدس مذہب کی حفاظت اور اعدائے اسلام کی مدافعت کے لئے کھڑے ہو جائیں۔ اس فرض میں چین۔ جاوا۔ ہندوستان۔ افغانستان۔ ترکستان۔ بخارا وغیرہ کے مسلمان برابر ہیں کسی کی تخصیص نہیں جن مقامات میں لڑائی ہوئی ہے جس طرح وہاں کے مسلمانوں پر فرض تھا کہ اپنے بھائیوں کی مدد اور دشمن کی مدافعت کریں اسی طرح روئے زمین کے مسلمانوں پر ایشیائی اور یورپین مظلوم مسلمانوں کی امداد و اعانت اور دشمنوں کی مدافعت فرض ہے، اگرچہ امداد و اعانت کی صورت مختلف اور مدافعت کی نوعیت جداگانہ ہے۔

اسلام نے اپنے پیروؤں اور کلمہ گویوں کے درمیان ایک ایسا رشتۂ اتحاد و اخوت قائم کیا ہے جو تمام قومی مصنوعی اتحاد سے بالاتر ہے اس میں قومیت اور لباس اور رنگت کا امتیاز نہیں صرف خدائے واحد پر ایمان لانا ایک مغربی شخص کو اقصائے مشرق میں رہنے والے کا بھائی بنا دیتا ہے۔" (۲۲)

زیر نظر خطبہ میں شیخ الہند نے ترک موالات کے علاوہ تحریک خلافت کی بھی بھرپور تائید فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں۔

"مسلمانوں کو ان کا خدا، ان کا رسول، ان کا پاک مذہب حکم کرتا ہے کہ وہ اپنے دینی بھائیوں کی مدد کریں خواہ وہ کہیں کے رہنے والے ہوں۔ کسی انسانی قانون اور طاقت کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کو ان کے مذہبی فرائض سے روکے یا ان کی جائز مذہبی جدوجہد کو غیر آئینی قرار دے۔" (۲۳)

آگے چل کر تفصیل سے خلافت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"معزز حاضرین! دنیائے اسلام میں گذشتہ چند صدیوں سے سلطان ٹرکی کی واحد سلطنت اسلامی شوکت کی ضامن تھی، اور حرمین محترمین بیت المقدس، عراق وغیرہ کے تمام اماکن مقدسہ و مقامات محترمہ کی حفاظت کی کفیل تھی، جمہور اہل اسلام کے اتفاق سے سلطان ممدوح کی خلیفۃ المسلمین مانے جاتے تھے، اور خلافت کے فرائض نہایت خوبی سے انجام دیتے تھے ان کا عروج و ترقی اور ان کی سلطنت کی وسعت جابر و غاصب مسیحی سلطنتوں کی آنکھ میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی،

۲۲۔ شیخ الہند۔ خطبہ صدارت اجلاس جمعیۃ علماء ہند منعقدہ دہلی۔ ۱۹۔۲۰۔۲۱ نومبر ۱۹۲۰ء ص ۳۔۴

۲۳۔ " " " " " ص ۱۰

اور وہ ہمیشہ اسی فکر میں لگی رہی تھیں کہ خلیفۃ المسلمین کا اقتدار گھٹایا جائے اور مستقر خلافت پر قبضہ کر کے یورپ سے اسلام کا نام و نشان مٹا دیا جائے ۔ ۱۸۷۷ء سے نوچ کھسوٹ کا متواتر ایک سلسلہ قائم ہو گیا ۔ مصر جیسا زرخیز علاقہ ۔ جزیرۂ قبرص ۔ طرابلس ۔ سالونیکا ۔ یونان ۔ بلغاریہ ۔ سرویا ۔ البانیہ وغیرہ ٹرکی علاقے یکے بعد دیگرے ان ظالموں کی جوع الذئب کی بھینٹ چڑھ گئے ۔" (۲۴)

ٹرکی کے مختلف علاقوں پر ان مظالم کے تفصیلی تذکرہ کے بعد فرماتے ہیں ۔

"جس کے دل میں ذرا سا ایمان بھی باقی ہے وہ سیماب وار بیقرار ہے اور اپنا شرعی، اخلاقی اور قانونی حق سمجھتا ہے کہ اپنے مظلوم بھائیوں کی نصرت و اعانت کیلئے اٹھ کھڑا ہو اور جس طرح ممکن ہو اپنے بھائیوں کو دشمن کے نرغہ سے نکالے اور ان کے پنجۂ ظلم سے نجات دلائے ۔" (۲۵)

عدم تعاون اور ترک موالات کی پر زور تائید کرتے ہوئے فرماتے ہیں ۔

"علماء ہند کی ایک کثیر جماعت یہ فیصلہ کر چکی ہے کہ چونکہ ہندوستان کے مسلمانوں کے پاس مدافعت اعداء کے مادی اسباب نہیں ہیں، اس لئے مادی جنگ نہیں کر سکتے، لیکن انھیں یقین رکھنا چاہئے کہ جب تک برطانیہ کے وزراء اسلامی مطالبات تسلیم نہ کر لیں، اس وقت تک تمام ہندوستان کے مسلمانوں کی ان کے ساتھ معاشرتی اور اخلاقی جنگ کی حالت ہے یعنی مسلمانوں پر حرام ہے کہ وہ اسلام کے دشمنوں کے ساتھ ایسے تعلقات قائم رکھیں جن سے ان کی مخالفانہ اور معاندانہ طاقت کو مدد پہونچے ۔" (۲۶)

آیات قرآنی اور احادیث سے ترک موالات اور تحریک خلافت کی تائید کرتے ہوئے فرماتے ہیں ۔

"فرزندان توحید! آج تمہارے ایمان اور اخلاص کا امتحان لیا جا رہا ہے ۔ خدا تعالیٰ دیکھ رہا ہے کہ کون اس کے جلال اور جبروت کے سامنے سر جھکاتا ہے، اور کون ہے جو دنیا کی ناپائیدار ہستیوں کے خوف سے خدا کی امانت میں خیانت کرتا ہے ۔ اگر تم کو میدان حشر میں خدا کے سامنے پیش ہونا ہے، اگر تم کو رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کی آرزو ہے تو اس کے پاک دین کی حفاظت کرو، اس کے مقدس احکامات کی اطاعت کرو، اس کی امانت توحید کو

---

۲۴ ۔ شیخ الہند ۔ خطبہ صدارت اجلاس جمعیۃ علماء ہند ۔ ص ۔ ۹

۲۵ ۔ " " " ص ۔ ۱۰

۲۶ ۔ " " " ص ۔ ۱۳

برباد نہ ہونے دو اور اس کی دی ہوئی عزت کو حقیقی عزت سمجھو۔" (۲۷)

شیخ الہند کے یہ الفاظ خاص طور سے غور کے قابل ہیں، نام نہاد دیندار طبقہ کے ذہنی طلسم کو توڑتے ہوئے بڑے درد سے فرماتے ہیں۔

"اسلام صرف عبادات کا نام نہیں، بلکہ وہ تمام مذہبی، تمدنی، اخلاقی، سیاسی ضرورتوں کے متعلق ایک کامل اور مکمل نظام رکھتا ہے۔ جو لوگ کہ زمانہ موجودہ کی کشمکش میں حصہ لینے سے کنارہ کشی کرتے ہیں اور صرف حجروں میں بیٹھے رہنے کو اسلامی فرائض کی ادائیگی کے لئے کافی سمجھتے ہیں، وہ اسلام کے پاک وصاف دامن پر ایک بدنما دھبہ لگاتے ہیں۔" (۲۸)

مذکورہ اجلاس کے مندرجہ بالا خطبہ کے علاوہ حضرت شیخ الہند کی ایک اور تحریر ہے جو اس اجتماع کے آخری اجلاس ۹ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ مطابق ۲۱ نومبر ۱۹۲۰ء میں پڑھ کر سنائی گئی۔ یہ حضرت شیخ الہند کی آخری تحریر ہے۔ اجلاس کے مباحث کو مدنظر رکھ کر مسرت ظاہر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"مسرت ہوئی کہ جسم قوم کی روح (جماعت علماء) نے بعض ان شعب سیاسیہ میں پھر ایک مرتبہ اپنی زندگی کا ثبوت پیش کیا ہے جن میں وہ بالکل مردہ سمجھی جارہی تھی۔ اور جن میں اگر وہ مردہ ثابت رہتی تو اسلامی عزت ووقار کا بالکل ہی خاتمہ تھا۔ آپ رنجیدہ نہ ہوں تو میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ کا علم وتدین اگر اب بھی عالم اسلامی کے خوفناک مصائب سے آنکھ بند کئے رکھنے کی اجازت دیتا تو آج دنیا ہماری غیرت ایمانی اور شرافت انسانی دونوں کے بیک وقت دفن کئے جانے پر ماتم کناں ہوتی۔ اور اب بھی اگر ہم چند تجاویز پاس کرکے اور صرف چند ساعتوں کی گرمی محفل کو اپنی تمام تقریروں اور خطبوں کا ماحصل سمجھ کر منتشر ہوگئے تو ہماری مثال ٹھیک اس مریض کی سی ہوگی، جو ایک اکسیر شفا کی تکرار زبان سے بار بار کرتا رہے لیکن اسکا استعمال ایک دفعہ بھی نہ کرے۔ ہم سب کو مل کر متوکلاً علی اللہ ان طے شدہ تجاویز پر عمل کرنا اور کرانا چاہئے جن سے ہمارے ایمان، ہمارے کعبہ، ہماری خلافت، ہماری عزت وآبرو، ہمارے مقامات مقدسہ، اور ہمارے ملکی اور قومی حقوق کا تحفظ ہوسکتا ہے، اگر اس وقت بھی ہم نے غفلت اور تن آسانی

۲۷- شیخ الہند۔ خطبہ صدارت اجلاس جمعیۃ علماء ہند۔ ص۔ ۱۸-۱۹

۲۸- " " " " ص۔ ۱۹

اختیار کی تو شاید عافیت حاصل کرنے کا یہ آخری موقع ہوگا جس کو ہم جان بوجھ کر اپنے ہاتھ سے کھوئیں گے ۔" (۲۹)

سانحۂ غم

بسلسلۂ علاج دہلی کے اسی مذکورہ سفر میں ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء کو شیخ الہند کا وصال ہوگیا۔ علالت اور مرض الوفات کا تذکرہ تفصیل سے ہم پہلے کر چکے ہیں، یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

حضرت شیخ الہند نے سیاسی مقاصد کے پیش نظر اگرچہ اپنی کوششوں کا سلسلہ عرصہ سے شروع کر رکھا تھا، لیکن ان کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ عوام تو کیا آپ کے قریب رہنے والے ارباب دارالعلوم دیوبند تک اس سے ناواقف اور بے خبر تھے۔ آخری عمر کے چند سال میں جب آپ کی کوششوں کے بروئے کار آنے کا وقت ہوا اور اچانک اسی دوران گرفتاری اور مالٹا میں اسارت کا حادثہ پیش آیا تو اس وقت عوام و خواص حضرت شیخ الہند کے کارناموں سے واقف ہو سکے اور اسی کی روشنی میں ماضی کے مدھم اور غیر واضح نقوش بھی پڑھے جا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ مالٹا کی واپسی پر ہاتھوں ہاتھ لئے گئے اور ہر جماعت اور ہر گروہ نے پیشوائی اور استقبال کو اپنے لئے سرمایۂ افتخار سمجھا۔ اس تھوڑے عرصہ میں اپنے کارناموں کی بنا پر حضرت شیخ الہند کی محبت نے لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا تھا۔ وفات کی خبر وحشت اثر کو سنتے ہی ملک کی ہر بزم طرب مجلس نالہ و شیون میں بدل گئی، اور ہر شخص پر رنج و ناسف کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ابھی مالٹا سے رہائی پر اظہار مسرت کا سلسلہ جاری تھا کہ قید حیات سے رہائی نے سب کو غم و اندوہ میں مبتلا کر دیا۔ جگہ جگہ اس حادثۂ جانکاہ پر حزن و ملال کیا گیا اور آپ کی عظیم الشان خدمات کو سراہا گیا۔

اس سانحہ سے مسلمانان ہند کا عزم و ارادہ اور حوصلہ و ولولہ اچانک یاس و ناامیدی سے بدل گیا۔ ایک شخصیت جس کے گرد سیاسیان ملت کا اجتماع رہتا تھا اور اس کے وجود سے ان سب کو تقویت حاصل تھی، اچانک اس کے فقدان سے امید کی ایک ایک کرن بجھنے لگی۔

اس حادثۂ غم پر اسلامیان ہند ہی نہیں بلکہ مسلمانان عالم کی آنکھیں برس پڑیں۔ بے محل اور نامناسب نہ ہوگا اگر ہم یہاں ان اشکہائے غم کو الفاظ کے دامن میں سمو کر

۲۹۔ شیخ الہند، خطبہ صدارت اجلاس جمعیۃ علماء ہند، ص ۲۲ - ۲۳

صفحۂ قرطاس کے دامن پر بکھیر دیں۔

ملک کے طول و عرض میں جگہ جگہ تعزیتی جلسے ہوئے اور بیشمار اخبارات نے اس حادثۂ عظیم پر اداریے اور مضامین شائع کئے۔ ملک کی مختلف تنظیموں۔ خلافت کمیٹی۔ مسلم لیگ۔ کانگریس وغیرہ نے تعزیتی جلسے کر کے اپنے رنج و غم کا اظہار کیا۔ ہندوستان کے علاوہ افغانستان میں بھی آپ کے سانحہ ارتحال پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا گیا۔ مختلف اخبارات نے اداریے اور آپ کی خدمات پر مستقل مضامین شائع کئے۔ شاہ افغانستان امیر امان اللہ خاں نے زیر دست مجلس قرآن خوانی منعقد کرائی اور بذات خود اس میں شریک ہوئے۔ امیر صاحب نے اس میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ـــ

"مولانا محمود حسن یک کار را شروع کردند۔ من اورا پورا می کنم" (۳۰)

رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر۔ مولانا شوکت علی۔ ڈاکٹر انصاری۔ مولانا آزاد۔ حکیم اجمل خاں وغیرہ اکابر ملک تحریک کے دوران جس طرح قریب رہے اس کا تقاضا تھا کہ انھوں نے اس کو نہ صرف قومی بلکہ ذاتی حادثہ تصور کیا۔

مولانا محمد علی نے انتہائی آب دیدہ ہو کر فرمایا کہ ـــ

"اس حادثہ نے ہماری کمر توڑ دی" (۳۱)

ڈاکٹر انصاری صاحب نے مسلم لیگ کے خطبۂ صدارت میں فرمایا تھا کہ ـــ

"حضرت شیخ الہند کی وفات نے مسلمانان ہند کو نہایت افسردہ کر دیا ہے سارے ہندوستان میں کسی ایک مسلمان کا گھر بھی ایسا نہ ہو گا جہاں اس حامل شریعت حقہ کی مفارقت دائمی کا ماتم نہ کیا گیا ہو کون نہیں جانتا کہ حضرت مغفور کی زندگی تقویٰ۔ اطاعت الٰہی۔ مذہبی سادگی اور روحانیت کے اعتبار سے کیسی عدیم المثال تھی۔ آپ عہد حاضر کے سب سے بڑے محدث اور اسوۂ حسنۂ پیغمبری کے عالم باعمل تھے۔ آپ کے درس کی شہرتیں دنیا کے مختلف اسلامی ممالک سے طالبان علم کو لاتی تھیں اور حلقۂ تدریس میں شامل کرتی تھیں آپ کے تلامذہ اور شاگرد ہزاروں کی تعداد میں شمار کئے جاتے ہیں۔ مولانائے مغفور کا اپنی جلا وطنی

۳۰۔ مولانا عبید اللہ سندھی۔ کابل میں سات سال۔ ص۔ ۸۲

۳۱۔ مولانا سید محمد میاں۔ علمائے حق جلد اول۔ ص۔ ۲۲۰

اور ابتلا کی نظر بندی میں مذہب کے لئے مصائب جھیلنا، پچہتر برس کے سن میں تکالیف اور صعوبتوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنا اور سب سے زیادہ مرحوم کی وہ ناقابل فتح قوت ارادی اور آپ کا غیر متزلزل ایمان بالحق یہ تمام خصوصیات ایک عظیم الشان وراثت ہیں جو حضرت اقدس مسلمانان ہند کیلئے چھوڑ گئے ہیں۔" (۳۲)

شیخ الہند کی تحریک میں جیسا کہ تفصیل سے گذر چکا ہے صرف مسلمان ہی نہ تھے اس لئے وفات پر احساس غم میں مسلمان تنہا نہ رہے بلکہ برادران وطن نے بھی اسے اپنا غم سمجھا۔ ناگپور میں ہندوستان کے مختلف کالجوں کے طلبار کی کانفرنس لالہ لاجپت رائے کے زیر صدارت ہو رہی تھی۔ کانفرنس کی تعزیتی تجویز میں کہا گیا تھا۔

"یہ کانفرنس حضرت مولانا محمود حسن صاحب کی وفات پر اپنے نہایت رنج و غم کا اظہار کرتی ہے۔ مولانا ممدوح کی شاندار اسلامی خدمات اور ہندو مسلم اتحاد کی کوششیں ہندوستان کے نوجوانوں کے لئے اس کانفرنس کی رائے میں سرمایۂ ہدایت ہوں گی۔" (۳۳)

شیخ الہند عمر کے جس مرحلہ میں پہونچ چکے تھے ظاہر ہے کہ اس میں دوسرے مسلم زعمار کے دوش بدوش شریک عمل نہ رہ سکتے تھے لیکن آپ کے وجود سے تحریک آزادی کے زعمار بالخصوص مسلم زعمار کو آپ کے دم سے بڑی تقویت حاصل تھی اور ان کے لئے یہ احساس ہی بہت تھا کہ کوئی ہمارا سرپرست موجود ہے۔ آپ کے وصال سے اس حوصلہ کو سخت ٹھیس پہونچی لیکن آپ اپنی ان تھک جدوجہد سے جو پیام عمل دے گئے تھے اس نے ان کے لئے مشعل راہ کا کام دیا۔ موت تو بہرحال سب کے لئے مقدر ہے ایک جاتا ہے دوسرا آتا ہے۔ ازل سے یہی دستور چلا آرہا ہے۔ چند دن محو غم رہ کر انسان پھر مصروف عمل ہو جاتا ہے اور بظاہر کوئی خلا بھی باقی نہیں رہتا ؎

خدا جانے یہ کس کی جلوہ گاہ ناز ہے دنیا
ہزاروں اٹھ گئے باقی وہی رونق ہے محفل کی

---

۳۲ - مدینہ بجنور یکم جنوری ۱۹۲۱ء

۳۳ - تذکرہ شیخ الہند۔ مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری۔ ص - ۲۹۰

پھر بھی یہ حادثہ اپنی نوعیت میں کچھ منفرد اور دیر تک یاد رہنے والا تھا کہنے کو یہ ایک فرد کا حادثۂ ارتحال تھا لیکن اپنی اہمیت کے اعتبار سے پوری ایک تاریخ کا خاتمہ تھا۔

فما کان قیس ہلکہ ہلک واحد
ولکنہٗ بنیان قوم تہدما

— .... —

ضمیمہ (۱)

ممتاز تلامذہ

اس طویل زمانہ درس و تدریس میں آپ کے بلا واسطہ شاگردوں کی تعداد ایک ہزار سے زائد ہوتی ہے اور بالواسطہ شاگردوں کی تعداد کئی ہزار تک پہونچ جائے گی۔ ذیل میں ہم حضرت شیخ الہند کے بلا واسطہ شاگردوں میں سے ایسے حضرات کا نام درج کر رہے ہیں جنھوں نے دارالعلوم اور نامور استاذ کا نام روشن کیا اور خود بھی امتیاز و انفرادیت کے حامل ہوئے۔

۱۔ مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ ۔ ۲۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ ۔ ۳۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ ۔ ۴۔ مولانا انور شاہ کشمیریؒ ۔ ۵۔ مولانا مفتی کفایت اللہ شاہجہاں پوریؒ ۔ ۶۔ مولینا شبیر احمد عثمانیؒ ۔ ۷۔ مولانا محمد میاںؒ عرف مولانا منصور انصاری ۔ ۸۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ (سابق مہتمم دارالعلوم) ۔ ۹۔ مولانا سید احمد صاحبؒ مہاجر مدنی ، بانی مدرسہ شرعیہ مدینہ منورہ ۔ ۱۰۔ مولانا اعزاز علیؒ ۔ ۱۱۔ مولانا سید فخرالدینؒ احمد صاحب صدر جمعیۃ العلماء ہند و شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند ۔ ۱۲۔ مولانا عبدالسمیع صاحب مدرس دارالعلوم دیوبند ۔ ۱۳۔ مولانا احمد علی لاہوری مفسر قرآن ۔ ۱۴۔ مولانا محمد صدیق صاحب مہاجر مدنی ۔ ۱۵۔ مولانا محمد صادق صاحب کراچی ۔ ۱۶۔ مولانا عزیز گل صاحب ۔ ۱۷۔ مولانا عبدالوہاب صاحب دربھنگہ ۔ ۱۸۔ مولانا عبدالصمد رحمانی ۔ ۱۹۔ مولانا عبدالرحیم صاحب پوپلزئی ۔ (۱)

۲۰۔ مولانا سید حامد حسن صاحب گنگوہی ثم نہٹوڑی ۔ ۲۱۔ مولانا رحمت اللہ نہٹوری ۔ ۲۲۔ مولانا محمد الیاس صاحب (بانی جماعت تبلیغ دہلی) ۲۳۔ مولانا احمد اللہ صاحب پانی پتی ۔ ۲۴۔ مولانا فضل ربی صاحب ۔ ۲۵۔ مولانا محمد اکبر صاحب ۔ ۲۶۔ مولانا محمد ابراہیم بلیاوی ۔ (۲)

⁂ ⁂ ⁂

۱۔ مولینا سید محمد میاں ۔ علماء حق جلد اول ۔ ص ۔ ۱۱۱

۲۔ مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری ۔ تذکرہ شیخ الہند ۔ ص ۔ ۷۲

مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی

شوال ۱۲۹۶ھ میں بانگرمئو ضلع اناؤ میں پیدا ہوئے آپ کے والد سید حبیب اللہ صاحب وہاں ایک اردو مڈل اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے اس لئے متعلقین کے ساتھ ان کا قیام وہیں تھا تقریباً تین سال کے تھے کہ آپ کے والد نے اپنا تبادلہ بانگرمئو سے اپنے وطن ٹانڈہ کرالیا۔ اس کے بعد بارہ سال کی عمر تک وہیں رہے اور وہاں رہ کر ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ دارالعلوم دیوبند میں آپ کے دو بھائی مولانا محمد صدیق صاحب اور مولانا سید احمد صاحب پہلے سے زیر تعلیم تھے۔ تیرہ سال کی عمر میں صفر ۱۳۰۹ھ میں والد محترم نے آپ کو بھی مزید تعلیم کے خیال سے دیوبند بھیجدیا۔ دیوبند کی فضا راس آئی اور کھیل کود کا کسی قدر مشغلہ جو وطن میں تھا سب چھوڑ چھاڑ یکسوئی سے تعلیم میں لگ گئے۔ اپنی محنت اور شوق پھر بھائیوں کی نگرانی اور اساتذہ کی توجہ سے تعلیم وتعلم سے مکمل رغبت و مناسبت ہوگئی۔ دیگر اساتذہ کے علاوہ حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ کے لطف وکرم اور توجہ کے خصوصی مرکز رہے حضرت شیخ الہند کے پاس اگرچہ اونچے درجے کی کتابیں تھیں مگر آپ نے مولانا سید حسین احمد صاحب کو بعض ابتدائی اور متوسطات کتب بھی پڑھائیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت شیخ الہند سے غایت درجہ تعلق اور انس تھا۔

ابھی دارالعلوم میں زیر تعلیم ہی تھے کہ شعبان ۱۳۱۶ھ میں آپ کے والد صاحب نے بارادہ ہجرت مدینہ منورہ کا قصد سفر فرمایا اور اپنے تینوں صاحبزادوں کو بھی ساتھ لے جانا چاہا چنانچہ شعبان میں تینوں بھائی دارالعلوم سے رخصت ہوکر گھر آگئے الوداع کہنے والوں میں خود حضرت شیخ الہند قدس سرہ بھی تھے جو اسٹیشن تک پیدل ساتھ ساتھ تشریف لائے اور تاکید کے ساتھ مشورہ دیا کہ تدریس سے غافل نہ ہونا خواہ ایک ہی دو طالبعلموں کو پڑھاؤ چنانچہ مدینہ منورہ پہونچنے پر استاد کے حسب ہدایت تعلیم دیتے رہے۔ عربی بولنے پر قدرت نہ ہونے کیوجہ سے قدرے پریشانی کا سامنا ہوا اسی لئے ابتداً حلقہ درس مختصر رہا۔ مگر جلد ہی اس پر قابو پا لیا اور حلقہ درس وسیع ہونے لگا۔ یہاں تک کہ عرب و ہند کے علاوہ متعدد دوسرے اسلامی ممالک کے بھی طلباء اور شائقین علم شریک درس رہنے لگے چنانچہ آپ نے سالہاسال تک مدینہ منورہ میں درس دیا۔ اس دوران متعدد بار ہندوستان بھی آنا ہوا مگر مدینہ منورہ کا تعلق یکسر منقطع نہ ہوا۔ (۲)

۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۵ء میں جب حضرت شیخ الہند حج و زیارات کا شوق اور کچھ سیاسی عزائم لیکر حجاز پہونچے تو اس وقت مولانا احمد حسین صاحب مدینہ منورہ ہی میں قیام پذیر تھے، حج سے فارغ ہوکر حضرت شیخ الہند جب مدینہ منورہ پہونچے تو آپ ہی کے دولت خانہ پر مقیم رہے۔ (۴)

یہاں تک کہ دوسرے حج کے بعد حضرت شیخ الہند کی گرفتاری کا واقعہ پیش آیا۔ مولانا حسین احمد صاحب کو حضرت شیخ الہند سے غایت درجہ تعلق اور انس تھا اسی کا نتیجہ تھا کہ اس کے باوجود کہ آپ کی گرفتاری کا حکم نہ تھا محض حضرت شیخ الہند کی معیت وصحبت کی خاطر آپ نے خود کو گرفتاری کے لئے پیش کر دیا۔ (۵)

اور پوری مدت اسارت میں ساتھ رہے یہاں تک کہ ۲۰ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ مطابق ۸ رجون ۱۹۲۰ء کو بمبئی پہونچاکر آپ سب حضرات کو رہا کیا گیا۔ (۶)

حضرت شیخ الہند کے شاگردوں میں یوں تو بہت سے صاحب علم وتقوی بزرگ ہوئے لیکن آپ کے جملہ کمالات علمی اور مشاغل سیاسی کی تمام خصوصیات مولانا سید احمد حسین صاحب میں اللہ تبارک وتعالی نے جمع فرمادی تھیں اس اعتبار سے مولانا سید حسین احمد صاحب حضرت شیخ الہند کے صحیح جانشین ثابت ہوئے۔

اسارت مالٹا سے کچھ قبل حضرت شیخ الہند نے اپنے عزائم سے آپ کو باخبر کیا اس سے پہلے آپ شیخ الہند کے سیاسی عزائم سے ناواقف تھے چنانچہ اسی وقت سے تہہ دل سے ساتھ ہو گئے، اور مالٹا سے واپسی کے بعد سے آخر دم تک شیخ الہند کے نقش قدم پر چلتے رہے دارالعلوم دیوبند میں خدمت تدریس کے باوجود سیاسی مصروفیات سے کنارہ کشی کی نوبت نہ آئی۔

سیاسی زندگی کی ابتدا شیخ الہند کی صحبت سے ہوئی۔ (۷)

۳۔ مولانا سید حسین احمد۔ نقش حیات جلد اول۔ ص۔ ۱۲۹۔ ۱۳۰

۴۔ 〃 〃 اسیر مالٹا ص۔ ۲۹

۵۔ مولانا سید اصغر حسین۔ حیات شیخ الہند۔ ص۔ ۶۲

۶۔ مولانا سید حسین احمد۔ نقش حیات جلد دوم۔ ص۔ ۲۳۵

۷۔ 〃 〃 〃 ص۔ ۲۱۶

سیاسی زندگی کی ابتدا شیخ الہند کی صحبت سے ہوئی۔ مالٹا سے واپسی کے بعد کانگریس کمیٹی کے ممبر بنے (۸) اور تاحیات "مجمع البحرین" بنے رہے۔ آپ ہی کی کوششوں سے کانگریس اور جمعیۃ میں گہرا ربط و تعلق پیدا ہوا جو آج تک باقی ہے۔

تحریک آزادی ہند میں آپ کی خدمات انتہائی قابل قدر ہیں جن کی پاداش میں انگریزی حکومت کی نظر عتاب کے مستحق بنے رہے اور بار بار قید و بند کی مصیبتوں میں بھی مبتلا ہوئے۔

آخر زندگی تک درس و تدریس کی انتہائی مشغولیت و مصروفیت کے باوجود سیاسی رہبری کے فرائض بھی انجام دیتے رہے اور مختلف جلسہ جلوس اور کانفرنسوں میں بھی شرکت فرماتے رہے۔

حضرت شیخ الہند کے وصال کے بعد آپ کی تحریک کو حلقہ دیوبند میں سے مولانا موصوف ہی نے زندہ رکھا۔

مزاج و مذاق کا یہ عالم تھا کہ ہر شخص سے انتہائی خوش دلی کا معاملہ فرماتے اور بڑی بات یہ تھی کہ مولویانہ تقشف سے کوسوں دور تھے۔ خانگی زندگی میں بڑے ہی نفیس الطبع اور باذوق واقع ہوئے تھے۔ (۹)

۱۲ رجمادی الاولی ۱۳۷۷ھ مطابق ۵ دسمبر ۱۹۵۷ء کو وفات پائی اور استاد محترم کے قریب ہی آسودۂ خاک ہوئے۔

⁂ ⁂ ⁂

۸۔ مولانا سید حسین احمد۔ نقش حیات جلد دوم۔ ص۔ ۲۷۳

۹۔ رشید الوحیدی۔ مرتب محمد طفیل۔ رسالہ نقوش شخصیات نمبر ص۔ ۱۱۶۹۔ ۱۱۷۳

مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ

۲۷ شوال المکرم ۱۲۹۲ھ بروز شنبہ صبح کے وقت اپنے ننہیال موضع دودہواں علاقہ لولاب کشمیر میں پیدا ہوئے۔ ساڑھے چار سال کی عمر میں اپنے والد ماجد مولانا سید محمد معظم شاہؒ سے قرآن پاک شروع کیا اور چھ برس کی عمر میں قرآن پاک کے علاوہ فارسی کے بعض رسائل بھی ختم کرلئے۔ پھر مولانا غلام محمد صاحب سے فارسی وعربی کی تعلیم حاصل کی۔ تیرہ چودہ سال کے تھے کہ شوق تعلیم نے وطن کو خیرباد کہنے پر مجبور کر دیا چنانچہ تین سال تک ضلع ہزارہ کے متعدد علماء کی خدمت میں رہ کر علوم عربیہ کی تکمیل فرماتے رہے وہاں بھی سیری نہ ہوئی تو تشنگیٔ علم نے دوسرے سرچشمہ فیض کی راہ دکھائی اور ۸-۱۳۰۷ھ میں سولہ سترہ سال کی عمر میں ہزارہ چھوڑ کر دیوبند آگئے، دیوبند میں چار سال رہ کر مشاہیر وقت اور یگانہ روزگار علماء حضرت شیخ الہند، مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری اور حضرت گنگوہی وغیرہم سے تعلیم حاصل کی اور نمایاں کامیابی کیساتھ سند فراغت حاصل کی۔ اس کے بعد تین چار سال تک مدرسہ امینیہ دہلی میں مدرس اول کی حیثیت سے خدمات تدریس انجام دیتے رہے کئی سال تک دہلی میں قیام کے بعد بعض ضرورتوں کی بنا پر کشمیر چلے گئے۔ اور ۱۳۲۳ھ میں بعض مشاہیر کشمیر کی معیت میں حج وزیارات سے مشرف ہوئے۔ واپسی کے بعد قصبہ بارہ مولا (کشمیر) میں مدرسہ فیض عام کی بنا ڈالی۔ تین سال تک وہاں سلسلۂ فیض جاری رہا۔ اس کے بعد دارالعلوم کے مطالبہ پر دیوبند آگئے اور وہاں فرائض تدریس انجام دیتے رہے۔ مولانا موصوف مجرد رہنا پسند کرتے تھے لیکن شیخ الہند کے مشورہ اور حکم سے ۱۳۲۶ھ میں جب کہ آپ کی عمر چوالیس سال تھی اتباع سنت نبویؐ کی خاطر گنگوہ کے ایک معزز خاندان میں شادی کر لی۔ دارالعلوم دیوبند میں ۱۳۴۵ھ تک صدر مدرس کی حیثیت سے درس دیتے رہے۔ اسی سال منتظمین دارالعلوم سے بعض اختلافات کی بنا پر دارالعلوم سے قطع تعلق فرمالیا اور مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب، مولانا سراج احمد رشیدی صاحب مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اور مولانا بدر عالم صاحب وبعض دیگر علماء اور کئی سو طلباء کے ساتھ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل (گجرات) تشریف لے گئے جہاں ۱۳۵۱ھ تک درس حدیث دیتے رہے۔ ۲ صفر المظفر ۱۳۵۲ھ کو شب کے آخری حصہ میں دیوبند میں وفات پائی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون (۱۰)

مولانا موصوف ذہانت وفطانت کا مجسمہ تھے تعلیم کا شوق اور جستجو اس پر مستزاد تھی قدرت

نے آپ کو جو علم و تفقہ عطا فرمایا تھا بعض اہل اللہ نے بچپن ہی میں اس کی پیشین گوئی کردی تھی ا
حدیث و فقہ میں آپ کی دور رسی اور دقت نگاہی اور وسعت نظر معروف و مسلم ہے۔ کمال و مہارت
کچھ انھیں علوم میں محصور نہ تھی بلکہ جن لوگوں نے آپ کے درس میں شرکت کی ہے یا کم از کم آپکی تالیفات
ہی کا غائر مطالعہ کیا ہے وہ اعتراف کریں گے کہ دیگر علوم میں بھی پوری دسترس حاصل تھی ۲ اور
حقیقت یہ ہے کہ آپ کے کمالات علمی میں "جامعیت" ہی آپ کا منتہائے کمال ہے۔

درس و تدریس اور اس سلسلہ کی تصنیفی خدمات کے علاوہ آپ نے وقت کے بدترین فتنہ
"مرزائیت" کے استحصال کے سلسلہ میں نمایاں کارنامے انجام دیئے۔ اس فتنہ نے مولانا موصوف کو
بے چین کر دیا تھا اور اس کے خطرناک نتائج و عواقب کے خیال سے آپ انتہائی پریشان تھے۔
چنانچہ تقریروں اور مناظروں کی ذہنی سہامی کے علاوہ اس کے متعلق مستقل علمی جوابات دیئے
اور اپنے متعدد لائق شاگردوں سے اس موضوع پر اپنی نگرانی میں مختلف کتابیں اور رسائل
لکھوائے نیز خود بھی اس سلسلہ میں بعض معرکۃ الآراء رسائل رقم فرمائے جنھوں نے اہل علم
سے خراج تحسین حاصل کیا۔ مولانا موصوف کے رسائل یہ ہیں۔ اکفار الملحدین والمتاولین فی
شئی من ضروریات الدین۔ عقیدۃ الاسلام فی نزول عیسیٰ علیہ السلام۔ خاتم النبیین وغیرہ۔ (۱۱)

....

مولانا اشرف علی صاحب تھانوی

تھانہ بھون ضلع مظفر نگر میں ۵/ ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ کو پیدا ہوئے۔ دادھیال والوں
نے عبدالغنی نام تجویز کیا، لیکن حضرت حافظ غلام مرتضیٰ صاحب مجذوب پانی پتی نے جو اپنے زمانہ
کے صاحب کشف و کرامت بزرگ تھے آپ کی ولادت بلکہ استقرار حمل تک سے قبل آپ کا نام
اشرف علی تجویز کر دیا تھا چنانچہ اسی نام سے مشہور خلائق ہوئے۔ اللہ تعالےٰ نے اسی نام کی
برکت سے حقیقی شرف و کمال سے نوازا۔ پانچ سال کے تھے کہ والدہ محترمہ کا سایہ سر سے اٹھ
گیا اس کے بعد سے مستقل والد صاحب کی تربیت میں رہے اور اس میں شک نہیں کہ انھوں
نے تربیت میں انتہا کردی۔ چنانچہ ذہین اور محنتی تھے اس لئے بچپن ہی سے پڑھنے میں تیز تھے،
جس کی وجہ سے والد کی توجہ اور محبت آپ کی طرف نسبتاً زائد ہوگئی تھی۔ مستقبل میں اللہ تعالےٰ
نے جو کمالات عطا فرمائے ان کے آثار بچپن ہی سے ظاہر ہو رہے تھے چنانچہ خواجہ عزیز الحسن مجذوب

نے لکھا ہے کہ ـ بچپن ہی سے نماز کا شوق اس قدر تھا کہ بعض کھیلوں میں بھی نماز کی نقل کیا کرتے تھے مثلاً ساتھیوں کے جوتے جمع کر کے ان کی صف بناتے اور ایک آگے رکھ کر خوش ہوتے کہ جوتے بھی نماز پڑھ رہے ہیں۔ وعظ کا شوق بچپن سے تھا چھوٹے موٹے سودا سلف کیلئے بازار بھیجے جاتے راستہ میں کوئی مسجد پڑتی تو اس میں گھس جاتے اور منبر پر چڑھ کر تھوڑی دیر خطبہ کی نقل کر لیا کرتے۔ نماز کا وقت نہ ہوتا اس لئے مسجد خالی ہوتی آزادی سے خطبہ کا شوق پورا کرتے۔ بارہ تیرہ برس کا سن تھا کہ رات کے آخری پہر اٹھ کر تہجد اور وظائف میں مشغول ہو جاتے۔ سردیوں تک میں یہی معمول ہوتا۔ فرماتے تھے کہ یہ شوق میرے ابتدائی استاد حضرت مولانا فتح محمد صاحب کے فیض صحبت سے پیدا ہوا تھا ـــ مولانا شیخ محمد صاحب محدثؒ تھانوی جو میاں جی نور محمد صاحب جھنجھانوی نور اللہ مرقدہٗ کے اجل خلفاء میں تھے انھوں نے مولانا اشرف علی صاحب کو بچپن میں دیکھ کر فرمایا تھا کہ میرے بعد یہ لڑکا ہی میری جگہ لے گا چنانچہ جملہ کمالات ظاہری و باطنی میں ان کے بعد آپ ہی کا نام روشن ہوا۔ (۱۲)

فارسی کی متوسطات اور عربی کی بعض ابتدائی کتابیں مولانا فتح محمد صاحب سے تھانہ بھون میں پڑھیں اور فارسی کی کچھ اعلیٰ کتابیں اپنے ماموں واجد علی صاحب سے پڑھیں اس کے بعد مزید تعلیم کیلئے دارالعلوم دیوبند آ گئے۔ عربی کی متوسطات سے لیکر آخری کتابیں تک پڑھیں۔ دیوبند میں تعلیم کے زمانہ میں مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی، حضرت شیخ الہندؒ مولانا سید احمد صاحب۔ مولانا عبدالعلی صاحب۔ اور ملا محمود صاحب وغیرہ سے مختلف کتابیں پڑھیں چونکہ نہایت ذکی ذہین اور محنتی تھے اس لئے جلد ہی اپنے اساتذہ کے مرکز توجہ بن گئے آخر ذی قعدہ ۱۲۹۵ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے اور ۱۳۰۱ھ کے شروع میں فارغ التحصیل ہو گئے۔ (۱۳)

درسیات سے فراغت کے بعد چودہ سال تک کانپور میں درس و تدریس کی خدمات انجام دیتے رہے تدریسی خدمات کے علاوہ وعظ و ارشاد بھی فرمایا کرتے تھے جس کی وجہ

---

۱۰ ـ سید محمد ازہر شاہ صاحب ـ مرتب ـ حیات الور ـ ص ـ ۱ ـ ۶

۱۱ ـ مفتی محمد شفیع ـ مرتبہ ـ ازہر شاہ ـ حیات الور ـ ص ـ ۲۴۷ ـ ۲۶۹

۱۲ ـ خواجہ عزیز الحسن مجذوب ـ اشرف السوانح جلد اول ـ ص ـ ۱۷ ـ ۵۴

سے لوگ آپ سے کافی قریب ہو گئے اور باوجودیکہ کان پور میں اہل بدعت کی خاصی تعداد اور زور تھا مگر حضرت تھانوی کی محبت اور آپ سے تعلق لوگوں کے دلوں میں جاگزیں ہو گیا تھا جب کہ عمر بھی کچھ زیادہ نہ تھی۔ (۱۴)

کان پور سے قطع تعلق کرنے کے بعد پھر تھانہ بھون ہی کو اپنا مستقر بنایا اور تاحیات وہیں رہے البتہ مجالس وعظ میں کثرت سے اور کبھی کبھی مناظروں میں شرکت فرماتے رہتے آپ کی شہرت اسی راہ سے ہوئی قدرت نے آپ کے وعظ میں بڑا اثر رکھا تھا۔ بڑے بڑے مجمع میں مخالفین کی اکثریت کے باوجود وعظ فرماتے اور لوگ متاثر ہوتے تھے۔ یہی مشغلۂ وعظ جو کان پور سے قطع تعلق کے بعد مستقل مشغلہ رہ گیا تا حیات باقی رہا، اور تھانہ بھون میں مستقل جویان فیض اور طالبان حق کا تانتا بندھا رہتا۔ ایک سے ایک پتھر دل آتے اور موم ہو ہو کر جاتے۔ اس راہ سے آپ نے اسلام اور اہل اسلام کی جو خدمت کی کم ہی لوگوں کے نصیب میں آتی ہے۔ آپ کے مواعظ اور آپ کے تصنیف کردہ رسائل سے ہزارہا ہزار گم کردہ راہ لوگوں کو راہ راست نصیب ہوئی اور بے شمار بدعات کے دروازے بند ہوئے۔ آپ کے تصنیف کردہ چھوٹے بڑے رسائل اور کتابوں کی تعداد سات سو سے متجاوز ہے۔

۱۵ / ۱۶ / رجب ۱۳۶۲ھ مطابق ۱۹ / ۲۰ / جولائی ۱۹۴۳ء کی درمیانی شب کو وفات پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا عبید اللہ سندھیؒ

ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں کے غیر مسلم گھرانے میں ۱۲ / محرم ۱۲۸۹ھ مطابق ۱۰ / مارچ ۱۸۷۲ء میں پیدا ہوئے پیدا ہونے سے پہلے یتیم ہو گئے تھے اس لئے والدہ ننہال آ گئیں جو ایک سکھ خاندان تھا، بچپن کی ابتدائی تعلیم کے دوران اسلام سے متاثر ہوئے "تحفۃ الہند" نامی کتاب ہاتھ لگ گئی اس سے اور دلچسپی بڑھی، مولانا اسماعیل شہیدؒ کی "تقویۃ الایمان" اور مولوی

---

۱۳ - خواجہ عزیز الحسن مجذوب۔ اشرف السوانح۔ جلد اول۔ ص۔ ۴۸-۶۰

۱۴ - " " " ص۔ ۶۷-۶۷

محمد لکھنوی کی کتاب "احوال الآخرۃ" نے اس جذبہ کو اور جلا بخشی۔ اسی دوران نماز سیکھ لی اور اپنا نام از خود عبید اللہ تجویز کیا۔ مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے گھر سے نکل کھڑے ہوئے اعزاء نے تعاقب کیا لیکن کسی کے ہاتھ نہ آئے۔ سندھ آکر عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ وہیں ایک بزرگ حافظ محمد صدیق صاحب (بھرچونڈی) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے بیعت ہو کر فیض صحبت حاصل کیا۔ انھیں بزرگ نے جذبہ اسلام کو مضبوط و مستحکم کیا، مولانا اپنے نام کے ساتھ "سندھی" کا انتساب انھیں کے تعلق سے کرتے تھے۔ مزید تعلیم کیلئے جب سندھ سے باہر نکلنے کا ارادہ کیا تو حافظ صاحب موصوف نے دعا دی کہ "خدا کرے عبید اللہ کا کسی راسخ عالم سے پالا پڑے"۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اسے قبول فرمایا اور حضرت شیخ الہند کی قدموں میں لا ڈالا۔ مختلف مقامات پر رکتے رکاتے صفر ۱۳۰۶ھ میں دارالعلوم دیوبند پہونچے۔ ۱۳۰۷ھ سے شیخ الہند کے درس میں شامل ہوگئے اور آپ کے خاص الخاص شاگرد بنے۔ سنن ابی داؤد مولانا رشید احمد گنگوہی سے پڑھی۔

شیخ الہند کی صحبت سے بہت فائدہ اٹھایا انھیں کے ذریعہ حکمت ولی اللہی سے متعارف ہوئے اور اس کے والہ و شیدا ہو گئے۔ غرض دل پہ شیخ الہند کی تعلیم و تربیت اور فیض صحبت کا نقش بیٹھا کر اور دماغ میں حکمت ولی اللہی کا سودا سما کر سندھ واپس ہوئے۔ مروجہ تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے اس لئے مطالعہ کے دائرہ کو اور وسعت دی اور حکمت ولی اللہی کا از خود تفصیلی مطالعہ اور اپنی بساط بھر اس کی اشاعت شروع کر دی۔

۱۳۲۷ھ میں شیخ الہند نے جمعیۃ الانصار کی بنا ڈالی تو اس میں کام کرنے کے لئے ان کو دیوبند طلب فرما لیا۔ اس کے بعد سے برابر شیخ الہند کی سرپرستی میں کام کرتے رہے۔ آپ ہی کے حکم سے ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۵ء میں کابل گئے۔ (۱۵)

اپنے ایک خط میں جو ڈاکٹر چوئتھ رام پریزیڈینٹ کانگریس کمیٹی سندھ کے نام ہے تحریر فرماتے ہیں۔

"بارہ سال میں شیخ الہند کے حکم سے سندھ میں کام کرتا رہا ہوں۔ میرا درجہ بڑھا کر چند سال انھوں نے مجھے دیوبند اپنے پاس رکھا اور اپنے لوگوں سے تعارف کرایا۔ دو سال دہلی میں علی گڑھ پارٹی سے ملنے کیلئے چھوڑا میرے استاد نے میرا تعارف ڈاکٹر انصاری سے کرایا اور انھوں نے مولانا محمد علی

۱۵۔ مولانا محمد میاں۔ علماء حق جلد اول۔ ص۔ ۲۲۱۔ ۲۳۱

سے ملایا۔ اور مولانا نے ابوالکلام آزاد سے تعارف کرایا اس کے بعد مجھے کابل بھیجدیا مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حضرت شیخ الہند نے ایک عرصہ سے مجھے اس کام کے لئے معین کر لیا تھا۔ جس قدر ضرورتیں مجھے کابل میں نظر آئیں گی ان امور کو وہ پہلے سے تیار کرتے رہے فقط ایک خانہ میرے لئے خالی چھوڑ رکھا تھا جسے پر کرنے کے لئے مجھے حکم دیا۔ میں نے یہ حکم نہایت تنگدلی سے قبول کیا میرے لئے اپنی طبیعت کے موافق ہندوستان میں کام کا بڑا میدان تھا اور میں اپنے آپ کو کابل سے غیر مناسب پاتا تھا۔ مگر اب شکر کرتا ہوں کہ اللہ نے اپنے بزرگ کا حکم ماننے کی توفیق دی۔" (۱۶)

مولانا سندھی فرمایا کرتے تھے کہ ۔۔

"جو بھی مجھے اسلام کی بات سمجھاتا اور وہ میرے دل میں بیٹھ جاتی تو میں اس کا دل و جان سے گرویدہ ہو جاتا۔ حضرت شیخ الہند مرحوم نے مجھے اسلام سکھایا اور ان کے واسطے سے میں شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کو سمجھا اور مجھ پر قرآن حکیم کے حقائق منکشف ہوئے اور میں دین اسلام کی حکمت سے آگاہ ہوا"۔ (۱۷)

حضرت شیخ الہند کے شاگردوں میں یوں تو بہت ایک سے ایک صاحب فضل و کمال ہوئے لیکن بعض حیثیتوں سے مولانا سندھی امتیاز اور انفرادیت کے حامل ہیں۔ شیخ الہند کی تعلیمات کا وہ عنصر جسے دوسروں نے محفوظ رکھا اور اس کی اشاعت کی ایسے افراد بہت ہیں لیکن مولانا سندھی نے جس عنصر کو اپنایا اور اس کی اشاعت میں اپنی جان کھپائی اس میں وہ اگر بالکل یکہ و تنہا نہیں تو بھی کم از کم امتیاز و انفرادیت کی شان ضرور رکھتے ہیں۔ مولانا سندھی نے شیخ الہند کے ذریعہ علوم ولی اللہی تک دسترس حاصل کی اور اس کے سب سے بڑے مبلغ اور ترجمان کی حیثیت سے سامنے آئے۔ مولانا سندھی کی شخصیت اس اعتبار سے بڑی قابل قدر ہے شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مولانا سندھی شیخ الہند کے سب سے معتمد رفیق کار تھے۔

طویل جلاوطنی کا عرصہ گذار کر مولانا جب ہندوستان آئے تو ایک موقع پر مفتی عتیق

۱۶۔ مرتبہ محمد طفیل۔ رسالہ نقوش لاہور۔ اشاعت خصوصی "خطوط نمبر" جلد اول۔ ص۔ ۳۱۱

۱۷۔ مرتبہ محمد سرور۔ تعلیمات مولانا سندھی۔ ص۔ ۶

الرحمٰن صاحب عثمانی مدظلہ نے ان سے دریافت کیا کہ تیس برس کی جلاوطنی کے زمانہ میں آپ پر عیش ومسرت کے بھی کچھ دن آئے ؟ فرمایا ۔ مفتی صاحب یقین کیجئے اس پوری مدت میں ایک شب بھی ایسی نہیں آئی ہے جس میں چین وآرام سے سویا ہوں ہندوستان پہونچنے پر تیس برس کے بعد میں پہلی مرتبہ سکون کی نیند سو سکا ہوں ۔ پروفیسر سعید احمد صاحب اکبرآبادی صاحب نے تحریر فرمایا ہے کہ ۔

"مولانا ننگے سر رہتے تھے ایک مرتبہ میں اور مولانا دلی کی جامع مسجد کے جنوبی دروازہ کے نیچے کھڑے ہوئے تھے کہ میں پوچھ بیٹھا مولانا آپ ہمیشہ ننگے سر رہتے ہیں اس کی کیا وجہ ہے ؟ فوراً لال قلعہ کی طرف اشارہ کرکے کچھ غصہ اور کچھ حسرت کے ملے جلے لہجہ کیسا تھ فرمایا ۔ میری ٹوپی تو اس دن سر سے اتر گئی جس دن کہ یہ لال قلعہ میرے ہاتھ سے نکل گیا اب جب تک یہ مجھ کو واپس نہیں مل جاتا میری غیرت اجازت نہیں دیتی کہ میں ٹوپی سر پر رکھوں " (۱۸)

آزادی وطن کے سلسلہ میں مولانا کی خدمات آب زر سے لکھی جانے کے قابل ہیں ۔ آپ پہلے ہندوستانی اور "مسلمان" شخص ہیں جس نے ہندوستان سے باہر نیشنل کانگریس کمیٹی قائم کی ۔ (۱۹) ۱۹۴۴ء میں انتقال ہوا ۔

مولانا محمد الیاس صاحب

ضلع مظفرنگر میں جھنجھانہ اور کاندھلہ وغیرہ کچھ بستیوں میں اہل اللہ کے مختلف گھرانے ایک عرصہ سے آباد ہیں انھیں میں ایک نامور خاندان مولانا محمد اسماعیل صاحب کا تھا ۔ مولانا اسماعیل صاحب کے تین صاحب زادے تھے (۱) مولانا محمد صاحب (۲) مولانا محمد یحییٰ صاحب (۳) اور مولانا محمد الیاس صاحب ۔

مولانا الیاس صاحب ۱۳۰۳ھ میں پیدا ہوئے ، اختر الیاس تاریخی نام رکھا گیا ۔

---

۱۸ ۔ پروفیسر سعید احمد اکبرآبادی صاحب ۔ (مضمون) رسالہ الرحیم ماہ اگست ۱۹۶۷ء جلد ۵ شمارہ ۳ ص ۲۲۳ ۔

۱۹ ۔ مولانا عبیداللہ سندھی ۔ کابل میں سات سال ۔ ص ۱۰۷

مولانا اسماعیل صاحب ان دنوں دہلی میں بنگلہ والی مسجد کے پاس رہتے تھے اور بہادر شاہ (ہندوستان کے آخری بادشاہ) کے سمدھی مرزا الٰہی بخش کے بچوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ فارغ اوقات میں راہ گیر مسلمانوں کو مسجد میں لاتے اور انھیں نماز و روزہ وغیرہ ضروریات دین کی تعلیم دیا کرتے تھے مولانا الیاس صاحب کا بچپن والد کے پاس نظام الدین دہلی میں اور ننہیال کاندھلہ میں گذرا (۲۰) اہل اللہ کا خاندان تھا مرد تو مرد عورتوں تک کی دینداری کے واقعات اچھے اچھوں کی ہمتیں پست کر دیتے ہیں۔ اندر سے لے کر باہر تک بہت ہی پاکیزہ ماحول تھا۔ ع این خانہ ہمہ آفتاب است ۔ ایسا دیندار و صالح ماحول کسی پست ہمت و بے حوصلہ کو بھی نصیب آ گئے۔ تو اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا پھر ایسی طبیعت کے لئے جس کو خود بھی مبدا فیض سے صلاح و تقویٰ کا حصہ وافر ملا ہو کہنا ہی کیا ؟

ابتدائی تعلیم کچھ کاندھلہ اور کچھ اپنے والد کے پاس نظام الدین دہلی میں حاصل کی آپ کے منجھلے بھائی مولانا محمد یحییٰ صاحب حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کے پاس گنگوہ میں مقیم تھے۔ مزید تعلیم کے لئے چھوٹے بھائی مولانا الیاس صاحب کو بھی اپنے ساتھ ۱۳۱۴ھ کے آخر یا ۱۳۱۵ھ کے شروع میں گنگوہ لے گئے۔ خاندان کا ماحول کیا کم تھا کہ حضرت گنگوہی کی صحبت بھی میسر آ گئی۔ حضرت گنگوہی کی صحبت نے فطری رنگ طبیعت کو اور نکھار دیا اسی زمانہ میں حضرت گنگوہی سے بیعت ہو گئے۔

بڑے بھائی مولانا محمد یحییٰ صاحب گنگوہ میں اپنے پاس رکھ کر آپ کو پڑھاتے رہے مولانا موصوف کو تدریس کا بڑا اچھا ملکہ حاصل تھا۔ مولانا الیاس صاحب بچپن سے لاغر و کمزور تھے گنگوہ کے زمانہ قیام میں صحت اور خراب ہو گئی اور سالوں علاج جاری رہا۔ شدید علالت کی وجہ سے مجبوراً سلسلہ تعلیم منقطع کرنا پڑا مگر آپ کا انتہائی شوق مستقل تعلیمی انقطاع کے لئے روا دار نہ ہوا۔ آخر آپ کے اصرار و طلب کو دیکھ کر بھائی نے پھر تعلیم جاری رکھنے کی اجازت دیدی۔ ۱۳۲۳ھ میں حضرت گنگوہی کا انتقال ہو گیا اس کے بعد ۱۳۲۶ھ میں دیوبند آ کر آپ شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کے حلقہ درس میں شریک ہوئے اور ترمذی شریف بخاری شریف کی سماعت کی۔ (۲۱)

۲۰۔ مولانا سید ابوالحسن ندوی ۔ مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت ۔ ص ۔ ۳۶ ۔ ۳۹

بزرگوں نے مولانا الیاس صاحب کے اندر چھپے ہوئے جوہر قابل کا اندازہ کر لیا تھا چنانچہ حضرت گنگوہی اور شیخ الہند وغیرہ آپ کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ شیخ الہند فرمایا کرتے تھے کہ۔

"میں جب مولوی الیاس کو دیکھتا ہوں تو مجھے صحابہؓ یاد آجاتے ہیں۔ (۲۲)

مولانا الیاس صاحب حضرت گنگوہی اور شیخ الہند کے علاوہ حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب رائے پوری اور مولانا اشرف علی تھانوی سے بھی انتہائی عقیدت و محبت رکھتے تھے۔ شیخ الہند کے ہاتھ پر آپ نے بیعت جہاد بھی کی تھی۔ (۲۳) آپ نے ۱۳۲۸ھ کے آخر سے مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور میں تدریس کے فرائض شروع کئے۔ (۲۴)

مولانا محمد اسماعیل صاحب نے اپنے نظام الدین کے زمانۂ قیام میں ایک مختصر سے مدرسہ کی بنا ڈالی تھی، جس میں کچھ میواتی بچے پڑھتے تھے۔ مولانا کے انتقال کے بعد آپ کے بڑے صاحبزادے مولانا محمد صاحب وہاں مقیم رہے۔ مدرسہ چلاتے اور آنے جانے والوں کو نماز روزہ وغیرہ سکھلاتے رہتے۔ ربیع الثانی ۱۳۳۶ھ میں مولانا محمد صاحب کا بھی انتقال ہوگیا تو لوگوں کے اصرار سے مولانا محمد الیاس صاحب نے ان کی جگہ سنبھالی اور اپنی بے مثال اور بے نظیر محنت سے اس ویرانہ کو مستقل آباد کر دیا۔ انتہائی عسرت اور تنگی کی حالت میں رہتے مگر ابرو پر بل نہ آتا اور مدرسہ کے تعلیمی نظام میں کوئی فرق نہ پڑنے دیتے۔ (۲۵)

دہلی کے جنوب کا علاقہ میوات کہا جاتا ہے اہل میوات کا تعلق آپ کے خاندان سے مولانا اسماعیل صاحب کے قیام نظام الدین کے زمانہ سے تھا جو ان کے انتقال کے بعد مولٰینا محمد صاحب کے ذریعہ بدستور قائم رہا۔ میو قوم عرصہ ہوا مسلمان ہو چکی تھی لیکن عادات و اطوار اور رسم و رواج بڑی حد تک ہندوانہ تھے مولانا محمد صاحب کے انتقال کے بعد جب مولانا الیاس صاحب نظام الدین میں مقیم ہوئے تو کچھ دنوں کے بعد اہل میوات کی طلب و خواہش پر آپ میوات تشریف لے گئے جانے سے پہلے یہ شرط کر لی تھی کہ میوات میں مدارس

۲۱۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت۔ ص ۴۰-۴۱

۲۲۔ 〃 〃 〃 ص ۴۲

۲۳۔ 〃 〃 〃 ص ۴۹

۲۴۔ 〃 〃 〃 ص ۵۱

۲۵۔ 〃 〃 〃 ص ۵۵-۵۶

اسلامیہ کا قیام عمل میں آئے تاکہ مستقل خدمت دین کی شکل پیدا ہو سکے۔ بڑی مشکلوں سے ایک مکتب قائم ہوا کیوں کہ اہل میوات اپنے بچوں کو کام کاج سے الگ کر کے تعلیم پر لگانے کے روادار نہ تھے چند دن قیام کے بعد آپ نے اسی سفر میں دس مکاتیب قائم کئے۔ (۲۶)

مدارس کے قیام کے علاوہ آپ نے خود بھی اہل میوات کی اصلاح اور تغیر حال کیطرف توجہ دی اور برابر میوات جاتے رہتے۔ مدارس سے جس قدر نتیجہ برآمد ہو رہا تھا آپ اس سے زائد مفید نتائج کے طلبگار تھے۔ ۱۳۴۵ھ سے تبلیغی گشت کا سلسلہ شروع کیا خود بھی نکلے اور احباب و متعلقین کو بھی دعوت دی کہ عوام میں نکل کر انھیں دین کی دعوت دیں اسطرح اس کام کی ابتدا میوات کے علاقہ سے فرمائی۔ (۲۷) میوات میں اس طریق کار کو کامیاب ہوتے دیکھ کر دائرۂ کار آہستہ آہستہ بڑھاتے رہے یہاں تک کہ وفات سے قبل آپ کے جاری کردہ تبلیغی گشت کا دائرہ عمل پورے ملک میں پھیل گیا۔ ۱۳ جولائی ۱۹۴۴ء کی شب میں نماز صبح سے پہلے داعی اجل کو لبیک کہا۔ (۲۸) اب یہ کام ہندو پاک کے علاوہ مختلف اسلامی ممالک میں بھی پھیل گیا ہے۔

مفتی کفایت اللہ شاہجہاںپوری

۱۲۹۵ھ میں شاہجہاں پور میں پیدا ہوئے۔ ذہانت و فطانت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ شوق و ذوق سے تعلیم حاصل کی۔ ابتدائی تعلیم کے حصول کے بعد عربی کی کچھ کتابیں مدرسہ اعزازیہ اسلامیہ شاہ جہانپور اور مدرسہ اسلامیہ شاہی مسجد مرادآباد میں پڑھیں۔ اس کے بعد دیوبند آکر حضرت شیخ الہند کے شاگرد ہوئے۔ مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی کے ہم سبق تھے مولانا مدنی ان کی ذہانت اور لیاقت کے مداح و معترف تھے۔

تعلیم کے بعد سیاسیات ملکی میں بھی دلچسپی لی چنانچہ مسلم لیگ۔ کانگریس وغیرہ سے

---

۲۶ - مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی خدمات۔ ص۔ ۶۲۔۳،

۲۷ - 〃 〃 〃 〃 ص۔ ۷۷۔۸۰،

۲۸ - 〃 〃 〃 〃 ص۔ ۱۶۱

وابستہ رہے اس کے بعد خود جمعیۃ علماء ہند کی بنا ڈالی۔ تحریک ترک موالات میں بھی پیش پیش رہے اور اس کی تائید میں مشہور فتویٰ ترتیب دیا۔
مدرسہ عین العلم شاہجہاں پور۔ مدرسہ امینیہ دہلی وغیرہ میں خدمت تدریس انجام دی۔ بالخصوص مدرسہ امینیہ کو آپ نے کافی ترقی دی۔ مفتی صاحب ممدوح کو فقہ اسلامی پر کافی عبور حاصل تھا جس کا ایک عمدہ اور جامع نمونہ آپ کے وہ ابتدائی فقہی رسائل ہیں جو عام ذہن کو سامنے رکھ کر لکھے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ردعیسائیت کے سلسلہ میں بھی آپ نے کافی کام کیا۔ آپ کے شاگرد مولانا احمد سعید صاحب مرحوم تقریریں کرتے تھے اور آپ ان کیلئے جملہ مواد فراہم کرتے تھے۔ (۲۹)

مولانا محمد میاں عرف مولانا منصور انصاری

قصبہ انبیٹھہ ضلع سہارن پور کے رہنے والے تھے۔ اصلی نام محمد میاں تھا لیکن سفر کابل میں اپنا نام بدل کر منصور انصاری رکھ لیا تھا۔ مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے نواسے اور مولانا عبداللہ صاحب انصاری سابق ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے صاحبزادے تھے۔ دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی۔ حضرت شیخ الہند سے قرب خصوصی حاصل تھا۔ دارالعلوم سے فراغت کے بعد مختلف مقامات پر تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ دارالعلوم معینیہ اجمیر میں عرصہ تک صدر مدرسی کے فرائض انجام دیئے۔ حضرت شیخ الہند نے اپنی تحریک کا ممبر اور ہمراز بنا لیا تھا۔ جمعیۃ الانصار میں مولانا سندھی کے نائب کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے۔ تحریک کے کام میں بڑی جانفشانی سے لگے رہے ہوگوں نے علیحدہ کرنے کی ہزار کوششیں کیں لیکن شیخ الہند سے وابستگی اور تعلق میں کوئی کمی نہ پیدا ہوئی۔ حضرت شیخ الہند کے ساتھ سفر حجاز میں شریک سفر تھے۔ غالب پاشا وغیرہ سے ملاقات کے بعد حضرت شیخ الہند نے آپ کو "غالب نامہ" کی ترویج و اشاعت کی غرض سے ہندوستان واپس بھیج دیا ہندوستان پہونچے تو انگریزوں کو "ریشمی خط" کی بھنک لگ چکی تھی اور گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا لوگوں نے آپ کو بھی گرفتار کرانے کی کوشش کی لیکن بھیس بدل کر

۲۹۔ امداد صابری۔ فرنگیوں کا جال۔ ص۔ ۲۸۹۔ ۲۹۳

آپ متعلقہ افراد کو ہدایات دیتے رہے۔ بال بچوں کو چھوڑ کر چھپتے چھپاتے یاغستان پہونچے اور کچھ دنوں کے بعد کابل چلے گئے۔ امیر حبیب اللہ خاں کی انگریز دوستی کے باعث وہاں بھی مطمئن نہ رہ سکے اور یاغستان آگئے اسی دوران اپنا نام بھی تبدیل کرلیا جس کیوجہ سے سی آئی ڈی کو گرفتاری میں ناکامی کا سامنا ہوا۔ امیر امان اللہ خاں کے زمانہ میں مختلف بڑے علمی اور سیاسی عہدوں پر فائز ہوئے اس کے بعد استنبول اور ماسکو کے افغانی سفارت خانوں میں ذمہ دارانہ حیثیت سے فرائض متعلقہ انجام دیتے رہے۔ کابل کے قیام کے دوران چند اسلامی رسائل بھی تصنیف کئے۔ ۶ صفر ۱۳۶۵ھ مطابق ۱۱ جنوری ۱۹۴۶ء کو جمعہ کے دن کابل میں وفات پائی۔ مولانا حامد الانصاری غازی آپ کے بڑے صاحبزادے ہیں۔ (۳۰)

مولانا عزیز گل صاحب

قصبہ زیارت کاکا صاحب ضلع پشاور کے باشندے اور دارالعلوم دیوبند کے فاضل تھے حضرت شیخ الہند کے خادم خصوصی اور محبت و تعلق رکھنے والوں میں تھے۔ شروع ہی سے تحریک کے ممبر رہے اور نہایت اہم اور خطرناک امور کو بخوبی سرانجام دیتے رہے۔ صوبہ سرحد اور یاغستان میں سفارت کی عظیم خدمات بھی انجام دیں۔ پہاڑی علاقوں میں حضرت شیخ الہند اپنے واقف کاروں اور متعلقین تحریک کے پاس انہیں کو بھیجتے تھے چنانچہ سرحد اور یاغستان کے علاقہ میں آپ کے تعاون سے بہت سے افراد تحریک کے ممبر اور ہم نوا بنے۔ لوگوں نے ان کو بھی حضرت شیخ الہند سے الگ کرنیکی کوشش کی لیکن انھوں نے ان کی باتوں پر کان نہ دھرا اور ہمیشہ شیخ الہند کے ساتھ رہے۔ ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۵ء کے سفر حجاز میں بھی ساتھ ساتھ گئے تھے اور وہیں رہے یہاں تک کہ گرفتاری کا واقعہ پیش آیا۔ یہ خود بھی گرفتار ہوئے اور پورا عرصہ اسارت مالٹا میں حضرت شیخ الہند کے ساتھ کاٹا اور شیخ الہند کی خدمت کرتے رہے آپ کے انتہائی معتمد اور راز دار رفیق تھے۔ حضرت کی وفات کے بعد ایک عرصہ تک آپ ہی کے مکان پر مقیم رہے۔ اسارت مالٹا کے زمانہ میں اہلیہ کا انتقال ہوگیا تھا دوسری شادی حضرت شیخ الہند کی بھانجی کی لڑکی سے ہوئی تھی جن سے اولاد بھی ہوئی۔ ان کے

۳۰۔ مولانا سید حسین احمد۔ نقش حیات دوم۔ ص۔ ۱۸۹۔ ۱۹۱

انتقال کے بعد جس زمانہ میں مدرسہ رحمانیہ رڑکی میں صدر مدرس تھے وہاں ایک میم سے اسکی خواہش پر نکاح کر لیا تیسری بیوی کو لے کر پشاور چلے گئے اور وہیں ۱۳ ھ میں وفات پائی۔ تحریک خلافت کے دوران دیوبند کی خلافت کمیٹی کی صدارت کے فرائض بھی انجام دیئے (۳۱)

مولانا احمد اللہ پانی پتی

پانی پت ضلع کرنال کے رہنے والے تھے اور حضرت مخدوم جلال الدین کبیرالاولیاء رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں سے تھے۔ موصوف نے علوم دینیہ مختلف مدارس میں حاصل کر کے دورۂ حدیث اور آخری کتابیں دارالعلوم دیوبند میں پڑھیں۔ اس کے بعد مختلف مدارس میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ ان کی دیانت وامانت پر حضرت شیخ الہند کو بڑا اعتماد تھا۔ چنانچہ تحریک کا ممبر اور راز دار بنالیا تھا۔ بسا اوقات حضرت کی ڈاک بھی انھیں کے سپرد رہتی جب حضرت شیخ الہند تحریک کے مقاصد کے پیش نظر حجاز کے لئے روانہ ہوئے تو جزئی اور فروعی امور انھیں کے سپرد کردئے گئے تھے، ان کے پاس چندہ دہندگان کا رجسٹر اور تحریک سے متعلق بعض دوسرے کاغذات رکھ گئے تھے جسے انھوں نے انتہائی رازدارانہ طریقہ پر رکھا اور متعلقہ اپنی صوابدید سے انجام دیتے رہے۔ اہم امور میں مولانا عبدالرحیم رائپوری (جن کو حضرت شیخ الہند مہمات امور کا ناظم بنائے گئے تھے) سے مشورے کیا کرتے تھے۔ حجاز میں جب حضرت شیخ الہند گرفتار ہوگئے اور کاغذات کی تلاش کے سلسلہ میں ہندوستان میں بھی گرفتاری اور تفتیش شروع ہوئی تو پولیس ان کے مکان پر بھی پہونچی مگر یہ کچھ ہی دیر پہلے تمام کاغذات کسی دوسری جگہ منتقل کر چکے تھے۔ پولیس کی ہزار پوچھ گچھ کے باوجود کسی بات کا اقرار نہ کیا آخر ان پر ایک مسلمان سی آئی ڈی متعین کیا گیا جس نے اخلاص وعقیدت کا اظہار کر کے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور مراحل سلوک طے کرتا رہا۔ ہر وقت اذکار واشغال میں مصروف رہتا اور مولانا موصوف کی خدمت بھی کرتا رہتا جس سے مولانا موصوف کو اس پر اعتماد ہوگیا اس شخص نے آہستہ آہستہ تمام باتیں پوچھ لیں اور تحریک کا ممبر بھی بن گیا ساری راز کی باتیں پوچھنے کے بعد فرار ہوگیا اور حکومت

۳۱۔ مولانا سید حسین احمد مدنی۔ نقش حیات دوم ص۔ ۱۹۱-۱۹۲

کو مطلع کر دیا اسی کی نشاندہی پر مولانا موصوف گرفتار کر لئے گئے لیکن چونکہ کوئی قطعی ثبوت نہ
تھا اور یہ خود اقرار نہ کرتے تھے اس لئے پنجاب کے بعض علاقوں میں نظر بند کر دیئے گئے ایک عرصہ
کے بعد سی آئی ڈی مولانا احمد چکوالی مرحوم کو لائی جو پہلے ہی معافی مانگ کر آزاد ہو چکے تھے اس
اثناء میں کچھ کاغذات حکومت کے ہاتھ لگ گئے تھے چکوالی صاحب نے مولانا موصوف کو سب
دکھا کر (جب کہ پس پردہ سی آئی ڈی افسران بھی بیٹھے ہوئے تھے) کہا کہ ان تحریروں کی موجودگی
میں اقرار اور معافی مانگنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں خود میں نے بھی مجبوراً ایسا ہی کیا ہے کہ تحریک ختم
ہی ہو چکی ہے آپ بھی معافی مانگ لیں اور آئندہ کے لئے اطمئنان دلا دیں۔ مولانا نے ان کے
مشورہ پر عمل کیا چنانچہ کچھ دنوں بعد آزاد کر کے پانی پت واپس کر دیئے گئے وہاں پہونچ
کر تعلیمی مشاغل میں مصروف رہے۔ آزادی کے چند دنوں بعد ہیضہ کے مرض میں مبتلا ہو کر
پانی پت میں وفات پائی۔ رحمہ اللہ تعالٰے۔ (۴۲)

مولانا محمد صادق صاحب کراچوی

محلہ کھڈہ کراچی کے باشندے تھے۔ کتب عالیہ درسیہ خصوصاً دورۂ حدیث میں حضرت
شیخ الہند کے شاگرد تھے۔ شیخ الہند کی تحریک سے بھی متعلق رہے۔ ان میں اور مولانا سندھی
میں گہرے تعلقات تھے جنگ عمومی کے زمانہ میں انگریزوں نے عراق پر حملہ کیا تھا انھوں نے
اپنے رفقاء کے تعاون سے اندرونی طور پر بلوچستانی قبائل سے بغاوت کرا دی۔ کراچی سے
ہر ہفتہ سپاہی اور رسد بذریعہ ... جہاز جایا کرتی تھی جس کی وجہ سے انگریزی فوجیں پیش
قدمی کرتی رہتیں۔ بلوچستانی بغاوت کیوجہ سے جو کمک عراق بھیجی جاتی تھی اسے سندھ میں
اتارنا پڑا۔ جس کے نتیجہ میں انگریزی فوجیں عراق میں اپنی بڑھتی ہوئی پیشقدمی کو برقرار نہ رکھ سکیں.
اور انھیں کوت العمارۃ میں محصور ہونا پڑا۔ بغاوت فرو کر کے جب انگریزی فوجیں وہاں پہونچیں
تو اُس وقت تک ترکی فوجوں نے حصار مضبوط کر لیا تھا - کئی ماہ تک
محصور رہنے کے بعد انگریزوں کو ہتھیار ڈالنا پڑا۔ انگریزی فوجیں اول جب
محصور ہوئی تھیں تو ان کی تعداد تئیس ہزار تھی لیکن جب حصار سے آزادی نصیب ہوئی تو کل
تیرہ ہزار تھیں کیوں کہ سترہ ہزار اسی کے اندر مر گئے تھے۔ اس کے بعد مولانا محمد صادق صاحب
کو گرفتار کر لیا گیا لیکن ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے کاروار (مہاراشٹر) میں نظر بند کر دیئے گئے۔

۴۲۔ مولانا سید حسین احمد مدنی۔ نقش حیات دوم۔ ص۔ ۱۹۲ - ۱۹۳

جہاں جنگ عمومی کے اختتام تک نظر بند رہے۔ بڑے جوشیلے اور کارگذار شخص تھے۔ تقسیم ہند سے پہلے پہلے دار العلوم دیوبند کی شوری اور جمعیۃ علمار ہند کی ورکنگ کمیٹی کے بھی ممبر رہے۔ خلافت کمیٹی سندھ اور جمعیۃ علمار سندھ کے کاموں میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ مدرسہ مظہر العلوم کھڈہ کراچی کے صدر مدرس اور صدر مہتمم بھی رہے۔

۵ رشوال ۱۳۷۲ھ مطابق ۱۸ رجون ۱۹۵۳ء کو وفات پائی۔ رحمہ اللہ۔ (۴۳)

مولانا عبد الرحیم پوپلزئی

آپ کے متعلق کچھ زیادہ تفصیلات حاصل نہیں ہوسکیں۔ جو کچھ معلوم ہوا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مولانا کا تعلق پشاور کے علمار کے ایک خاندان سے تھا: ابتدائی کتابیں اپنے والد مولانا عبد الحکیم پوپلزئی سے پڑھیں۔ تکمیل تعلیم کی خاطر وطن سے نکل کر رام پور اور دہلی کی تعلیم گاہوں سے فیض حاصل کرتے ہوئے ۱۹۱۰ء کے بعد دار العلوم دیوبند پہونچے وہاں حضرت شیخ الہند سے تلمذ اور شرف صحبت حاصل رہا۔ شیخ الہند کی خدمت میں رہ کر فکر ولی اللٰہی سے واقفیت اور رفتہ رفتہ گہرا ارتباط و تعلق پیدا ہوا۔

تکمیل تعلیم کے بعد واپس آکر پشاور کی مشہور و معروف مسجد قاسم علی خاں میں سلسلۂ درس شروع کیا تھوڑی ہی مدت میں اطراف و جوانب سے کھنچ کھنچ کر کثرت سے طلبہ آنے لگے۔

شیخ الہند کے تعلق کی بنا پر تحریک خلافت سے بھی وابستگی تھی اور فکر ولی اللٰہی سے مناسبت کیوجہ سے مولانا سندھی سے بھی خاصے مراسم تھے۔ تحریک ولی اللٰہی کے علمی و فکری پہلوؤں میں گو دونوں متفق تھے لیکن عملی طریقۂ کار میں دونوں کے مابین خاصا اختلاف بھی تھا۔ (۴۴)

٭ ٭ ٭

۴۳۔ مولانا سید حسین احمد مدنی۔ نقش حیات دوم۔ ص۔ ۱۹۶۔ ۱۹۷

۴۴۔ عمر دراز وفی نہاد۔ رسالہ الرحیم جون ۱۹۶۳ء جلد اول شمارہ ۱۔ ص ۔ ۴۴ ۔ ۴۶

مولانا محمد اکبر صاحب

باغستان کے باشندے اور دارالعلوم دیوبند کے فاضل تھے۔ حضرت شیخ الہند سے انھیں بھی شرف تلمذ حاصل رہا۔ صلاحیت و استعداد علمی بہت اچھی تھی حضرت شیخ الہند سے کتب حدیث کی تکمیل کے بعد جنوبی افریقہ چلے گئے تھے جہاں علمی خدمات اور امامت کے فرائض انجام دیئے۔ چندسال وہاں رہ کر اپنے وطن واپس آگئے۔ حضرت شیخ الہند نے ان کو جہاد میں شرکت اور دوسروں کو آمادہ کرنیکے لئے حکم دیا۔ یاغستانی قبائل میں آپس میں بے انتہا اختلاف اور پشت در پشت کی عداوتیں اور لڑائیاں چلی آرہی تھیں، آپ کی مساعی سے ان میں بڑی حد تک کمی ہوئی۔ اور کسی حد تک اتفاق و اتحاد کی فضا پیدا ہوگئی جو جہاد کے لئے معاون ثابت ہوئی۔ (۳۵)

مولانا فضل ربی صاحب

پشاور کے باشندے اور دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے حضرت شیخ الہند سے شرف تلمذ بھی حاصل رہا۔ انتہائی جوشیلے جری اور باہمت بزرگ تھے۔ اپنے وطن میں علمی مشاغل میں مصروف تھے حضرت شیخ الہند نے حکم دیا کہ یاغستان کے علاقہ میں جاکر وہاں کے لوگوں کو آمادۂ جہاد کریں۔ موصوف بڑے اچھے مقرر تھے ان کی تبلیغ جہاد کا خاصا نتیجہ خیز اثر برآمد ہوا اور ایک بڑی جمعیت جہاد کے لئے تیار ہوگئی۔ حاجی ترنگ زئی صاحب نے جب علم جہاد بلند کیا تو مولانا موصوف بھی ان کے ساتھ شریک جہاد رہے، شکست کے بعد کابل چلے گئے اور اپنی علمی استعداد و صلاحیت کی بناپر افغانستان کے محکمہ تعلیم میں ملازم ہوگئے۔ (۳۶)

⁂

۳۵۔ مولانا سید حسین احمد مدنی۔ نقش حیات دوم۔ ص۔ ۱۹۸۔

۳۶۔ 〃 〃 〃 〃 〃

ضمیمہ - ۲ -

خلفاء اور مجازین

حضرت شیخ الہند نے چوں کہ مولانا گنگوہی کی حیات تک کسی کو بیعت نہ کیا اور آپ کے وصال کے بعد بھی علمی و سیاسی مصروفیات نے اس طرف توجہ کا موقع کم دیا۔ اکثر بیشتر بیعت وارشاد کے خواہش مندوں کو مولانا تھانوی۔ مولانا خلیل احمد صاحب۔ مولانا عبدالرحیم صاحب رائپوری میں سے کسی کے پاس بھیج دیا کرتے تھے۔ اس لئے قدرتاً آپ کے خلفاء اور مجازین کی تعداد کم ہے چند نام جو ہمیں معلوم ہوسکے ہیں ذیل میں درج ہیں۔

۱۔ مولانا ضرغام الدین صاحب مظفر نگری۔

۲۔ صوفی محمد اکرم صاحب پنجابی۔

۳۔ مولانا محمد سہول صاحب بھاگل پوری۔

۴۔ مولانا وارث حسن صاحب۔ (۳۷)

۵۔ مولانا ریاض احمد صاحب۔

— مرتب "تحریک ریشمی رومال" مولانا عبدالرحمٰن صاحب نے لکھا ہے کہ مولانا موصوف بھی حضرت شیخ الہند کے خلفاء میں سے تھے نیز تحریک سے بھی وابستہ تھے اور حضرت نے ان کے ذمے کئی اہم امور کئے تھے۔ (۳۸)

ضمیمہ - ۳

مکاتیب :-

خطوط نویسی اور مکتوب نگاری بالعموم واردات و کیفیات کے اظہار کے لئے بڑا ذریعہ ہے بیشتر حالات میں خطوط مکتوب نگار کی شخصیت

۳۷۔ مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری۔ تذکرہ شیخ الہند۔ ص۔ ۱۰۱۔ ۱۰۲

۳۸۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب۔ تحریک ریشمی رومال۔ ص۔ ۱۴۲

کی عکاسی اور آئینہ داری کا کام دیتے ہیں اور اس کے محسوسات و خیالات اور مشاغل و مصروفیات کی چغلی کھاتے ہیں کسی شخصیت کو اس کی اصلی شکل میں دیکھنے اور سمجھنے کیلئے اس کی آپ بیتی سے زیادہ بے تکلف مکتوبات معاون ثابت ہوتے ہیں، آپ بیتی یا اس جیسے کسی اور مضمون میں تکلف اور احتیاط لازمی سی چیز ہے اس کے برعکس خطوط میں بے ساختگی اور برجستگی ہوتی ہے جسے لکھنے والا بے تکلف صفحۂ قرطاس کے حوالہ کر دیتا ہے اور ان میں اس کے محسوسات کے علاوہ بہت سے وقتی معاملات و مسائل کی تاریخی جھلک ہوتی ہے اس لئے بعد میں آنیوالوں کے لئے مکتوب میں اس کے تحریر کے عہد کے سیاسی اور سماجی حالات سے واقفیت کے علاوہ سامان بصیرت اور درس عبرت بھی ملتا ہے۔

مکتوبات کے ذخیروں میں اولیت ان مکاتیب کو حاصل ہے جو بالعموم صوفیاء اور اہل اللہ کے تحریر کردہ ہیں جن میں انھوں نے اپنے مسترشدین کو ... حق کا راستہ دکھایا ہے مگر یہ مکاتیب تقریباً سب فارسی زبان میں ہیں بلاشبہ ان میں بہت سے مکاتیب اپنی معنوی عظمت و بلندی اور جلالت شان کے علاوہ زبان و انشاء کا بھی عمدہ نمونہ ہیں۔ اسی ذخیرہ میں بعض شاہان وقت کے مکاتیب کا بھی پتہ چلتا ہے۔

اردو زبان میں خطوط نویسی اپنی فنی حیثیت سے غالب کے بعد شروع ہوئی غالب سے پہلے زبان و ادب میں خطوط نویسی کی وہ شان اور مرتبہ نظر نہیں آتا جو غالب کے خطوط کو حاصل ہے، اردو زبان میں خطوط نویسی کو فنی حیثیت غالب نے بخشی ہے ان خطوط کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ پڑھنے والا مکتوب نگار سے ہمکلامی کا سا لطف اٹھاتا ہے۔

آج اردو زبان میں "مکاتیب" کا خاصا ذخیرہ موجود ہے، جو بیشتر اپنی فنی اور ادبی حیثیت سے پڑھے اور پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں لیکن ایسے مجموعۂ مکاتیب کی بھی کمی نہیں جنھیں فنی و ادبی حیثیت سے پرکھنا خطوط، اور فن و ادب دونوں کے ساتھ مذاق ہے، لیکن ان میں ایک عہد کی تاریخ اور شخصیت کا سوز دروں سمو دیا ہوا ہوتا ہے اور اسی خصوصیت کی بنا پر اہل نظر انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ــــ آئندہ صفحات میں زیر بحث شخصیت حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کے مکاتیب اسی دوسری نوع کے تحت ہم نقل کر رہے ہیں۔ ان کا فنی و ادبی تجزیہ و تحلیل نہ مناسب ہے اور نہ شایان شان اور نہ یہ ہمارا مقصود ہے۔

انہتر سال کی عمر میں سیکڑوں مکاتیب قلم سے نکلے ہوں گے جو مکتوب نگار کی شخصیت اس کے علم وفضل کی ترجمانی کرتے اور گرد وپیش کے حالات پر روشنی ڈالتے لیکن ان کا ذخیرہ محفوظ نہیں۔ کچھ خطوط کے جستہ جستہ اقتباسات مولانا سید اصغر حسین صاحب نے اپنی کتاب میں دیئے ہیں اور چند خطوط کا ایک علیحدہ مجموعہ شائع کیا ہے جس میں کل آٹھ خط ہیں۔ بعض خطوط مفتی عزیز الرحمٰن صاحب بجنوری نے اپنی کتاب میں جمع کر دیئے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ خطوط متفرق کتابوں اور اخبارات سے تلاش کر کے راقم الحروف نے جمع کئے ہیں۔ چند خطوط ایسے بھی حاصل ہو گئے جو ابھی تک طبع نہیں ہو سکے۔ آئندہ صفحات میں ان سب کو یکجا کر دیا گیا ہے۔

ضروری ہے کہ ان کے مطالعہ کے وقت مکتوب نگار کی شخصیت پیش نظر رکھی جائے جو عالموں کی صف میں عالم، صوفیاء اور اتقیاء کی صف میں ان کا ہم مشرب بوریہ نشین، اور سیاست ملی کے میدان میں نہ صرف دوسرے مسلم زعماء کے دوش بدوش بلکہ قافلہ سالار نظر آتا ہے — یہ مکاتیب شخصیت کے انھیں مشاغل و مصروفیات کے گرد دائر ہیں، ان میں بیشتر مکاتیب آخری چند سالوں کے ہیں، اس لئے قدرتی طور پر ان میں انھیں حالات کا تذکرہ ملتا ہے کوشش کی گئی ہے کہ تاریخی ترتیب سے نقل کیا جائے بعض خطوط پر سن تحریر درج نہ ہونیکی وجہ سے اس ترتیب میں فرق کا بھی امکان ہے۔

حسب ضرورت بعض مکاتیب کے شروع میں توضیحی نوٹ دیدئے گئے ہیں تاکہ ان کے مالہ و ماعلیہ کے سمجھنے میں کسی قسم کی دشواری نہ ہو، جن خطوط میں کوئی وضاحت طلب بات نہیں، صرف ان کی نقل پر اکتفا کیا گیا ہے۔

۴۹۔ مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری۔ تذکرہ شیخ الہند ص۔ ۱۴۹

سب سے پہلا خط جو ملتا ہے وہ مولانا سید اصغر حسین صاحب کے نام ہے خط پر اگرچہ تاریخ درج نہیں ہے لیکن مکتوب کے مندرجات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اوائل ۱۳۲۸ھ کا ہے کیوں کہ رسالہ القاسم رجب ۱۳۲۸ھ سے نکلنا شروع ہوا۔ (۳۹) اور زیر نظر مکتوب میں حضرت شیخ الہند نے مکتوب الیہ کو اسی رسالہ کی ادارت کے لئے طلب کیا تھا، مکتوب یہ ہے۔

مکتوب بنام مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ

برادر مکرم بارک اللہ فیکم وسلم!

بندہ محمود تسلیمات مسنونہ کے بعد ملتمس ہے گرامی نامہ پہونچا، بندہ کو مادہ سوداوی نے ستا رکھا ہے، ایسی حالت میں اپنی رائے پر رہا سہا اعتماد بھی نہیں ہو سکتا، آپ سے مخلص مکرم سے اپنا خیال عرض کرنے میں تکلف بھی بیجا۔ ہے خط جو آپ کے پاس گیا تھا اس میں یہ ضعیف بھی واقعی شریک تھا، آپ کا خیال واقعی درست ہے، اول اپنا پریشان خیال آپ پر ظاہر کرتا ہوں پھر استفسار کا جواب عرض کرتا ہوں۔

آپ کو معلوم ہے کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں، عالم شہود سے اور عالم برزخ سے قریب ہو رہا ہوں اتنا فکر ضرور ہے کہ استاذ رحمۃ اللہ علیہ سے بفضل اللہ اگر مشافہہ کی نوبت آگئی اور پوچھا کہو مدرسہ کس پر چھوڑا اور کس حالت میں ہے تو اس کا جواب ایسا دے سکا جو پسند خاطر ہو، اس کی کوئی تدبیر نہیں مگر یہ کہ اپنے مخلصین صلحاء لائق کے نام گنوا دوں، سو آپ کی طرف بھی بچند وجوہ میرا خیال ضرور جاتا ہے اور چاہتا ہوں کہ آپ جیسے چند "اصغر" مگر حقیقت مفید اور "اکبر" کسی بہانہ سے احاطہ مدرسہ میں آنکھوں سے دیکھ لوں، آپ نے جو دو صورتیں تحریر فرمائی ہیں باللہ العظیم ہرگز اس کو پسند نہیں کرتا ہوں کہ آپ مشغلہ تدریس سے یکسو ہوں بلکہ چاہتا ہوں کہ تدریس حالا... موجودہ سے زیادہ نصیب ہو۔ میں تو آپ کے جلد بلانے کیلئے تدبیر موجودہ کو در اصل پسند کرتا ہوں، یہ ہرگز مطلب نہیں کہ سید صاحب مشغلہ علمی سے یکسو ہو کر رسالہ بازی میں عمر صرف کریں، البتہ یہ ضرور ہے کہ سردست رسالہ کی گاڑی سنبھالنے کو کافی لائق معتمد علیہ شخص ہو۔ کچھ عرصہ کے بعد رسالہ کے لئے انشاء اللہ بہت پیدا ہو جائیں گے، اس وقت

رسالہ کی ابتدا اگر ہماری طرز وضع اور خیال کے خلاف پڑ گئی تو اندیشہ کی بات ہے ، اس وجہ سے بے شک یہ مستحسن نظر آیا کہ مکرم سید کو رسالہ دار بالفعل بنا دیا جائے اسلئے اپنا خیال عرض کرتا ہوں ، حکم ہرگز نہیں ، آپ کو پسند اور بے تکلف گوارا ہو تو سبحان اللہ ورنہ جو آپ کو منظور ہو ہم کو منظور ہوگا اور آپ سے بخدا کوئی تعلجان یا ملال کا واہمہ بھی انشاء اللہ نہ ہوگا ۔ وہ یہ ہے کہ آپ بالکل اپنے مدرسہ کے احاطہ کے اندر اللہ کا نام لے کر آجائیں اور آہستہ آہستہ کام کئے جائیں انشاء اللہ آپ کے شغل تدریس کی ہر ممکن کوشش کیجائے گی قصور نہ آویگا اور پینچ بجلی کا خیال اگر اعتماد کے قابل نہ ہو تو دو ماہ سے لیکر چھ ماہ تک کی رخصت لیکر تشریف لاکر رسالہ کو ہمارے کہنے کے مطابق جاری فرمائیں اس کے بعد جو صورت آپ پسند فرمائیں اس کے کرنے میں ہم آپ کی موافقت بلکہ متابعت خوشی کے ساتھ کرنے کو موجود ہیں ، ان چند روزوں کی جو آپ کو رسالہ کے متعلق تحریرات کی نوبت آئے گی اس کا حساب کیا جائے گا کہ اتنی مدت کی تالیفات جو تنور سے زائد ہوں گی یا کم ، سو یہ میرا خبط ہے جو خیال کے قابل نہیں ، میں خوب جانتا ہوں کہ یہاں آپ کسی عنوان سے آئیں مگر غالباً وہ آزادی اور استقلال جو جون پور میں ہے آپ کو بوجوہ مختلف میسر نہ ہوگا مگر کیا کروں اپنے خیال خام کیوجہ سے جیسا خود مقید ہوں اپنے لائق مخلصین کو بھی مقید کرنے کا شوق ہوتا ہے ، آپ بالکل مدرسہ اور خدام مدرسہ کے خیر اندیش اور بہی خواہ ہیں اور ہم خدام مدرسہ بالکل آپ کے خیر طلب اور دعاگو ہیں ، خط آپ ہی ختم ہو گیا کاغذ ہی نہیں رہا ۔

(۴۰)

---

۳۹ ۔ مفتی عزیز الرحمن بجنوری ۔ تذکرہ شیخ الہند ۔ ص ۔ ۱۵۰ ۔ ۱۵۲

۴۰ ۔ علامہ سید سلیمان ندوی ۔ حیات شبلی ۔ ص ۔ ۵۱۷

دوسرا خط علامہ شبلی نعمانی کے نام ہے جسے "حیات شبلی" کے مصنف نے صفحہ ۵۲۸-۲۹ پر نقل کیا ۔ ۱۹۱۲ء میں دہلی کے اجلاس ندوہ کے زمانہ میں علامہ شبلی کو مدارس عربیہ کا انتشار دور کر کے سب کو قریب لانیکا خیال پیدا ہوا اس مقصد سے انھوں نے سب سے پہلا خط مولانا محمود حسن صاحب کو تحریر کیا ۔ (۱۴) ان کا جواب درج ذیل ہے ۔

مکتوب بنام علامہ شبلی نعمانی

مکرم والا درجت زید فضلکم

تسلیم مع التکریم

بوجہ تشریف آوری حجاج بندہ کو دہلی ، میرٹھ ، سہارن پور جانا ہوا اس لئے جواب میں تاخیر ہوئی ۔ آپ نے جو لائق مدرس کی نسبت ظاہر فرمایا نہایت ضروری اور قابل اہتمام ہے اس کا بند و بست ہونا چاہئے ۔ جیسا آپ نے تضادیر کا انسداد فرمایا اسی طرح دیگر جزئیات کی طرف وقتاً فوقتاً آپ کی توجہ نہایت مفید اور موثر ہوگی ۔

ایک مختصر مجمع میں جس میں چند حضرات بیرونی بھی شریک تھے حالات موجودہ پر کچھ بحث ہوئی دو باتیں قابل اہتمام سمجھی گئیں ۔ اول یہ کہ مرکز بنایا جائے یا نہیں ، اور بنایا جائے تو کس کو؟ دوسری یہ کہ اس کی صورت کیا ہو ، امر اول کو موجودین نے منظور کیا اور بالاتفاق مسئلہ مرکز کو مستحسن کہا ، تعیین مرکز کی نسبت جو رائے ہوئی تو بعد گفتگو یہی قرار پایا کہ مدارس اسلامیہ بجز دیوبند اور کسی کی ماتحتی نہ پسند کر سکتے ہیں اور نہ یہ امر مناسب ہے ۔

بقیہ حضرات سے استفسار کے بعد جو امر طے ہوگا اطلاع دوں گا امر دوئم یعنی اس سلسلہ کی صورت اور شرائط و قیود کیا ہوں گی یہ لمبی بحث ہے جو جملہ اراکین وغیرہ کے بدوں اس کا تصفیہ قابل اعتبار ناممکن ہے ، بعد مشاورت اگر کوئی امر قابل عملدرآمد طے ہوگیا تو جناب کو اطلاع دی جائے گی آپ کسی تجویز مفید سے اطلاع فرمائیں تو غالباً اس وقت میں مفید ہوگی ۔

مجھ کو یہ بھی خیال ہے کہ آپ کو اور ہم کو یونیورسٹی سے کیا تعلق رکھنا مناسب ہے ، غالباً آپ نے کوئی امر ضرور مقرر فرما لیا ہوگا ۔ والسلام

بندہ محمود حسن دیوبند

۱۰ ربیع الاول ۱۳۲۹ھ ۔ (۱۴)

ذیل کا مکتوب "نقوش" لاہور کے خطوط نمبر میں شائع ہوا ہے مکتوب الیہ کا نام درج نہیں، مندرجات مکتوب سے اندازہ ہوتا ہے کہ علی برادران یا مولانا عبدالباری فرنگی محلی میں سے کوئی مخاطب ہے۔

بنام ....

مدرسہ اسلامیہ دیوبند۔ ۲۱ شعبان ۱۳۳۲ھ

مخدوم و معظم و مکرم عم فیضہ ا

بعد سلام مسنون گذارش خدمت بابرکت ہے کہ افتخار نامہ سرمایۂ عزت ہوا، انجمن خدام کعبہ کے انعقاد اور اس کے مقاصد کا اجمالی علم رکھتا ہوں اور اس کی نیک کوششوں کا معتقد ہوں۔ جزاکم اللہ خیرا۔

بندہ کو یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ جناب نے اس کے اغراض سے مطلع فرمانے کی غرض سے تکلیف بھی فرمائی تھی مگر اپنی غیر حاضری کی وجہ سے تفصیلی علم حاصل کرنے سے معذور رہا۔ بنابریں ضرورت ہے کہ بندہ جناب سے نیاز حاصل کر کے اول تفصیلی کوائف معلوم کرے اس کے بعد کوئی رائے عرض کرے۔ مجھے امید ہے کہ ابھی جناب میری نسبت کوئی فیصلہ نہ فرماویں گے اس کے علاوہ یہاں کے مدرسہ وغیرہ کے تعلقات اور ان کے سوائے اور بھی بعض امور پیش نظر ہیں جو عجب نہیں کہ خیال شرکت کے مزاحم ہوں، بہر حال اول ملاقات ضروری ہے بندہ خود حاضر ہونے یا جناب کو تکلیف سفر دینے میں جلدی کرتا مگر معذوری یہ ہے کہ چند سفر ضروری درپیش ہیں ان سے فارغ ہونے کے بعد اس کے متعلق عرض کرونگا، انشاء اللہ تعالے۔

والسلام

بندہ محمود۔ دیوبند۔ دوشنبہ۔ (۴۳)

۴۲۔ علامہ سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، ص۔ ۵۲۸۔ ۵۲۹

۴۳۔ محمد طفیل، مرتب۔ رسالہ "نقوش" خطوط نمبر جلد دوم ۱۹۶۸ء ادارہ فروغ اردو لاہور ص ۱۱۳

ذیل کے کچھ خطوط حضرت شیخ الہند نے اپنے ایک شاگرد مولوی حاجی محمد احمد صاحب ساکن سملک ضلع سورت (گجرات) کے نام تحریر فرمائے ہیں، ان سب کو مولانا سید اصغر حسین صاحب نے اپنے شائع کردہ مجموعہ مکاتیب میں شامل کر دیا ہے اسی ماخذ سے یہاں نقل کئے جا رہے ہیں۔ ان میں سے پانچ خطوط پر سن تحریر درج نہیں لیکن ان کے مندرجات سے ظاہر ہوتا ہے کہ سفر حجاز سے پہلے کے ہیں، چھٹا خط مالٹا سے تحریر فرمایا ہے جس پر تاریخ اور سن بھی درج ہے۔ خطوط یہ ہیں۔

مکتوب اول بنام مولوی حاجی محمد احمد صاحب۔

اخی فی دین اللہ الاوحد رزقکم اللہ علما نافعا وعملا متقبلا

احقر محمود۔ سلام مسنون کے بعد ملتمس ہے کہ آپ کا عنایت نامہ پہونچا خیریت معلوم ہو کر اطمینان ہوا اور عزم سفر مبارک سے مسرت ہوئی حق سبحانہ آپ کو بخیر لا دے اور قبول فرما دے، وہاں کی خصوصیات سے یہ بات ہے کہ مکہ میں حرم شریف کی نماز با جماعت کا پورا التزام کیا جائے اور وہاں کی حاضری اور کثرت طواف جد وجہد کے ساتھ کیجاوے اور مسجد نبوی کی بھی جماعت اور حاضری میں اہتمام ہو اور روضۂ مطہرہ کے سامنے جس قدر ہو سکے حاضر رہنا اور وہاں بیٹھنا النعمت کبری سمجھا جاوے مگر جس قدر بیٹھنا ہو غایت تعظیم وحرمت اور توجہ تام اور شوق وخشوع کے ساتھ ہو باقی سفر میں اپنے کام میں مستعد اور ہوشیاری سے رہنا چاہئے جس پر اطمینان نہ ہو اس کی شرکت سے اجتناب بہتر ہے اگر سفر میں کسی قسم کی تشویش یا تکلیف پیش آوے تو گھبرانا نہ چاہئے بلکہ اس تکلیف کو بھی شوق ومحبت کے ساتھ برداشت کرنا چاہئے "حفت الجنۃ بالمکارہ" ہر ایک حالت عسر ویسر میں اللہ پر اعتماد ہو کسی سے کچھ توقع نہ کی جاوے مکہ مکرمہ میں کوئی شخص جس کو خط لکھوں یاد نہیں آتا، اور مدینہ طیبہ میں مولوی حسین احمد صاحب اور ان کے ہر دو بھائی موجود ہیں وہ انشاء اللہ آپ کی رفاقت کریں گے ان کو خط کی حاجت نہیں، ان سے جو حاجت ہو بے تکلف فرما دیں وہ تعمیل کریں گے، اور میرا سلام بھی ان کی اور ان کے والد ماجد کی خدمات میں عرض کر دینا۔ آپ کے خواب اول کا یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ باذن اللہ عالم میں اسلام کو فروغ ہوگا اور انوار سنت عالم میں جلوہ گر ہوں۔ واللہ اعلم بندہ حقیر آپ کے مطالب دارین کے لئے دعا کرتا ہے اور انشاء اللہ کرتا رہے گا۔

واللہ معکم اینما کنتم ۔ والسلام فقط
مواقع متبرکہ اور اوقات مخصوصہ میں بندہ کو دعائے خیر سے گاہ گاہ یاد کر لیا جاوے
واللہ لا یضیع اجر المحسنین ۔ مولانا مسعود احمد صاحب خیریت سے ہیں مدرسہ دیوبند
میں خیریت ہے ۔ والحمد للہ ۔ (۴۴)

مکتوب دوم بنام مولوی محمد احمد صاحب

برادرم مکرم بارک اللہ فیکم وعلیکم

بندہ محمود سلام مسنون کے بعد ملتمس ہے مولوی کفایت اللہ صاحب کے خط سے آپ کی تشریف آوری کی خبر معلوم ہوئی تھی خط لکھنے کا ارادہ کرتا تھا مگر پتہ پورا معلوم نہ تھا ۔ الحمد للہ آپ کے خط سے خیریت اور دیگر حالات معلوم ہو کر اطمینان ہوا بخیر و خوبی اس سفر مبارک طویل کا انجام پذیر ہو جانا حق تعالیٰ کا انعام ہے ۔ فلہ الحمد والمنۃ ۔
بچہ کے انتقال سے افسوس ہوا مگر کچھ مضائقہ نہیں آپ کا فرط خیر مکہ میں رہا جس سے خیر و فلاح کی توقع ہے اللہ قبول فرمائے ۔ آمین ۔
اللہ کے فضل سے جب آپکو اس وقت فراغت ہے تو ضرور جم کر کسی کار خیر میں لگ جائیں ، حیات دنیوی کا کچھ اعتبار نہیں آدمی سے جو کچھ ہو سکے اس میں دیر نہ کرے " اے ز غفلت بخیر در ہر چہ باشی زود باش " مگر آپ تمام جوانب پر نظر ڈال کر یہ طے کرلیں کہ قیام کہاں مناسب اور سہل ہوگا چوں کہ اہلیہ بھی معیت میں ہیں اس لئے تأمل کر لینا بہتر ہے ، وطن میں سہولت ہوتی ہے عورات اور اطفال کو باہر رہنے میں دقت ہوتی ہے آپ تو یہاں رہے ہوئے ہیں ، آپ کو انشاء اللہ پریشانی نہ ہوگی ۔ بہتر سو جو آپ ایک دو مرتبہ استخارہ بھی کرلیں اور پھر جو رائے ہو اس کو قائم کریں ۔ یہ بھی خیال کر لیجئے کہ وہاں کے قیام میں وہاں کے لوگوں کو ہدایت ہو جانے کی توقع ہے اور بدعات میں اور لوگوں کی جہالت میں کمی ہو نیکی امید ہو سکتی ہے ماننے میں آپ بہنوں کے عقد سے فارغ ہوں ، اس عرصہ میں ان امور کو باطمینان طے فرمالیویں ۔
آپ کی تحریر کے موافق دربارۂ طلبی ایک تحریر روانہ کئے دیتا ہوں ۔ آپ جملہ جوانب سے مطمئن ہو کر اگر یہاں آنے کی ہی رائے قائم ہو جاوے تو اس تحریر کو دکھلا دیں ، تازہ سانحہ یہ

---

۴۴ ۔ مولانا سید اصغر حسین ۔ مرتب مکتوبات شیخ الہند ، ص ۔ ۲۰۳

گذرا کہ میری بڑی لڑکی عوارض اسقاط میں انتقال کر گئی آپ اس کی مغفرت کی دعا ضرور فرمائیں ۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ آپ کے قیام کی وجہ سے وہاں کے مدرسہ میں کسی حد تک ترقی ہو سکے گی ۔ ایک صورت یہ بھی ہے کہ آپ برس روز چھ مہینے کے لئے یہاں آجاویں اور اس کے بعد وطن چلے جاویں اور پھر وہاں کی باتوں کو انجام دیں بہرحال جو صورت مناسب اور مفید تر نظر آوے اس کو معین فرمادیں ۔ واللہ ولی التوفیق والسلام ۔

فقط بندہ محمود عفی عنہ ۔ جمعہ ۔ (۴۵)

مکتوب سوم بنام مولوی محمد احمد صاحب

برادر معظم اکرمکم اللہ وسلم

بندہ محمود سلام مسنون کے بعد ملتمس ہے عرصہ کے بعد آپ کا عنایت نامہ صادر ہوا ۔ آپ کی خیریت معلوم ہو کر مسرت ہوئی ۔ اللہ تعالےٰ آپ کو خیریت کے ساتھ اپنی مرضیات کی توفیق روز افزوں عنایت فرماوے آدمی کو لازم ہے کہ وقت کو ضائع نہ کرے اپنی وسعت کے موافق نیک کام اور نیک خیال میں لگا رہے اور جہاں رہے ہر وقت مفید کام سے غافل نہ ہو ۔ بندہ بھی بحمد اللہ خیریت سے ہے اور مدرسہ میں بھی سب خیریت سے ہیں ۔ خواب سب مبارک و مفید ہیں اول خواب میں اس امر کی ہدایت معلوم ہوتی ہے کہ آدمی کو صرف اپنے نفع پر اکتفا نہ کرنا چاہئے بلکہ خلق اللہ کی نفع رسانی ہر امر خیر میں ملحوظ رہے ۔ خواب دوئم میں اس امر کی طرف تنبیہ ہے کہ جملہ مرغوبات نفس صرف زندگی تک نظر آتے ہیں بعد حیات کار آمد نہیں ، آدمی کو ایسے کاموں کیطرف متوجہ ہو جانا چاہئے جو بعد میں کام آویں ۔ تیسرے خواب میں اس کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ بحمد اللہ آپ کی طلب مقبول اور آپ کی دوستی اور تربیت اور اصلاح عند اللہ ملحوظ ہے اور آپ کو کسی مقبول بندہ سے نفع پہونچے ۔ مزنی حضرت امام شافعی کے بلا واسطہ شاگرد رشید اور غالباً امام طحاوی کے ماموں ہیں اکابر علماء اور مشاہیر میں سے ہیں رحمہ اللہ باقی خیریت ہے ۔ والسلام فقط ۔

مولوی حسین احمد صاحب دیوبند میں مقیم ہیں بعد رمضان عزم مدینہ طیبہ مصمم رکھتے ہیں ۔

بندہ محمود عفی عنہ ۔ یکشنبہ ۔ (۴۶)

مکتوب چہارم بنام مولوی محمد احمد صاحب

مخدوم بندہ دام فضلکم

بندہ محمود سلام مسنون کے بعد ملتمس ہے۔ ذیقعدہ کے اخیر میں آپ کا گرامی نامہ مع بلٹی پہونچا تھا۔ بندہ گنگوہ وغیرہ چلا گیا۔ جواب میں اس لئے تساہل ہو گیا۔ لیمون اور ادرک بجنسہ پہونچ گئی۔ مفتی صاحب، مہتمم صاحب اور بعض صاحبوں کو بھی پہونچا دیا گیا۔ لیموں بہت بڑے تھے اور ادرک تازہ عمدہ۔ باقی بندہ بحمد اللہ خیریت سے ہے اور مدرسہ میں بہمہ وجوہ خیریت ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خیریت سے رکھے اور فلاح دارین عطا فرمائے۔ مولوی محمد شفیع صاحب سے سلام فرما دیجئے۔ مولوی حسین احمد صاحب کی مکہ سے خیریت آ گئی، مدینہ طیبہ سے کوئی خط نہیں آیا۔ ڈاک بھی بند معلوم ہوتی ہے۔ حرب وضرب میں طول بڑھتا جاتا ہے۔ تشویش میں ترقی ہے اللہ تعالیٰ انجام بخیر کرے۔ مولوی محمد میاں دیوبند میں ہیں اور خیریت سے ہیں بعض تدابیر میں مشغول ہیں۔ مقدمہ کے لئے روپیہ کی بھی فکر میں ہیں اللہ تعالیٰ کامیاب فرما دے۔ اپنے اوراد التزام سے کئے جائیں۔ حق سبحانہ استقامت نصیب کرے۔ مولوی عزیز گل گھر گئے ہیں۔ مولوی خان محمد صاحب خیریت سے ہیں ان کا سلام قبول ہو۔ اپنی خیریت سے مطلع فرماتے رہیئے۔ والسلام۔ فقط

بندہ محمود عفی عنہ۔ شنبہ۔ (۴۷)

۴۵۔ مولانا سید اصغر حسین۔ مرتب مکتوبات شیخ الہند۔ ص۔ ۳۴۳

۴۶۔ 〃 〃 〃 〃 ص۔ ۴

مکتوب پنجم بنام مولوی محمد احمد صاحب

مکرم بندہ — السلام علیکم

آپ کا خط اس وقت ملا جب کہ میں جہاز پر سوار ہونیکے لئے لب دریا پڑا ہوں۔ اس وقت سند لکھنے سے مجبور ہوں انشاء اللہ دوسرے وقت لکھدوں گا۔ آپ کی ہمشیرہ خدیجہ عائشہ اور جو درخواست کریں اور آپ مناسب سمجھیں ان کی بیعت قبول کرتا ہوں۔ اللہ تعالےٰ برکت دے۔ سب کو صبح و شام کا وظیفہ مع تاکید نماز وغیرہ فرما دیجئے۔ سعی فی الدین کا خیال رہے اللہ مددگار ہے آپ کیلئے انشاء اللہ دعا کرتا رہوں گا آپ بھی دعا فرماتے رہیں اور سب سے سلام فرما دیجئے۔ والسلام

فقط بندہ محمود عفی عنہ۔ بمبئی یکشنبہ (۴۷)

مکتوب ششم بنام مولوی محمد احمد صاحب

برادر مکرم و محترم مد فیوضکم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ

آپ کا محبت نامہ ۱۴ر صفر کا آٹھ نو ماہ کے بعد ذیقعدہ کی شروع میں مجھ کو ملا بہت ہی مسرت ہوئی آپ کی یادآوری کا ممنون ہوں۔ آپ کی خیریت معلوم ہونے سے مسرور ہوں۔ الحمد ربہم الحمد للہ

بخاری شریف، ہدایہ وغیرہ کتب کی تدریس سے بہت خوشی ہوئی اللہ تعالےٰ آپ کی علم و عمل میں برکت دے اور اپنے بندوں کو آپ کے فیض سے مستفیض فرما دے۔ یہ عاجز حق سبحانہٗ تعالےٰ کی رحمت اور آپ کی دعا سے مع جملہ رفقاء بہمہ وجوہ خیریت سے ہے۔ مولوی حسین احمد مدنی، وحید احمد ان کا برادر زادہ۔ مولوی عزیر گل۔ مولوی حکیم نصرت حسین یہ چار حضرات میرے ساتھ ہیں سب بخیریت ہیں اور سلام مسنون عرض کرتے ہیں۔ جس کاغذ پہ یہ خط لکھ رہا ہوں انھیں پر خط لکھنے کی اجازت ہے اس لئے سند حدیث اسوقت ارسال کرنے کا موقع نہیں۔ خدائے تعالےٰ کو منظور ہے تو دوسرے وقت آپ کی فرمانے کی

۴۷۔ مولانا سید اصغر حسین۔ مرتب مکتوبات شیخ الہند۔ ص ۵

تعمیل ہو جاوے گی۔ آپ طلبہ کو سند دیدیجئے اس میں تامل نہ فرماویں۔ بندہ کی سند یہ ہے کہ بندہ کو حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ سے ان کو حضرت شاہ عبدالغنی مہاجر مدنیؒ اور مولانا احمد علی صاحب سہارن پوریؒ سے۔ ان دونوں حضرات کو حضرت شاہ محمد اسحاق صاحبؒ سے ان کو حضرت شاہ عبد العزیزؒ سے ان کو اپنے والد حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ سے رحمہم اللہ علیہم اجمعین اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی سند کی کتابوں میں اور علماء میں مشہور ہے اس کے لکھنے کی حاجت نہیں۔ آپ احقر کے لئے دعاءِ عافیت دارین فرماتے رہیں۔ بندہ بھی آپ کے لئے دعا کرتا ہے۔ تولد فرزند سے خوشی ہوئی۔ اللہ تعالے عمر اور سعادت دارین عطا فرماوے۔ ایک تعویذ لکھتا ہوں اس کو لکھ کر عزیز معصوم کے گلے میں ڈالدینا۔

"بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ اعوذ بکلمات اللہ التامات من شر کل شیطان وہامۃ وعین لامۃ تحصنت بحصن الف الف لاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم"۔

اصحاب سورت خدا کرے سب خیریت سے ہوں۔ سب کی خدمت میں سلام مسنون پہونچا دیجئے۔ والسلام مع الاکرام۔ بندہ محمود حسن

مالٹہ سینٹ کلیمنٹ براکس۔ ۲۸ ذلقعدہ سنہ ۱۳۳۶ھ۔

۲۲۱۹ء۔ (۴۹)

۔۔ مولانا سید اصغر حسین۔ مرتب مکتوبات شیخ الہند۔ ص۔ ۵

۴۹۔ مولانا سید اصغر حسین۔ مرتب مکتوبات شیخ الہند۔ ص ۵ - ۶

ذیل کے دو خط حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ کے نام ہیں۔ ان میں پہلے خط کے مندرجات کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خط سفر حجاز میں گرفتاری سے قبل لکھا گیا ہے۔ خط پر تاریخ تحریر ہے لیکن سن درج نہیں ہے انداز سے تعین کر کے ۱۳۳۵ھ لکھا گیا ہے۔ دوسرا خط چونکہ بہت ہی مختصر ہے اور اس کے مندرجات سے کوئی اندازہ لگانا ممکن نہیں اس لئے صرف تاریخ جو مکتوب میں درج ہے یہاں بھی تحریر کر دی گئی ہے۔ یہ دونوں خط مؤلف اشرف السوانح نے کتاب کے تیسرے حصہ میں نقل کئے ہیں۔

مکتوب اول بنام مولانا تھانوی

سراپا فضل و کمال شرفکم اللہ تعالےٰ وجعلکم فوق کثیر من الناس
السّلام علیکم ورحمۃ اللہ

بارہا آپ کی خیریت معلوم ہونے کا داعیہ پیدا ہوا اور ایک دو دفعہ بعض آئندگان کی زبانی آپ کی خیریت معلوم بھی ہوئی۔ اللہ تعالےٰ آپ کو مع جملہ متعلقین خیریت سے رکھے۔ اس وقت ایک صاحب بنگالی مسمیٰ عبد المجید سے ملاقات ہوئی جو ہندوستان واپس ہو رہے ہیں اور جناب کی خدمت میں حاضر ہونے کا قصد رکھتے ہیں یہ موقع غنیمت معلوم ہوا اس لئے یہ عریضہ روانہ کرتا ہوں۔ بندہ مع رفقا بحمد اللہ اس وقت تک بالکل خیریت اور اطمینان سے ہے۔ شروع رجب میں مکہ معظمہ حاضر ہو گیا تھا اس وقت تک یہیں حاضر ہوں۔ مجھ کو امید ہے کہ فلاح وحسن خاتمہ کی دعا سے اس دور افتادہ کو فراموش نہ فرمادیں گے۔ آئندہ قیام کی نسبت ابھی کچھ عرض نہیں کر سکتا۔ مولوی شبیر علی صاحب مولوی محمد ظفر صاحب مولوی عبد اللہ صاحب وغیرہ حضرات سے سلام مسنون فرما دیجئے۔ مولانا مولوی یحییٰ صاحب۔ مولانا قمر الدین صاحب کی وفات سے بے افسوس بر افسوس ہوا۔ انا للہ۔ رحمہما اللہ تعالےٰ۔

والسلام علیکم وعلی من لدیکم۔ فقط

منشی رفیق احمد صاحب کی خدمت میں سلام۔ خدا کرے ان کا رسالہ رو بہ ترقی ہو۔

بندہ محمود عفی عنہ۔ بمکہ معظمہ۔ ۱۲۔ محرم۔ چہارشنبہ (۱۳۳۵ھ غالباً) (۵۰)

مکتوب دوم بنام مولانا تھانوی

معدن حسنات و خیرات دام ظلکم!

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ۔

نامۂ سامی موجب مسرت و امتنان ہوا۔ جو ہو امکرمین و مخلصین کی ادعیۂ مقبولہ کا ثمرہ ہے، ادام فیوضہم و برکاتہم۔ احقر اور رفقاء و متعلقین بحمد اللہ خیریت سے ہیں سب کا سلام مسنون قبول ہو۔ والسلام علیکم و علی من لدیکم۔ فقط

بندہ محمود عفی عنہ از دیوبند۔ دویم شوال روز یکشنبہ۔ (۵۱)

۵۰۔ خواجہ عزیز الحسن مجذوب۔ اشرف السوانح حصہ سوم ص۔ ۳۹۰ - ۳۹۱

۵۱۔ 〃 〃 ص۔ ۳۹۱

ذیل کے دو خط شیخ الہند نے اپنے برادر حقیقی حکیم محمد حسن صاحب کے نام تحریر فرمائے ہیں ان میں پہلا خط عربی زبان میں ہے اور مصر سے لکھا گیا ہے دوسرا خط اردو میں ہے جسے مالٹا پہونچنے کے بعد تحریر فرمایا ہے دوسرے خط میں آپ نے جس پہلے خط کا تذکرہ کیا ہے وہ یہی عربی والا خط ہے۔ پہلے خط میں تاریخ اور سن تحریر درج ہے البتہ دوسرے خط میں تاریخ درج نہیں۔

شیخ الہند مصر کے جیل خانہ سے مالٹا ۲۹ ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ مطابق ۲۱ فروری ۱۹۱۷ء کو پہونچے ہیں اس لحاظ سے اندازہ یہ ہے کہ دوسرا خط شاید جمادی الاولیٰ ۱۳۳۵ھ یا اس کے بعد کسی قریبی مہینہ کا تحریر کیا ہوا ہے۔

مکتوب اول بنام مولانا حکیم محمد حسن صاحب

من قاہرۃ مصر۔ المعتقل السیاسی بجیزہ۔

إلی جناب الأخ السعید المولوی الحکیم محمد حسن سلمہ اللہ تعالیٰ۔

آمین۔ بعد مزید السلام علیکم وعلی سائر الأہل والأولاد والأقارب والدعوات الصالحۃ لہم۔ فاعلموا أنی مع الرفقۃ لبکل خیر وسلامۃ وأرجو من فضل اللہ أن تکونوا بصحۃ تامۃ وعافیۃ کاملۃ فینبغی لکم أن تکونوا علی طمانیۃ کاملۃ من جہتی ومن جہۃ الرفقۃ عسی اللہ أن یجمعنا جمیعا بأسرا حوال وأسرع زمان وسلموا إلی سائر الأہل والأقارب والأحباب ومن ہہنا یسلم علیکم حسین احمد والمولوی عزیر گل و وحید احمد والمولوی حکیم نصرۃ حسین صاحب۔ وأخبرونا من صحتکم۔ ہذا والسلام ختاما۔ تحریرا فی ۱۲ من ربیع الآخر ۱۳۳۵ھ۔ وسلموا منا علی سائر اہل المدرسۃ والأحباب وطمنوا خواطرہم ولا تنسونا من الدعوات الصالحۃ۔

محمود حسن عفی عنہ۔ (۵۲)

۵۲۔ اخبار مدینہ بجنور ۱۳ر ۱۹۱۷ء۔ شمارہ ۲۰۔ جلد ۶

مکتوب دوم بنام حکیم محمد حسن صاحب

الحمد للہ رب العالمین والعاقبۃ للمتقین

اخ معظم اکرمکم اللہ وسلم ۔

کل انتظار مدید کے بعد آپ کا خط ساتویں جمادی الاول کا لکھا ہوا ہمکو مالٹا میں ملا سب کی خیریت مجمل معلوم ہو کر مسرت ہوئی ۔ الحمد للہ ۔ عزیز مسعود کے بعد چھ ماہ میں آپ کا خط آیا بہت غنیمت معلوم ہوا ۔ بقول شخصے ۔

یوں اسیران قفس تک کوئی پہونچا گل برگ
جیسے غربت میں شفیقان وطن کا کاغذ

چند خطوط بعض رفقا نے اور بھی روانہ کئے ہیں غالباً پہونچے ہوں گے ۔ بالجملہ ہم سب بحمد للہ خیریت سے ہیں اور راحت سے ہیں ۔ آپ کو خط لکھنے کے پندرہ بیس روز بعد یہ ہوا کہ ہم لوگ مصر سے کچھ ترقی کر کے مالٹا آ گئے ۔ مسافت تو کچھ بڑھ گئی مگر تکلیف کچھ نہیں بلکہ یہاں راحت زیادہ ہے ۔ الحمد للہ ۔ گو اس عرصہ میں حالات وطن سے بے خبری رہی مگر دور دراز کے وہ حالات معلوم ہوئے جو خواب میں بھی نہ دیکھے سنے ۔ آدمی جب تک زندہ ہے حرکت زمانی تو کسی وقت رکتی نہیں مگر حرکت زمانی اور مکانی دونوں مل کر بہت سے انکشافات جدیدہ کی موجب ہو گئیں ۔

ستبدی لک الایام ما کنت جاہلاً ۔
و یاتیک بالاخبار من لم تزود

۔ ترجمہ ۔ عنقریب زمانہ بہت سی نامعلوم باتیں تجھ پر ظاہر کر دیگا اور تجھے وہ شخص خبر دیگا " اور اجرت بھی نہیں دی ۔

مشغلہ اسباق و دیگر مشاغل میں اچھی طرح گذر رہی ہے ادھر " ونرجون من اللہ مالا یرجون " کا مبارک سلسلہ بھی ایسا نہیں کہ جو کسی وقت منقطع ہو جائے ۔ الحمد للہ ثم الحمد للہ ۔ گھر میں سب کو اور مکان میں بچوں کو سلام کہہ دینا ۔ فقط والسلام ۔

بندہ محمود عفی عنہ ۱۳۳۶ھ (۵۳)

۵۳ - مفتی عزیز الرحمن بجنوری : تذکرۂ شیخ الہند ۔ ص ۴۰۵-۴۰۴ ۔ ۳۵

تذکرہ شیخ الہند کے مصنف نے حافظ زاہد حسین صاحب امروہی کے نام دو خط نقل کئے ہیں، یہ دونوں خط مالٹا سے لکھے گئے ہیں، پہلے خط پر تاریخ اور سن درج ہے دوسرے پر صرف تاریخ لکھی گئی ہے سن نہیں لیکن مندرجات کی روشنی میں سن کا ضمنی تعین کر دیا گیا ہے خط ۲ ر صفر کا لکھا ہوا ہے اور اس میں مولوی سید نصرت حسین صاحب کے انتقال کا ذکر ہے جو ذیقعدہ ۱۳۳۷ھ میں ہوا اس لئے یقین کیساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ خط ۳۸ھ کا ہے اسی ۱۳۳۸ھ کے ماہ رمضان میں آپ رہا ہوکر ہندوستان آگئے۔ اس لئے اس کے بعد کے کسی سال کا احتمال باقی نہیں رہتا۔

مکتوب اول بنام حافظ زاہد حسن صاحب

ہوالرحمٰن الرحیم

از مالٹا

سراپا فضل وکرم دام لطفکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

عنایت نامہ سراپا شادمانی ہوا۔ جناب کی یاد آوری کا مشکور ہوں اور اس پر متاسف ہوں کہ اس سے پہلے جو آپ نے خطوط بھیجے قسمت کی نارسائی سے ایک بھی نہیں ملا۔ یہ بات تو ضرور ہے کہ یہ دور افتادہ کسی مخلص کو ابتداءً خط لکھنے سے عمداً ابھی کچھ رکتا ہے مگر جس قدر ابتدا کرنے سے قاصر ہوں اس سے زیادہ جواب دینے میں چست ہوں خطوط کا حال ایسا ہی ہے جو مل گیا مل گیا، نہ ملا نہ ملا، چٹھی جائے بھی اس وقت تک نہیں پہونچی ۔ ان مخلصان مراد آباد اور دیگر یاران امروہہ شریف کی خدمات میں سلام عرض کر دیجئے جن کو یہ ناکارہ یاد رہ گیا ہو اور جو بھول گئے ہوں سو خیر۔ بالخصوص مدرسین امروہہ اور مراد آباد سے ضرور سلام عرض کر دیجئے۔ خوب یاد آیا سنبھل جناب منشی صاحب کی خدمت میں سلام و نیاز پہونچا دیجئے۔ اگرچہ ایک کارڈ صرف ہو۔ خدا کرے آپ سب حضرات خیریت سے ہوں۔ احقر کے پاس کارڈ یا خط بھیجنے میں ٹکٹ لگانا فضول ہے جملہ رفقاء اور ان کے طفیل سے یہ ناکارہ خیریت اور راحت سے ہیں۔ آپ کی اس مولوٹی مراد آبادی کی چار سازنے بہت کام دیا۔ آپ کی عنایات کو یاد دلاتی رہتی ہے یہ تو فرمائیں مولانا مرحوم کے صاحبزادے کس مشغلہ میں ہیں کتب ضروریہ سے فارغ بھی ہو چکے؟ اللہ کرے بخوبی فارغ ہوکر اپنے مقدس بزرگوار کے پیرو ہوں جملہ رفقاء آپ سب حضرات کو سلام مسنون عرض

کرتے ہیں۔ آپ کے کارڈ پر تاریخ نہ تھی مگر ہم کو اخیر محرم میں ملا۔ یہ عریضہ ۲۹ محرم کو روانہ کرتا ہوں۔ جناب سید صاحب بالاجمال سب جگہ کو خیریت لکھ دیں۔ مناسب ہے سنبھل۔ بچھراؤں، نگینہ وغیرہ۔ والسلام علیکم۔

مالٹہ۔ سینٹ کلیمنٹ براکس ۹ محرم سنہ ۱۳۳۷ھ

محمود حسن ۲۲۱۹ء (۵۴)

مکتوب دوم بنام حافظ زاہد حسن صاحب

سراپا فضل وکرم دام لطفکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا گرامی نامہ ۸ شعبان ہم کو ذی الحجہ میں وصول ہوا۔ ممنون فرمایا۔ آپ کی اور جمیع حضرات امروہہ، مرادآباد، سنبھل، نگینہ، حسن پور، بچھرایوں کی بالاجمال خیریت معلوم ہوئی۔ الحمدللہ وجزاکم اللہ۔

مکرر یا کیا عرض کروں اسقدر بعد پر اپنے مکرمین واحباب سے تعلق میں کچھ کمی واقع نہیں ہوئی۔ اسلئے بالاجمال بھی خیریت معلوم ہوکر یک گونہ سکون ضرور ہو جاتا ہے اور حوادث ہندوستان معلوم ہوکر مکروہ وپریشانی ہوتی ہے۔ جب کسی کی خیریت معلوم ہوتی ہے یک گونہ اطمینان ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو عافیت دارین عطا فرمائے۔ اس سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ مردے کے تعلق سے گو احیاء کے قلوب میں یکسوئی یا غفلت آجاتی ہے جیسا کہ مشاہد ہے مگر غالباً اموات کے تعلق قلبی میں کمی نہیں آتی گو کسی حال میں ہوں۔ واللہ اعلم

جب سے بعض خطوط سے معلوم ہوا ہے کہ مولوی احمد شاہ صاحب بوجہ ضعف و مرض ترک تعلق کر کے وطن آ گئے۔ بار بار خیال آکر ملال ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اور ان بزرگوں کی برکت سے ان کو جملہ افکار وتکالیف سے محفوظ رکھے۔ الحمدللہ قاضی صاحب بخیر اپنے مرکز پر قائم ہو گئے۔ ان کے خط کے جواب میں ایک عریضہ روانہ کیا تھا خدا کرے کہ پہونچ گیا ہو۔ غالباً

م ۵۔ مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری: تذکرۂ شیخ الہند۔ ص۔ ۲۵۶-۲۵۵

آپکو معلوم ہوگیا ہوگا کہ رجبتی جاں نثار۔ مولوی سید نصرت حسین بماہ ذی قعدہ پیش قدمی کرکے راہی آخرت ہوئے۔ اللہ تعالےٰ رحمت اور مغفرت فرمادے۔ ان کی والدہ صاحبہ کو اطلاع کردی تھی۔ کوئی ان کا خط ابھی تک نہیں آیا۔ باقی سب رفیق بخیریت ہیں۔ آپ کو اور سب کو سلام عرض کرتے ہیں۔ آپ کی دال اور گوشت کی پارسل سے خوشی ہوئی۔ مگر اس وقت تک کوئی نہیں پہونچا۔ آپ کو تحریر جواب میں بھی اسی لئے تاخیر کی کہ پارسل آجاویں تو آپ کو رسید بھی پہونچ جاوے۔ مگر افسوس ہے کہ اس وقت تک نہیں پہونچا۔ احباب مرادآباد کی عرض ہے۔ جو صاحب پارسل بھیجنے کا ارادہ فرمادیں ان کو منع کردیجئے اول تو چنداں حاجت نہیں۔ دوسرے اس قدر مسافت میں ضائع ہونیکا خطرہ۔ تیسرے پنیٹھ بکھیڑ (؟) شروع ہے مدینہ زقنہ متفرق طور لوگ جارہے ہیں۔ سو یہ احتمال ہے کہ پارسل کہاں پہونچے۔ مرسل الیہ کہاں؟ مولوی کفایت اللہ صاحب سے بعد سلام مسنون فرمادیجئے کہ اپنی سعی کو اس زائد امر میں صرف نہ فرمائیں۔ اس میں شک نہیں کہ کسی مخلص کا کوئی پارسل آتا ہے تو مسرت ہوتی ہے اس لئے کہ علامت محبت ہے مگر سعی اور ترغیب یقیناً مکروہ معلوم ہونی چاہئے۔ مولوی امین الدین وجملہ ان کے مدرسین کو سلام۔ قاری سید محمد صاحب کو سلام مسنون۔ کاش آپ یہ بھی لکھ دیتے کہ کتب درسیہ سے فارغ ہوگئے اور اب یہ مشغلہ ہے۔ والسلام و فقط

اپنے مدرسہ اور دیگر مواقع میں جہاں سلام پہونچا سکیں پہونچا دیجئے۔

مالٹا سنٹ کلیمنٹ براکس۔ ۲۰ صفر ۱۳۳۸ھ مطابق ۲۲/۱۰ (۵۵)

۵۵۔ مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری۔ تذکرہ شیخ الہند۔ ص۔ ۳۵۶۔ ۳۵۸

مولانا سید اصغر حسین صاحب کے شائع کردہ مجموعۂ مکاتیب میں دو خط حضرت شیخ الہند کے بھانجے اور داماد مولوی محمد حنیف صاحب کے نام ہیں۔ پہلا خط مکمل ہے اور اس پر تاریخ بھی پڑی ہوئی ہے البتہ دوسرے خط پر تاریخ درج نہیں اور خط بھی مکمل نہیں۔ معلوم نہیں کیوں "مختصراً" شائع کیا گیا ہے۔ یہ دوسرا خط ۳۷ھ کے آخر یا ۳۸ھ کے اوائل کا معلوم ہوتا ہے۔ دونوں مالٹا ہی سے لکھے گئے ہیں۔

مکتوب اول بنام مولوی محمد حنیف صاحب

عزیز محترم اسعدکم اللہ واکرم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

پہلے بھی کئی خط روانہ کر چکا ہوں۔ تمہارے بھی کئی خط آئے۔ بحمد اللہ خیریت سے ہوں۔ اور جملہ رفقا بھی خیریت سے ہیں۔ جمادی الثانی کے شروع پر تمہارا مرسلہ گوشت پہونچا۔ عجب چیز معلوم ہوا کئی برس کے بعد گائے کا گوشت نظر آیا کچے میں کسی قدر بو آتی تھی مگر پکنے کے بعد اچھا ہو گیا، مزے سے کھایا۔ چوں کہ گوشت کا قدر داں اور شائق اپنی جماعت میں صرف میں ہی ہوں اس لئے باوجود دانتوں کی کمزوری کے اوروں سے زیادہ کھایا۔ تم نے جو چوغے بھیجے تھے ان کی رسید اسی وقت تمہارے پاس روانہ کر دی تھی۔ مولوی زاہد حسن صاحب امروہی نے سب کے واسطے متعدد کرتے اور پاجامے سلوا کر اور بہت سی چاء اور چانول وغیرہ اشیاء بھیجی تھی اس کی رسید بھی ان کے نام روانہ کر چکا ہوں۔ تمہارے پاس خط پہونچ جائے تو تم بھی ان کو مطلع کر دینا۔ میرا سلام چھوٹوں اور بڑوں سبھی کو پہونچا دینا اور جملہ رفیق آپ کو اور سب کو سلام عرض کرتے ہیں۔ اسیروں کے متعلق تحریکات شروع ہیں حق سبحانہ کو منظور ہے تو جلد یا کچھ دیر کے بعد نتائج بھی ظاہر ہو جاویں گے۔ اللہ بس باقی ہوس۔ والسلام۔

۴ رجمادی الثانی ۱۳۳۷ھ۔ (۵۹)

مکتوب دوم بنام مولوی محمد حنیف صاحب

میں اور جملہ رفقاء اطمینان سے ہیں۔ حق تعالیٰ بخیریت آپ سے ملادے، دعا کرتے رہئے۔ وہاں کہیں کی کمی نہیں جملہ رفقاء جس عزم اور ہمت سے میرے ساتھ ہوئے تھے اسی عزم پر پختہ ہیں بعض موقعوں پر بعض صاحبوں کو میں نے چھوڑنا بھی چاہا کہ تم کیوں میری وجہ سے مفت دقت میں پڑتے ہو مگر کسی نے علیحدگی گوارا نہیں کی۔ ہر جگہ ہر طرح سے میری راحت اور تقویت میں مستعد ہیں۔ گویا اپنے گھر بیٹھا ہوا ہوں مجھ کو کچھ فکر کرنا نہیں پڑتا۔ جزاہم اللہ تعالیٰ ؎

خدا گر بحکمت بہ بندد درے

کشاید بفضل وکرم دیگرے

۔ اکثر یاد آجاتا ہے ۔ (۵۷)

مکتوب بنام ...... (ملتان)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

عنایت نامہ کاشف حالات ہوا۔ اس میں شک نہیں ہے کہ حالات موجودہ میں ہجرت کی ضرورت اور اہمیت سے انکار نہیں نہیں اور آپ جب اس امر کی اہمیت اور نزاکت کو کماحقہ سمجھ چکے ہیں تو آپ پر اس بارے میں جدوجہد فرض ہے اگر کوئی جاہل وغافل بعد از جہل قابل معافی سمجھا جائے تو ممکن ہے مگر جن کو حقیقت الامر منکشف ہو چکی ہے وہ کسی قسم کی معافی کے مستحق نہیں ہو سکتے لہٰذا بندہ کے نزدیک آپ جیسے باخبر اور قوی الہمت کے لئے اس امر میں ہرگز ہرگز کوتاہی جائز نہیں معلوم ہوتی۔

جس قدر امور اپنے متعلق آپ نے تحریر فرمائے ہیں اس میں قابل لحاظ والدین کی اطاعت اور زوجہ کی معیشت ہے اس لئے احتیاط اس میں ہے کہ آپ زوجہ اور صغیر اولاد کے گذران کی کوئی صورت فرمادیں اور والد سے حصول اجازت میں کوشش بلیغ سے کام لیں۔ اگر والدین کسی طرح رو براہ نہ ہوں تو پھر مناسب ہے کہ آپ ہجرت کا ارادہ نہ فرمائیں بلکہ بطور خدمت گذاری اسلام اور بطور ملازمت ارادہ وہاں جانیکا فرمالیں اور ان کی عدم اجازت کی پرواہ نہ کریں۔ ہاں ارادہ یہ ضرور رکھیں کہ خدمت ضروری ہے جب فارغ ہوں گا والدین کی خدمت میں چلا آؤں گا اور آپ وہاں پہونچکر جس تدبیر اور رائے سے مشورہ متعلقین کر کے اسلام کو نفع پہونچا سکیں اس میں کوشاں اور ساعی رہیں۔

بندہ محمود بقلم محمد مبین ۔ ۲۸ ذی قعدہ ۱۳۳۸ھ (۵۸)

ہجرت ہی کے متعلق ڈیرہ اسماعیل خاں کے ایک صاحب کے استفسار پر آپ نے ایک درخط تحریر فرمایا ہے جو مسئلہ مذکور کے متعلق بہت ہی جامع و بالغ جواب ہے خط یہ ہے۔

مکتوب بنام خلیفہ صاحب

مخدوم و مکرم بندہ جناب خلیفہ صاحب مدفیوضکم!

احقر محمود تسلیم مسنون کے بعد عرض رسا ہے جناب کا والا نامہ ایسے وقت پہونچا کہ بندہ سہارن پور گنگوہ وغیرہ گیا تھا وہاں سے کل واپس آیا تو جناب کا گرامی نامہ بندہ کو ملا۔ مگر سب جانتے ہیں کہ ہجرت کی فضیلت اور خوبی ہر وقت مسلمہ ہے کہ اس کے استحباب اور استحسان میں ہر طرف سے تاکید وجوب محسوس ہوتا ہے جو اہل محبت کے عمل کرنے کے لئے بالکل کافی ہے اب اس میں خواہ مخواہ فرضیت اور عدم فرضیت کا مباحثہ اور منازعت کرنا ان ہی لوگوں کا کام ہے جو حیلہ جو طبائع رکھتے ہیں۔ ایک حق کو رلانا چاہتے ہیں۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ اس تحقیق کی چند جوانب ملحوظ رکھنا ضروری ہیں۔

۱۔ دارالحرب کو جس سے ہجرت کریں اس کو غور سے ملاحظہ کرنا۔

۲۔ جس دارالاسلام میں جانا چاہتے ہیں اس کے احوال پر نظر کرنا۔

۳۔ جو ہجرت کریں ان کے حالات کو پیش نظر رکھنا ـــــ کیونکہ حالات بیحد مختلف ہیں خلاصہ یہ ہے کہ یہ وقت پریشانی کا ہے اور اہل اسلام کی آزمائش کا ہے۔ پس اہل اسلام اس سے جان نہ چرائیں۔ اللہ کے واسطے ہجرت کریں۔ اس ضروری وقت کو بحث و مباحثہ میں صرف نہ کریں۔

ہجرت ضروری ہے تو ایسی ضروری نہیں کہ نہ والدین کی اجازت کی حاجت ہو اور نہ اہل و عیال کی کفالت اور حیلہ اہلِ اسلام کو علی الفور ہجرت لازم کر دیجائے۔ اور مستحب ہے تو ایسی

۵۶۔ مولانا سید اصغر حسین۔ مرتب مکتوبات شیخ الہند۔ ص۔ ۶-۷

۵۷۔ 〃 〃 〃 ص ۷

۵۸۔ اخبار مدینہ بجنور ۹ ستمبر ۱۹۲۰ء

مستحب بھی نہیں کہ تمام اہل ہند بے حس وحرکت ہوکر آرام و اطمینان سے اس دار الکفر میں لمبے پیر پسار کر سوتے رہیں بلکہ فرض ہے کہ ہر شخص اپنی ہمت اور وسعت کے مطابق تائیدوں کے لئے مال اور جان سے کوشش کرے خواہ یہاں رہے یا کہیں باہر جاوے۔ لہٰذا موافق اکابر اور عمائد اسلام پر علی الخصوص واجب ہے کہ خود ہمت کریں اور عوام کو ہمت بندھائیں اور جو شخص جس کام کے لائق ہو اس کو اس کام میں لگائیں۔ اور بحث واختلافات جس کا منشا نفسانیت ہے اس سے بچیں اور دوسروں کو بچائیں اور "العلم حجاب اللّٰہ" کے مصداق نہ بنیں۔ احقر نے حالات موجودہ پر نظر کر کے جو مناسب حق سمجھا جناب کی خدمت میں پیش کر دیا۔ باقی عبارات کتب جن کو ہمارے علماء نے اپنے قول کی مؤید سمجھ کر اپنے استدلالات پیش فرمائے ہیں ان کا مطلب اہل علم جو سمجھ رہے ہیں اس میں مجھ کو عرض کرنے کی حاجت نہیں۔ میں نے فقط یہ عرض کیا ہے کہ ہجرت فرض ہے یا مستحب، قابل غور یہ ہے کہ ہم کو اس حالت میں کیا کرنا چاہئے۔ گر قبول افتد زہے عز وشرف۔

احقر اس خاص وقت میں ایسی منازعت کو نہایت منحوس اور مضر سمجھتا ہے۔ والسلام
۳ ذی الحجہ بندہ محمود عفی عنہ (۵۹) ۱۳۳۸ھ غالباً۔

۵۹۔ ۔ ۔ اخبار مدینہ بجنور۔ ۱۳ اکتوبر ۱۹۲۰ء

اسارت مالٹا کے بعد جب حضرت شیخ الہند ہندوستان آئے تو ضعف و ناتوانی کے علاوہ بیمار بھی رہنے لگے تھے اسی بیماری میں بعض مقامات کے سفر بھی کئے لیکن کسی طویل المسافت سفر کی راہ میں ضعف مانع تھا چنانچہ جب کلکتہ میں خلافت کانفرنس ہوئی تو شوق اور خواہش کے باوجود اس میں شرکت کیلئے تشریف نہ لیجا سکے، اس لئے مولانا مرتضیٰ حسن صاحب کے بدست ذمہ داران خلافت کانفرنس کے نام "ایک خط ایک پیغام" ارسال فرمایا جو کانفرنس کے اجلاس میں پڑھ کر سنایا گیا۔ خط درج ذیل ہے۔

مکتوب بنام ذمہ داران خلافت کانفرنس کلکتہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بندۂ ناچیز و ضعیف اپنے مکرمین اور مخلصین حضرات کی خدمت میں تسلیمات مسنونہ کے بعد ملتمس ہے۔ سب سے پہلے یہ عاجز آپ حضرات کی ان مساعی جمیلہ کا شکریہ واجب سمجھتا ہے جن کو آپ حضرات نے اپنی لگاتار کوششوں سے اپنے ملک اور قوم اور ملت کی بہبودی کیلئے بیدریغ مبذول فرما رہے ہیں اور سوتے ہوؤں کو خواب غفلت سے جگا جگا کر اور کمزوروں کو چونکا چونکا کر مفید باتیں دکھا اور سنا رہے ہیں۔ فجزاکم اللہ عنا احسن الجزاء و افضل الجزاء۔

اس وقت تمام ملک میں جو آثار بیداری کہیں زیادہ کہیں کم نظر آتے ہیں وہ آپ ہی کی جد وجہد کا نتیجہ اور آپ ہی کی جان توڑ مسلسل محنت اور ہمت کا ثمرہ ہے۔ اللہم زد فزد۔

اس کے بعد یہ عرض ہے کہ آپ حضرات نے جو اس ناتوان اور ناکارہ کو یاد فرما کر عزت واحترام کے ساتھ مکرر سہ کرر اپنی شرکت سراسر برکت کیلئے طلب فرمایا اس کا جواب بجز لبیک کے کچھ نہ تھا مگر کیا عرض کروں ہجوم عوارض اور کمزوری طبیعت ایسی سد راہ ہے کہ باوجود عزم و اشتیاق شرکت کسی طرح حرکت نہ کر سکا اور افسوس کے ساتھ آپ حضرات کی تعمیل سے بالکل قاصر رہا۔ آپ کے اخلاص کریمانہ سے بوجہ اپنی معذوری قویٰ کے معافی کا مستحق ہوں۔ اب بجز اس کے کیا کر سکتا ہوں کہ حق سبحانہ تعالیٰ آپ کے نیات و مساعی میں برکت عطا فرمادے اور اہل اسلام اور تمام ملک کو اس کی خیر و برکت سے مستفیض کرے یہ دور افتادہ باوجود ضعف و ناتجربہ کاری آپ کی ہمدردی و شرکت میں باذن اللہ ہرگز قاصر نہیں۔ فالحمد للہ۔

یہ ضرور ہے کہ ترک موالات وغیرہ جملہ امور میں انجام بینی اور احتیاط سے کام لیا جائے کسی جوش اور جذبہ کی اتباع بغیر تأمل و مشورہ ہرگز نہ کیجائے واللہ الموفق والمعین۔

بندہ محمود عفی عنہ - ۱۸ ذی الحجہ (۱۳۳۸ھ) (۶۰)

---

۶۰ ۔ ۔ ۔ اخبار مدینہ بجنور ۱۷ ستمبر ۱۹۲۰ء

بعض مکاتیب کے جستہ جستہ اقتباسات مولانا سید اصغر حسین نے اپنی کتاب میں نقل فرمائے ہیں جن کے مکتوب الیہ کا تعین دشوار ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ بعض خطوط داماد اور بعض اہلیہ محترمہ کے نام تحریر فرمائے ہیں۔ ان مکاتیب سے حضرت کی شان استقامت پر واضح روشنی پڑتی ہے۔ خود اسیری کی مدت گذار رہے ہیں مصائب و تکالیف کا بھی سامنا ہے مگر متعلقین کو کس حوصلہ سے صبر و رضا اور توکل علی اللہ کی بار بار تلقین فرما رہے ہیں۔ انہیں خصوصیات کی بنا پر ناتمام ہوتے ہوئے بھی ان اقتباسات کو جوں کا توں درج کیا جا رہا ہے ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں۔

"دو پارسل پہونچے ایک میں پان اور چھالیا اور دوسرے میں صرف چھالیا تھی تم نے جوتوں کے جوڑے بھیجے تو سب کے واسطے۔ وہاں قربانی کی تو سب کی طرف سے۔ پھر یہ پارسل ایسا کیوں بھیجا جس سے ایک کے سوا کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے۔ اتنی دور سے پارسل آوے اور ایک کے سوا کسی کو اس سے نفع نہ ہو، تعجب کی بات ہے تھوڑا سا ادرک یا زیرہ یا گٹے یا بتاشے ہی رکھ دیئے ہوتے تاکہ سب کی ناک میں خوشبو ہی پہونچ جاتی یا دال ہی میٹھی ہو جاتی۔" (۶۱)

دونوں طرف کے خطوط سینسر کی وجہ سے بہت تاخیر سے پہونچتے تھے اس کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

"... مگر اتنی مدت میں پہونچا کہ سخت تعجب ہوتا ہے کہ اتنی تاخیر کا کیا باعث ہوا۔ تم نے ۲ رجمادی الاولی ۱۳۳۷ھ کو روانہ کیا اور ہم کو ۲۴ رصفر ۳۸ھ کو ملا۔ حل کی مدت معتاد سے بھی بڑھ گیا۔ مگر الحمد للہ کہ وصول ہو گیا یہ بھی غنیمت ہے۔" (۶۲)

ایک دوسرے خط میں بھی اسی کا تذکرہ ہے تحریر فرماتے ہیں۔

"تمہارے پندرہ سولہ خط اکٹھے ہو کر مجھ کو صفر کے اخیر میں ملے شوال۔ ذی قعدہ، ذی الحجہ۔ ان چاروں مہینوں کے خطوط تھے۔" (۶۳)

ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں۔

"دنیا میں کوئی چیز یوں ہی نہیں ہو جاتی۔ جو کچھ ہوتا ہے اس کا کرنے والا حق تعالیٰ ہے ہر کام میں اس کی حکمتیں اور رحمتیں ہیں جن کو وہی جانتا ہے۔ تمام دنیا کو اس نے پیدا اور آباد کیا پھر ایک ان سب کو فنا کر دیگا اور پھر سب کو نئے سرے سے پیدا کریگا اس کے ہر حکم کو حق

سمجھنا چاہیے۔ راحت ہو یا مصیبت ہمت کر کے سر پر رکھ لینا چاہیے۔ اور اس کی رحمت سے کبھی مایوس نہ ہونا چاہیے۔" (۶۴)

"خدا کے سوا کوئی کچھ نہیں کر سکتا اسی پر نظر رکھو اور اسی سے دعا کرو۔ دنیا کے تمام قصے بھلے اور برے ختم ہو جانے والے ہیں اس لیے زیادہ خیال کرنے کے لائق نہیں۔ صبر اور سکوت سے جس طرح ہو سکے اپنے دن گذارو اور اللہ کی رحمت سے متوقع اور اس کی ناراضی سے ڈرتے رہو۔" (۶۵)

دنیا بہت گندی اور ناپائیدار ہے۔ اللہ کے سوا کسی سے امید رکھنا بالکل غلط ہے۔ جو احسان کرے اس کا احسان ماننا چاہیے اور اللہ کا شکر کرنا چاہیے کہ اس نے اپنے کسی بندے سے ہم کو نفع پہونچایا اور جو احسان نہ کرے اس کی شکایت ہرگز نہ چاہیے۔" (۶۶)

"بات قابل فکر صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہم سب کا خاتمہ ایمان پر کرے اور کوئی امر قابل فکر و اندیشہ نہیں۔ آدمی کی سعادت اور خوش قسمتی بس یہی ہے کہ اپنے اللہ رحیم کریم کو کسی حال میں نہ بھولے اور جہاں تک ہو سکے اس کے حکم مانے۔ باقی کوئی چیز چنداں اعتبار کے قابل نہیں۔ حسبنا اللہ ونعم الوکیل۔ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العظیم۔" (۶۶)

"حق سبحانہ جو تکلیف ڈالتا ہے اس کے سامنے قری محصنہ اور بر و مشیدہ رفع عنکبوت سے زیادہ کام نہیں دیتے اور جو راحت دیتا ہے اس کے آگے غربت دے کسی و در ماندگی و بے دستی و پائی سب ہبا منثور ان جاتی ہیں ؎

گر الست توقیع احسان اوست
ور انیست منشور احسان اوست" (۶۷)

(۶) کچھ تحریکات جو پہلے سے شروع تھیں اب ان کا کچھ ظہور ہو رہا ہے مگر بہت آہستگی

۶۲۔ مولانا سید اصغر حسین: حیات شیخ الہند، ص ۱۱۰

۶۳۔ ایضاً، ص ۱۱۱

۶۴۔ ص ۱۱

۶۵۔ ص ۱۱۰

۶۶۔ ص ۱۱۰

جو سے بہر حال سلسلہ شروع ہے حق تعالے کو جو منظور ہے لا بد ایک روز پورا ہو ہی جاوے گا۔" (۶۸)

"بندہ کی سعادت مندی اس میں ہے کہ مالک حقیقی کے حکم کو گو وہ نفس پر کتنا ہی شاق ہو بصبر و رضا سر پر رکھ لے اور اس کی رحمت پر بھروسہ رکھے پریشان نہ ہو۔ اس کی قدرت و رحمت میں سب کچھ ہے اس کی قدرت کے سامنے کوئی چیز لا علاج نہیں تکلیف کو راحت راحت کو تکلیف کر دینا اس کو ہرگز دشوار نہیں۔" (۷۰)

ایک صاحبزادی کے انتقال کا ذکر شروع کے کسی مکتوب میں آچکا ہے اہلیہ محترمہ کو ان کے متعلق ہدایت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

"اپنے آگے چلی جانے والی لڑکی کو ثواب رسانی سے مت بھولو قلیل کثیر جو ممکن ہو وقتاً فوقتاً اس کو ثواب میں یاد رکھو۔" (۷۱)

۶۷۔ مولانا سید اصغر حسین۔ حیات شیخ الہند۔ ص ۱۱۰۔ ۱۱۱

۶۸۔ " " " ص ۱۱۱

۶۹۔ " " "

۷۰۔ " " "

۷۱۔ " " "

کتابیات

اردو، فارسی کتب

۱۔ اسباب بغاوت ہند ۔ سرسید احمد خاں ۔ اردو اکیڈمی سندھ مشن روڈ کراچی۔ سنہ ۱۹۵۷ء

۲۔ انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ ۔ عبداللہ یوسف علی کریم سنز پبلشرز ۔ کلیٹن روڈ ۔ کراچی سنہ ۱۹۶۷ء

۳۔ سنہ ۱۸۵۷ء کا تاریخی روزنامچہ ۔ عبداللطیف ۔ مرتبہ پروفیسر خلیق احمد نظامی ۔ سنہ ۱۹۵۸ء۔

۴۔ سنہ ۱۸۵۷ء ۔ محمد شفیع ۔ سنہ ۱۹۵۷ء

۵۔ سنہ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ ۔ میاں محمد شفیع ۔

۶۔ آثار الصنادید ۔ سرسید احمد خاں ۔ (طبع اول)

۷۔ انقلاب سنہ ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ ۔ ایڈورڈ ٹھامپسن ۔ ترجمہ حسام الدین ۔ سنہ ۱۹۳۱ء

۸۔ سنہ ۱۸۵۷ء ۔ مولانا غلام رسول مہر ۔ کتاب منزل ۔ لاہور ۔ سنہ ۱۹۵۷ء

۹۔ سنہ ۱۸۵۷ء ۔ ایس ۔ بی ۔ چودھری ۔

۱۰۔ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر ۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (طبع پنجم) مجلس تحقیقات و نشریات اسلام ۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ سنہ ۱۹۶۷ء

۱۱۔ آپ بیتی ۔ ظفر حسن ایبک (طبع اول) منصور بک ہاؤس ۔ لاہور ۔

۱۲۔ اسیر مالٹا ۔ مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی ۔

۱۳۔ اشرف السوانح ۔ اول ۔ دوم ۔ سوم ۔ خواجہ عزیز الحسن مجذوب (طبع اول) ثنار اللہ خاں اینڈ سنز ۲۶ ریلوے روڈ ۔ لاہور سنہ ۱۹۶۰ء

۱۴۔ ایام غدر ۔ مسز ہورلشٹ انگلیبسی ۔ ترجمہ ظفر حسن عاصی ۔ سنہ ۱۹۲۳ء

۱۵۔ تاریخ امارت ۔ مولانا عبدالصمد رحمانی ۔ مکتبہ امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ سنہ ۱۳۶۲ھ

۱۶۔ افتتاحی خطبہ ۔ ۱۲ جنوری سنہ ۱۹۴۰ء مولانا عبیداللہ سندھی ۔ لارنس پریس روڈ ۔ کراچی۔

۱۷۔ الجہد المقل ۔ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ۔
۱۸۔ الیضاح الادلہ ۔ شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ ۔
۱۹۔ بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد ۔ سید رئیس احمد جعفری ندوی ۔ کتاب منزل ۔ لاہور طبع اول ۱۹۵۶ء
۲۰۔ باغی ہندوستان ۔ مولانا فضل حق خیر آبادی ۔ ترجمہ عبدالشاہد خاں شیروانی ۔ (طبع اول) مدینہ بکڈپو ۔ بجنور ۔ ۱۹۴۷ء
۲۱۔ بیگمات کے آنسو ۔ خواجہ حسن نظامی ۔ خواجہ اولاد کتاب گھر ۔ نظام الدین دہلی جولائی ۱۹۵۲ء
۲۲۔ بھارت میں انگریزی راج ۔ جلد سوم ۔ پنڈت سندر لال ۔ ۱۹۲۸ء
۲۳۔ پاکستان ناگزیر تھا ۔ سید حسن ریاض ۔ کراچی یونیورسٹی کراچی اگست ۱۹۶۷ء
۲۴۔ پیغام صدارت ۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن ۔ غنی المطابع ۔ دہلی ۔ ۱۹۲۰ء
۲۵۔ تاریخ ہند ۔ منشی ذکار اللہ ۔
۲۶۔ تاریخ ہند ۔ مارشمین ۔
۲۷۔ تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت ۔ سید ہاشمی فرید آبادی ۔ ۱۹۵۳ء
۲۸۔ تاریخ مگدھ ۔ مولوی فصیح الدین بلخی ۔ انجمن ترقی اردو ہند ۔ دہلی ۔ ۱۹۴۴ء
۲۹۔ تاریخ امروہہ جلد اول ۔ محمود احمد عباسی ۔
۳۰۔ تاریخ دیوبند ۔ محبوب علی رضوی ۔ ادارہ تاریخ ۔ دیوبند ۔ ۱۹۵۲ء
۳۱۔ تاریخی مقالات ۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی ۔ جنوری ۔ ۱۹۶۶ء
۳۲۔ تواریخ بلند شہر ۔ ڈاکٹر منگل سین ۔
۳۳۔ تذکرہ علماء ہند ۔ مولوی رحمٰن علی ۔ ترجمہ محمد ایوب قادری ۔
۳۴۔ تذکرہ شاہ ولی اللہؒ ۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی ۔ (طبع سوم) نفیس اکیڈمی کراچی ۱۹۵۹ء
۳۵۔ تذکرہ شیخ الہند ۔ مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری ۔ مدنی دار التالیف ۔ بجنور ۔ اگست ۔ ۱۹۶۵ء
۳۶۔ تذکرہ مشائخ دیوبند ۔ مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری ۔ مدنی دار التالیف ۔ بجنور ۔ جولائی ۱۹۶۷ء
۳۷۔ تذکرۃ الخلیل ۔ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی ۔ الخلیل مشین پریس ۔ میرٹھ ۔
۳۸۔ تذکرۃ الرشید اول ۔ دوم ۔ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی ۔ مکتبہ عاشقیہ ۔ قیصر گنج روڈ ۔ میرٹھ ۔
۳۹۔ تذکرۂ عالم ۔ مسز ہور لشرٹ انگلیسی ۔ ترجمہ ظفر حسن عاصی ۔
۴۰۔ تحریک ریشمی رومال ۔ مولانا حسین احمد مدنی ۔ مولانا عبدالرحمٰن (طبع دوم) کلاسیک ۔ ۴۲ ۔ دی مال ۔ لاہور ۔ ۱۹۶۶ء

۴۱۔ تصویر کا دوسرا رخ۔ سید حامد حسین جیلانی۔ نولکشور پریس۔ لکھنؤ۔ ۱۹۴۸ء

۴۲۔ تعلیمات مولانا عبیداللہ سندھی۔ مرتبہ محمد سرور (طبع اول) دسمبر ۱۹۵۵ء

۴۳۔ ٹیپو سلطان۔ مرتبہ عبداللہ بٹ (طبع چہارم) قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور ۱۹۶۳ء

۴۴۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء۔ خورشید مصطفیٰ رضوی (طبع اول) مکتبہ برہان اردو بازار۔ جامع مسجد دہلی۔ اپریل ۱۹۵۹ء

۴۵۔ جامعہ کی کہانی۔ عبدالغفار مدہولی۔ مکتبہ جامعہ۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ جنوری ۱۹۶۵ء

۴۶۔ داستان غدر۔ ظہیر دہلوی۔ مطبع کریمی۔ لاہور۔

۴۷۔ دہلی کی جانکنی۔ خواجہ حسن نظامی۔ (طبع چہارم) خواجہ اولاد کتاب گھر نظام الدین دہلی
جولائی ۱۹۶۴ء

۴۸۔ ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی۔ مرزا فرحت اللہ بیگ

۴۹۔ ذاتی ڈائری۔ مولانا عبیداللہ سندھی۔

۵۰۔ حیات شبلی۔ علامہ سید سلیمان ندوی (طبع اول) دار المصنفین۔ اعظم گڑھ ۱۹۴۳ء

۵۱۔ حیات جاوید۔ مولانا الطاف حسین حالی۔ اکاڈمی پنجاب سادنی دینا منزل۔ لاہور فروری ۱۹۵۷ء

۵۲۔ حیات ولی۔ مولانا محمد رحیم بخش دہلوی۔

۵۳۔ حیات اجمل۔ قاضی عبدالغفار۔

۵۴۔ حیات شیخ الہند۔ مولانا سید اصغر حسین

۵۵۔ حیات انور۔ مرتبہ سید محمد ازہر شاہ قیصر شاہ منزل دیوبند ۱۹۵۵ء

۵۶۔ حیات امداد۔ پروفیسر انوار الحسن شیرکوٹی (طبع اول) مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیو ٹاؤن کراچی ۱۹۶۵ء

۵۷۔ حکومت خود اختیاری۔ ہی

۵۸۔ خطبات مولانا سندھی۔ مرتبہ محمد سرور۔

۵۹۔ خطبہ صدارت مع فتویٰ۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن۔ عینی المطابع۔ دہلی۔ ۱۹۲۰ء

۶۰۔ خطبہ صدارت اجلاس جمعیۃ علماء ہند۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن
عینی المطابع۔ دہلی۔ ۱۹۲۰ء

۶۱۔ روداد کوثر۔ شیخ محمد اکرام (طبع سوم) فیروز سنز۔ لاہور۔ ۱۹۵۸ء

۶۲۔ سیرت سید احمد شہید۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (طبع سوم) مکتبہ اسلام گوئن روڈ
لکھنؤ ۱۹۶۸ء

۶۳ ۔ سیر المتاخرین ۔ غلام حسین طباطبائی ۔

۶۴ ۔ سید احمد شہید ۔ مولانا غلام رسول مہر ۔ ۱۹۵۷ء

۶۵ ۔ سرگذشت مجاہدین ۔ مولانا غلام رسول مہر طبع اول ۔ کتاب منزل ۔ لاہور ۔ ۱۹۵۶ء

۶۶ ۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری ۔ شورش کشمیری ۔ مکتبہ چٹان میکلوڈ روڈ ۔ لاہور ۔ ۱۹۵۶ء

۶۷ ۔ سید المرسلین ۔ شاہ ولی اللہ دہلوی رح ۔ ترجمہ عزیز ملک طبع اول ادبستان ۔ لاہور ۱۹۵۶ء

۶۸ ۔ سید احمد خاں کی سوانح عمری ۔ میجر جنرل الف ۔ آئی ۔ گریہم

۶۹ ۔ سیاست ملیہ ۔ محمد امین زبیری

۷۰ ۔ سوانح قاسمی اول ۔ دوم ۔ سوم ۔ مولانا سید مناظر احسن گیلانی طبع اول دارالعلوم دیوبند ۱۳۷۳ھ

۷۱ ۔ سوانح عمری مولانا قاسم نانوتوی ۔ مولانا محمد یعقوب نانوتوی ۔

۷۲ ۔ سوانح حیات مولانا اصغر حسین صاحب ۔ سید اختر حسین ۔

۷۳ ۔ سوانح مولانا عبدالقادر رائپوری رح ۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (طبع اول) مکتبہ اسلام ۔ گوئن روڈ لکھنؤ ۔ ۱۳۸۳ھ

۷۴ ۔ سن ستاون ۔ پنڈت سندر لال ۔ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ دسمبر ۱۹۵۷ء

۷۵ ۔ سوانح دہلی ۔ مرزا احمد اختر

۷۶ ۔ سن ستاون میری نظر میں ۔ مرتبہ ناصر کاظمی ۔ انتظار حسین

۷۷ ۔ سوانح ٹیپو سلطان ۔ سید امجد علی ۔ وکیل بکڈپو ۔ امرتسر ۔ ۱۹۲۰ء

۷۸ ۔ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ۔ مولانا عبیداللہ سندھی رح (طبع اول) کتاب خانہ پنجاب ۔ لاہور ۔ ۱۹۴۲ء

۷۹ ۔ شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ ۔ مولانا عبیداللہ سندھی سندھ ساگر اکاڈمی ۔ لاہور جنوری ۱۹۴۹ء

۸۰ ۔ شاہ ولی اللہ رح اور ان کے سیاسی مکتوبات ۔ مرتبہ و تفسیر خلیق احمد نظامی (طبع اول) النفیس منزل ۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۵۰ء

۸۱ ۔ شاہ اسماعیل شہید ۔ مرتبہ عبداللہ بٹ ۔ قومی کتب خانہ ریلوے روڈ ۔ لاہور ۱۹۵۵ء

۸۲۔ شیخ الہند ۔ شائع کردہ انجمن اعانت نظر بندان اسلام ۔ دہلی ۱۹۱۸ء
۸۳۔ شیر میسور ۔ قیصر مصطفیٰ ۔
۸۴۔ ضیاء القلوب ۔ حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی ۔
۸۵۔ عروج سلطنت انگلشیہ دوم ۔ منشی ذکاء اللہ
۸۶۔ علماء حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے ۔ جلد اول ۔ مولانا سید محمد میاں
کتب خانہ فخریہ ۔ امروہہ گیٹ ۔ مراد آباد
۸۷۔ علمائے ہند کا شاندار ماضی جلد دوم مولانا سید محمد میاں ۔ الجمعیۃ بکڈپو ۔ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۱۹۵۷ء
۸۸۔ علماء حق اور ان کی مظلومیت کی داستانیں ۔ مفتی انتظام اللہ شہابی
۸۹۔ علی گڈھ تحریک ۔ مرتبہ ۔ نسیم قریشی ۔ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ ۔ ۱۹۶۰ء
۹۰۔ غدر کا نتیجہ ۔ خواجہ حسن نظامی ۔ حلقہ مشائخ بکڈپو نظام الدین دہلی دسمبر ۱۹۳۰ء
۹۱۔ غدر کی صبح و شام ۔ ترجمہ ضیاء الدین برنی مارچ ۱۹۲۶ء
۹۲۔ فرنگیوں کا جال ۔ امداد صابری ۔ امداد صابری پبلشر چوڑی والان دہلی جنوری ۱۹۴۴ء
۹۳۔ فتویٰ ۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن ۔ شائع کردہ خلافت کمیٹی آگرہ ۔ ۱۹۲۰ء
۹۴۔ قیصر التواریخ ۔ سید کمال الدین حیدر ۱۸۹۶ء
۹۵۔ کمپنی کی حکومت ۔ باری علیگ ۔
۹۶۔ کابل میں سات سال ۔ مولانا عبید اللہ سندھی ۔
سندھ ساگر اکاڈمی ۔ لاہور ۔ اکتوبر ۱۹۵۵ء
۹۷۔ کالا پانی ۔ مولانا محمد جعفر تھانیسری
۹۸۔ کلیات شیخ الہند ۔ شیخ الہند ۔
۹۹۔ محمد بن عبد الوہاب ایک مظلوم اور بدنام مصلح ۔ مولانا مسعود عالم ندوی
مکتبہ نشاط ثانیہ ۔ حیدر آباد ۔ ۱۳۶۱ھ
۱۰۰۔ محاربہ عظیم ۔ کنھیا لال ۔ ۱۸۸۹ء
۱۰۱۔ مرثیہ ۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن ۔
کتب خانہ اعزازیہ ۔ دیوبند ۔
۱۰۲۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل ۔ سید طفیل احمد منگلوری ۔ (طبع سوم)

نظامی پریس بدایوں : ۱۹۴۰ء

۱۰۳۔ مسلمانوں کا عروج و زوال ۔ پروفیسر مولانا جناب سعید احمد اکبر آبادی۔

۱۰۴۔ مسلمانان ہند کی سیاست وطنی ۔ محمد امین زبیری ۔ عزیزی پریس ۔ آگرہ

۱۰۵۔ مقدمہ ترجمہ قرآن ۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن۔

۱۰۶۔ مکاتیب سرسید احمد خاں ۔ مرتبہ ۔ مشتاق حسین۔

اسٹار بکڈپو ۔ اردو بازار لاہور۔

۱۰۷۔ مکتوبات شیخ الہند ۔ مرتبہ مولانا سید اصغر حسین۔

۱۰۸۔ ملفوظات شاہ عبدالعزیز ۔ ترجمہ محمد علی لطفی ۔ مفتی انتظام اللہ شہابی

پاکستان ایجوکیشنل پبلشرز لمیٹیڈ ۱۲ میری روڈ کراچی ۱۹۶۰ء

۱۰۹۔ مکمل تاریخ آزاد ہند فوج ۔ اسرار احمد آزاد۔

۱۱۰۔ موج کوثر ۔ شیخ محمد اکرام ۔ طبع دوم فیروز سنز لاہور ۔ ۱۹۵۸ء

۱۱۱۔ مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت ۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ۔ کتب خانہ

الفرقان ۔ لکھنؤ دسمبر ۱۹۶۴ء

۱۱۲۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور جنگ آزادی ۔ عزیز الرحمٰن جامعی ۔

(طبع اول)

۱۱۳۔ مولانا مودودی کی تحریک اسلامی ۔ محمد سرور۔

سندھ ساگر اکاڈمی ۔ لاہور مئی ۱۹۵۶ء

۱۱۴۔ میری کہانی حصہ دوم ۔ پنڈت جواہر لال نہرو

مکتبہ جامعہ نگر ۔ دہلی۔

۱۱۵۔ نقش حیات اول ، دوم ۔ مولانا سید حسین احمد مدنی

الجمعیۃ بکڈپو ۔ قاسم جان اسٹریٹ ۔ دہلی ۔ ۱۹۵۴ء

۱۱۶۔ ہماری آزادی ۔ مولانا ابوالکلام آزاد ۔ ترجمہ ۔ پروفیسر محمد مجیب۔

(طبع اول) اورینٹ لونگ مینس ۔ پرائیویٹ لمیٹیڈ بمبئی ۱۔ فروری ۱۹۶۱ء

۱۱۷۔ ہندوستانی مسلمان ۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

مجلس تحقیقات و نشریات اسلام ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

۱۱۸۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان۔ ڈبلوڈبلوہنٹر۔ ترجمہ صادق حسین۔
قومی کتب خانہ ریلوے روڈ۔ لاہور۔ ۱۹۵۵ء
۱۱۹۔ ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں۔ ڈاکٹر سید عابد حسین
۱۲۰۔ ہندوستانی مسلم سیاست پر ایک نظر۔ ڈاکٹر محمد اشرف (طبع اول) مارچ ۱۹۶۳ء
۱۲۱۔ ہندوستان کا مستقبل۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد۔
(طبع اول) جمالی پبلشنگ ہاؤس۔ کتاب گھر۔ دہلی جون ۱۹۴۶ء

عربی کتب

۱۔ تاریخ آداب اللغۃ العربیہ ۔ جرجی زیدان ۔

۲۔ تفہیمات الٰہیہ اول ۔ شاہ ولی اللہ دہلوی

۳۔ حجۃ اللہ البالغہ ۔ شاہ ولی اللہ دہلوی

۴۔ نزہۃ الخواطر جلد ۴ ۔ مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی رح
(طبع اول) دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن ۱۹۵۷ء

۵۔ حاشیہ مختصر المعانی ۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن

۶۔ الہدایۃ السنیۃ فی ذکر المدرسۃ الدیوبندیۃ ۔ مولانا ذوالفقار علی
مطبع مجتبائی ۔ ۱۳۰۷ھ

رسائل

۱۔ آج کل ـــ ایڈیٹر۔ شہباز حسین ۔ دہلی جون۔ ۱۹۶۹ء

۲۔ الرحیم ـــ ؍؍ محمد سرور

۳۔ الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر ـــ ایڈیٹر۔ مولانا محمد منظور نعمانی (طبع دوم) بریلی ۱۳۶۰ھ ۱۹۴۱ء

۴۔ چراغ راہ نظریہ پاکستان نمبر ـــ ایڈیٹر۔ خورشید احمد۔ کراچی ۔ ۱۹۶۰ء

۵۔ القاسم ۔ ایڈیٹر۔ مولانا محمد حبیب الرحمٰن ۔ دیوبند۔

۶۔ نقوش ۔ ایڈیٹر۔ محمد طفیل
ادارہ فروغ اردو۔ لاہور۔ جون۔ ۱۹۵۷ء

۷۔ نقوش شخصیات نمبر ـــ ایڈیٹر۔ محمد طفیل۔
ادارہ فروغ اردو۔ لاہور۔ جنوری ۱۹۵۵ء اکتوبر ۱۹۵۶ء

۸۔ نقوش خطوط نمبر ـــ ایڈیٹر۔ محمد طفیل
ادارہ فروغ اردو۔ لاہور۔ اپریل مئی۔ ۱۹۶۸ء

۹۔ نقوش آپ بیتی نمبر ـــ ایڈیٹر۔ محمد طفیل
ادارہ فروغ اردو۔ لاہور۔ جون ۱۹۶۴ء

۱۰۔ نیا دور جنگ آزادی نمبر ـــ
لکھنؤ۔ اپریل ۱۹۵۷ء

—

اخبارات

۱۔ الجمعیۃ۔۔ شیخ الاسلام نمبر — مولانا محمد عثمان فارقلیط دہلی۔ ۱۹۵۸ء

۲۔ الخلیل — بجنور

۳۔ انگلینڈ ٹائم — بجنور ۲۵ راگست ۱۸۵۸ء

۴۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ — سرسید احمد خاں ۲۴ راپریل ۱۸۸۰ء

۵۔ چٹان — شورش کشمیری — لاہور

۶۔ مدینہ — بجنور

۷۔ ندائے ملت مسلم یونیورسٹی نمبر — ایڈیٹر حفیظ نعمانی لکھنؤ۔ ۱۹۶۵ء

٭ ٭ ٭